سو عظیم کتابیں

مارٹن سیمور سمتھ

ترجمہ یاسر جواد

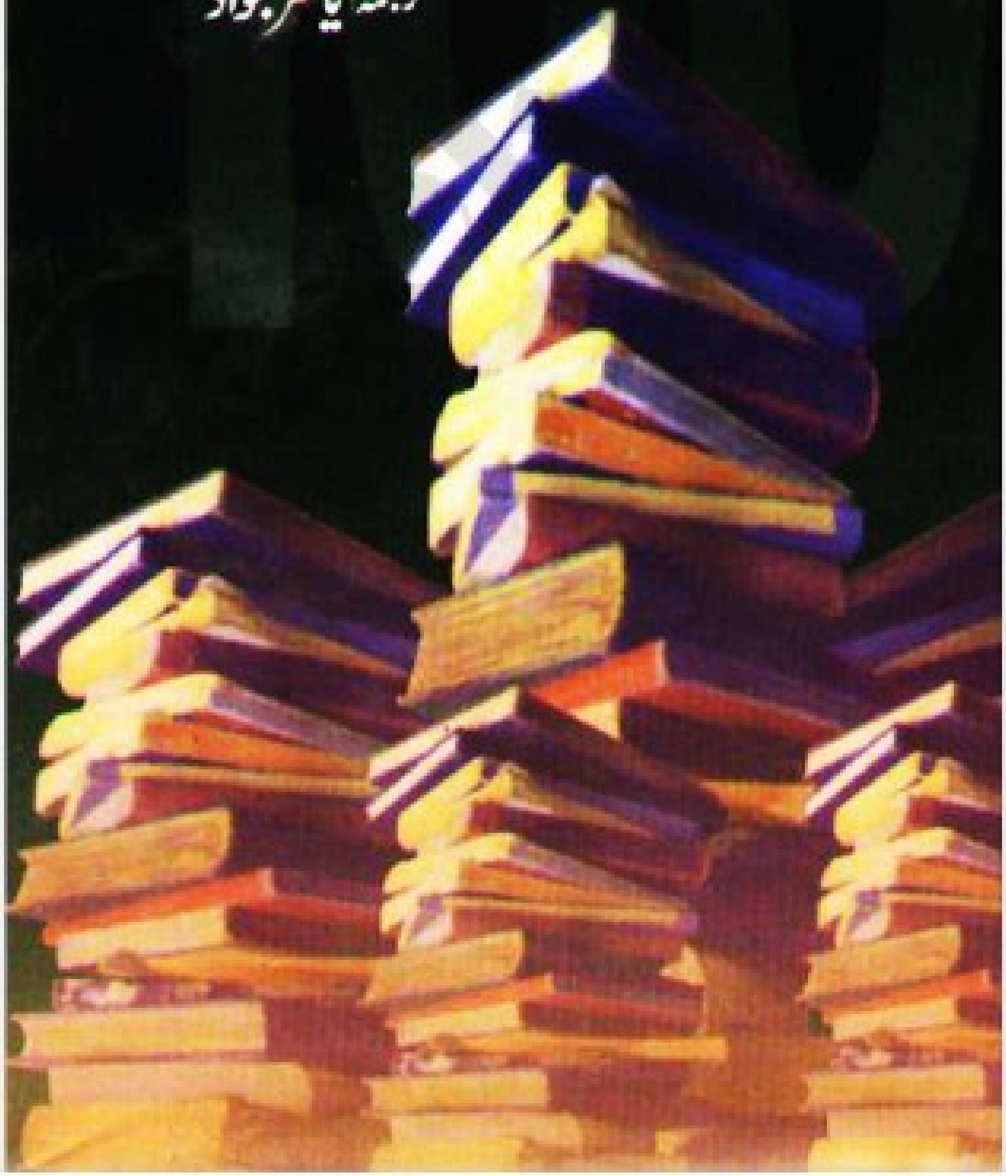

فہرست

ہومر
لاؤ تزو
کنفیوشس
تھیوسی ڈائیڈز
بقراط
ارسطو
ہیروڈوٹس
افلاطون
یوکلید
ورجل
لوکریشیس
سکندر یہ کا فیلو
پلوٹارک
کورنیلیس ٹیسی ٹس
مارکس اوریلیس
سکسٹس ایمپیریکس
پلوٹینس
ہپو کا آگسٹائن
موسس میمونائیڈز
ٹامس آکوینس

دانتے الگیری
ڈیسیڈ ریئس اراسمس
نکولو میکیاویلی
مارٹن لوتھر
فرانسوئز رابلیس
جان کیلون
نکولس کاپرنیکس
مائیکل ایکیوم دی مانٹین
میگوئیل دی سروانٹیس
جوہانس کپلر
فرانسس بیکن
ولیم شیکسپیئر
گلیلیو گلیلی
رینے ڈیکارٹ
تھامس ہوبز
گوٹ فرائیڈ ولیم لیبنز
پاسکل
باروک دی سپنوزا
جان بنیان
آئزک نیوٹن
جان لاک
جارج برکلے
گیامبا تستا ویکو
ڈیوڈ ہیوم
ڈینس دیدرو

سیموئیل جانسن

فرانسوا - ماری دی والٹیئر

تھامس پین

ایڈم سمتھ

ایڈورڈ گبن

ایمانوئیل کانٹ

ژاں ژاک روسو

ایڈمنڈ برک

میری وولسٹون کرافٹ

ولیم گوڈون

تھامس رابرٹ مالتھس

جارج ولیلم فریڈرک ہیگل

آرتھر شوپنہاور

آگسٹ کومتے

کارل میری واں کلاسوز

سورین کیرکیگارڈ

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس

ہنری ڈیوڈ تھورو

چارلس ڈارون

جان سٹوارٹ مل

ہربرٹ سپنسر

گریگور مینڈل

لیو ٹالسٹائی

جیمز کلارک میکسویل

فریڈرک نطشے

سگمنڈ فرائیڈ

ولیم جیمز

البرٹ آئن سٹائن

ولفریڈو پیریٹو

کارل گستاو ینگ

مارٹن بوبر

فرانز کافکا

کارل پوپر

جان مینارڈ کینز

ژاں پال سارتر

فریڈرک واں ہائیک

سیمون دی بووا

نوربرٹ وینر

جارج آرویل

جارج ایوانووچ گرجیف

لڈوگ وٹگنسٹین

ناؤم چومسکی

ٹی ایس کوہن

بٹی فرائیڈان

ماؤزے تنگ

بی ایف سکنر

1

یی چنگ

(تبدیلیوں کی کتاب)

"The I Ching"

اندازاً 1500 قبل مسیح

یی چنگ کو انگریزی میں I Ching لکھا جاتا ہے جس کا مطلب تغیرات یا تبدیلیوں کی کتاب ہے۔ یہ کتاب خود چین جتنی ہی قدیم ہے۔ کتاب کے مختلف متن بتاتے ہیں کہ یہ کنفیوشسی اور تاؤ انداز حیات کی بنیاد بنی اور اسی کے ایک موضوع (تاؤمت کی Dark Learning) کے ذریعہ بدھ مت نے چین میں مقبولیت حاصل کی۔ اٹھارہویں اور انیسویں

صدیوں میں اہل مغرب آہستہ آہستہ تبدیلیوں کی کتاب سے متعارف ہوئے (لیبنز تو اس سے بہت مسحور ہوا)۔ مغرب والوں پر اس کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہوا جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مغرب کے بہت سے لوگ اس کے ذریعہ فال نکالتے ہیں۔ ''نیویارک ٹائمز'' میں ایک مرتبہ اس امر کا ذکر کیا گیا۔ چینی تاریخ میں بھی یہ کتاب حیرت انگیز مقبولیت کی حامل رہی' تاہم، یہ کتاب گزشتہ تین ہزار سال کے دوران کسی بھی تبدیلی سے محفوظ رہی' حتیٰ کہ ماؤ سے مارکس ازم سے بھی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اہل مغرب کی بہت بڑی تعداد میں سیاستدانوں کا احترام کرنے سے گریز اور داخلی زندگی کی جانب توجہ کا رجحان متعدد مختلف صورتوں میں جاری رہا۔ اس رجحان میں ''تبدیلیوں کی کتاب'' کا اہم کردار متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے چینی لوگوں کے فیصلہ کرنے کے انداز کو نہایت گہرائی میں متاثر کیا۔ ثقافتی اور سیاسی دونوں اعتبار سے۔ لہٰذا مغرب پر بھی اس کا اثر ہوا۔ لیکن اس نے کم از کم 1950ء کے بعد انفرادی فیصلوں کو بھی اتنی ہی گہرائی میں متاثر کیا...... گزشتہ پچاس برس سے یہ کتاب موجود ہے اور اسے ایک مکاشفہ خیال کیا جاتا رہا ہے۔ درحقیقت مغربی معاشروں پر اس کا اثر رومن ادوار کے بعد کسی بھی چیز کی نسبت زیادہ ہے۔

تبدیلیوں کی کتاب کے اصل ماخذ پر اسراریت کی دھند میں کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ انسانی ذہن کی کائنات میں اپنا مقام تلاش کرنے کی اولین کوششوں میں سے ایک ہے۔ یہ بات تو بہرحال واضح ہے۔ چنانچہ اس کی تہہ میں موجود عمومی نظریات تجرباتی حوالے سے ''کارگر'' معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چین کے نہایت قدیم نظریہ ''یانگ'' اور ''ین'' کی پیداوار ہے۔ یانگ کا اصل مطلب سورج کی روشنی ہے، جبکہ ین سے مراد روشنی اور حرارت کی عدم موجودگی ہے۔ ان دو متضاد اصولوں کو کائناتی قوتیں سمجھا گیا۔ مردانگی/نسوانیت، گرمی/سردی، روشنی/تاریکی، خشکی/گیلا پن، سختی/نرمی وغیرہ۔ چینیوں نے تصور کیا کہ دو مظاہر کی باہمی جدلیات نے کائنات کو پیدا کیا۔ روایت کے مطابق چین کے افسانوی شہنشاہ فوسی (Fu Hsi) نے یی

چنگ کی بنیاد پر آٹھ بنیادی سہ رکنی خاکے...... ٹوٹی اور سالم تین تین لائنوں کے سیٹ...... بنائے تھے۔ ان سہ رکنی خاکوں میں سے کسی بھی دو کو ملا کر 64 ہشت رکنی خاکے (Hexagrams) بنائے جا سکتے ہیں۔ ئی چنگ کا اوریجنل ٹیکسٹ ہر ایک ہشت رکنی خاکے کے علامتی مفہوم کے بیان پر مشتمل ہے۔ لیکن اس وضاحت کے باوجود انہیں سمجھنا ممکن نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بارھویں صدی کے بادشاہ وین (Wen) نے قید کے دوران 64 امتزاجات ایجاد کیے تھے۔ خیال ہے کہ اس کے بیٹے، چو (Chou) نے ہر ہشت رکنی خاکے (Hsiao) پر تفاسیر کا اضافہ کیا، لیکن ئی چنگ کا ہم تک پہنچنے والا متن (اگرچہ 1715ء میں اس میں ترمیم کی گئی) کنفیوشس کا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کنفیوشسی عالم کہلانے والے افراد نے کنفیوشس کی "گلدستہ تحریر" اور دیگر تحریروں کی طرح اسے بھی اس کی موجودہ شکل دی۔ البتہ یہ قرین قیاس نہیں کنفیوشس خود بھی الوہیت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ کتاب اب بھی ایک قسم کی مذہبی سند رکھتی ہے، کنفیوشس ازم ایک مذہب نہیں بلکہ اخلاقیات کا ایک (ناکام) ضابطہ ہے۔ تاہم، یہ امر ناقابل تصور ہے کہ کتاب کے بارے میں کنفیوشس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا؛ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اس نے کیا کہا۔ بے شمار اور نہایت مختلف اندازے قائم کیے گئے ہیں۔

نہ معلوم مصنف کی تحریری چنگ "ہر ایک چیز پر استدلال کرتی ہے۔" ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے زیادہ قابل قدر ہے جو ینگی (Jungian) یا حتیٰ کہ غیر ینگی حوالے سے بھی اپنے بے شعور ذہنوں کو کھوجنا یا "اپنے آپ کو تلاش کرنا" چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اس قسم کا تصور کافی نقصان دہ یا حتیٰ کہ کم از کم خود جاذبی سوچ کی بنیاد بن سکتا ہے۔ غالباً اس میں یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ تاہم، کتاب میں بذات خود کوئی دانش موجود نہ ہونا عجیب ہوگا کیونکہ چینیوں نے اسے ہمیشہ بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔

درحقیقت ئی چنگ دوسری صدی قبل مسیح میں اس وقت لکھی گئی جب شانگ اور چو لوگ کچھوے کے خولوں سے شگون لیا کرتے تھے۔ خولوں کو گرم کرنے پر ان میں بننے والے شگافوں

کی "تحریر" کو پڑھا جاتا۔ حکایت کے مطابق فو ہسی نے کہا تھا کہ اس نے اپنے آٹھ سہ رکنی خاکوں کو پہلی مرتبہ ایک کچھوے کے خول پر دیکھا تھا۔ 213 ق-م میں جب چن سلطنت کے پہلے شہنشاہ شیہہ ہوانگ تی...... جس نے سٹالن اور ہٹلر کی طرح اپنے اقتدار کی خاطر ماضی کو بدلنے کی کوشش کی...... نے کتب سوزی کا حکم دیا تو ئی چنگ نے شاید اپنی موجودہ صورت اختیار کی۔ یہ نام نہاد تاریخی ریکارڈز...... موسیقی، رسوم، شاعری اور قدیم نغمات...... کی واحد کتاب کھل عام موجود رہی۔ اسے باعث خطرہ نہ سمجھا گیا کیونکہ یہ الہام یا فال گیری کی کتاب تھی۔ اس کے بعد جلد ہی اسے ہر عالم کی تربیت کا لازمی جزو سمجھا جانے لگا، اور اس نے ایک فریم ورک مہیا کیا جس کے اندر ہر ایک چیز پر بحث کی جاتی تھی۔ انجام کار "ئی چنگ" کو بھی بائبل کی طرح دنیا کے ہر مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ الکیمیا دانوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی نظاموں کے مبلغین اور اذیت پسندوں (Sadists) نے بھی اسے استعمال کیا۔ جہاں تک مغرب والوں کا تعلق ہے تو "ئی چنگ" کا ایک انگریزی ترجمہ نہایت مقبول ہوا جو ایک عالم اور پروٹسٹنٹ مبلغ جیمز لیگی نے کیا۔ جیمز لیگی آکسفورڈ میں چینی زبان کا پہلا پروفیسر بنا۔ اس کے بعد رچرڈ ولہلم نے "ئی چنگ" کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ سی جی ینگ نے اس ترجمے کا دیباچہ لکھا۔

اس مقبول عام نجی کتاب الہام کے متعلق یہ تمام ابہام شاید ناگوار معلوم ہو۔ یہ بذات خود محض ایک غلط ملط ریکارڈ ہی نہیں، بلکہ اسے مغرب میں متعارف کروانے والے مترجمین کے ناگزیر مذہبی تعصب نے بھی اپنا کام دکھایا۔ چینی زبان کے مختلف ماہرین "ئی چنگ" کے کئی مختلف ترجمے کر سکتے ہیں اور وہ سبھی مستند ہوں گے۔ لیکن کتاب کی تہہ میں اس کی اصل دانش بدستور موجود ہے جو خود کو نہایت موثر انداز میں آشکار کرتی ہے۔ ملحدین کے سوا تمام حلقہ ہائے فکر کے لیے اس کا تھیسس غیر معمولی نہیں: زندگی کائناتی نظم پر مرکوز ہے، اور وہ نظم بھی تبدیلی و تغیر سے مبرا نہیں...... چنانچہ انسانوں کو ناگزیر کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا سیکھنا چاہیے۔ غالباً بہت سے اہل مغرب نے اسے فلسفۂ تقدیر کے طور پر دیکھا۔ تقدیر پرست اپنی قسمت سمیت ہر چیز کو پہلے سے طے شدہ سمجھتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے خیال میں یہ نکتہ نظر شخصی ذمہ داری کا

خاتمہ کر دیتا ہے۔

تقدیر کا چینی تصور منگ (Ming) کچھ مختلف ہے۔ درحقیقت متعدد نسبتاً کم خام مغربی رویوں میں اس کی بازگشت موجود ہے۔ منگ سے مراد محض 'وجود کے تمام حالات اور ساری کائنات کی قوتیں' ہے۔ اگر ہمیں کامیاب سرگرمیاں اپنانا ہیں تو ان حالات یا شرائط کے ساتھ (جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں) تعاون کرنا پڑے گا۔ لہٰذا کنفیوشس نے کہا: ''منگ سے نا آشنا شخص اعلیٰ انسان نہیں بن سکتا۔'' لی چنگ میں جا بجا ہمیں ''اعلیٰ انسان'' کی اصطلاح ملتی ہے۔ یہ اعلیٰ انسان عام مفہوم میں ''اعلیٰ یا برتر'' نہیں، وہ صرف دانش کا مالک ہونے کے باعث اچھے حالات سے بدتر ہے۔ چنانچہ اپنی تقدیروں پر مختار نہ ہونے کے باوجود ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ زندگی کیسے گذارنی چاہیے: ہم غالب کائناتی حالات کے ہمراہ سفر کرنے کی راہ منتخب کر سکتے ہیں۔

ظاہری طور پر کنفیوشس نے خود الہامی یا کہانتی کتاب سے رجوع نہیں کیا تھا۔ اس کی بجائے اس نے دنیا کی اصلاح کرنا چاہی اور ناکام رہا۔ تاہم، اس نے کہا کہ ''اگر میرے خیالات غالب آ جائیں تو وہ منگ ہیں اور اگر غالب نہ آ سکیں تو وہ منگ نہیں۔'' یوں ''ی چنگ'' کی بنیادوں کو ''غیر اخلاقی'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کا اخلاقیات یا نیکی کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ الہام سے رجوع کرنے والا شخص جان لیتا ہے کہ وہ ''اچھا'' ہے یا ''برا۔'' اس کی بے انتہا مقبولیت کے پیش نظر یہ جاننا ممکن نہیں اس کا زیادہ فائدہ بُروں نے اٹھایا یا اچھوں نے۔ عیسائی ہمیشہ یہ سوال کرتا ہے: ''ایک خدائے خیر کس طرح شر کو آزاد چھوڑ سکتا ہے؟'' البتہ چینی ''خدا'' زیادہ غیر شخصی ہے اور اس کے بارے میں ایسا سوال نہیں کیا جاتا۔ اصل معاملہ نیک یا اچھا ہونا نہیں بلکہ حقیقت کے ساتھ مربوط ہونا ہے۔ ہٹلر اتنا ''خوش قسمت'' کیوں تھا؟ یقیناً اس وجہ سے تو نہیں کہ اس نے ''ی چنگ'' کے بارے میں سن رکھا تھا، لیکن اس قسم کے لوگ (آج کل کے بیشتر کروڑ پتی لوگوں کی طرح جو نیکی سے لاتعلق ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی مذہب ضرور اپنائے رکھتے ہیں) اپنے اپنے دور کی حقیقتوں کے ساتھ ضرور منسلک ہوتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کی ''جبلت'' اور ''قسمت'' کی بھلا اور کیا وضاحت کر سکتے ہیں؟

چنانچہ ''ی چنگ'' بھی نیکوں کے ساتھ ساتھ موقع پرستوں کی خدمت میں بھی موجود ہے۔

تاہم، اس میں ''ہر چیز کا استدلال شامل نہیں۔'' اس معاملے میں یہ بہت رمزیہ اور مبہم ہے۔ شاید کسی دور میں یہ ہر چیز کے لیے استدلال کی حامل تھی؟ لیکن اس کا بنیادی اصول، یہ خیال کہ ہر چیز رو بہ تغیر ہے، اب بھی کافی استناد کا حامل ہے۔

یہاں اس کا درست رتبہ یہ ہے کہ یہ مسیتی ریاضت کے لیے ایک آلے کا کام دے سکتی ہے، جبکہ اس کے ماخذ ابہام کی دھند میں ملفوف ہیں ...... نیز یہ ایک زراعتی تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ اپنے استعمال کرنے والوں کو ایک طرح کا ''زندہ ہونے'' کا احساس دیتی ہے۔ ماہر نفسیات سی جی ینگ کا اسے لاشعور کی کنجی قرار دینا پُر اثر تھا۔ لیکن اس نے تاریخی مفہوم میں اس پر قطعی غیر تنقیدی رویہ اختیار کیا۔

ہمیں ''ی چنگ'' کی صورت میں مجسم فلسفہ کی قسم پر غور و خوض کرنا چاہیے۔

rekhta

2

عہدنامۂ قدیم

"The Old Testament "

اندازاً 1500 قبل مسیح

عقائد کے اساسی صحائف کے سلسلے میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامۂ جدید دو بالکل مختلف کتابیں ہیں۔ عیسائی کلیسا کے مطابق عہد نامہ قدیم ہمیں جدید کی جانب لے جاتا ہے۔ بائبل کے کچھ معتقد آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں عہد ناموں پر مشتمل جلد خدا کا پیغام اور ''تحقیق'' کا بالکل سچا بیان بھی ہے۔ یہ چیز عقیدے کی تاریخ کا حصہ تو ہے مگر دانشورانہ تحقیق کا نہیں۔

لفظ بائبل یونانی لفظ biblia یعنی ''کتابیں'' سے ماخوذ ہے۔ عبرانی زبانی میں کتابوں کے لیے لفظ Sepharim ہے۔ بائبلی ادب کے لیے عبرانی لفظ تمام اصطلاحات کی نسبت قدیم

ترین ہے۔ سفاریم کو عبرانی میں عموماً تناخ(Tanakh) کہتے ہیں۔ لفظ تناخ ہمیں اس میں شامل چیزوں کے بارے میں یاد دلاتا ہے: توریت (شریعت)، نبوئیم (پیغمبر) اور کیتووِیم (تحریریں) ...... یعنی Ketuvim, Neviim, Torah یہ صرف عیسائیوں کے لیے ''عہدنامہ قدیم'' ہے۔ اس کی تدوین یہودیوں نے تقریباً ایک ہزار سال کے دوران کی اور اس میں حکایات، قصے، تاریخ، شاعری، ضرب الامثال، دعا، شریعت، گنتی اور پیشگوئی شامل ہے۔ یہ اب تک مغرب میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے اور اس نے نہایت نیک اور بد دونوں قسم کے افعال کو تحریک دلائی۔ سترہویں صدی میں ڈچ-پرتگیزی یہودی فلسفی سپنوزا نے اس مجموعہ تحریر پر تاریخی اور موزوں تنقید کی۔ بلاشبہ اسے اس کے ہم عقیدہ یہودیوں نے مذہب سے خارج کر دیا۔

بائبل کے چند ایک حصوں کے سوا تمام متن عبرانی میں تھے۔ بائبل کی موجودہ شکل اختیار کرنے کی تاریخ بہت پیچیدہ اور نہایت متنازعہ بھی ہے۔ عیسائی عہد سے قبل اس مجموعے کا ترجمہ یونانی میں ہو چکا تھا اور یہ بالخصوص یونانی زبان بولنے والے یہودیوں کے لیے تھا۔ اس کے بعد تقریباً 30 عیسوی میں فلسطین میں مخصوص واقعات کے باعث عیسائی اسے اپنے لیے موزوں سمجھنے لگے۔ دوسری صدی عیسوی میں عیسائیوں کے ہاں اس کی واحد مدمقابل سینوپے کے عظیم ''کافر'' مارسیون کی تحریریں تھیں جو 160ء میں فوت ہوا اور جس کی غناسطی قسم کی تحریروں کو تلف کر دیا گیا۔

پہلی صدی کے یہودی فریسی جوزیفس کی تحریروں سے مورخین کو بہت مدد ملی۔ وہ ایک رومن شہری تھا۔ اس نے اپنا یہودی عقیدہ کبھی نہ چھوڑا۔ (وہ اپنی چالاکی کے باعث جان بچانے کے قابل ہو سکا۔ اس نے پیشگوئی کی تھی ویسپاسین شہنشاہ بنے گا، لہٰذا ویسپاسین نے صلہ رحمی کی۔) اسے روم میں رہنے اور لکھنے کی اجازت مل گئی اور اس نے اپنی ''یہودی جنگیں'' 77ء میں اور ''یہودیوں کے قدیم ریکارڈز'' 94ء میں مکمل کی۔ جوزیفس ایک جانی پہچانی کہانی سے آغاز کرتا ہے!

''اس دور میں سدومی (اہل سدوم) اپنی دولت اور خزانوں کی وجہ سے مغرور ہو گئے:

وہ انسانوں کے ساتھ غیر منصفانہ اور خدا کے معاملے میں ناپاک ہو گئے، یہاں تک کہ وہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کا ذکر کرنا بھی بھول گئے۔ انہوں نے مسافروں سے نفرت کی اور سدومی روایات کی گمراہی اختیار کی۔ چنانچہ خدا ان سے بہت ناخوش ہوا......''

چوتھی صدی عیسوی کے آخری عشرے میں پائی جانے والی گڑبڑ اور تنازعات نے سینٹ جیروم (342-420ء) کے لیے یہ لازمی بنا دیا کہ وہ ایک لاطینی ترجمہ کرے۔ اس میں چار اناجیل کے بارے میں سینٹ جیروم کی اپنی رائے بھی شامل تھی۔ اسے ولگیٹ (Vulgate) کا نام دیا گیا اور چھٹی صدی میں واحد جلد میں اکٹھا کیا گیا۔ لیکن ولگیٹ کا قدیم ترین معلوم مسودہ Jarrow کے مقام پر راہبوں نے تحریر کیا تھا۔ اس کی تین نقول تیار کی گئیں جن کے لیے 1500 بچھڑوں کی کھالوں کی ضرورت پڑی۔ سیولفرتھ 716ء میں یہ نسخہ روم میں گریگوری دوم کو پیش کرنے جا رہا تھا کہ راستے میں ہی مر گیا۔

انگریزی زبان میں بائبل کے اولین تراجم اینگلو سیکسن ادوار میں کیے گئے، لیکن کوئی مکمل اینگلو سیکسن بائبل موجود نہیں۔ اولین مکمل یا تقریباً مکمل ورژن ''Wycliffet'' کہلاتے ہیں کیونکہ لولارڈز کے رہنما اور انگریز فلسفی جان وکلف کو ان کا الہام ہوا۔ لولارڈز اولین انگریزی بولنے والا گروپ تھا جس نے کیتھولک کلیسیا پر اعتراضات اٹھائے۔ زیادہ تر ترجمہ نثر نگار ولیم Tyndale (1494ء تا 1536ء) نے کیا جو 1611ء کے مقبول عام ''مستند متن'' کی بنیاد بنا۔ ولیم بروسلز کے نزدیک Vilvorde کے مقام پر کھال کھینچنے کے بعد جلا دیا گیا کیونکہ اس نے بائبل کا ترجمہ کیا تھا۔

انگریزی بولنے والے علاقوں میں آج بھی بائبل سب سے زیادہ مقبول اور عزیز رکھی جانے والی کتاب ہے۔ جہاں تک قارئین کا تعلق ہے تو جدید نئی ''انگلش'' بائبل ایک ناقابل اعتبار جانشین ہونے کے ساتھ مذہب کے تمام جوہری توہین بھی ہے۔

ایملی ڈکنسن نے تقریباً 1882ء میں ایک نظم لکھی جس میں عیسائی بائبل کے متعلق لوگوں کے انداز فکر کا ذکر کیا:

بائبل ایک قدیم جلد ہے......
جسے نامعلوم آدمیوں نے لکھا
پاک روحوں کے کہنے پر......
موضوعات ...... بیت اللحم......
عدن...... قدیم مسکن......
شیطان ...... بریگیڈیئر
یہوداہ...... گناہگار عظیم......
گناہ...... ایک نمایاں چٹان
دیگر نے لازماً مدافعت کی......
''یقین رکھنے والے'' لڑکے بہت تنہا ہیں......
کچھ دوسرے لڑکے ''کھوئے ہوئے'' ہیں......
بس ایک Warbling قصہ گو کی کہانی ہوتی......
تمام لڑکے آتے
اور فیلکس کا خطبہ مسحور کن تھا......
اس میں لعنت ملامت نہیں تھی۔

بلاشبہ اور فیلکس افسانوی پاگان ہے...... ایک یونانی گویا جو اپنے بربط کے ذریعہ مویشیوں اور حتیٰ کہ پتھروں کو مسحور کر لیتا تھا اور اس کا سر ٹکڑے ہونے کے بعد بھی گاتا رہا۔ نظم میں واضح طور پر بائبل کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ اس میں گناہگاروں کی جانب عیسائی خدا کی بجائے یہودی خدا والا بے رحم رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ ایملی ڈکنسن اس امر پر نوحہ کناں تھی کہ کتاب مقدس مسحور کن کی بجائے ملامتی انداز میں تحریر کی گئی تھی...... وہ افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ عہدنامہ قدیم کا غضبناک یہودی خدا اور فیلکس جیسا زم نمونہ بن سکا۔

درحقیقت ہمارے عہد میں تحقیق گہری ہونے کے نتیجہ میں عموماً کہا جاتا ہے کہ عیسائی مذہب یہودی مذہب کی ہی ایک صورت ہے۔ یہاں تک کہ رومن کیتھولک چرچ نے اپنے حقیقی

اصولوں کو چھوڑتے ہوئے (حالیہ ادوار میں) یہودیوں کو مسیح کے صلیب پر چڑھانے کے الزام سے بری کر دیا۔

اس سارے معاملے نے جدید کلیسائیوں کو نہایت غیر منطقی رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو آج کے دور میں بہت عجیب اور غیر موزوں ہے۔ اس کے باعث روایت پسندوں اور حقیقت پسندوں کے درمیان بھی شدید لڑائی ہوئی۔ یہ تنازعہ عموماً گھٹیا عقلی سطح پر گھسے پٹے دلائل کے ساتھ جاری رہا۔ خطرہ یہ ہے کہ کلیسیا سیکولر ہو جائے گا، لیکن یہ ساری تاریخ میں کافی سیکولر رہا ہے۔ مذہب ہمیشہ سے ہی خدا کی تعظیم اور سیاست کا ایک غیر موزوں ملغوبہ ہے۔

قابل معلوم حقائق بھی مذہب کے پیروکاروں کی راہ میں حائل نہیں ہوتے، کیونکہ مذہب تلاش حق کی جانب دلالت کرتا ہے اور کسی کو بھی صداقت سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر سچائی اہل مذہب کے منصوبوں میں مداخلت کرے تو وہ خوفزدہ ضرور ہوتے ہیں۔

تنقیدی رویہ کو ترجیح نہ دینے والوں کے ساتھ دلائل بازی کرنا خطرناک اور غیر دانشمندانہ ہے، لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ استدلال موزوں ہے جو حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے تنقیدی ہونے کا دکھاوا کرتے ہیں۔ حقائق اتنی دیر تک ہی اہم رہتے ہیں جب تک کہ انہیں نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ آج عیسائیوں کے لیے بائبل کی اصل اہمیت اس کے وجدانی اور ادبی وصائف کی وجہ سے ہونی چاہیے۔ تاریخ کے چند غیر معمولی افراد میں سے ایک حضرت مسیح کسی طرح بھی فوت نہیں ہوئے۔ لیکن دو ہزار سال سے اختیار کی ہوئی عیسائیت مردہ ہو گئی ہے۔ یوں کہہ لیں کہ عیسائیت صرف اپنے ماضی کے مخصوص ادوار میں ہی زندہ ہے۔ عیسیٰ مسیح اور ان کے نام پر جاری مذہب کے درمیان واضح امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ نہ صرف ایک یہودی بلکہ غناسطی بھی تھے۔ غناسطیت نے ہی عیسائی کلیسیا کو غناسطی مخالف بنا دیا۔ اس نے عہد نامہ قدیم میں بیان کردہ یہودی مذہب کی وحدانیت کو شدت سے مسترد کر دیا۔ جس دور میں مارسیون نے چیلنج دیا تو معدودے چند سچے عیسائی ہی باقی رہ گئے۔

آج کل ہم جسے عہد نامہ قدیم کہتے ہیں...... یعنی خمسہ موسیٰ یا پہلی پانچ کتب...... وہ یہودی مذہب کا سنگ بنیاد ہے۔ عیسائی کلیسیا کا اسرائیل کے جائز وارث ہونے کا دعویٰ غیر تاریخی اور

گمراہ کن ہے۔ (عہد نامہ جدید بہت مختلف معاملہ ہے)۔ خمسہ موسیٰ پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوہ سینا پر موسیٰ کے ذریعہ یہودی خدا کا نہایت براہ راست مکاشفہ شامل ہے۔ لیکن اس حقیقت نے بہت سے مسائل کھڑے کیے کہ دراصل یہ ایک مخصوص عوام سے خطاب ہے۔ عیسائی عقیدے میں پرورش پانے والا بدترین قسم کا شخص یا عیسائی بدستور ایک یہودی خدا کو موزوں بنانے کی کوشش کرتا ہے جس کی انہیں بطور اجنبی یہودی خدا عبادت کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ دوسری طرف عیسائیوں کے ہاں یہ ناقابل فہم احساس موجود رہا ہے: ''خدا نے یہودیوں کو کیسے منتخب کر لیا۔'' عیسائی کلیسیا کے اندر ایک غناسطیت نے ہی مذہب کو ایک داخلی معاملہ بنایا اور اسے سختی سے کچل دیا گیا: قرون وسطیٰ میں جب لوگوں نے یہودی مذہب کی تفسیر کرنے کی کوشش شروع کی تو زیادہ حقیقت پسند، زیادہ شہوانی قبالہ نے انسانوں کے ذریعہ خدا کی نجات کو بھی خدا کے وسیلہ سے انسان کی نجات جتنا ہی اہم بنا دیا۔ انجام کار جدید استدلال پسند یہودیوں نے اسے بھی توہمات پرستی کے طور پر مسترد کر دیا۔ لیکن دونوں ہی مسالک موجود رہے۔

3

اِلیڈاوراوڈیسے

"The Iliad and the Odyssey"

ہومر

اندازاً 9ویں صدی قبل مسیح

ہومر کی ''اوڈیسے'' اور ''ایلیڈ'' کے مسودات پہلی مرتبہ اس کی موت کے 1700 برس بعد دریافت ہوئے۔ افلاطون اور ارسطو کے عہد تک قدیم یونانی میں یہ کلاسیک حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ تاہم، ہمیں ہومر (ہومروں) کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس کے

نام کے مختلف معنی بتائے گئے...... مثلاً ''جو دیکھتا نہ ہو''، ''یرغمالی''، ''ساتھی''، ''معاملات کو منظم کرنے والا'' وغیرہ۔ حتیٰ کہ یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس نام کا کوئی شخص واقعی گزرا ہے۔ اگر وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا تو یہ رزمیہ نظمیں کس نے لکھی تھیں؟ ان سوالات نے بہت سی بحث وتمحیص کو جگہ دی۔

یونانیوں کے خیال میں ہومر نامی ایک شاعر نے اسی طرح یہ دو نظمیں لکھی تھیں جیسے شیکسپیئر نے اپنے کھیل یا ملٹن نے ''گمشدہ بہشت'' لکھی تھی۔ آج بہت سے لوگ بس اسی بات پر اکتفا کر لیں گے...... اور اس میں کوئی نقصان بھی نہیں کیونکہ دونوں نظمیں موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہی ہے۔ نظموں کی بلند پائیگی، دونوں کو مربوط کرنے والے عنصر نے ہماری تہذیب کو کافی حد تک لفظ ''معیار'' کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد دی۔ والٹیئر نے ہومر کو ''رفیع الشان مصور'' کہا۔ بہت سی نظموں کے مقابلہ میں ہومری نظموں کی برتری درحقیقت بہت واضح ہے۔

تاہم، ایک ری ایکشن سامنے آیا۔ خیال پیش کیا گیا کہ ہومر نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں، یا اگر تھا بھی تو اس کی حیثیت محض ایک مولف کی تھی۔ دونوں رزمیہ نظموں کو لوک نظموں کے طور پر بتایا گیا جنہوں نے اپنی موجودہ صورت نویں یا دسویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ 1795ء میں جرمن محقق ایف اے وولف نے لکھا کہ ایلیڈ اور اوڈیسے محض مختلف شاعروں کی نظموں کا مدوّن کردہ مجموعہ ہے۔ اس نے اپنی رائے کے حق میں دلائل پیش کیے۔ اس کے دلائل ہرگز کمزور نہ تھے، لیکن انہوں نے شاعری کے مخالف افراد کی حمایت حاصل کی، جیسے آج ساختیات کی مخالفت کرنے والے حضرات لکھنے کی اہلیت رکھنے والوں کے حسد میں ''مصنف'' کو بالکل پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن وولف کے پیروکار زیادہ پریقین تھے۔ انہیں ''تجزیہ نگار'' (Analyst) کہا گیا۔ جبکہ شاعر ہومر پر یقین رکھنے والے لوگ Unitarians کہلائے۔ کوئی بھی دھڑا بالکل غلط نہ تھا، کیونکہ ہومر میں بہت سے ایسے حصے موجود ہیں جنہیں ''دیگر شعرا'' نے لکھا۔ واضح طور پر متعدد اضافے اور تراجم بھی نظر آتی ہیں: بیسویں صدی میں ایک امریکی دانشور مل مپیری نے نہایت شاندار انداز میں ''تجزیاتی'' نکتہ نظر کو حتمی صورت دی۔ پیری نے یہ پرزور رائے دی کہ ہومر کی شاعری تحریری نہیں بلکہ زبانی تھی۔ البتہ اس رائے پر بھی کلی اتفاق نہیں ہوسکا۔

rekhta

درحقیقت اب یہ زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ ایلیڈ اور اوڈیسے ایک نئی خواندہ اور پرانی ناخواندہ ثقافت کے درمیان ٹکراؤ کی اولین قابل ذکر پیداوار تھیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف کے ذہن پر کونسی ثقافت حاوی تھی۔ اس نے نئی ثقافت کی بدبختیوں کو پوری طرح شناخت کیا اور وہ پرانی ثقافت سے مربوط اور اس کا دلدادہ تھا۔ دو نظموں میں کچھ قارئین کو ایک تخلیقی مسرت کا احساس ہوا جو تحریری صورت میں ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ سامنے موجود سامعین کی بجائے کسی نامعلوم قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھنے کا فن بھی بہت نیا تھا: نہ ہی اس وقت بیورو کریٹس نے تحریر کو نیم برباد کیا تھا۔ پہلی بابلی سلطنت کی رزمیہ ''گل گامش'' (جہاں سے یہودیوں نے سیلاب عظیم کی کہانی لی) ہومر سے ایک ہزار سال پہلے مرتب ہو چکی تھی۔ یہ ایک شاندار فن پارہ ہے لیکن اس میں وہ لطیف خصوصیات موجود نہیں جو ہومر کے ہاں ملتی ہیں۔ تاہم، تقریباً 1750 ق-م میں اس قسم کا شاعر موجود نہیں ہو سکتا تھا۔

سرے اوڈیسس

''ایلیڈ'' ٹرائے کے محاصرے میں ایک مختصر اور موثر مرحلے کی کہانی بتاتی ہے۔ جنگ ٹروجن کے واقعات ہر اس قاری کے ذہن میں زندہ ہیں جو ان کے بارے میں سن چکا ہے۔ کچھ معاصر یونانی محققین کو یقین ہے کہ یہ جنگ کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ بلاشبہ یہ اس طرح نہیں ہوئی تھی جس

انداز میں ہومر نے اسے بیان کیا۔ اس کی دو نظمیں کسی بھی طرح مائی سینی تہذیب کا موزوں تاریخی بیان نہیں ہیں۔ اس حوالے سے ہومر پر بہت سے الزامات لگائے گئے۔ لیکن کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟

بالکل بھی نہیں! یہ تاریخ نگاری نہیں بلکہ شاعری ہے۔ تو پھر ہمیں یہ کیوں لگتا ہے کہ یہ جنگ ہوئی تھی؟ اول تو اس لیے کہ اہل یونان خود بھی جنگ ٹروجن پر یقین رکھتے تھے، دوم اس لیے کہ یہ تاریخ کے حقیقی ''جوہر'' کی حامل ہے۔ ایلیڈ میں واقعات چاہے کتنے ہی ''غیر درست'' ہوں، یہ تاریک دور میں چاہے کتنی ہی ناقابل بھروسہ رہنما کیوں نہ ہو لیکن اس کے بارے میں ارسطو کا بیان قابل قدر ہے:

> ہومر دیگر تمام شعراء کے مقابلہ میں اس حوالے سے الہام یافتہ ہے کہ اگرچہ جنگ ٹروجن کا ایک آغاز اور اختتام بھی تھا، مگر اس نے ساری کی ساری جنگ کو اپنی نظم میں شامل کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ اتنا بڑا موضوع ہے کہ اس کا ایک ہی بار میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ اس کی طوالت کو محدود کرتا تو واقعات کا تنوع اسے بہت پیچیدہ بنا دیتا۔ اس نے جنگ کا صرف ایک حصہ لیا اور دیگر حصوں سے متعدد واقعات قسطوں کی صورت میں شامل کیے۔

قبل ازیں ارسطو نے اپنی Poetics میں لکھا تھا کہ شاعر کا کام اصل واقعہ کو نہیں'' بلکہ وقوع پذیر ہو سکنے والی چیزوں'' کو بیان کرنا ہے (یہ جملہ بہت معنی خیز ہے)۔ ''یہی وجہ ہے کہ شاعری تاریخ کی نسبت زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ سنجیدہ غور و فکر کی حقدار ہے۔ تاریخ صرف مخصوص حقائق جبکہ شاعری کائناتی سچائیاں بیان کرتی ہے۔''

یہ بات اب بھی بالکل ٹھیک ہے، بشرطیکہ ہم یہ تسلیم کریں کہ ''مخصوص حقائق'' اپنی سی (کمتر) سطح پر نہایت اہم ہیں۔ لیکن ہمیں ان مخصوص واقعات کو ہمہ گیر سچائی کے طور پر بیان کرنے میں ہومر کی صلاحیت پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ اس کے ہاں کچھ بے ربطیاں نظر آتی ہیں۔ جی نہیں، ہومر کی تحریر بے ربط نہیں۔ البتہ اس کی 24 ابواب میں تقسیم (ہر باب کا عنوان ایک یونانی حرف تہجی ہے) تیسری صدی قبل مسیح کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔ لیکن

دونوں نظموں میں ہمیں ایک یگانگت اور پرشکوہ تخیلاتی وانسانیت پسندانہ دانش نظر آتی ہے۔ اپنے امیر کبیر سرپرستوں کے مقابلے میں کمتر سماجی رتبے کا حامل شاعر بڑے خوبصورت انداز میں عام لوگوں اور ان کی زندگیوں کے متعلق اپنی معلومات سے استعارے اخذ کرتا ہے۔ یہاں وہ اہل حشم کی بجائے عوام سے مخاطب ہے۔

ہم اس متفقہ رائے پر پہنچتے ہیں: آئیونیا سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر ہومر نے ایک لوک داستان یا اس قسم کی دو رزمیہ نظمیں لکھیں۔ شاعر کا دور آٹھویں صدی تھا اور غالباً وہ بھی اندھا تھا کیونکہ گویے (Bards) عموماً اندھے ہی ہوتے تھے (اوڈیسے کے گویے بھی نابینا ہیں)۔ یہ خیال کچھ زیادہ مستحکم بنیاد نہیں رکھتا کہ دونوں نظمیں ایک ہی ہاتھ سے تحریر ہوئیں کیونکہ دونوں کا رنگ جدا ہے اور اوڈیسے غالباً کچھ موخر دور کی ہے۔ بہر حال ہومر ایک زبردست شاعر تھا اور اس نے بھی شیکسپیئر کی طرح آہستہ آہستہ ترقی پائی۔ وہ اپنے فن پر کافی بہتر کنٹرول رکھتا ہوگا۔

شیکسپیئر اور ہومر دونوں نے ہی اکثر ماضی بعید کے خیالی بیانات پیش کیے۔ اگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ شیکسپیئر اپنی بے شمار ''حقائق کی اغلاط'' کے باوجود ہمیں انگریزی تاریخ کا جوہر فراہم کرتا ہے تو ہم یہ بھی کیوں نہ کہیں کہ ہومر نے بھی ناخواندہ یونان کے لیے یہی کچھ کیا؟

ہومری نظموں کے محض لوک داستانیں ہونے پر دلالت کرنے والی خصوصیت ''فارمولوں'' کی موجودگی ہے۔ فارمولوں سے مراد مخصوص مقولے یا جملے ہیں: مثلاً Wine-dark sea Rosy fingered dawn-28,000 لائنوں پر مشتمل دو نظموں میں کم از کم 25,000! اس قسم کے بار بار دوہرائے جانے والے جملے ہیں۔ بلاشبہ ہومر نے ان سب کو ایجاد نہیں کیا تھا...... تاہم، انہیں اپنے مقاصد کے لیے خوبصورتی کے ساتھ استعمال ضرور کیا۔ ایک ناخواندہ عہد میں ان کا اصل کام قصہ گوؤں اور گویوں کے لیے سہولت پیدا کرنا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ہومر کی تحریر بھی اسی طرح کی ایک پر فارمنس کا ریکارڈ ہو۔ لیکن ایسا ہونا قرین قیاس نہیں۔

ٹرائے شہر (جس کی جائے وقوع موجودہ ترکی میں ہے) 1200 قبل مسیح میں تباہ ہوگیا تھا اور خیال ہے کہ یہ کام براعظم سے آنے والے مائی سینی حملہ آوروں نے کیا۔ بعد میں مائی سینی تہذیب خود بھی ڈوریائی (شمال کے) حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ جس تہذیب کو ہم قدیم

یونان کے طور پر جانتے ہیں...... یعنی ایسکائی لس، سوفوکلیز، یوری پیڈیز، افلاطون اور ارسطو کا یونان ...... اس نے اپنی شکل اختیار کرنا شروع کی تھی۔ افسوس کہ سیاسیات ایجاد کی گئی۔ 1200 اور 800 قبل مسیح کے درمیان، یعنی تاریک ادوار میں گویے یقیناً ناخواندہ تھے۔ کندہ تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل یونان نے فونیقی حروف تہجی اپنانا شروع کر دیے تھے چنانچہ اگر ہومر نے اپنی نظمیں بغیر لکھے ہی تخلیق کی تھیں تو اس کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد انہیں لکھ لیا گیا۔ وہ نظمیں گویوں کے ایک گروہ ''ہومریدے'' کی ملکیت بن گئیں جو خصوصی حقوق رکھتے تھے۔

پھر ایتھنی حکمران پسی سٹراٹس کے عہد میں (560 تا 527 ق م) انہیں ''حتمی'' صورت میں ترتیب دیا گیا۔ ممکن ہے کہ یہ کام کسی اور ایتھنیائی شاعر نے سرانجام دیا ہو۔

ایلیڈ کا مصنف کسی جدید مصنف جتنا ہی لطیف تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے قارئین مختلف جزائر، مقامات اور مواقع کی شناخت کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اسے پتہ تھا کہ وہ ایک قصہ تخلیق کر رہا ہے۔ اس کا ایتھنیائی اپنے بہترین نقادوں سے بھی ماورا تھا۔ اس نے جنگ ٹروجن کا جو بیان پیش کیا وہ کسی بھی جنگ کے ''مخصوص حقائق'' کے ریکارڈ کی نسبت زیادہ متاثر کن ہے۔ شیکسپیئر کے ''Troilus and Cressida'' میں یولیسس کا کردار کافی اعتبار سے ہومر کا مرہونِ منت ہے۔

ہومر اندھا ہونے کے باوجود غیر معمولی بصیرت کا حامل تھا اور اس کے استعمال کردہ استعارات اور تشبیہات اپنے موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ نظموں میں بہت سے حصے ایک ہی ذہن کی پیداوار لگتے ہیں۔ یونانیوں نے اپنی ثقافت کو ان نظموں کی بنیاد پر تعمیر کیا، لہذا یہ ہماری تہذیب کی تہہ میں بھی موجود ہیں۔ کوئی بھی اور شاعر...... ورجل یا دانتے سمیت...... ان رزمیہ نظموں جیسا کمال حاصل نہیں کر سکا۔ جن لوگوں نے ان نظموں کو (تراجم میں) نہیں پڑھا وہ کامل انسان نہیں۔ لیکن ہمارا دور وہ ہے جس میں لالچ اور جھوٹ کے فن میں تربیت نے علم کی جگہ لے لی ہے اور نصاب بنانے والے روبوٹ نما کلرکوں کی نظر میں ہومری نظمیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کی مردہ آنکھوں میں صرف تبھی چمک پیدا ہوتی ہے جب انہیں بتایا جائے کہ سینکڑوں برس کے دوران ہومر کی فروخت سے بہت زیادہ روپیہ کمایا جا چکا ہے۔

4

اُپنشد

"Upanishads"

اندازاً 700 تا 400 قبل مسیح

پہلے ہندوستانی مذہب ''ہندومت'' کے ماخذوں کی تاریخ وادی سندھ کی تہذیب کے متعلق حالیہ دریافتوں میں کچھ پیچیدگی کی حامل رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وادی سندھ کی تہذیب بھی میسوپوٹیمیا، چین اور مصر کی تہذیبوں کے ساتھ ہی پروان چڑھی۔

وادی سندھ کی تہذیب (4000 تا 2200 ق م) کا ایک مرکز ہڑپہ شہر تھا جس کے رابطے میسوپوٹیمیائی اور غالباً دیگر شہروں کے ساتھ بھی تھے۔ ہڑپہ کی کھدائی بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں شروع ہوئی اور ابھی تک جاری ہے۔ وہاں سے ملنے والی مہروں کی تحریر ابھی تک

پڑھی نہیں جاسکی۔ یہاں کے مذہب کو ''قبل از تاریخ ہندومت'' قرار دیا جاتا ہے۔

بلاشبہ ہم ہڑپہ کی مذہبی خصوصیات کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں ...... بالخصوص مذہبی اشنان اور شیو سے مشابہت رکھنے والے ایک دیوتا کی عبادت کے متعلق ...... وہ بعد کے ہندومت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہڑپہ بھی پدرسری معاشرہ لگتا ہے، اگرچہ وہاں ایک دیوی ماں بھی موجود تھی۔ ایران اور افغانستان تک پہنچنے والے ہند یورپی قبائل یعنی آریاؤں نے وادی سندھ کی تہذیب کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ لگتا ہے کہ یہ پانی کی کمی اور دیگر فطری وجوہ کے باعث ختم ہوئی۔

غیر معمولی تنوع کی حامل ہندو مذہبی روایت کی تاریخ نہایت پیچیدہ اور تقریباً تمام حوالوں سے متنازعہ ہے۔ لیکن ہم اس کا ایک بنیادی ڈھانچہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ اوریجنل ہندومت میں سے تین ''بدعتیں'' نکلیں: جین مت، بدھ مت اور سکھ مت۔ ان تینوں میں کافی کچھ مشترک ہے۔

تقریباً 900 قبل مسیح میں رگ وید نے اپنی حتمی صورت اختیار کی۔ سنسکرت لفظ ''وید'' کا مطلب علم ہے، اور اس سے بالخصوص ہندوؤں کا مقدس علم بھی مراد ہے۔ ویدوں کے چار مجموعے ہیں جن میں سب سے اہم رگ وید 1028 بھجنوں پر مشتمل ہے۔ تیکنیکی لحاظ سے اپنشدوں کی بجائے رگ وید کو اس کتاب میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کی تدوین ہندوستان میں فن تحریر متعارف ہونے سے بہت پہلے ہوئی تھی اور اس کے موخر بھجن وحدانیت کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ نہایت شاندار اور مکمل طریقے سے اپنشدوں میں بیان ہوا ہے جو رگ وید کی زیادہ فلسفیانہ اور شاعرانہ شاخ ہیں۔

ان اپنشدوں نے ہندو فکر پر اہم ترین اثر ڈالا ...... اور بودھی و مغربی فکر پر بھی۔ مغرب میں شوپنہاور اور بعد ازاں وٹگنسٹین وغیرہ نے اسے مقبول بنایا۔ وٹگنسٹین نے لکھا، ''سانپ کی روح ...... تمہاری روح ہے، کیونکہ تم اپنے ذریعہ سے ہی باقی سب کی روحوں سے واقف ہوتے ہو۔'' یوں اس نے اپنی حقیقی تحریک آشکار کی۔ وہ شوپنہاور کے لیے اپنی چاہت کے ذریعہ اپنشدوں تک پہنچا۔

آج ہندوستان سے باہر کے چند ایک افراد نے ہی رگ وید کے بھجن پڑھے ہوں گے، لیکن پڑھے لکھے زیادہ تر لوگوں کو اپنشدوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے۔ اپنشد اصل میں

تین الفاظ اُپ + نی + شد کا مرکب ہے جس کا مطلب استاد کے ''قریب بیٹھ کر سننا'' ہے۔

اپنشدوں کی تعداد تقریباً 200 ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر بعد میں لکھی ہوئی تفسیریں ہیں۔ حقیقی اور جاندار اپنشدوں کی گنتی 20 سے زیادہ نہیں۔ ہمیں ان کے مصنفین کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ بابلی داستان گل گامش اور ہومری نظموں کے ابتدائی حصوں سے بعد میں تحریر ہونے کے باوجود اپنشد میں ہی نوع انسانی نے پہلی مرتبہ شعوری طور پر غور و فکر کر کے دیوتاؤں کی تعریف میں کہانیاں لکھیں اور شہوانی محبت بیان کی۔ ان کی مختلف تفاسیر کی گئی ہیں۔

اپنشدوں کا نفس مضمون یہ ہے کہ برہمن (برہما) اور آتما ایک ہی چیز ہیں۔ برہمن کائنات کا سچ ہے۔ آتما داخلی انفرادی سچ ہے۔ اپنشدوں میں اس امر کو متعدد طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ تصوف کو پسند نہ کرنے والے عیسائی اس پر بہت پیچ و تاب کھاتے ہوئے کیونکہ وہ اپنے مذہب کو کامل سچائی خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندومت کے ساتھ ساتھ بدھ مت کو بھی الحاد پرستی قرار دیا۔ عیسائی عقیدے کے مادی لحاظ سے کامیاب مکتبہ ہائے فکر کے مقابلے میں اپنشد کہیں زیادہ روادار اور منکسر المزاج ہیں۔ ان میں خارجی قوتوں کے سامنے اظہار اطاعت بہت کم ہے اور نام نہاد ''کافروں'' کو مارنے کا جذبہ اور بھی کم۔ انہوں نے ایک بچے کے ذہن کے ساتھ آغاز کیا جو پیراڈاکس کو بڑوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ منڈوکیہ اپنشد میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ برہما نے ''ہر چیز'' ''سب کچھ'' اور ''کچھ بھی نہیں'' یا ''کوئی بھی چیز نہیں'' متعین کی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پیراڈاکس مضحکہ خیز معلوم ہو، لیکن یہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں ہماری قیاس آرائیوں سے زیادہ مضحکہ خیز نہیں۔ ہم لاشیئیا نیستی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیا ''کسی چیز'' کا نہ ہونا لاشیئیت'' ہے، یا کیا ''Nothing'' کے حوالے سے یہ نظریہ محض احمقانہ ہے؟۔ اسی اپنشد سے دو پرندوں کی مشہور کہانی نکلی:

دوستی کے بندھن میں بندھے دو پرندوں نے ایک ہی درخت پر اپنے گھر بنائے۔
ایک پرندہ ادھر اُدھر نظر ڈالتا اور میٹھے پھل پر چونچ مارتا۔
شخصی ذات ادھر ادھر دانہ چگنے سے تھک کر رنجیدگی میں ڈوب جاتی ہے، لیکن جب
وہ ریاضت کے ذریعہ جان لیتا ہے کہ دوسری لاشخصی ذات درحقیقت روح ہے تو

رنجیدگی غائب ہو جاتی ہے۔
روح کو پا لینے والا خود ہی روح بن جاتا ہے۔

برہید آرنیک اپنشد کہتا ہے: ''روح (آتما) سے آگاہ ہو جانے والا شخص خود ہی آتما، ہر چیز بن جاتا ہے۔''

کیونکہ جب تک دوئی رہتی ہے ایک دوجے کو دیکھتا ہے، اسے سونگھتا ہے، اسے سنتا اور اس سے بات کرتا ہے، اسے جانتا ہے؛ لیکن جب سب کچھ ایک ہی ذات میں متحد ہو جائے تو دوجے کو کون دیکھ سکتا ہے، وہ دوسرے کو کیسے دیکھ سکتا ہے: دوجے کو کون سونگھ سکتا ہے، وہ دوجے کو کیسے سونگھ سکتا ہے: کون دوجے کو سن سکتا ہے: وہ دوجے کو کیسے سن سکتا ہے: کون دوجے سے بول سکتا ہے، وہ دوجے سے کیسے بول سکتا ہے؛ کون دوجے کے متعلق سوچ سکتا ہے: وہ دوجے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؛ کون دوجے کو جان سکتا ہے: وہ دوجے کو کیسے جان سکتا ہے؟

(بہ الفاظ دیگر: اصل شہود شاہد و مشہود ایک ہے۔
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!)

کچھ اہم اپنشدوں کے مترجم یوآن مسکارو نے سپنوزا کا ایک قول نقل کیا ہے: ''رحمت نیکی کا انعام نہیں بلکہ بذات خود نیکی ہے۔ نیکی میں مسرت نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ ہم اپنی تحریصات کو قابو کرنے کے اہل ہیں؛ بلکہ ہم اپنی تحریصات پر قابو پانے کے اہل ہونے کے باعث نیکی میں مسرت پاتے ہیں۔''

اپنشدوں کی فکر عیسائی انداز کی پیوریٹانی (Puritanical) نہیں۔ کیا کوئی شخص ایک عیسائی کا م سوتر کا تصور کر سکتا ہے؟ ہندومت کا مطمع نظر صرف جنسی سرگرمی ہی نہیں بلکہ جنسی سرگرمی میں پائی جانے والی خود غرضی ہے (جسے وتسا ین کی کام سوتر میں بہت سراہا گیا ہے۔) اصل ہدف شخصی ذات ہے، بظاہر کامل معلوم ہونے والی انا ہے، شاخ پر افسردہ بیٹھا ہوا پرندہ ہے۔ لیکن حقیقت میں موجود شخصیت (ذات) بہت چھوٹی اور غیر اہم ہونے، اور اس کی مسرتیں محض سراب انگیز ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ''شر'' کی ''مدح سرا'' ہے۔

یہاں دوزخ محض ہستی کا روز کا معمول ہے جس سے نجات ناممکن ہے۔ اپنشدوں کے مصنفوں نے مسرت اور مسرت کے حصول کی غیر مختتم تلاش کو ''خیر'' سے تمیز کیا ہے۔ ان کی نظر میں صرف ایک سچی مسرت تھی: معرفت ذات یعنی اپنے آپ کو جاننا۔ یہ مطلق نیکی تھی۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ جس پر مرکوز آرتھوڈوکس عیسائی اسٹیبلشمنٹ کی نسبت زیادہ گہرا اور حقیقت پسندانہ تھا۔ ایک جدید ہندوستانی فلسفی کے الفاظ میں: ''سماجی فرائض کی بے لوث انجام دہی کے ذریعہ فلسفیانہ غور و خوض سے سچا علم ذات حاصل ہوتا ہے۔'' ہندوستانی فلسفہ مادے کو غیر حقیقی ثابت کرنے کی کوششوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا نظریہ ایسے فلسفہ کے لیے فطری طور پر موافق ہے۔ لیکن یہ بات اہم نہیں کہ ہم مادے کے حقیقی ہونے پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں۔ اپنشدوں اور ان کے بعد کی تحریروں (رگ وید بھی اسی سمت میں گامزن تھا) کا جذبہ اس قسم کے امتیازات پر انحصار نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ اگر اپنے تجربہ کے ذریعہ کل کے اتحاد کی تفہیم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں تو ہم نجات پا سکتے ہیں۔ اس عمل کو کبھی بھی آسان نہیں کہا گیا اور نہ ہی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ زندگی گزارنی نہیں چاہیے۔ یہ مقصد پانے کی ایک نہایت شاندار راہ ہمیں ''دھمپد'' میں ملتی ہے۔

5

راستہ اور اس کی طاقت

"The Way and Its Power"

لاؤ تزو

تیسری صدی قبل مسیح

لاؤ تزو (استاد لاؤ یا بوڑھا گرو) تاؤ مت میں مرکزی شخصیت ہے لیکن غالباً وہ کوئی حقیقی شخص نہیں تھا۔ روایت کے مطابق وہ کنفیوشس کا نسبتاً بوڑھا ہم عصر تھا، جس نے کنفیوشس کو رسوم سے متعلقہ امور کی تعلیم دی۔ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں چو ریاست میں پیدا ہوا اور چینی زبان میں فلسفے کی پہلی کتاب تاؤ تے چنگ یا ''راستہ'' لکھی۔ ایک یہ روایت بھی موجود ہے کہ لاؤ نے

چین کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر اسے خیر باد کہا اور ہندوستان جا کر بدھ بن گیا۔ اگر چہ یہ کہانیاں دلچسپ ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی جدید تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ وہ یقیناً من گھڑت قصے ہیں۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں یقیناً ایک گرو لاؤ تزو (Lao Tzu) موجود تھا، اور اس کے چند ایک اقوال ''راستہ اور اس کی طاقت'' نامی کتاب '' چینی زبان میں 5250 الفاظ پر مشتمل) میں شامل ہوں گے۔ لیکن ''راستہ'' میں کنفیوشسی اقدار پر تنقید کی گئی ہے اور کنفیوشس کے پیروکار مینیئس (371 تا 289 ق م) نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ''راستہ ضرور کنفیوشس کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ یہ یقیناً ''متحارب ریاستوں کا دور'' قرار دیے جانے والے عرصے (403 تا 221 ق م) میں تالیف کی گئی۔ دوسری صدی قبل مسیح سے پہلے تک لفظ ''تاؤمت'' بھی نہیں گھڑا گیا تھا۔ یہاں ہم صرف ''راستہ اور اس کی طاقت'' کے بارے میں ہی بات کرنا چاہیں گے جو چین سے باہر بھی کافی معروف ہے۔

کنفیوشس مت اور تاؤمت کے مابین کچھ اختلافات (اور موافقتوں) کے متعلق باب 7 میں بحث کی گئی ہے۔ کنفیوشس کی '' Analects '' میں متعدد فرق تو واضح ہیں جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ خود کو دنیا کی نظر سے اوجھل کرنے ...... یعنی تاؤمت کے انداز میں ترک دنیا ...... کے خواہش مند کچھ لوگوں نے رشی (Sage) کو سفر کے دوران تضحیک کا نشانہ بنایا؛ کنفیوشس بھی ان میں سے ایک تھا جسے اپنے کامیاب نہ ہو سکنے کا علم تو تھا مگر وہ کوشش کرتا رہا۔ دونوں رویوں کے مابین بنیادی فرق کو بہترین الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے: کنفیوشس نے تارکین دنیا کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ ان کی پاکیزگی کی خواہش میں یقیناً ایک خود غرضی شامل تھی کیونکہ انہوں نے انسانی وجود کے اہم ترین پہلو یعنی معاشرے میں انسان کے مقام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے برعکس ''راستہ'' کے باب 3 میں کہا گیا ہے، ''اگر ہم اقتدار سونپنے کے لیے ''اعلیٰ انسان'' کی تلاش روک دیں تو لوگوں کے درمیان رشک وحسد موجود نہیں رہے گا۔''

جس طرح کنفیوشس سے پہلے ''کنفیوشس ازم'' موجود تھا، اسی طرح افسانوی لاؤ تزو کے روایتی ''زمانے'' سے پہلے بھی ''تاؤ ازم'' موجود تھا۔ چینی فلسفہ میں کنفیوشسی رنگ اس کی

اخلاقی اور سماجی تشویشات کا اظہار کرتا ہے، جبکہ تاؤمت اس کی انفرادیت پسندانہ اور صوفیانہ دلچسپیوں کا۔ بیسویں صدی میں چینی فلسفہ کے صف اول کے مفسر فنگ لو لان کی رائے میں تاؤمت کے پیروکار ''خود غرض'' تھے۔ لیکن جلد ہی چینیوں نے اپنے عملی لوگ ہونے کے باعث ایک زیادہ سیاسی دلچسپی سے رجوع کیا (جس کا اظہار غیر متعین دور کی ایک اور تاؤ مت کتاب Lieh tzu میں ہوتا ہے)۔

کنفیوشس ازم ایک اخلاقی نقطہ نظر کے فقدان والے ادوار کی تکالیف کا غماز تھا۔ اس دور میں ایک منظم ماضی کے قوانین کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ تاؤمت کے پیروکاروں نے ''دنیاوی مقاصد'' وظائف سرانجام نہ دے سکے...... یعنی فطری نظم کی مطابقت میں۔ مغربی نقطہ نظر سے یہ تاؤمت کا انارکسٹ پہلو تھا جس کے ماخذ پر کنفیوشس ازم کے برعکس قدیم چینی سحر اور شمن ازم میں تھے۔

چینی فلسفہ میں پیش رفت کی تاریخ کے کسی بھی علم کی نسبت ''راستہ'' کا دائرہ اثر بہت وسیع رہا ہے۔ ''راستہ'' بلاشبہ ایک صوفیانہ (باطنی) تحریر ہے، اور اس والا جذبہ Analects میں بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ اس کا انداز مبہم اور تشبیہاتی ہے۔ اس کا مختلف متعدد طریقوں سے ترجمہ کیا جا سکتا ہے، اور کیا بھی گیا ہے۔

یہ قدیم سحر پر مبنی نہایت لطیف فلسفیانہ استدلال اور بالکل نئے سرے سے تخلیق کی گئی ایک چیز کا الجھا ہوا ملغوبہ بھی ہے۔ لہٰذا باب 1 میں حقیقے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ''آسمان اور زمین کی پیدائش بے نام میں سے'' ہوئی' اور خود کو ہمیشہ کے لیے خواہش سے آزاد کر لینے والا شخص ہی ''ماہیتوں کا راز دیکھ'' سکتا ہے۔ لیکن باب 6 (جو بلاشبہ سابق دور کی کسی نظم کا اقتباس ہے) سوچ کے ارتقاء پذیر ہونے سے بھی پہلے کے دور کی بات کرتا ہے: اس میں ابتدائے حیات کو کافی کم فلسفیانہ ۔ صوفیانہ انداز میں دیکھا گیا ہے: ''روح وادی (Valley Spirit) کبھی نہیں مرتی۔ اسے تاریک مادہ کہا جاتا ہے، اور زمین و آسمان اسی کی دہلیز میں سے برآمد ہوئے۔''

آپ اس میں اور قبالہ میں پیش کردہ جنسی اور جنسیتی کے متعلق قیاس آرائیوں کا با مقصد

موازنہ کر سکتے ہیں۔ یہ غالباً تمام باطنی تحریروں میں سب سے زیادہ مشہور ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ قدیم عوامی سحر اور ترقی یافتہ فلسفیانہ قیاس آرائی کے مابین مصالحت کی نمائندہ ہے۔

ہم کنفیوشس ازم کی جڑیں مراضی بالقصار ویوں کے خاتمے کی خواہش حتی کہ بی چنگ کے بدترین اثرات کو کمزور کرنے کی خواہش میں بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ''راستہ'' کا بنیادی فلسفہ توکل پسندانہ (Quietist) ہے۔ یا کم از کم یہ توکل پسندی پر منتج ہوتا ہے۔ تاؤ مت نے سیاسی اعتبار سے دیگر اور بعد کی تحریروں پر انحصار کیا۔ سیاسی آراء باب 34 میں سے اخذ کی جا سکتی ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص ''کسی بھی موقع پر عظمت کا اظہار نہیں کرتا وہ در حقیقت عظمت پا لیتا ہے۔'' یوں دیگر ریاستوں کے ساتھ مقابلہ آرائی نہ کرنے والی ریاست کو یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ غالب آئے گی...... کیونکہ ''ردعمل'' کے مظہر کی رو سے ہر چیز اپنے متضاد میں بدل جاتی ہے۔ مثالی (آئیڈیل) تاؤ سٹ حکومت مداخلت کرنے والی نہیں: یہ لوگوں پر کوئی چیز حتی کہ روایتی اخلاقیات بھی لاگو نہیں کرتی...... یوں ہر چیز کو اپنے قدرتی بہاؤ پر بہنے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ باب 30 میں کہا گیا: ''جو شخص تاؤ (راستے) کے تحت کسی حکمران کی مدد کا خواہشمند ہو تو تمام مسلح تسخیر کی مخالفت کرے گا کیونکہ معاملات متضاد ردعمل کے تابع ہیں۔ تاؤ کے خلاف کوئی بھی چیز جلد ہی فنا ہو جائے گی۔''

مذہب میں گہری دلچسپی رکھنے والے مغربی فلسفیوں نے بھی اس سوال سے پہلو تہی کی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ اب مغربی فلسفہ میں ایسی کوئی بھی چیز موجود نہیں جو اس قسم کے سوال کے ساتھ نمٹ سکے۔ ''راستہ'' ایک ایسی ضرورت پوری کرتا ہے جو فلسفوں کو کبھی پیش نہیں آئی۔ یہ بالخصوص مذہبی رجحان رکھنے والوں کی تسکین کرتا ہے جو اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں لیکن عقیدے کے باعث گڑبڑائے ہوئے ہیں: یہ کسی مخصوص خدا سے اپیل کیے بغیر تخلیق کا ایسا بیان پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے مافوق فطرت قوتوں کی کارگزاری پر دلالت کرتا ہے۔

نتیجتاً ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی میں چینی سرزمین بدھ مت کے لیے اس قدر زرخیز ثابت کیوں ہوئی۔ بدھ مت واقعی وہ نہیں ہو سکتا جو آپ اسے بنانا چاہتے ہیں...... لیکن یہ

عقیدے کو مسترد کر آنے والوں کے لیے پناہ گاہ ضرور فراہم کر سکتا ہے۔ تاؤ کا تصور بذات خود کافی حد تک قدیم ین یانگ اصول کا مرہون منت ہے۔ آپ اسے ایک قسم کی ثنویت (Dualism) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ین لاشئے اور یانگ ہستی ہے۔ لاشئے کے بغیر شئے بھی نہیں ہو سکتی۔ بامقصد عمل اور غیر عمل (مجہولیت) بھی موجود ہے۔ بہت سے مفسرین نے ہیگل اور اس کے تھیس اینٹی تھیس عمل کا حوالہ دیا ہے۔

باب 25 کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''آسمان اور زمین کے وجود میں آنے سے پہلے کچھ بے شکل مگر کامل موجود تھا...... ہم اس کا حقیقی نام نہیں جانتے مگر اسے تاؤ کہتے ہیں۔'' نظم میں مزید کہا گیا ہے کہ پرے جانے کا مطلب واپس آنا ہے۔ ''راستہ'' کا ایک سادہ پن پیراڈاکس (یعنی متضاد دعووں) میں اس کی مسرت ہے جس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ خالق خود مخلوق نہیں ہو سکتا اور تغیر پیدا کرنے والا خود قابل تغیر نہیں ہو سکتا۔ دانش مند حکمران کو بے عملی کی کامل حالت حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اس طرح درست حکومت قائم ہوگی۔

کنفیوشس ازم کا دانا حکمران ایک تسلیم شدہ نظام اخلاقیات کی اطاعت کرتا ہے، اور تاؤسٹ دانا حکمران اپنے آپ میں فطری کی جستجو سے تحریک یافتہ ہوتا ہے۔ یہ دو رویے ایک دوسرے سے مزید جدا نہیں ہو سکے، تاہم، تاؤ مت کے پیروکار صرف اسی وجہ سے کنفیوشس پسندوں کے ساتھ مل کر کام کر پائے۔ چینی رویہ پائیداری کو تسلیم نہیں کرتا، بشرطیکہ یہ بذات خود تاؤ کی محیط کل پائیداری جیسی نہ ہو جو بیک وقت خالی پن، بے عملی اور لاشئیت ہے اور اس کے باوجود نیکی کی حامل بھی۔ ہست ہونے کی حالت سے ہی ہم اس سراب تک پہنچتے ہیں کہ تاؤ لاشئے ہے۔

ساری تاریخ میں تاؤ مت نے ین یا پھر یانگ کی طرفداری کی ہے، اور چوتھی صدی عیسوی میں مانوی مذہب کے زیر اثر یانگ کو فیصلہ کن اولیت دے دی گئی۔ ماہرین طب نے ایک یا پھر دوسرے اصول پر زور دیا۔ ''راستہ'' کا عظیم ترین مفسر قلیل العمر وانگ پی (226 تا 249 ق۔م) تھا جو کنفیوشس کے لاؤ سے زیادہ ماہر ہونے پر یقین رکھتا تھا (کیونکہ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا

کہ لاشئے کے متعلق بات کرتا!)۔ اس نے تعلیم دی کہ ''لاشئے'' تاؤ کا ''جوہر''، تمام چیزوں کا ماخذ ہے، لیکن اس کی کارکردگی ہستی کے ذریعہ منکشف نہیں ہو سکتی۔ یوں اس نے مغربی فکری نظاموں جیسی ہی پیچیدہ مابعد الطبعیات تشکیل دی۔

تاؤ تے چنگ کی مفاہمت ''گلدستۂ تحریر'' (Analects) کے ساتھ کروائی جا سکتی ہے کیونکہ ایک کی مدد کے بغیر دوسری کو پڑھنا بہت مشکل ہے۔ دونوں نے مل کر چین کو اس کا توازن عطا کیا۔ چین پر دونوں کا ہی اثر پڑا۔ لیکن بالواسطہ طور پر انہوں نے دنیا کو بھی متاثر کیا۔ ماؤ کے وسیلے سے کارل مارکس کا اثر آئندہ کے چین پر باقی رہے گا، لیکن کوئی ایک اثر بھی ختم نہیں ہوگا۔

6

اوستا

"The Avesta"

اندازاً 500 قبل مسیح

موجودہ دور کے زیادہ تر محققین کی رائے کے مطابق ایرانی مذہب زرتشت مت نے اپنے بعد میں آنے والے مذاہب پر گہرے اثرات مرتب کیے: یہودی، عیسائیت، مہایان بدھ مت، مانی مت اور اسلام۔ فریڈرک نطشے کی ''زرتشت نے کہا'' نے بھی مغربی فکر پر بہت اثر ڈالا، اگرچہ اس کا زرتشت یا زرتشت مت سے کوئی تعلق نہیں۔

روایت کے مطابق سپتاما خاندان میں جنم لینے والا زرتشت واحد ایسا بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی مسکرایا۔ اس کا دور 1400 تا 1200 قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اس کے دور کا تعین

rekhta

کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کیونکہ تب تک ایران میں فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب فن تحریر وجود میں آ گیا تو زرتشت کے پیروکاروں نے اسے الوہی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں زرتشت مت کی اولین تحریریں کہیں 500 تا 400 ق۔م میں ہی جا کر وجود میں آئیں جب مذہب ایک ہزار سال پرانا ہو چکا تھا۔ نیز ان تحریروں کی زبان اوستائی (جسے بعد میں ژند کا نام دیا گیا) کافی حد تک قدیم فارسی جیسی تھی۔ یہ زبان 1500 سال پہلے متروک ہو چکی ہے۔

چنانچہ تفاسیر اور تراجم میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ محققین اور دانشوروں نے اپنے ایک خوف کے باعث اسے مزید بگاڑ ڈالا...... زرتشت مت کے مطابق کائنات میں خیر کے ساتھ ساتھ شر بھی ابتدائے آفرینش سے موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کچھ تحریریں تقریباً 1200 ق۔م کی ہیں اور کچھ دیگر 800 تا 600 قبل مسیح کی۔ زرتشت مت دو عظیم سلطنتوں کا سرکاری مذہب تھا: اکیمنی (559 تا 323 ق۔م) جس کا خاتمہ سکندر نے کیا؛ اور ساسانی (226 ق۔م تا 650ء) جو اسلام کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوئی۔

زرتشت مت کی عظیم "لادینی" کے پیروکار دیوتائے زماں زروان (Zurvan) کی عبادت کرتے تھے۔ ہمارے پاس موجود قدیم ترین مسودہ 1323 عیسوی میں لکھا گیا تھا۔ زرتشت نے صرف گاتھا یعنی بھجن تصنیف کیے تھے جو خالصتاً شاعری ہیں۔ اوستائی تحریریں دینیاتی حوالے سے زیادہ مستند ہیں، لیکن اس میں ساسانی دور کی پہلوی تحریروں سے بہت کچھ شامل کیا گیا۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی کی تحریریں اپنے سے پہلے کی تحریروں پر قابل قدر روشنی ڈالتی اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ مذہب نے کن خطوط پر ترقی کی۔ مثلاً Dinkard اوستا کا ایک خلاصہ ہے؛ بنداہشن (Bundahishn) میں تخلیق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مقدس صحائف خالصتاً اوستا گاتھا (بھجن)، کتاب عبادات (کھوردا اوستا) وسپراد اور قانونی وطبی وندیداد پر مشتمل ہیں۔

اعتقادات کا یہ عمیق اور پیچیدہ مجموعہ زرتشتیوں کی تعداد نہایت قلیل رہ جانے کے باوجود معدوم نہیں ہوا۔ انھوں نے اسلام کی سرفرازی کے دور میں بہت برے دن دیکھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں زرتشت مت کے سچے پیروکار Manekji Limji Hataria نے کچھ

کامیابی حاصل کی اور اپنے ہم مذہبوں کو تحفظ دیا۔ جدید زرتشتیوں کا بڑا حصہ پارسیوں (فارسیوں) پر مشتمل ہے جن میں سے زیادہ تر ممبئی میں کافی وقار کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں لیکن تقریباً 12,000 پارسی عراق اور کچھ مزید ایران میں۔

اس وقت پارسیوں کی کل تعداد ڈیڑھ لاکھ سے کم ہے اور ان کے زرتشت مت میں دوئی (خیر اور شر کی دوئی) کا شائبہ تک بھی موجود نہیں۔ لیکن زرتشت نے یہودیت اور عیسائیت میں اپنی راہ نکالی۔ ان دونوں مذاہب میں شیطانی اور لادین قرار دیے گئے فرقے اسی کے اثر کی پیداوار ہیں۔ عیسائیت میں ان کا قلع قمع کرنے کے لیے 1232ء میں پہلی مرتبہ عدالت احتساب سرکاری طور پر متعین کی گئی۔

مشرقی ایران کے نشیبی علاقے کا مذہبی پیشوا، شاعر، پیش بین اور پیغمبر زرتشت خود کو وراثت میں ملنے والے کثرت پرست مذہب کا ایک مصلح تھا۔ یہ نام نہاد قدیم ایرانی مذہب مبہم ہے اور ہم صرف قیاسی بنیادوں پر ہی اس کے خدوخال کا اندازہ کر سکتے ہیں، اگرچہ رگ وید اس کے بارے میں اصول رہنمائی کرتا ہے۔ زرتشت کی اپنی الٰہیات کو Zarathustrianism قرار دیا جاتا ہے تاکہ اسے Zoroastrianism سے تمیز کیا جا سکے۔ موخرالذکر مذہب کو سیاستدانوں نے ایک ہزار سال تک اپنائے رکھا کیونکہ یہ ان کے مقاصد پورے کرتا تھا۔ دراصل مذاہب سیاسی "کامیابی" حاصل کرتے ہی اپنی عین الٹ صورت اختیار کرنے لگے جاتے ہیں۔

زرتشت کی الٰہیات مختصراً یوں ہے: دیوتا اہورا مزدا (یہ نام ویدوں میں کہیں نہیں ملتا، لیکن غالباً یہ ویدک دیوتا ورونا کی ہی تبدیل شدہ صورت ہے) ہمیشہ سے موجود اور غیر مخلوق اچھائی (خیر) ہے جس نے کائنات تخلیق کی لہٰذا کائنات بھی سراسر خیر ہے۔ دوسری طرف شرانگیز امینیو (جسے بعد میں اہرمن کہا گیا) بھی غیر مخلوق اور اہورا مزدا کی ازلیت میں شریک ہے۔ لیکن ہر انسان اپنے دل سے انگرا مینیو کے خلاف اہورا مزدا کی مدد کا فرض لازماً اختیار کرتا ہے۔ کافی پیچیدہ تفصیل کا حامل یہ اعتقاد اور ساتھ ہی اخلاقی نظریات متاثر کن نثر میں بیان کیے گئے ہیں۔ مسیح کے عہد کی دنیا میں یہ اعتقاد نہایت طاقتور تھا اور تقریباً 500 برس قبل کے ارسطو اور افلاطون بھی اس کے بارے میں آگاہ تھے۔

زرتشت نے بذاتِ خود ایک ولی کے طور پر داستانی شہرت حاصل کی۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے فیثا غورث کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ زرتشت کے دعووں اور تحریری ریکارڈ کے درمیان تقریباً ڈیڑھ ہزار برس کا فاصلہ ہونے کے باوجود عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کا پیغام حیران کن استناد کے ساتھ محفوظ رکھا گیا۔ پیغمبر کہتا ہے: ''زمین کو ٹھہرائے رکھنے اور آسمان کو گرنے سے روکے رکھنے والا کون ہے؟'' ''کس صناع نے دن اور راتیں بنائیں؟'' تاہم، زرتشت کی وفات کے بعد متعدد پرانے ایرانی دیوتا دوبارہ ظاہر ہو گئے۔ ان کی حیثیت اہورا مزدا والی نہیں بلکہ مذاہب عالم میں نمودار ہونے والے اولین فرشتوں کی تھی۔

اس پروہت کے پیروکاروں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسی طرح مسیح کی بات بھی نہ سنی گئی۔ اس نے سفر اور پرچار کیا...... اس حوالے سے کئی حکایات موجود ہیں...... اور آخر کار اسے ایک اور ایرانی سلطنت میں ایک بادشاہ وشتاسپ مل گیا جس نے اس کی بات غور سے سنی۔ قصے کے مطابق زرتشت نے وشتاسپ کے گھوڑے کا کامیاب علاج کر دیا تھا۔ کئی نشیب و فراز کے بعد زرتشت کے وحدانیت پرست مذہب نے سرکاری حیثیت اختیار کر لی اور تیزی سے پھیلنے لگا۔

زرتشت نے دعویٰ کیا کہ اس نے اپنی تعلیمات اپنے دوست اہورا مزدا سے براہ راست وصول کی ہیں۔ اس نے خوش امیدی کے ساتھ تبلیغ کی کہ زمانے کے اختتام پر نیکی فاتح ہو گی۔ یوں اس نے پہلی مرتبہ نظریہ معادیات (Eschatology) یعنی قیامت کا تصور مذہبی فکر میں متعارف کروایا۔ لیکن دریں اثناء انسان خیر و شر میں سے ایک کو منتخب کرنے کو آزاد تھے اور ان کا حساب ان کی منتخب کردہ راہ کی نہایت داخلی نوعیت پر ہی منحصر تھا۔ (درحقیقت ''اختتام'' ایک آغاز ہے۔ آخر کار دنیا کو شر سے پاک کر دیا جائے گا) مرضی یا انتخاب کی آزادی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے...... آشا کے راست باز راستے پر چلنے کی آزادی جو زرتشت مت میں ہر جگہ موجود تصور ہے۔

ہندی...... ایرانیوں کے دیوتاؤں کو زرتشت نے متشدد اور اخلاقیات سے عاری قرار دے کر مسترد کیا۔ اس نے اور اس کے پیروکاروں نے ان دیوتاؤں میں حملہ آوروں کی تباہ کن طاقتیں دیکھیں جو علاقے کے عوام کی پرامن خانہ بدوش زندگی کے لیے ہر وقت خطرہ بنے رہتے تھے۔

چنانچہ گھوڑے اور جو گائیں اہم تھیں، اور گائے کی آہ و زاری زرتشتی شریعت میں ایک مشہور اقتباس ہے۔ گائے جھوٹ کی قوتوں کے باعث تکلیف اٹھا کر ڈکراتی ہے، اور اہورا مزدا اور اس کے معاونین (ایشا اور سپیتا) نے زرتشت کو اس کی حفاظت پر مامور کیا ہے۔ لیکن گائے اس بات پر خوش نہیں: وہ اسے ایک کمزور انسان سمجھتی ہے۔ (''کیا میں ایک بے طاقت رکھوالے، ناتواں شخص کو برداشت کر لوں جبکہ مجھے ایک طاقتور حکمران کی ضرورت ہے؟'')

چنانچہ یہ راستبازی کی جستجو میں روح کی تکالیف کا ایک استعارہ ہے۔ اس میں روح کی ناتوانی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اور دیگر بھجن (گاتھائیں) ہومر سے کئی سو سال پہلے کے ہیں، اور یہ اپنی نفسیاتی و مابعد الطبیعیاتی پیچیدگی میں کہیں زیادہ قابل ذکر ہیں۔

زرتشت کی تعلیمات اس کے معاشرے کی عکاس ہیں جس میں گلہ بان ظالم اور لاقانون خانہ بدوشوں کی لوٹ مار کے خلاف ایک باقاعدہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہے تھے (ان حملہ آوروں کے اثر کو ہرگز کم اہمیت نہیں دی جا سکتی)؛ لیکن یہ ایک اخلاقی اور باطنی عنصر کی حامل بھی ہیں جو تاریخی سوچ بچار سے ماوراء ہے۔ وہ صرف اپنے دور، علاقے اور قبیلے کی اقدار کو ہی تحفظ نہیں دینا چاہتا۔ وہ پرامن اور خونیں قربانی کے خلاف تھا۔ اس کے نظامِ فکر میں کسی شخص کا حساب اس کی موت کے بعد Chinvat پل پر کیا جاتا ہے۔ یہ حساب کتاب تین فرشتے متھرا، سروش اور رشنو لیتے ہیں۔ نیک و بد اعمال اور خیالات و افکار کو بھی تولا جاتا ہے۔ اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو تو روح کو پل سے گزار کر جنت میں لے جایا جاتا ہے، اور اگر بد اعمال زیادہ ہوں تو روح کو ایک بتدریج تنگ ہوتے ہوئے راستے سے پل تک لے جایا جاتا ہے اور آخر کار وہ پھسل کر تکالیف بھرے پاتال میں جا گرتی ہے۔

لیکن جب دنیا سے برائی کے عظیم خاتمے کا موقع آتا ہے تو سارے انسان سفید گرم دھات کے وسیع دریا کو پار کر کے تطہیر پاتے ہیں، اور صرف دونوں دنیاؤں کے بہترین افراد ہی خود کو سچے ثابت کر پاتے ہیں۔ بعد کی زیادہ مستند توضیحات میں کہا گیا تھا کہ اہورا مزدا نے دنیا تخلیق کرتے وقت تمام انسانوں کی فروشیوں (اعلیٰ ارواح) سے مشورہ کیا تھا کہ کیا وہ مادی صورت اپنانا چاہتی ہیں یا نہیں: انہوں نے ایک طرف کھڑے رہنے کی بجائے برائی کے خلاف جنگ میں مادی صورت اختیار کرنے کی راہ منتخب کی۔

ایک زرتشتی معبد

چنانچہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں سبھی نے اپنے مختلف نظریات حاصل کیے...... جنت اور دوزخ، موت اور حیات بعدالموت اور شر کی فطرت کے متعلق عقائد...... زرتشت مت کے مطابق مستقبل میں ایک کنواری کے بدن سے ایک نجات دہندہ جنم لے گا جو پیغمبر کی اپنی نسل میں سے ہوگا (اس کا تخم کرشماتی طور پر ایک جھیل میں محفوظ ہے اور اب بھی وہاں چمک رہا ہے)۔ غالباً یہودی مسیحا اور عیسائیوں کے یسوع مسیح کا ماخذ یہی ہے۔ Chinvat پل پر حساب کتاب کی نوعیت کا انحصار بنیادی طور پر ''آشا'' پر ہے۔ ''آشا'' کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس کا مفہوم ''چیزوں کا فطری انداز'' لے سکتے ہیں...... ایک ایسا تصور جس میں رحمدلی، کریم النفسی، نظم دنیا اور کافی کچھ شامل ہے۔ ''آشا'' کا متضاد دُروج (Druj) یعنی بدنظمی ہے جو اکثر نظم کے طور پر نظر آتا ہے۔ نظم کے بھیس میں اس بدنظمی کو فرانز کافکا کے ''دی

ٹرائل'' اور ''دی کاسل'' ناولوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ دی کاسل میں مبصر اصرار کرتا ہے کہ فائلوں کی ناقابل درگتی بے ترتیبی کی تہہ میں بھی ایک ترتیب کارفرما ہے۔ موجودہ دنیا کے ہر ٹاؤن ہال میں عین یہی منظر نظر آتا ہے۔ اس سب پر ''کلرکوں کا اختیار'' ہے۔

انجام کار، دیگر تمام مذاہب کی طرح زرتشت مت نے بھی اپنی تردید خود ہی کر دی: رشوت خور پجاریوں نے اسے ریاستی مذہب بننے کے لیے موزوں صورت دی اور یوں اپنے حکمرانوں کا دنیا میں بول بالا کیا۔ لیکن اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ زرتشت مت کا بانی انسانیت پسندی اور دانائی رکھتا تھا...... اور اس کے کچھ جانشین بھی۔ پہلوی ادوار میں ابھوا مزدا ''غیر معلوم'' ہونے کی تمنا کرتا ہے: ''اگر وہ مجھے جان گئے تو کوئی بھی میری پیروی نہیں کرے گا۔'' یہ حقیقت پسند خدا غیر معلوم خدا سے متعلق ہی جیسا کی پیش بینی کر رہا ہے جو خالق سے مختلف ہے۔

7

گلدستۂ تحریر

"Analects"

کنفیوشس

اندازاً پانچویں تا چوتھی صدی قبل مسیح

سترہویں صدی میں چین جانے والے یسوعی مبلغوں نے کنفیوشس (محترم کُنگ 551 تا 479 ق م) کے نام کو لاطینی صورت (Confucius) دی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس نے کچھ بھی تصنیف نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اور صرف ایک اتالیق تھا جس نے کوئی مافوق فطرت

اتھارٹی ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس نے خود کو علم کا پرچار کرنے والا کہا۔ لیکن وہ چینی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور اور بااثر مفکر ہے۔ لہٰذا اس کی تفسیر مختلف اور متضاد طریقوں سے کی گئی۔ ہمیں چاہئیے کہ اسے حکایات سے الگ کر کے دیکھیں: لیکن یہ کام بہت مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن بھی ہے۔

کنفیوشس مت اصل میں کوئی مذہب نہیں، اور نہ ہی کنفیوشس جدید مفہوم میں ''مذہبی'' تھا۔ اسے چینی مذہب کی عمومی انسانیت پسند نوعیت کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ چینی مذہب میں خدا بہت عظیم نہیں، اور نہ ہی اس سے زیادہ رجوع کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تاؤ مت بھی خدا کی جانب بااحترام رویہ نہیں رکھتا۔ چینی خدا فطرت کے مترادف ہے۔ مثلاً کسی یہودی ولی کے ساتھ موازنے پر کنفیوشس زیادہ احترام کا حامل نظر نہیں آتا۔ وہ انسان کی فطری نیکی کی بات کرتا ہے جسے غیر صوفیانہ قسم کی تطہیر ذات کے ذریعہ باہر لانے کی ضرورت ہے۔ چین کی انسانیت پسندی نشاۃ ثانیہ والی انسانیت پسندی جیسی بھی نہیں: یہ فرد پر کم اور فرد بطور جزو معاشرہ پر زیادہ زور دیتی ہے۔ ''قادر مطلق کا تصور چینی فکر میں مخصوص الملک ہے: لیکن کائنات کے ہر لمحہ متغیر ہونے کا تصور نہیں۔

کنفیوشس کی پہلی سوانح اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ وہ ریاست لو (Lu) کے ایک غریب اشرافی خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ کچھ عرصہ تک ریاست کے ایک ادنیٰ (کچھ کے مطابق اعلیٰ) عہدے پر فائز رہا، لیکن 498 ق م میں استعفیٰ دے کر ایک ایسے حکمران کی تلاش میں سفر پر نکل گیا جسے وہ اپنے نظریہ سیاست کے مطابق حکومت کرنے پر مائل کر سکے۔ اس کے نظریات کسی بھی دوسرے مفکر جتنے ہی قابل تعریف اور منطقی ہیں۔

افلاطون کے برخلاف کوئی بھی شخص کنفیوشس کو اپنے سیاسی تجربات آزمانے کا موقع دینے کو تیار نہ تھا۔ انجام کار وہ مرنے کے لیے 476 میں آبائی علاقے میں واپس آگیا۔ وہ اپنی ناکامی سے دلبرداشتہ تھا۔ شاید وہ جانتا ہو کہ نسبتاً مختصر عرصہ میں اس ناکامی کی تفصیلات اس کے اپنے ہی ملک کے معاشرہ میں اوپر سے نیچے تک نفوذ کرنے والی ہیں۔ کمیونزم کے نفاذ سے پہلے تک چین کا نظام تعلیم اسی کے نظریات پر مبنی تھا۔ یہ سوال بہت گنجلک ہے کہ کنفیوشس مت نے

rekhta

کمیونسٹ حکومت کو کس حد تک متاثر کیا۔ لیکن اس کا اثر ضرور پڑا۔ ماؤ ازم میں کنفیوشس ازم کی کافی جھلک ملتی ہے۔

ہمہ گیر طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ کنفیوشس کے حقیقی خیالات اور نظریات کی درست عکاسی ''گلدستہ تحریر'' (Analects) سے ہی ہوتی ہے۔ تمثیلات یا مختصر قصوں اور بات چیت کی صورت میں یہ تحریریں اس کے ایک شاگرد (یا شاگرد کے شاگرد) نے جمع کی تھیں۔ اس بات کا تعین نہیں کیا جا سکا کہ ''گلدستہ تحریر'' کنفیوشس کے خیالات کی کس حد تک ترجمانی کرتی ہے۔

چین کے دو عظیم فلسفوں میں سے کسی ایک کو بھی اولیت دینا ممکن نہیں۔ وہ مغرب کی رومانویت اور کلاسیکیت کے درمیان تضاد کے عکاس ہیں۔ تاؤ مت ین (Yin)، نسوانیت، کثرت پرستی، بے گناہی، انارکزم، داخلی دنیا اور جذبات کا مذہب ہے، جبکہ کنفیوشس مت میں یانگ (Yang)، مردانہ پن، اخلاقیات، انصاف، تنظیم، خارجی دنیا اور دانش کو بنیاد مانا گیا ہے۔ لہٰذا لاؤ زے غالباً ایک داستانی شخصیت ہے (اس کے تاریخی وجود کی کوئی شہادت نہیں ملتی)، لیکن کنفیوشس ایک حقیقی انسان ہے۔

دونوں فلسفوں کا ماخذ ایک ہی ہے: زراعت۔ چین میں مفکرین عموماً جاگیردار تھے جن کا دارومدار عام کسانوں ہی کی طرح کامیاب کاشت کاری پر ہوتا تھا۔ تاؤ مت کا تعلق فطرت، وجدان اور بے ساختگی سے ہے اور کنفیوشس مت کا نشوونما، منطق اور سماجی ذمہ داری سے۔ تاؤ مت میں قابل خواہش کی بات کی گئی ہے، جبکہ کنفیوشس مت بتاتا ہے کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہونا لازمی ہے۔ کنفیوشس مت سالہا سال کے دوران بننے والے خاندانی تعلقات اور حکومت کے پیچیدہ نظام کو نئے سرے سے مرتب کرنے اور اس کو قابل جواز بنانے کی ضرورت کی پیداوار تھا۔ تاہم، دونوں فلسفوں میں ایک نکتۂ نظر مشترک تھا: انہوں نے تسلیم کیا کہ ین اور یانگ کے درمیان غیر مختتم اندرونی تعلق میں ''اُلٹ'' (Reversal) کا عنصر موجود تھا: ایسا عمل جس کے ذریعہ ہر واقعہ یا چیز میں اپنا ہی الٹ ملوث ہوتا ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ دن کے بعد رات آتی ہے۔ جوانی میں بڑھاپا اور بڑھاپے میں جوانی ملوث ہے۔ چنانچہ دونوں مکاتب فکر نے ''اگرچہ مختلف وجوہ کی بناء پر) ''تبدیلیوں کی

کتاب'' (I Ching) کو محترم مانا۔

دونوں فلسفے اپنی طویل تاریخ کے دوران جدا ہوتے رہے اور پھر باہم مل گئے: تیسری صدی کے تاؤ مت والوں نے کنفیوشس مت سے قریب تر ہونے کی کوشش کی اور بارہویں صدی کے کنفیوشس پسندوں نے تاؤ مت کی جانب جھکاؤ کا رویہ ظاہر کیا۔ تیسری صدی میں وانگ پی جیسے تاؤ پیروکاروں نے کہا کہ کنفیوشس نے ہستی سے ماورا ہونے کی حالت پائی تھی لیکن لاؤ زے اپنے اندر ہی رہا! ان دو رویوں نے چینی عوام کو ایک مفید توازن عطا کیا، اور انہیں دو دستیاب دنیاؤں (دوسری اور یہ) میں ایک بنیاد فراہم کی۔

یہ امر واضح نہیں کہ ہمیں کنفیوشس کو کنفیوشس مت سے کس حد تک الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔ اس نے اپنے سے منسوب چیزوں کا 10 فیصد بھی انجام نہیں دیا تھا۔ اس نے چھ کلاسکس کو ایڈٹ تک نہیں کیا تھا (یعنی یعنی تبدیلیاں، شاعری کی کتاب، تاریخ، موسیقی اور رسوم) اگرچہ ایک بنیاد پرست ہونے کے ناطے وہ انہیں مستند مانتا تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ ایک منظم معاشرے میں چیزوں کے نام نہیں ہونے چاہئیں: گلدستہ تحریر میں کہا گیا ہے کہ ''سب سے پہلے ناموں کی درستگی کی ضرورت ہے۔'' لہٰذا بیٹا ایک بیٹا اور حکمران ایک حکمران ہی ہے۔ برا حکمران حکمران نہیں ہوتا کیونکہ حکمران کی حیثیت میں اس کے افعال حکمرانی کے شایان شان نہیں ہوتے۔

کنفیوشس کا دور ایک ایسا دور تھا جب بہت سے گروہ چو سلطنت کی ختم ہوتی ہوئی طاقت پر قبضہ کرنے کے لیے باہم برسر پیکار تھے۔ اس نے سیاست میں اخلاقی اور انسانیت پسندانہ اصول متعارف کروانا چاہیے۔ لفظ انسان (jen) کے جوہر کو...... (اس لفظ کا جوہر یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرو جو تم اپنے ساتھ ہونا پسند نہیں کرتے)...... عملی صورت دینے کے ذریعہ ہی کوئی شخص شخصی اور معاشرتی دونوں حوالوں سے ''عظیم'' بنتا ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر نیکی پیدا کر کے ہی دوسروں میں نیکی پیدا کرنا سیکھ سکتا ہے۔ لی (Li) یا راست رویے کا تصور بھی کنفیوشس کے فلسفہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کنفیوشس مت میں نیکی اپنا انعام آپ تھی؛ اور ''گلدستہ تحریر'' میں کہا گیا ہے کہ ''اعلیٰ انسان'' ہی سیاست میں جائے گا کیونکہ یہ

درست چیز ہے، چاہے اسے اپنی کامیابی یقین ہی نہ ہو۔

دنیا کے تمام اہم مفکرین میں سے کنفیوشس غالباً سب سے زیادہ aphoristic یعنی تشبیہاتی اور بہت کم گہرا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خالی نہیں۔ وہ ماضی کی روایتی اخلاقیات کے نظام کا احیائے نو چاہتا تھا۔ اس کے کم گہرا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اٹھارہویں صدی تک کے عظیم مفکرین سے زیادہ سیکولر تھا۔

کنفیوشس نے اپنی تجربیت پسندی (Pragmatism) کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پر غور وفکر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا جو انجام کار مابعد الطبیعیاتی قیاس آرائیوں کی جانب لے گئی۔ جدید اخلاقیات کا کافی بڑا حصہ گلدستہ تجربے سے حاصل ہوا۔ کانٹ کے ہاں موجود بہت کچھ شاید کنفیوشس سے لاتعلق معلوم ہو کیونکہ چینی فلسفیوں نے (جو سب کے سب تجربیت پسند تھے) علم کے پیش کردہ مسائل پر بہت کم توجہ دی۔ کنفیوشس ''پریشانی اور الجھن سے نمٹنے'' کے بارے میں متفکر ہونے اور منافع سے نفرت کرنے کے باعث بھی موجودہ دور کے ساتھ مربوط ہے۔

ہمارا بین الاقوامی ٹیکنالوجی کا دور ہماری زندگیوں کی بدنظمی اور بے ترتیبی کو فوراً آشکار کر دیتا ہے! اور یہاں نفع کمانے والے لوگ سب سے زیادہ ''فوری انفارمیشن'' مہیا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جو کنفیوشس کے بیان کردہ ''غور وفکر'' (Reflectivencess) کا قلع قمع کرتی ہے۔

کنفیوشس کے نظریات کو مینسیئس (Mencius) نے ترقی دی جو 371 اور 289 ق م کے دوران گزرا ہے۔ اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ مینسیئس نے کنفیوشس کے پوتے کے ایک شاگرد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے انسان کی بنیادی اچھائی پر زور دیا جسے خود کنفیوشس کے ماننے والوں نے ہی چیلنج کیا۔ مینسیئس نے وہ کچھ بھی کیا جس میں کنفیوشس ناکام ہو گیا تھا...... یہ وضاحت کہ انسانوں کو دوسروں کی جانب مخیرانہ رویہ کیوں اختیار کرنا چاہیے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک اور اہم کنفیوشس پسند ہسن تزو (Hsun Tzu) زیادہ رواقی (Cynical) تھا۔ اس نے کنفیوشس مت کے ایک پہلو کو زیادہ حقیقت پسندانہ صورت دی۔

آج کنفیوشس مت چین کے ہمسایہ ممالک میں پھل پھول رہا ہے، اور جزوا کنفیوشس پسند ماؤزے تنگ کی وفات کے وقت دور کے ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کنفیوشس کے بغیر کنفیوشس مت وہ شکل اختیار نہ کر سکتا جو اس نے اب کر لی ہے۔ تاؤ مت میں لاؤ تزو کا کوئی وجود اور کردار نہیں۔ کنفیوشس کا اثر اس قدر زیادہ ہونے کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس میں افلاطون کی سے گہرائی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ حکمرانوں کو دانا اور نیک انسان دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اس نے موروثی حکومت کے نظام پر کبھی اعتراض نہ کیا۔ البتہ اس نے مغرب کے ''جنٹل مین'' کے تصور میں ضرور حصہ ڈالا۔ نشاۃ ثانیہ کے اطالوی مصنف بالداسارے کاستیلیونے کی ''درباری'' (The Courtier) اور کنفیوشس کے نظریہ ''راست رویہ'' کا موازنہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

بلاشبہ کنفیوشس ''اعلیٰ انسان'' خلقی طور پر زیادہ اخلاقی اور کم انفرادیت پسند ہے، لیکن کافی کچھ مشترک بھی دکھائی دے گا۔ تاہم، کنفیوشس کا اثر بہت اچھا پڑا۔ اس نے خواہ مخواہ گہرائیوں میں اترنے کی بجائے انسانی حقیقتوں میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔

کنفیوشس میں جس چیز کا فقدان ہے وہ بقول افلاطون ''فلاح'' کے حصول کی خواہش کے لیے ایک فلسفیانہ (یا مذہبی) بنیاد ہے۔ البتہ اس کی دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی کے حوالے سے اس کی تعلیمات آج بھی کافی حد تک کارآمد ہیں۔ عیسائیت کی نسبت کنفیوشس مت بہت کم تقاضے کرتا ہے، اور اس میں پڑوسیوں سے محبت کی تلقین بھی زیادہ شدت سے کی گئی ہے۔ کنفیوشس کے ہاں اور نہ ہی کنفیوشس مت میں کبھی دنیا کا اختتام قریب ہونے کی بات کی گئی۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ کنفیوشس کو اپنی نیکی کی نصیحتیں اکارت جانے کے بارے میں معلوم تھا، لیکن کے معلوم کہ اگر یہ نصیحتیں کی ہی نہ گئی ہوتیں تو یہ دنیا کس قدر بری ہوتی؟

8

پیلوپونیشیائی جنگ کی تاریخ

"History of the Peloponnesian War"

تھیوسی ڈائیڈز

پانچویں صدی قبل مسیح

ہیرو ڈوٹس کو "باباے تاریخ" قرار دینا مشکل ہے: وہ ایسی بہت سی چیزوں میں بھی دلچسپی رکھتا تھا جو تاریخ کے دائرہ کار میں نہیں آتیں۔ ہیرو ڈوٹس کو بابائے تاریخ قرار نہ دینا 'ادبی حوالے سے اس کے اور ہمارے لیے مفید ہے۔ لیکن اس کے تقریباً 20 برس بعد پیدا ہونے والے تھیوسی ڈائیڈز کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر بابائے تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ واضح طور پر

طریقہ کار اور وضاحت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نے تاریخ کے میدان میں اپنے عظیم پیشرو کو دعوت مبارزت دی۔

ہیرو ڈوٹس نے یونان اور فارس کی طویل جنگ کو اپنا موضوع بنایا۔ یہ جنگ کالیاس (Callias) کے مقام پر معاہدۂ امن کے ساتھ 448 قبل مسیح میں ختم ہوئی۔ لیکن کم از کم 478 ق م کے بعد سے سپارٹا اور ایتھنز کے درمیان شدید دشمنی موجود تھی جس کی بڑی وجہ ایتھنز میں ڈیلیائی لیگ کی بڑھتی ہوئی آمرانہ قیادت تھی۔ یہ لیگ اصل میں اہل فارس کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ بعد میں جمہوری یونان نے اپنے تمام اتحادیوں، بالخصوص سپارٹا کی آزادی کو سلب کرنا چاہا جبکہ سپارٹا کی عسکریت پسند ڈکٹیٹرشپ حق خود اختیاری کی چیمپئن تھی۔

460 ق م میں اہل ایتھنز دراصل تجارت کی وجہ سے کورنتھ اور پیلو پونیشے کی دیگر ریاستوں کے ساتھ جنگ آزما ہوئے۔ ان ریاستوں میں ایجینا (Aegina) ریاست بھی شامل تھی جس کو محاصرے میں لے کر 457 میں فتح کر لیا گیا۔ اس موقع پر سپارٹا نے اپنے پرانے اتحادی کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور تھیبس کے نزدیک تاناگرا کے مقام پر ایک ایتھنی فوج کو شکست دی۔ لیکن پیریکلیز کی زیر قیادت ایتھنز مزید چند برسوں تک مسلسل کامیابی حاصل کرتا رہا۔

446 ق م میں سپارٹا اور دیگر ریاستوں نے ایتھنز کو پیچھے دھکیلا۔ پیریکلیز نے دیکھا کہ ایتھنز کو جارحانہ پالیسیاں ترک کر کے ایک طاقتور فوج اور بحریہ والا منضبط تجارتی ملک بننا چاہیے۔ اس نے ایتھنز اور اس کی بندرگاہ پائریس کے درمیان طویل دفاعی دیواریں تعمیر کیں۔ اس نے 445 ق۔م میں "تیس سالہ" معاہدۂ امن کیا۔ یوں پہلی پیلو پونیشیائی جنگ ختم ہو گئی۔ معاہدۂ امن بس ایک عشرے تک ہی چل سکا۔ دو ریاستوں کے درمیان جھگڑے میں ایتھنز کی مداخلت کے بعد 432 میں سپارٹا نے اعلان جنگ کر دیا۔ اس نے ایتھنز کی جانب سے تیس سالہ معاہدۂ امن کی خلاف ورزی کو وجہ بنایا۔ یوں دوسری پیلو پونیشیائی جنگ شروع ہوئی جو تھیوسی ڈائیڈز کا موضوع ہے۔

تھیوسی ڈائیڈز 460 اور 465 کے درمیان تھریکی نسل کے ایک اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوا۔ غالباً وہ ایتھنی جرنیل ملتیادیس (550 تا 489 ق۔م، جس نے میراتھن کے مقام پر اہل فارس

کوشکست دی تھی) کے بیٹے سیمون (Cimon)[1] کا رشتہ دار تھا۔ تھیوسی ڈائیڈز ایتھنز میں 429 کی وبا (طاعون) کا شکار ہو مگر اس کی جان بچ گئی۔ وہ پیریکلیز کی غرض (Cause) کا ایک نوجوان حامی تھا۔

424 میں تھیوسی ڈائیڈز بھی دیگر نو افراد کی طرح جنرل منتخب ہوا۔ اسے شمالی بیڑے کی کمانڈ سونپی گئی (ہم اسے امیر البحر یعنی ایڈمرل کہیں گے)۔ اس اسی برس وہ اہم مقدونیائی شہر ایمفی پولس کو سپارٹائی براسیداس (Brasidas) کے قبضے میں جانے سے بچانے میں ناکام ہوا۔ تھیوسی ڈائیڈز اپنی ''تاریخ'' کی کتاب چہارم میں اس سارے معاملے کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ وہ براسیداس کی اعتدال پسندی اور ''نرم مزاجی'' کا معترف ہے۔ لیکن یہ اس کے جنگی کیریئر کا خاتمہ تھا۔ اسے گھر واپس بھیج کر مقدمہ چلایا گیا اور ناکامی کی پاداش میں ایتھنز سے 20 سال کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ کتاب چہارم میں نہایت سچے انداز میں بتاتا ہے:

> اس دور کی تاریخ ایتھنز کے تھیوسی ڈائیڈز نے بھی گرما اور سرما کے واقعات کی زمانی ترتیب میں لکھی ہے...... اس وقت سے لے کر جب لیسیڈیمونیوں اور ان کے حلیفوں نے سلطنت ایتھنز کا خاتمہ کیا اور طویل دیواروں اور پائریس پر قبضہ کر لیا۔ یقیناً مجھے جنگ کے آغاز سے لے کر اختتام تک سب یاد ہے...... میں نے یہ سارے واقعات خود دیکھے اور ان کی سچائی جاننے کے لیے پوری توجہ دی۔ ایمفی پولس میں فوج کی قیادت کرنے کے بعد 20 سال کے لیے اپنے علاقے سے جلاوطن ہونا میرا مقدر تھا (اس نے ان بیس برس کے دوران طویل سفر کیے اور آخر کار ایتھنز واپس آنے کے بعد چند سال ہی زندہ رہ سکا)۔ دونوں فریقین میں اور بالخصوص اپنی جلاوطنی کے باعث پیلو پونیشیوں کے درمیان موجود رہنے کے باعث میں معاملات کا مشاہدہ کچھ زیادہ باریک بینی کے ساتھ کرنے کے قابل ہوا۔

اس اقتباس میں ایک مورخ کے طور پر تھیوسی ڈائیڈز کا نرالا طریقہ کار واضح ہوتا ہے۔ وہ خود کو معاصرانہ واقعات کے سچے محرر کے طور پر بیان کرتا ہے۔ وہ یہ بھی زور دیتا ہے کہ اس نے شعوری طور پر معاملات کا مشاہدہ کیا۔ وہ ہیروڈوٹس کے خلاف میدان میں اترتے ہوئے یہ

ثابت کرنے کا مظاہرہ کرتا ہے کہ پیلو پونیشیائی جنگ فارس کے ساتھ جنگ سے زیادہ اہم تھی۔ کم از کم اس لحاظ سے اس کا کہنا بجا تھا کہ اس جنگ نے یونانی تہذیب کے خاتمے کی صورت پیدا کر دی۔ ریاستوں کا ایک نیٹ ورک ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے میں ناکام رہا اور انجام کار تباہی سے دوچار ہوا۔ بلاشبہ اپنی جلاوطنی کے احساس نے بھی تھیوسی ڈائیڈز کی معروضیت کو تیکھا پن عطا کیا: وہ کوئی بڑا سپہ سالار نہیں تھا، اور اس کی ناکامی میں لاپروائی سے زیادہ بدقسمتی کا عمل دخل تھا۔ چاہے اس کی جلاوطنی منصفانہ تھی یا غیر منصفانہ، بہرحال اس کے نتیجہ میں ایک فن تاریخ معرض وجود میں آیا۔

مخصوص حوالوں سے تھیوسی ڈائیڈز میکیاویلی کا نقیب اور پیش رو ہے۔ اس کی تحریر کا ایک تاریک پیغام یہ ہے کہ انسان ہمیشہ نیکی کی بجائے مصلحت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات اس امر کے پیش نظر مایوس کن ہے کہ اچھائی کی تبلیغ کرنے والا افلاطون ایتھنی وبا پھیلنے کے چند سال بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ مایوس کن ہے کہ میکیاویلی کی پیدائش عیسیٰ مسیح کے 1,469 برس بعد ہوئی جنہوں نے تشدد کو مسترد کیا۔ لیکن بچوں کو سکول میں اس بات کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

تھیوسی ڈائیڈز کی نثر گنجلک، واقعات کا بیان قابل تعریف طور پر تیز، کردار نگاری با مقصد ہے۔ وہ اپنے سے کافی بعد کے پلوٹارک کی نسبت کردار کی کہیں زیادہ بہتر فراست رکھتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے ساتھ رقابت کے باعث اس نے فارسی اثر کی اہمیت کو گھٹا کر بیان کیا، اور اکثر مواقع پر اس کی رائے دیگر تمام مورخین کی طرح ناقص ہے۔ لیکن مجموعی طور پر وہ حیرت انگیز حد تک درست بیانی سے کام لیتا ہے۔ تھیوسی ڈائیڈز پہلا ایسا مورخ تھا جس نے تاریخ کو پڑھنے...... نہ کہ سنانے...... کے لیے لکھا۔ اس کا مقصد قارئین کو آئندہ انسانی طرز عمل کے متعلق ہدایات دینا تھا۔ وہ میکیاویلی کی طرح حقیقت کا طول اور افسردہ پہلو پیش نہیں کرتا۔

تھیوسی ڈائیڈز نے ہومر کے انداز میں جو تقاریر شامل کیں ان کی درستگی پر بہت بحث مباحثہ ہوا، کیونکہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کا حافظہ کمزور ہے اور صرف تخیل سے ہی کام لینا پڑ رہا ہے۔ اس نے واقعات کے درست بیان کی خاطر تخیل کے استعمال سے گریز بھی کرنا چاہا۔ یقیناً اس نے

شعوری طور پر نوٹس لیے یا راویوں کے بیانات سنے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے مواد کو ڈرامائی رنگ بھی دیا۔ اس معاملے میں وہ ماہر اور کامیاب رہا۔ کچھ واقعات کو اس نے شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ المیہ فن اور حقیقت نگاری کو خوبصورتی کے ساتھ ملانے کے باعث وہ ہیروڈوٹس کا ہم پلہ ہے اور اس کی تحریر نے تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ زیادہ تر لوگ ایتھنی پولس کی شکست کا الزام تھیوسی ڈائیڈز کی بجائے ایتھنیوں کو دیتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک ناکامی تھی جو تاریخ کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئی۔

9

تحریریں

"Works"

بقراط

انداز اً 400 قبل مسیح

افلاطون کے بوڑھے ہم عصر بقراط کی نیم داستانی شخصیت (469 تا 399 ق۔م) کی حیثیت قدیم یونانیوں، عربوں، قرون وسطیٰ کے اہل فکر کے لیے ہر عہد میں مثالی طبیب کی رہی ہے۔ ہم یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتے لیکن وہ غالباً اسی رتبے کا حقدار تھا۔ بہر کیف افلاطونی مفہوم میں وہ مثالی طبیب ہے۔ خود افلاطون بھی اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ تاہم، نام نہاد ''بقراطی

تحریریں'' اس کی تھیں۔ کچھ تحریریں ضرور اس کی ہوں گی، اور باقی اس سے متاثر ہونے والوں کی۔ کچھ لوگوں کے مطابق طب یونانی بھی یونانی ڈرامہ جیسی بلند پایہ اور تخلیقی کامیابی تھی۔

لیکن بقراط کون تھا اور ان تحریروں کی حقیقت کیا ہے؟

بقراط کے گرد اس قدر حکایات کا جھمگٹ ہے کہ اس بارے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی حقیقی ہستی تھا۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ بقراط محض ایک افسانوی شخصیت ہے۔ دراصل اس سے منسوب قصوں کی تعداد اس کی بطور استاد اور معالج شہرت کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کی طبی اہمیت سے قطع نظر، چند قطعی حقائق موجود ہیں: وہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل سے پرے واقع یونانی جزیرہ کوس (Cos) کا رہنے والا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس نے طب کے استاد کی حیثیت میں کافی سفر کیا۔ وہ طبیب ہیراقلیدیس کا بیٹا تھا اور Asclipiadae نامی طبی تنظیم کا رکن بنا (تنظیم کا نام شفا کے یونانی دیوتا Asclepius سے مشتق ہے)۔ ایک اور اتنا ہی اہم طبی مکتبہ سمندر کے اس پار براعظم پر Cnidus میں واقع تھا۔

بقراط کا بہت مشہور اور محترم طبیب بن جانا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن ہمیں اس کی انفرادی صلاحیت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس کے چند قریبی ذرائع پر ہی انحصار کرنا ہو گا۔ اس کے بعد کی صدیوں کے دوران کئی دوسرے طبیبوں نے اس کی شہرت کو گہنائے رکھا۔ چنانچہ ''تحریروں'' میں سے متعدد اس کی موت کے بعد لکھی گئیں...... البتہ چند ایک ہی 330 ق۔ م کے بعد کی ہیں۔ مختلف تحریروں کو صرف اور صرف بقراط سے منسوب کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں...... لیکن ضروری نہیں کہ وہ کوششیں غلط ہوں۔ دو نمایاں تحریروں میں ''مرگی کے بارے میں رسالہ'' بھی شامل ہے جس کا مقصد اس مفروضے کو مسترد کرنا ہے کہ مرگی کوئی مقدس بیماری ہے۔ دوسری تحریر ''ماحولیات کے بارے میں'' مختلف'' مقامی بیماریوں کا بیان'' ہے...... ایسی بیماریاں جو آب و ہوا، مٹی اور ارضی حالات کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

طب کی تاریخ اور طبی خیالات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی وجہ سے ''تحریریں'' انمول ہیں۔ جدید ادوار میں انہیں ایڈٹ کیا گیا۔ ان میں شامل 58 تحریروں کو 73 کتابوں

میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں تجربی نکتہ نظر اپنایا اور مشاہدے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ سر کے کسی بھی ایک طرف چوٹ لگنے سے جسم کے دوسرے پہلو پر اثرات پڑتے ہیں۔ ''تحریروں'' نے افلاطون اور ارسطو دونوں کو متاثر کیا۔ ان میں توہماتی تفاسیر کی ہر ممکن حد تک مخالفت کی گئی۔ ان کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ مقبول عام نکتہ نظر کے ساتھ ساتھ ایک سائنسی طرز فکر بھی موجود تھا۔

افلاطونی مثالیت پسندی، چاہے اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو طبی سیاق و سباق میں موزوں نہیں تھی۔ تاہم، افلاطون ''فیدرس'' میں بقراط کے متعلق قابل قدر معلومات فراہم کرتا ہے...... (بشرطیکہ اس کا بقراط بھی سقراط کی طرح ایک افسانوی ذریعہ نہ ہو)۔ وہ اسے اس یقین کا حامل بیان کرتا ہے کہ جسمانی اعضاء کے متعلق اتنی دیر تک کچھ بھی نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ جسم کی تفہیم بحیثیت مجموعی نہ کی جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ مثلاً پورے جسم کے حوالے سے جگر کی کارکردگی کو سمجھے بغیر جگر کو جاننا ناممکن ہے۔

غالباً بقراط خود اس مفروضہ پر یقین رکھتا ہوگا کہ بیماری کی وجہ نامکمل انہضام ہے: غیر ہضم شدہ ہوا کھانے کی باقیات کے ساتھ خارج ہوتی اور پھر جسم پر حملہ کرتی ہے۔ تاہم، بیماری کے بارے میں اس قسم کا تصور ''تحریروں'' میں موجود نہیں۔ جانے مانے ڈاکٹروں کا یقین ہے کہ بقراط نے تقریباً چھ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب میں کہا گیا ہے کہ

> زندگی مختصر: آرٹ طویل، موقع fleeting (کمیاب)، تجربہ گمراہ کن اور فیصلہ مشکل ہے۔ ڈاکٹر کو نہ صرف وہ کام کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو درست ہے، بلکہ مریض، معاونین اور ماتحتوں کو بھی تیار کرنا چاہیے۔

تاہم، سب سے مشہور قول یا اقتباس Prognostics میں ہے۔ یہ اقتباس موت زدہ لوگوں کی ظاہری صورت کے بارے میں ہے: ''تیکھا ناک، خالی آنکھیں، پچکی ہوئی کن پٹیاں......'' لیکن مصنف ڈاکٹروں کو پُر امید رہنے کا کہتا ہے...... اس ظاہری حالت کی کچھ اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔

بیشتر تہذیبوں کے طبیبوں نے بقراط کو مثالی استاد کے طور پر اپنایا۔ ''طبیبوں کے شہنشاہ'' یونانی گیلن (130 تا 20 عیسوی) کی شہرت بھی کچھ کم نہیں۔ بقراط کی طرح اس کی تحریروں کو بھی صحیفے کا درجہ دیا گیا۔ لیکن اسے یہ مقام اپنی موت کے 1500 برس بعد ہی ملا۔ بقراط کی نسبت گیلن کے متعلق زیادہ کچھ معلوم ہے، اور یہ سبھی معلومات خوشگوار نہیں: گیلن مغرور، تھیوری میں کمزور اور نہایت خود پسند تھا۔

گیلن (جالینوس)

اسے مارکس آریلیئس کے اکھڑ بیٹے کوموڈس کی صحت کا خیال رکھنے کا ناخوشگوار فریضہ سونپا گیا۔ نیز، اگر اس کا کوئی پیش رو بھی اس جتنا ممتاز ہوتا تو شاید وہ اپنی خود تنقیدی کی خامی پر قابو پالیتا۔

تیسری صدی قبل مسیح کے دو طبیبوں، ہیروفیلس اور ایرسٹراٹس کی تحریریں غالباً اس سے زیادہ اہم تھیں؛ لیکن اس نے ان پر توجہ دی تھی۔ اس نے بقراط پر بھی غور کیا۔ کچھ موقعوں پر گیلن نے غیر تھیوریٹیکل بنیادوں پر بقراط کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ چیز طب کی ترقی کے لیے نقصان دہ تھی۔ لیکن اسے خمیازہ بھگتنا پڑا: سولہویں صدی میں اس کی شہرت ماند پڑنے جبکہ بقراط کی بڑھنے لگی۔

مشہور ''بقراطی حلف'' کی کچھ صورتیں بقراط سے پہلے بھی موجود تھیں، لیکن تب اس حلف نامے کا نام کوئی اور ہوگا۔ ہندوستانی طبیب بھی اسی قسم کا حلف اٹھاتے تھے، اور یونانیوں کے پاس یہ حلف نامہ مصریوں یا فیثا غورث، یا شاید دونوں سے آیا ہوگا۔ یہ حلف لیتے ہوئے طبیب وعدہ کرتا ہے کہ وہ مریضوں کی پوری خدمت کرے گا، ان کے ساتھ جسمانی تعلقات نہیں قائم کرے گا' کبھی کوئی زہریلی دوا نہیں دے گا، کبھی اسقاط حمل میں مدد نہیں کرے گا اور ہمیشہ رازداری برقرار رکھے گا۔

10

تحریریں

"Works"

ارسطو

چوتھی صدی قبل مسیح

فلسفی، سائنسدان اور عوامی مفکر ارسطو ہمارے موروثی انداز فکر میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ ہمیں اس کا نام کبھی اجنبی نہیں لگا۔ اگر ہم مذہبی شخصیات کو شمار نہ کریں تو دنیا پر ارسطو کا اثر کسی بھی اور فرد کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ افلاطون کا شاگرد تھا اس لیے ہمیں ان تمام موضوعات پر اسے ہی فوقیت دینی چاہیے جن پر وہ افلاطون کے ساتھ اختلاف رکھتا تھا۔

تاہم، ارسطو کی حیثیت افلاطون کے ایک "حاشیے" سے کافی زیادہ ہے۔ ہم تک پہنچنے والی اس کی تحریریں کچھ مبہم (dull side) ہیں تو ہمارے پاس اس کے لیے رومن سسرو کا ایک قول موجود ہے کہ گمشدہ تحریروں میں بلاغت کا ایک "سنہری دھارا" رواں تھا۔

ارسطو 384 قبل مسیح میں تھریسی ساحل کے ایک چھوٹے سے قصبے ستاگرا (موجودہ Stavros) میں ایک طبیب نکوماکس کے گھر پیدا ہوا۔ اس کا باپ مقدونیائی دربار کے ساتھ تعلقات رکھتا تھا۔ ارسطو اٹھارہ برس کی عمر میں ایتھنز میں افلاطون کی اکادمی میں داخل ہوا۔ وہاں بیس برس گزارنے کے بعد وہ خود بھی ایک مقرر بن گیا۔ افلاطون نے اسے "مکتبہ کی دانش" اور "القاری" دونوں قرار دیا۔ تاہم، اس نے یہ بھی کہا کہ اسے مہمیز کی بجائے لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔" وہ افلاطون کی "پارمینائیڈز" میں نظر آتا ہے۔ افلاطون کی وفات (347 ق م) کے بعد ارسطو کا دل اکادمی میں نہ لگا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب اس کا رجحان "فلسفہ سے ریاضی کی جانب" ہو گیا ہے۔ اس نے افلاطون کے شاگردوں کے ایک گروپ میں شمولیت اختیار جو اکادمی کے ایک سابق طالب علم ہرمیاس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہرمیاس شمال مغربی ایشیائے کوچک میں ساحلی شہر اتارنیئس کا آمر حکمران بن گیا تھا۔ ارسطو نے وہاں گزارے ہوئے تین برس کے دوران ہرمیاس کی بھانجی اور لے پالک بیٹی پائتھیاس سے شادی کر دی جس کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

342 ق م میں مقدونیا کے فلپ دوم نے ارسطو کو دعوت دی کہ وہ اس کے تیرہ سالہ بیٹے الیگزینڈر (سکندر) کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اٹھا لے۔ اس نے دو سال تک سکندر کو پڑھایا۔ تقریباً 340 میں نوجوان سکندر اپنے باپ کا نائب السلطنت بنا۔ اس کے باپ کو چار برس بعد قتل کر دیا گیا۔ ارسطو کو اپنی اتالیقی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملا، لیکن فطری علوم میں تحقیقات کے لیے نمونے حاصل کرنے کی غرض سے اسے ہزاروں غلام مہیا کرنے کی کہانیاں غالباً دروغ گوئی ہیں۔ البتہ وہ ایسا آدمی ضرور ہوگا جو انسانی علم کی انتہائی حدود کو ہر قیمت پر کھوجنا چاہتا تھا۔

ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ارسطو کا اپنے ڈینگ باز شاگرد سکندر "اعظم" پر کیا اثر پڑا۔ نوجوان سکندر نے یونان اور مقدونیہ میں سازشیں فرو کرنے کے بعد شام اور مصر فتح کیا (جہاں کسی

مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا) 331 میں اسے لیبیا میں دیوتا قرار دیا گیا، اور اسی برس اس نے فارس کی فتح مکمل کی۔ اب ایشیا کا حکمران یا فاتح بن کر وہ 327 ق م میں ہندوستان کی جانب روانہ ہوا مگر آگے تک نہ جا سکا۔ 324 ق م میں اس کی تھکی ہوئی فوج نے واپس جانے کا مطالبہ کیا اور وہ ایک تکلیف دہ سفر کے بعد سوس پہنچے۔ 32 سالہ سکندر بخار کے باعث بابل میں مر گیا۔ عام طور پر اسے ایک عظیم فوجی قائد خیال کیا جاتا ہے جس نے ساری "دنیا پر حکومت کرنے" کا اپنا خواب تقریباً پورا کر دیا تھا۔ اکثر یہ سوال نہیں اٹھایا جاتا کہ "عالمی ریاست" قابل خواہش کیوں ہے، اور اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس نے یونانی شہری ریاستوں کی خودمختاری اور یونانی تہذیب کے کمالات کو تقریباً ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ کیا ارسطو کی تعلیمات نے سکندر کو ولولہ انگیز بنایا؟

سکندر آکس کی جنگ میں

جنگ یا امن یا یونانی تہذیب کے کمالات یا لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کے متعلق ارسطو کے خیالات چاہے کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وہ بالکل بے اختیار تھا، اور یہ ممکن نہیں کہ سکندر کے عزائم پر اس نے اثر ڈالا ہو۔ مگر اس کی تحریروں میں غلامی کی روایت پر کوئی اعتراض موجود نہیں جس کا

مطلب ہے کہ وہ یونانیوں کی فطری برتری کا دعویدار تھا۔ تاہم، یہ اعتراض اٹھانے کا مقصد ارسطو پر سیاسی اعتبار سے انگشت نمائی کرنا نہیں۔

1900ء کے عشرے میں جس طرح کپلنگ اور بہت سے دیگر افراد نے غیر برطانوی لوگوں کو ''فطری غلام'' محسوس کیا، اسی طرح ارسطو بھی اہل مشرق کو یہی سمجھتا تھا۔ اس نے سکندر کو بھی یہی تعلیم دی ہوگی۔ لیکن ڈرامہ نگار یوری پیڈیز نے اس سے تقریباً ایک صدی قبل غلامی کی روایت پر سوال اٹھایا۔ فیثا غورث سمیت متعدد سوفسطائی اس کے دوست تھے۔ ارسطو نے یوری پیڈیز کو سب سے زیادہ المناک (Tragic) شاعر خیال کیا۔ ان کے درمیان یہ فرق بدستور موجود ہے۔

انسانیت اور عدل و انصاف کے متعلق اس کے نظریات کی لاریب خامیوں کو متوازن کرنے کے لیے قرین قیاس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فتح میں سکندر بلند نظری ارسطو کی ہی مرہون منت تھی۔ سکندر فاتح تو بہرصورت بن ہی جاتا لیکن ارسطو نے مفید اثرات مرتب کیے۔ اپنے حملوں کے لیے سکندر نے بہانہ بنایا کہ وہ اپنے حملہ کا نشانہ بننے والوں کو بچانا چاہتا تھا: اس کام کے لیے ایک اچھا فلسفہ ضروری تھا۔ یہ فلسفہ ارسطو نے فراہم کر دیا۔ علاوہ ازیں اس کے بارے میں بے شمار قصوں میں سے ایک کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں: کہ اس نے اپنے ہی غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ فلپ یا سکندر میں اینٹی ایتھنز کچھ بھی نہیں: کہ ان کے لیے بربری فارسی اولین دشمن تھے۔ پلوٹارک کے مطابق سکندر نے ارسطو کو لکھا:

> ''سکندر بنام ارسطو، تسلیمات۔ آپ نے زبانی عقیدے کے بارے میں اپنی کتابیں شائع کر کے اچھا نہیں کیا: اب اگر وہ چیزیں بھی سب کے سامنے کھول کر رکھ دی جائیں جو ہمیں خصوصی طور پر سکھائی گئی ہیں تو دوسروں پر ہماری کیا برتری رہ جائے گی؟ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طاقت اور سلطنت کو وسعت دینے سے زیادہ شاندار چیز کے علم میں دوسروں پر سبقت لے جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ الوداع''

سکندر کا عملی طور پر اس بات سے بمشکل ہی کوئی تعلق تھا، لیکن یہ اس پر ارسطو کے اثر کی نشاندہی کرتی ہے۔

ارسطو قد میں اوسط سے کم، چھوٹی چھوٹی آنکھوں، گنجے سر اور پتلی ٹانگوں والا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ خوبصورت عورتوں کو کیوں پسند کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ کوئی اندھا ہی یہ سوال پوچھ سکتا ہے۔ نرم دل ہونے کے باوجود وہ اپنا ہر کام بڑی مستعدی اور تن دہی سے کرتا تھا۔ اور اس غالب نظریے کو چیلنج کرنے کی وجوہ بہت کم ہیں کہ وہ ایک اخلاقی انسان تھا جس کا اخلاقی رویہ اپنے دور کے اخلاقی رویوں سے برتر تھا۔ ارسطو کی "Ethics" (اخلاقیات) کے بارے میں ایک ذہین عام آدمی (اور عام آدمی ہر لحاظ سے فلسفیوں سے کمتر نہیں ہوتے) کا نکتۂ نظر یقیناً یہی ہوگا۔ Ethics کچھ بورنگ ہونے کے باوجود نہایت قابل فہم تھی۔ اس کی "Poetics" حقیقی معنوں میں قابل تعریف اور ہنوز متاثر کن ہے۔ لیکن اس میں ''آمد'' کے نظریہ کو قبول کرنے کے باوجود شاعری پر حقیقی توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس حوالے سے وہ ہمیشہ یونیورسٹی پروفیسروں کے لیے مثالی نمونہ بنا رہا جو عموماً آمد پر یقین نہیں رکھتے۔

334 ق م میں مقدونیا کی حامی حکومت وقت کا فائدہ اٹھا کر ارسطو واپس ایتھنز آیا اور Lyceum کی بنیاد رکھی۔ اس نے گشتی فلسفی کا لقب حاصل کیا کیونکہ وہ ادھر ادھر چل پھر کر شاگردوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔ گیارہ برس بعد، جب سکندر مر چکا تھا اور ایتھنز میں مقدونیہ مخالف حکومت آ گئی تھی، اس پر ''لادینی'' کا الزام عائد کیا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک اور ایتھنی حکومت کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتا اور بھاگ کر کالیس (Chalcis) چلا گیا۔ ایک ہی برس بعد 322ء میں اس کی وفات ہو گئی۔

ارسطو کی تحریروں کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ ''خارجی'' تحریروں پر مشتمل ہے جو سب کی سب کھو چکی ہیں (لیکن اقوال کی صورت میں ضرور موجود ہیں)۔ ارسطو نے ان تحریروں کو Exoteric (یونانی زبان میں exo کا مطلب خارجی ہے) اس لیے کہا کیونکہ یہ اکادمی میں قیام کے دوران لکھی گئیں، اور یہ اکادمی کے ارکان کی بجائے بیرونی سامعین کے لیے تھیں۔ دوسرا حصہ لائسیئم میں محققین کی معلومات کے لیے لکھی گئی یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ تقریباً یہ سب تحریریں بھی کھو چکی ہیں۔ ہم تک پہنچنے والی زیادہ تر تحریریں تیسرے حصے کی ہیں: مقالے، لیکچر نوٹس اور لائسیئم کے طالب علموں اور Esoteric (اندرونی) لوگوں کے لیے لکھی گئی

نیکسٹ بکس۔

اگر چہ ارسطو کی تحریروں کی حیثیت غیر یقینی ہے اور ان میں سے بہت کچھ کھو چکا ہے پھر بھی وہ ایک اولین نظریہ دان اور غالباً اولین عوامی مفکر بھی تھا۔ اس قسم کے دماغ کا اسقدر متاثر کن ہونا محض ایک اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ایک پاگان (بت پرست) یونانی ہونے کے ناطے اس کا فلسفہ عیسائی عقیدے کا ستون بن گیا (لیکن لوتھر نے اسے ''بدبودار'' قرار دیا)؛ اس سے قبل وہ اسلامی دنیا کا فکری آقا رہ چکا تھا؛ سترھویں صدی کے انگریز محققین نے اس کے مجسمے کو ''اعلیٰ شان والا'' کہا۔ وہ ناگزیر طور پر وہ کچھ بن گیا جو حقیقت میں نہیں تھا؛ ایسے معاملات میں بھی اس سے سند پیش کی گئی جن کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے خدا کو غیر مخلوق، لاانتہا اور دنیا کو بامقصد قرار دیا۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ ''ہر سنجیدہ عقلی ترقی کا آغاز ارسطوئی عقیدے پر حملے کے ساتھ کیا گیا۔'' یہ کہانی معقول ہے کہ اس نے اس وجہ سے خود کو سمندر میں غرق کر لیا تھا کیونکہ وہ مدوجذر کی وضاحت نہیں کر سکا تھا۔

ہمارا علم کی درجہ بندی کرنے کا طریقہ ارسطو سے ہی مستعار لیا ہوا ہے۔ اپنی وسیع لائبریری' یونانی ریاستوں کے 158 آئین، اپنے سائنسی نمونوں کے ساتھ اس نے دنیا کو مابعد الطبیعیات، حیاتیات، منطق، علم شہاب ثاقب، سیاست، اخلاقیات، علم بیان، نفسیات اور طبیعیات سے متعارف کرایا۔ یقیناً اس حوالے سے وہ افلاطون کا محض ایک حاشیہ نہیں۔

ہیرو اور کمینے آدمی، عاشق اور دوست' مسخرا پن اور حاضر دماغی کے درمیان امتیازات بھی ارسطو کی دین ہیں۔ اعتدال کے متعلق ہمارے خیالات کا آغاز اسی کے اقوال سے ہوتا ہے۔ کیا کوئی شخص یہ کام مزید بہتر طریقے سے کر سکتا تھا؟ منطقی قیاس (Syllogism) اور اس سے منسلک بہت سی لطافتیں ارسطو کی ہی دین ہیں...... مثلاً یہ طرز استدلال: ''تمام انسان فانی ہیں، سقراط ایک انسان ہے، اس لیے سقراط فانی ہے۔''

آخر میں ہم ایک غیر مختتم موضوع پر بات کریں گے، یعنی ارسطو ازم کی تاریخ۔ وہ ہمارے لیے جو اصطلاحات چھوڑ گیا ان میں سے کچھ یہ ہیں: Syllogism (قیاس منطقی)، Substance (جوہر)، Conclusion (حاصل بحث)، Dialectics (جدلیات)۔ مختلف

دھڑوں نے ارسطو کو اپنے اپنے نکتہ نظر کی حمایت میں استعمال کیا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں اس کی کتابوں کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح اس کے اثر کا پہلا دور شروع ہوا اور نتیجتاً 529ء میں جسٹینین نے ایتھنز میں فلسفہ پڑھانے پر پابندی لگا دی۔ اب عرب اس کی جانب متوجہ ہوئے: ابن سینا اور ابن رشد دونوں نے اسے مستند مانا، اور ان کی لکھی ہوئی تفسیروں کے ذریعہ ہی ارسطو کی تحریروں کے لاطینی تراجم سپین کے راستے واپس یورپ پہنچے۔ آکوینس نے اسے کم و بیش نئی صورت دی، اور اس کے خیالات کو عیسائی کلیسیا کے عقائد کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ دانتے نے ارسطو کو ''اہل علم کا گرو'' قرار دیا۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید فلسفہ ارسطو کی سوچ کی ہی تعمیر نو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں عموماً دیے جانے والے اس بیان کو باجواز بناتا ہے کہ وہ آخری آدمی ہے جسے وہ سب کچھ معلوم تھا جو اس کے دور میں جاننے کے قابل تھا۔

11

تاریخ

"History"

ہیروڈوٹس

چوتھی صدی قبل مسیح

تاریخ بے کم وکاست اور قیاسی سائنس کے درمیان ایک چوراہا ہے۔ اسی لیے ابتداء میں اسے آرٹ کی ایک صورت خیال کیا گیا۔ خارجی واقعات کی فہرست بنا دینا بہت آسان ہے، لیکن ان کی اہمیت جانچنے اور ان کے پس پردہ کارفرما انسانی خواہشات کا پتہ لگانے کی کوشش کرنا اتنا آسان نہیں۔ بہت سے بے کم وکاست (exact) لیکن قوت تخیل سے محروم مورخ دلچسپ انداز

میں نہ لکھ پائے۔ ایڈورڈ گبن جیسے عظیم مورخین نے اس میں کامیابی حاصل کی۔ رومن قانون دان فلسفی اور خطیب مارکس تولیئس سسرو نے بجا طور پر ہیروڈوٹس (480 تا 425 ق م) کو ''بابائے تاریخ'' قرار دیا۔ اس نے بہت اچھے انداز میں لکھا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک معیار قائم کر گیا۔ ایسا معیار جسے تقریباً سبھی مورخین نے تسلیم کیا۔

ہم پیچھے کہہ چکے ہیں کہ رزمیہ شاعر ہومر کے ہاں تاریخ اور داستان ملے جلے ہونے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ یہ مسئلہ ایسے ہی رہے گا۔ یونانیوں کے ''نثری ہومر'' ہیروڈوٹس کے حوالے سے بھی یہ سوال تحلک ہے، مگر کم۔

تمام معاشروں کے اپنے پروفیشنل وقائع نگار گزرے ہیں۔ ان میں سے متعدد پیشہ ور دروغگو، اطاعت گزار بیوروکریٹس یا اعداد و شمار کا حساب رکھنے والے تھے، اور آج بھی ہیں۔ لیکن کچھ دیگر کم نمایاں لوگوں نے مقدور بھر ایمانداری دکھائی اور آج بھی دکھا رہے ہیں۔ دوسری جگہوں کی طرح یونان میں بھی (حتیٰ کہ فن تحریر کے آغاز سے پہلے) یہی صورتحال تھی......

یونانیوں نے اپنے حروف تہجی آٹھویں صدی میں فنیقیوں سے لیے۔ اس سے پہلے وہ زبانی ریکارڈ رکھتے تھے۔

سچائی کے انکشاف کا ذریعہ ہونے کے موجودہ مفہوم میں تاریخ نے بیرونی اثرات کے بغیر صرف تین معاشروں میں ترقی حاصل کی: چینی، عبرانی اور یونانی۔ لیکن ہیروڈوٹس اولین انفرادی مورخ ہے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہے۔ اس نے فارم ایجاد کی۔ اس نے ہر ممکن حد تک خود کو محض وقائع نگاری کی بجائے باقاعدہ مورخ بنایا۔

تاہم، تاریخ کا ایک جائز ''دادا'' موجود ہے جسے ہیروڈوٹس نے مسترد کرنے کے باوجود کافی زیادہ استعمال بھی کیا۔ تاریخ کا یہ دادا ملیٹس کا جغرافیہ دان ہیکاٹیس (Hecateus) تھا جو چھٹی اور ابتدائی پانچویں صدی کے دوران گزرا ہے۔ وہ ہیروڈوٹس کی نسبت کم خوش قسمت تھا کیونکہ ہم تک اس کی "Circuit of the World" میں سے چند اقتباسات (تقریباً 300) ہی پہنچ سکے ہیں۔ Periegesis یا سرکٹ آف دی ورلڈ تقریباً 500 ق۔م میں لکھی گئی تھی۔ تاہم، ضروری نہیں کہ یہ کتاب بھی ہیروڈوٹس کی ''تاریخ'' جیسی ہی قابل مطالعہ ہوتی۔ ہیکاٹیس،

ملطیس کے ہی اناکسی ماندر کا شاگرد تھا۔ سرکٹ یا چکر دکھانے کے لیے اس کا استعمال کردہ نقشہ اناکسی ماندر کے خیالات کو ہی منعکس کرتا ہے۔

یہ نقشہ دنیا کو چار حصوں میں صفائی سے تقسیم کی ہوئی ایک ڈسک کے طور پر دکھاتا ہے جس کے گرد سمندر بہہ رہا ہے۔ ہیروڈوٹس نے اس نقشے کو مسترد کر دیا لیکن جب بھی ضرورت پڑی ہیکاٹیئس سے ضرور رجوع کیا۔ ہیروڈوٹس کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ اس نے تن تنہا ہی "تاریخ" ایجاد کی۔ ہم اسے ہیکاٹیئس کو اہمیت نہ دینے کا مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

البتہ ہیکاٹیئس کے حوالے سے ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ اس نے اپنی ایک تحریر کے آغاز میں مندرجہ ذیل جملہ لکھا: "میں نے یہاں جو کچھ لکھا ہے وہ میرے یقین کے مطابق سچائی ہے۔ اہل یونان بہت سی کہانیاں سناتے ہیں جو میرے خیال میں لغو ہیں۔" یہ جملہ تنقیدی سوچ رکھنے والے ایک مورخ کا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بھی اپنے بارے میں خوش اعتقادی سے عاری نہ تھا۔ اس کے ہم عصر فلسفی ہیراکلیتس نے ہیکاٹیئس کی مثال ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کی جس نے دکھا دیا کہ علم وفضل کے لیے ذہانت لازمی نہیں۔ تاہم، برتری کے خواہشمند ہیراکلیتس نے ہیروڈوٹس کے بارے میں ایسا نہ کہا۔

ہیروڈوٹس تقریباً 484 قبل مسیح میں جنم لینے والا ایک ایشیائی یونانی تھا۔ اس کا آبائی وطن ہالی کارناسس آئیونیا میں کیریا (موجودہ ترکی میں Bodrum) تھا۔ اس کے رزمیہ شاعر چچا پانیاسس کی نظم ہیراکلیا (جواب کھو چکی ہے) کا مقابلہ کبھی ہومر کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہیروڈوٹس نے اپنے کچھ خیالات چچا سے حاصل کیے ہوں گے۔ ہالی کارناسس یونانی اور فارسی سلطنت کے درمیان واقع تھا۔ ہیروڈوٹس کی پیدائش کے وقت یہ علاقہ سلطنت فارس میں شامل تھا۔ چنانچہ وہ اپنے لکھے ہوئے کچھ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ پایا۔ یقیناً اس نے ایک فارسی ("دشمن") بحری بیڑے کو روانہ ہوتے اور لوٹتے دیکھا۔ وہ اپنی "تاریخ" کا آغاز یوں کرتا ہے:

> "یہ ہالی کارناسس کے ہیروڈوٹس کی تحقیقات ہیں جو اس نے انسانوں کے کارناموں کو فراموشی سے بچانے اور یونانیوں و بربریوں کے قابل ذکر و عظیم کاموں کو جائز مقام دینے کے علاوہ ان کے جھگڑے کی وجوہ بھی بتانے کی غرض سے شائع کی ہیں (بربریوں سے مراد تمام غیر یونانی ہیں)۔"

پانیاسس ہالی کارناسس کے فرمانروا لائیگد اس کی بپا کی ہوئی ایک شورش میں قتل ہو گیا۔ لائیگد اس اہل فارس کی طرف سے شہر کا حکمران تھا۔ خود ہیروڈوٹس کو بھی قریبی جزیرہ ساموس پر جانا پڑا۔ 354 میں جب لائیگد اس کا تختہ الٹا گیا اور ہالی کارناسس دوبارہ یونانیوں کو ملا تو اس کی واپسی ممکن ہوئی۔ تاہم، وہ وہاں زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکا ہو گا کیونکہ تقریباً دس برس بعد جب وہ نئی قائم کی گئی یونانی کالونی تھوری (Thurii اٹلی میں ترنتم کے نزدیک) میں مقیم ہوا تو ایک مشہور سیاح بن چکا تھا۔ اس نے 354 سے پہلے تک کافی سفر کیا ہو گا۔ "تاریخ" کا آغاز اس نے غالباً 443 میں Thurii کے مقام پر کیا۔ یہ کتاب بیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی (کچھ کے خیال میں یہ نامکمل ہے) اور وہ اندازاً 420 ق م میں پیلا (Pella) یا پھر قرین قیاس طور پر تھوری میں ہی وفات پا گیا۔ 425 میں ڈرامہ نگار ارسٹوفینز نے اس کا مضحکہ اڑایا؛ لیکن جواب میں سقراط سمیت ہر ایک نے ارسٹوفینز کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔

443 ق م تک ہیروڈوٹس نے ایتھنز میں لیکچر دینے کے ساتھ ساتھ مصر، فلسطین، شام، بابل، مقدونیہ اور غالباً جزیرہ کریٹ بھی دیکھ لیا تھا۔ بول کر سنانے کے لیے لکھی گئی اور دو حصوں میں تقسیم "تاریخ" کو بعد ازاں سکندریہ کے ایک عالم نے نو حصوں میں تقسیم کیا۔ چونکہ کتاب کا مقصد بحیثیت مجموعی یونانی فارسی جنگ کے ماخذ کو کھوجنا ہے، اس لیے پہلے پانچ حصے صرف میراتھن کی جنگ (490) پر منتج ہونے والے واقعات کے بیان پر ہی مشتمل ہیں۔ اس جنگ میں یونانیوں نے فارسیوں کی کہیں بڑی فوج کو شکست دی۔

ہیروڈوٹس نیم داستانی جنگ ٹروجن سے آغاز کرتا اور پھر 560 اور 546 کے دوران لیڈیا کے بادشاہ کروسس کی کہانی تفصیل سے بتاتا ہے۔ میراتھن کا ذکر چھٹی کتاب میں ہی آتا ہے۔ نکتہ عروج ساتویں تا نویں حصوں میں اس وقت آتا ہے جب فارس کا زرکسیز (قیصر) یونانیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع بنانے کی خاطر لشکر کشی کرتا ہے (480 ق م)۔ ہیروڈوٹس نے سائرس کی بری و بحری فوج کی تعداد بتانے میں مبالغہ سے کام لیا۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ فوج 12,50,000 سپاہیوں اور 1,200 جہازوں پر مشتمل تھی۔ لیکن حقیقت میں فارسیوں کی تعداد

اہل یونان کے مقابلہ میں بہت زیادہ نہ تھی (40,000 سپاہی اور 400 جہاز)۔ اس کے خیال میں فارس نے یونان کو تشکیل دے کر تاریخ میں اپنا کردار ادا کیا: یونانیوں کو مطیع بنانے کی خواہش کے ذریعہ فارسیوں نے انھیں ایتھنز کی زیر قیادت متحد کر دیا۔

چونکہ یونانیوں نے ہیروڈوٹس کی زندگی میں ہی باہم لڑنا شروع کر دیا تھا، لہٰذا اس کا نکتۂ نظر جلد ہی پرانا لگنے لگا۔ فارسی جنگوں کے بعد یونانیوں کے درمیان حقیقی اتحاد کا کوئی نظریہ موجود نہ رہا۔ چنانچہ کہیں سکندر کے دور میں آ کر ہی ہیروڈوٹس دوبارہ قابل تقلید بنا۔

ہیروڈوٹس پر تنقید کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ کو علم جغرافیہ سے علیحدہ نہیں کر سکا۔ لیکن کیا ان دونوں میں امتیاز کرنا لازمی ہے؟ اس نے ہمیں اپنے دور کی دنیا کی اولین مکمل تصویر پیش کی اور وہ اہل فارس کے متعلق اس قدر معروضی نکتۂ نظر رکھتا تھا کہ پلوٹارک نے اسے ''بربریوں کا دوست'' قرار دے ڈالا۔ وہ یہ تفہیم حاصل کرنے والا پہلا مصنف تھا کہ نکتہ ہائے نظر میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ایک معاشرے کی نظر میں بری چیز دوسرے معاشرے کی نظر میں اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ یونانی شاعر پنِدار کے اس قول کی حمایت کرتا ہے کہ ''سب پر روایت حکمران ہے۔''

ہیروڈوٹس نے پہلی مرتبہ نثر کے کمالات کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس نے اپنے اوپر ہومر اور ہیکاٹیس کے اثرات کو باہم ملانے کی کوشش کی۔ ''تاریخ'' بیان کرنے کے دوران شامل کردہ ہومری تقاریر افسانوی، آرٹسٹک اور بیک گراؤنڈ سمجھانے کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ وہ ہیکاٹیس کے ہاں ملنے والے قابل تعریف احساس تجسس سے بھی تحریک یافتہ ہے۔

غیر متنازعہ طور پر بڑے مصنفین کی طرح اس کے جانشینوں نے بھی اس کی کئی تفاسیر کیں۔ ایتھنی امیر البحر تھیوسی ڈائیڈز نے ہیروڈوٹس کو بطور مورخ تسلیم کیا: لیکن اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ پلوٹارک نے ہیروڈوٹس کو روایت سے منحرف اور جانبدار خیال کیا۔ البتہ پلوٹارک اس کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔ حالانکہ وہ ہیروڈوٹس سے 500 برس بعد کا ہے۔ یونانی طرب نگار لوسیان (Lucian) کے خیال میں وہ جھوٹا ہے...... لیکن اس نے خود کو سچا ثابت کر دکھایا۔ ہیروڈوٹس نے مغربی لوک ریت میں ققنس (فینکس) کو متعارف کروایا، مگر ساتھ ہی

یہ بھی کہہ دیا کہ ''میں نے خود اس پرندے کی صرف تصویر ہی دیکھی ہے۔'' بالعموم وہ سب سے پہلے مشاہدے اور پھر زبانی روایات کی بنیاد پر بات کرتا ہے۔ فارس کے سائرس کے متعلق بتاتے ہوئے اس نے لکھا: ''میں تین بیانات دے سکتا ہوں...... لیکن یہاں صرف انھی فارسی کتب کی بنیاد پر بیان دوں گا جو کامل سچائی کو بلا مبالغہ پیش کرتی ہیں۔''

ہیروڈوٹس مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا تھا اور اس وجہ سے اس پر کافی تنقید بھی کی جاتی ہے۔ لیڈیا کا بادشاہ کروسس اس کا ہیرو ہے لیکن وہ بھی مکافاتِ عمل کا شکار ہوا۔ لیکن کیا یہ نکتۂ نظر واقعی اتنا غلط اور غیر تاریخی ہے؟ یا کیا اہل یونان انسانی زندگی میں تقدیر کے کردار کے حوالے سے اپنے نکتۂ نظر میں درست تھے؟ ہیروڈوٹس کا یہ نظریہ ابھی تک جھٹلایا نہیں جا سکا کہ تاریخ کو مخصوص افراد نے الوہی قوانین کے تحت بنایا ہے...... البتہ اسے نظر انداز ضرور کر دیا گیا۔

ہیروڈوٹس کا سب سے زیادہ مثالی پہلو اس کی انسانیت پسندی، بردباری اور غیر متعصب پن ہے۔ اس کے قدیم اور جدید دونوں قارئین نے ایک سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ وہ اس میں ٹریجک احساس ڈھونڈتے رہے، اور وہ ''اعلیٰ ترین سنجیدگی'' بھی جو میتھیو آرنلڈ کو جیفری چوسر کے ہاں نہ ملی۔ اس لحاظ سے ہیروڈوٹس کا موازنہ موزارٹ (موتسارٹ) کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موزارٹ میں اس قدر سحر اور خوبصورتی تھی کہ زندگی کے بارے میں اس کے مجنونانہ نظریہ کو طویل عرصہ تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ہیروڈوٹس کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ''تاریخ'' بحیثیت مجموعی ایک اداس اور گہرا سرگتی ہے۔ وہ ہرگز ایک ''سچا'' محب وطن نظر نہیں آتا۔ وہ جانتا تھا کہ یونانی انداز حیات میں سے بہت کچھ آئندہ آنے والی نسلوں کی نظر میں قابل قدر ہو گا، لیکن اس میں ''بربریوں'' کو سراہنے کی ہمت بھی تھی۔ سوفوکلیز اور ایسکائی لس کی طرح وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انسانی خواہشات اور امنگیں ایک قسم کی تقدیر کے تابع ہوتی ہیں...... اور انسان شاذ و نادر ہی اس تقدیر کی تفہیم کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس کی تحریر آج بھی 425 ق۔م جتنی ہی شگفتہ اور تازہ ہے۔

12

ری پبلک

"The Republic"

افلاطون

انداز اً 380ق۔م

فلسفی ایلفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ نے کہا تھا کہ فلسفہ کی حیثیت ''افلاطون کے حواشی'' سے زیادہ نہیں۔ یہ بات بالکل ٹھیک نہیں، لیکن اس کے خلاف دلیل بازی کرنا مشکل ہے۔ افلاطون کسی بھی اور فلسفی کی نسبت زیادہ حد تک تمام لوگوں کے لیے ''سب کچھ'' رہا ہے۔ اسے دنیا کا سب سے پہلا منطقی فلسفی قرار دیا جاتا ہے، اگرچہ عمومی خیال ہے کہ سقراط (469 تا 399ق م)

......جس نے کچھ بھی نہ لکھا...... کے افکار افلاطون کے خیالات کا منبع بنے۔ افلاطون کے مکالمات میں افلاطون کا نکتہ نظر بیان کرنے کے لیے ہمیشہ سقراط سے کام لیا جاتا ہے۔ اور افلاطون سے پہلے کے فلسفیوں کو ''ماقبل افلاطون'' کی بجائے ''ماقبل سقراط'' کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا گمراہ کن ہے۔ افلاطون نے متعدد فلسفیوں، بالخصوص تھیلس، پارمینائیڈز اور ہیراکلیٹس سے کافی کچھ سیکھا تھا اور یہ سب اس سے پہلے کے تھے۔ ارسطو اور افلاطون کے ہاں ان کا اثر موجود ہے۔

اگرچہ افلاطون ایک منطقی فلسفی تھا، لیکن وہ گہرائی میں ایک صوفی تھا۔ ارسطو کے ساتھ ایسا معاملہ نظر نہیں آتا۔ افلاطون ارسطو کا استاد اور پیش رو تھا۔ افلاطون کی تمام کتابوں میں سے ''ری پبلک'' سب سے زیادہ متاثر کن رہی ہے۔

افلاطون کی تحریر میں ملنے والا سقراط ایک افسانوی شخصیت ہے...... بدصورت، سحر انگیز، شہوانی، ایک گفتگو کا ماہر۔ وہ افلاطون کے تحریر کردہ ڈراموں (یا ''مکالمات'') میں مرکزی کردار ہے۔ اس بارے میں بہت بحث مباحثہ ہوا کہ افلاطون کے سقراط اور حقیقی سقراط میں کس حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، تاہم، ان میں قریبی مماثلت موجود ہونا قابل فہم ہے۔

افلاطون نے ''جمہوریت'' کے خلاف اپنے تعصب کے باعث بیسویں صدی کے بہت سے مفکرین کو الجھن میں ڈالے رکھا (یونانی جمہوریت میں غلاموں یا عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی)۔ افلاطون نے غالباً اس وجہ سے جمہوریت کو ناپسند کیا کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے اصل صورت حال کا مشاہدہ کیا تھا۔ اسے پیریکلیز پسند نہیں تھا: اور بلاشبہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایتھنز پر پیریکلیز کی طویل حکومت کے دوران کیا کچھ ہوتا رہا۔ بہرکیف افلاطون نے ''تیس'' کی حکومت کی مذمت کی۔ یہ تیس حکمران 404ق۔م میں ایتھنز پر حکومت کر رہے تھے۔ اس وقت افلاطون کی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی جب اس کے محترم دوست سقراط کو ''لامذہبیت پھیلانے'' اور ''نوجوانوں کو گمراہ کرنے'' کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی (حالانکہ سقراط تو انہیں جہالت سے نکال رہا تھا)۔ اور یہ سب کچھ 399 میں ایک جمہوری حکومت کے دور میں ہوا۔ افلاطون سقراط کے کچھ دیگر مایوس اور ناراض حامیوں کے ہمراہ میگارا (Megara) اور

وہاں سے اٹلی اور سسلی چلا گیا۔ لیکن 385 میں، جب اس کی عمر 45 برس تھی، اس نے اکادمی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ اکادمی ایتھنز کے نواح میں ہیرو اکاڈیمس سے منسوب ایک کنج تھا۔ یوں دنیا کی پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی۔

لیکن افلاطون کی خارجی زندگی محض ایک استاد کی زندگی جیسی جامد نہیں تھی۔ اسے مزید ایڈونچر کرنا تھے۔ 387 میں اس نے نہ صرف باطنیت پسند فیثا غورثی آرکیٹاس (Archytas of Tarentum) بلکہ سائرا کیوس کے بادشاہ ڈائیونیسس کے سالے اور داماد ڈائیون (Dion of Syracuse) کے ساتھ بھی دوستی قائم کر لی تھی۔

سقراط

اکادمی میں مرکزی استاد کے طور پر افلاطون کی سیاسی حیثیت جانی مانی تھی: حکمرانوں کے فلسفی یا فلسفیوں کے حکمران بن جانے تک شہروں کا مقدر تاریک ہی تھا۔ ''دی ری پبلک'' کا تعلق اسی نکتہ نظر سے ہے: ایک فلسفی بادشاہ کی باقاعدہ حکومت۔ لیکن افلاطون نے سائرا کیوس کو مستثنیٰ قرار دیا، اور اس بات نے اس کی شہرت کو نقصان پہنچایا۔ بیسویں صدی کے کچھ نقادوں نے تو اسے ''پہلا فاشسٹ'' بھی کہا۔ جدید دور میں اس پر موثر ترین اعتراض کارل پوپر کی "The Open Society and Its Enemies" میں کیا گیا۔ ہمیں کہنا پڑے گا کہ کارل پوپر ایک حس مزاح سے عاری آدمی تھا...... جبکہ سقراط کی طرح افلاطون بھی شدید طنزیہ انداز رکھتا تھا۔

تقریباً 389 میں Dion افلاطون کے نظریہ ''فلسفی بادشاہ'' کے سحر میں گرفتار ہوا۔ ایک امیر البحر اور قابل بھروسہ ریاست کار کے طور پر Dion اپنے سسر ڈایونی سیئس اول کے دربار

میں خاصا اثر ورسوخ رکھتا تھا۔ 367 میں جب اس کا ناتواں اور غیر مستقل مزاج بیٹا ڈایونی سیئس دوم تخت پر بیٹھا تو Dion نے اسے برطرف کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ مگر اس کی بجائے اس نے افلاطونی نظریات کی مطابقت میں ایک ری پبلک قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ ہمیں افلاطون کی ری پبلک کی تاریخ معلوم نہیں (380 اور 370 ق م کے دوران)۔ ہم بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ افلاطون نے اسے اپنے ''وسطی دور'' میں ہی لکھا تھا۔

یہ ایک عملی تجربہ کی پہلی (اور غالباً آخری) تاریخی مثال ہے جس میں فلسفہ کے اعلیٰ ترین مثالی تصورات کو عملی سیاست کی کسوٹی پر جانچا گیا۔ افلاطون کی طرح Dion بھی جمہوریت کی یونانی طرز سے نفرت کرتا تھا: اس نے سائرا کیوس میں ایک افلاطونی آئین نافذ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ''دی ری پبلک'' پڑھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سائرا کیوس کے شہری اس قسم کے آئین کی ہرگز حمایت نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس نے شہریوں کے ہی مفاد میں یہ آئین لاگو کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ اور افلاطون شہریوں کی نسبت زیادہ کچھ جانتے تھے۔ لیکن لوگوں کو یہ جاننے میں دلچسپی نہ تھی کہ ان کا فائدہ کس بات میں ہے۔

یہاں آپ کو ایک امر سے خبردار کرتے چلیں: افلاطون جدید مغربی دنیا والی ایک فرد ایک ووٹ والی جمہوریتوں کا دشمن نہیں تھا جن میں حکومتیں ''منصفانہ'' طور پر منتخب کی جاتی ہیں (لیکن ژاں پال سارتر کے بقول انتخابات ''احمقوں کے پھندے'' ہیں)۔ افلاطون اور اس کا شاگرد Dion صرف اس قسم کی ''جمہوری'' حکومتوں کے بارے میں جانتے تھے جس میں سقراط کو سزائے موت دی گئی۔ کسی جدید جمہوریہ کو دیکھ کر افلاطون حیران رہ جاتا۔ وہ اس نظام پر تنقید کرتا جس میں حکومتیں صرف غیر مقبول اور معزول ہو جانے کے خوف سے درست اقدام بھی نہیں کرتیں۔ اس نے یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ ہر کوئی ہر موقع پر ایک ہی جتنا دانا ہوتا ہے۔

Dion نے مخلصانہ طور پر محسوس کیا کہ نوجوان بادشاہ کو اس آدمی سے ملاقات کرنی چاہیے جو اسے بتا سکے کہ ایک فرمانروا کی حیثیت میں اپنی طاقت کو لوگوں کے مفادات میں کس طرح محدود رکھنا ہے۔ اور 367 ق م میں سائرا کیوس کا سفر کرتا ہوا 62 سالہ افلاطون بمشکل ہی غلطی پر ہو سکتا تھا: یہاں فلسفی بننے کا خواہشمند ایک بادشاہ موجود تھا۔ آخر اکادمی کا مقصد بھی تو لوگوں کو

فلسفی بادشاہ بننے کی ہی تربیت دینا تھا!

مگر کیا افلاطون دانا کم اور اولوالعزم زیادہ تھا۔ ہر معاملے میں افلاطون کے زبردست وکیل اے ای ٹیلر نے اس خیال کو مسترد کیا کہ وہ "سب سے زیادہ پر تعیش یونانی شہر میں دی ری پبلک کے خیالی شہر کی نقل قائم کرنا چاہتا تھا۔" لیکن افلاطون جیسے آدمی کو بھی اس خوفناک نقص سے مبرا کیوں سمجھا جائے! اس سے پہلے کے تمام یونانی شاعروں...... ایسکائی لس، سوفوکلیز، یوری پیڈیز...... نے انسانی کردار کی کھوج اسی قسم کے نقص کے حوالے سے کی۔ تاہم، افلاطون کے مثالی شہر میں تمام شاعری پر پابندی ہے۔

افلاطون نے ڈایونی سیس کو جیومیٹری پڑھانا شروع کی اور مختصر عرصہ کے لیے اس کے دربار میں جیومیٹری رواج بن گئی۔ لیکن نوجوان بادشاہ، جو خود بھی مستقبل کا شاعر اور فلسفی تھا، جلد ہی Dion اور افلاطون کی دوستی سے حسد کرنے لگا۔ اس نے Dion کو دیس نکالا دے دیا، اور افلاطون کو اپنے پاس ہی رکھنے کی ناکام کوشش کی مگر وہ واپس ایتھنز آ گیا۔

اب Dion اکادمی میں آیا۔ افلاطون نے سابق وزیر اور اس کے حکمران کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈایونی سیس نے سائراکیوس میں Dion کی ساری جائیداد ضبط کر لی اور حتیٰ کہ اس کی بیوی Areto کو کسی اور کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا۔ تاہم، اس کم مائیگی کے باوجود افلاطون کو 361 میں واپس سائراکیوس جانے کی طلب ہوئی۔ یہ اس کا تیسرا دورہ تھا۔ لیکن بادشاہ یا اس کے باڈی گارڈز نے اس قدر جارحیت کا مظاہرہ کیا کہ وہ اپنے پرانے دوست Archytas کی مدد سے ہی بچ کر واپس ایتھنز جانے کے قابل ہو سکا۔ یوں اس کہانی میں اس کا کردار تقریباً ختم ہو گیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ Dion کی موت میں وہ بھی ایک پارٹی رہا ہو گا۔ ایک محقق کے مطابق "Dion کو ایسے لوگوں نے قتل کیا جن کا افلاطون کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق نظر آتا ہے۔"

357 ق۔م میں Dion نے سائراکیوس پر قبضہ کر کے اس کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ افلاطون نے اپنے خطوط میں (اگر وہ واقعی اس کے ہیں) اسے مبارک دی اور ساتھ ہی اس کے غرور سے خبردار بھی کیا۔ آگے چل کر Dion غیر مقبول ہو گیا: افلاطونی بنیادوں پر جمہوریت کے

ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر وہ ایک سابق حلیف کے قتل میں پارٹی بنا۔

یہ ایڈونچر "دی ری پبلک" کا پس منظر تشکیل دیتا ہے۔ اور ایڈونچر میں متوقع فلسفی محض عام سیاست دانوں اور قاتلوں جیسے نظر آتے ہیں۔ کیا اس سارے معاملے کے کھنڈرات "دی ری پبلک" میں بھی موجود ہیں؟ کیا ہیگل اور افلاطون کی طرح افلاطون بھی ریاست کے مفادات کی خاطر فرد کو دم گھونٹ کر مارنے کا ملزم تھا؟ کیا "ری پبلک" اوپن سوسائٹی کی ایک دشمن ہے؟

افلاطون بحیثیت مجموعی عوام اور ریاست کو فرد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے...... فرد کے لیے لازمی ہے کہ وہ ریاست کے مقاصد کو مطلق سمجھے۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اسے ایک غلطی خیال کیا: وہ نشاندہی کرتا ہے کہ معاشرے کے ارکان کی بہبود سے چشم پوشی کر کے معاشرے کی فلاح کی بات کرنا بے معنی ہے۔ لیکن کیا افلاطون نے ایسا سمجھتے بوجھتے ہوئے کیا؟

"دی ری پبلک" اصل میں یونانی عنوان "Politea" کا غلط ترجمہ ہے۔ اس کا زیادہ موزوں ترجمہ یہ ہونا چاہیے: "کمیونٹیز کی موزوں عوامی اور سیاسی زندگی۔" یہ کتاب اہل نظر افراد کے درمیان مکالمے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ میں نے اسے ایک مقالے کی بجائے طربیہ اور عقلی کھیل (نہ کہ ڈرامہ) کے طور پر پڑھا۔ اس میں بہت سے "کردار" موجود ہیں۔ دس حصوں پر مشتمل یہ کتاب اوسط سائز کے تین ناولوں کے برابر ہے...... اور اس میں پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کی دنیا کو درپیش زیادہ تر مسائل پر بات کی گئی ہے۔ یہ مسائل آج بھی موجود ہیں۔

دوسرے حصے سے پہلے دلائل نہیں دیے گئے، البتہ ابتدائیہ بحیثیت مجموعی کتاب کے لیے موزوں ہے۔ سقراط، گلاکس، پولی مارکس اور دیگر افراد پائریکس میں دیوی Bendis کے تہوار میں شرکت کرنے جاتے ہیں۔ وہ انصاف کے مفہوم پر گفتگو کے ساتھ آغاز کرتے ہیں اور پولی مارکس انصاف کی ایک تعریف پیش کرتا ہے جو چھٹی صدی قبل مسیح کے ایک شاعر اور ولی سیموناڈیز نے کی تھی۔ سقراط جلد ہی اس تعریف پر تنقید کرتا اور اسے روایتی اور غیر منطقی ثابت کر دیتا ہے۔

دی ری پبلک بحیثیت مجموعی اتنی گنجلک ہے کہ ہم یہاں مختصراً اس پر بات نہیں کر سکتے۔ اس کی

تشریح کے لیے بہت سی کتب لکھی گئیں اور ان میں نہایت مختلف نتائج اخذ کیے گئے۔ آیئے مرکزی اور مشہور ترین دلائل پر بات کرتے ہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ مثالی شہری ریاست خصوصی طور پر تعلیم یافتہ افراد (محافظوں) کی زیر نگرانی ہونی چاہیے۔ محافظوں کے کام میں معاونت کرنے کے لیے دو دیگر طبقات "معاونین" اور کسان و ہنر مند ہیں۔ محافظوں اور ان کے معاونین اور سپاہیوں کو کیمپوں میں رہنا چاہیے۔

محافظ لوگ شبیہوں (Form...... اشکال، صورتوں) کی تفہیم رکھتے ہیں۔ بعد کے فلسفے کو زبردست انداز میں متاثر کرنے والا نظریہ اشکال افلاطون کی مشہور "غار کی تمثیل" میں بیان کیا گیا ہے۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ انسانوں کو ایک غار میں مکین تصور کریں جنہیں غار کے دہانے کی طرف پشت کرا کے پابہ سلاسل کیا گیا ہے۔ راستے کے ساتھ ساتھ بنائی گئی ایک دیوار نے گزرنے والے لوگوں کو نظر سے اوجھل کر رکھا ہے۔ تاہم، آگ کی روشنی راہگیروں کے سروں پر رکھی چیزوں کا سایہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ سائے ہم غار میں رہنے والوں کے لیے حقیقت کا واحد نظارہ ہیں۔ چیزوں کو حقیقت میں دیکھنے کے لیے آزاد کیے جانے پر ہم تکلیف اور اذیت کا سامنا کرتے ہیں...... اور غار میں واپس آنے پر ہر کوئی ہم پر ہنستا اور ہماری کہانی پر یقین کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس تمثیل سے مراد یہ ہے کہ معروضی معیار وجود رکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی کامل Genuine دائرہ حواس کے لیے وجود نہیں رکھتا: صرف کامل دائرہ، "دائرے کا تصور" موجود ہے جو صرف ذہن کو اپیل کر سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ بھی موضوعی یا من مانا نہیں ہو سکتا: ایک حقیقت موجود ہے جس سے ہم اپیل کر سکتے ہیں...... یوں افلاطون نے "نسبتی سچائی (Relative Truth) کے نظریہ کو جھٹلایا۔

افلاطون کے "محافظوں" کو موزوں تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ حقیقت سے آگاہ ہوں اور درست طریقے سے حکومت کریں۔ تاہم، افلاطون کہتا ہے کہ کسی جمہوریہ میں (جس میں لوگ حکومت چلاتے ہیں) غیر درست حکومت ہوگی کیونکہ بہت سے لوگ حقیقت کی تفہیم نہیں رکھتے۔

"اشکال" (یا اعیان / Ideas) کو بنیاد بناتے ہوئے افلاطون نے بھی ہر قسم کی "نقل باز شاعری" کو ممنوع قرار دیا جس میں ہومر بھی شامل تھا۔ "سقراط" ہومر کے لیے ایک ذاتی احترام

کا اظہار کرتا مگر ایک سچ گو کے طور پر اسے اہمیت نہیں دیتا۔ افلاطون مثال پیش کرتا ہے کہ تین قسم کے پلنگ موجود ہیں" خدا کا پلنگ جو کامل اور حقیقی پلنگ ہے، ہنر مند کا مخصوص پلنگ جو خدا کے پلنگ کی نقل ہے، اور تیسرا پلنگ پینٹر کا ہے جو ہنر مند کے پلنگ کی نقل ہے۔ چنانچہ "شاعرانہ سچ" گمراہ کن اور غلط ہے: یہ محض ایک نقل کی نقل ہے!

نیز شاعر کے ہاں حقیقت کا کمتر روپ نہ صرف جھوٹا بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔ (ایتھنز کا ایک ابتدائی حکمران) سولون ایک اچھا قانون دہندہ تھا، لیکن کیا کوئی بھی شاعر اس جیسا ہوا ہے؟ "لہٰذا اگر ہومر لوگوں کو پاکباز بننے میں حقیقی مدد دینے کے قابل ہوتا تو کیا اس کے ہم عصر یہ اجازت دیتے کہ وہ اِدھر اُدھر گھوم کر اپنے گیت گاتا پھرے؟ کیا وہ اسے ایک نادر شے نہ سمجھتے اور یہ نہ کہتے کہ وہ ان ساتھ چل کر رہے؟...... نہیں، شاعر محض نقال ہیں...... وہ سچائی بیان نہیں کرتے۔" افلاطون کا سقراط کہتا ہے کہ شاعری حقیقی حسن سے عاری ایک عمر رسیدہ چہرے جیسی ہے۔

اس سب نے افلاطون کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس کے "محافظ" بے روح آمروں جیسے لگتے ہیں۔ وہ باقی سب کے مقابلہ میں زیادہ کچھ جانتے اور ہمیں شاعری اور حتیٰ کہ موسیقی کی مسرتوں سے حظ اٹھانے سے روکتے ہیں۔

لیکن افلاطون کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ وہ اپنے کھیل میں دراصل کامل ریاست کی بات کر رہا ہے: دی ری پبلک سب سے پہلی یوٹوپیا ہے۔ یوٹوپیا یعنی کامل بادشاہت میں شاعری (یا کم از کم وہ شاعری جس کے بارے میں افلاطون بات کرتا ہے) غیر ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہومر اور اس کے بعد سے کی گئی تمام شاعری دنیا میں شر کی موجودگی کا نتیجہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی ری پبلک میں صرف چند منتخب آرٹس کی ہی اجازت ہوگی۔ یہ ساری سکیم عملی اعتبار سے ناکام تھی۔ لوگ اس قسم کی حکمت عملی کو اختیار نہیں کرتے۔

دنیا کی کتابوں میں دی ری پبلک کی اعلیٰ حیثیت کے باعث اس میں عملی پہلو کے فقدان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اگر ہم زمین پر جنت بنانے کا سوچیں تو دی ری پبلک سے کچھ تصورات مستعار لینا پڑیں گے۔ افلاطون کا مطمع نظر بھی یہی تھا۔ وہ اپنی کتاب میں اس امر کے

حوالے سے غور نہیں کر سکتا تھا کہ ہنر مند جلد ہی ''محافظوں'' اور ان کے اہلکاروں کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ زمین پر جنت تبھی ممکن ہوگی جب ہر کوئی مطمئن اور صاحب فکر ہو۔

دی ری پبلک کا سب سے پہلا اثر خود افلاطون پر پڑا جس نے سازشوں میں ہزیمت اٹھائی۔ لیکن کسی ملک پر حکومت کرنے کی کوشش کرنے والے کسی بھی مفکر یا دانشور کے انجام پر غور کریں۔ سٹالن، ہٹلر اور دیگر نفرت انگیز آمر افلاطون کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ٹراٹسکی ایک ادبی شخص کے طور پر یہ فہم رکھتا تھا۔ مگر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے افلاطون کھڑا تھا؟ مجھے اس پر شک ہے۔ سیاستدان طاقت کے متلاشی ہوتے ہیں اور تھوڑی سی طاقت بھی انہیں خراب کر دیتی ہے۔ وہ چیزوں کو ممکن بنانے کے عمل میں مصروف ہوتے ہی فلسفہ اور دانش کو بھول کر کچھ Dion کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔

جہاں تک افلاطون کا تعلق ہے تو اس نے نظر ثانی بھی کی۔ سیاست کے متعلق اپنی بعد کی تحریروں میں وہ خیال کا اظہار کرتا ہے کہ یوٹوپیا کی جستجو کا مقدر ناکامی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ افلاطون کے ساتھ انصاف کریں اور صرف ری پبلک نہیں بلکہ اس کی دوسری تحریروں کا بھی مطالعہ کریں۔

13

عناصر

"Elements"

یوکلید

اندازاً 280 قبل مسیح

یوکلید کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ بادشاہ ٹولمی اول (306 تا 283 ق م) کے دور میں سکندریہ میں رہتا اور پڑھاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شفیق، خوش خلق اور صاف گو تھا اور اسے اپنی پڑھائی ہوئی جیومیٹری کی عملی اہمیت سے شدید نفرت تھی۔ اس کی کچھ تحریریں کھو گئی ہیں۔ ہم تک پہنچنے والی تحریروں میں سب سے زیادہ قابل ذکر Elements تیرہ کتب پر مشتمل

ہے: کتاب نمبر 1 تا 6 سادہ جیومیٹری، اور کتاب نمبر 7 تا 9 نظریہ اعداد کے بارے میں، جبکہ کتاب نمبر 11 تا 13 (جو غالباً اس نے نہیں لکھی تھیں) غیر منطقی اعداد کے بارے میں ہیں۔ پہلی کتاب کی قابل قدر شرح لکھنے والا پروکلس بتاتا ہے کہ وہ "افلاطون کا پیروکار" تھا، لیکن یہ امر یقینی نہیں۔

یوکلید کا اثر بہت زبردست رہا ہے۔ اور بلاشبہ گزشتہ صدی کے نوجوان بھی اس کے پیش کردہ مسئلوں کو حل کرنے میں بہت مشکلات کا شکار ہوئے۔ ان طلبا کے لیے جیومیٹری کا مطلب "یوکلید" تھا۔ وہ اپنا موضوع خود بن گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک زیادہ لوگ QED یعنی (quod erat demonstrandum) سے واقف نہیں تھے۔ آج بھی سکولوں میں پڑھائی جانے والی جیومیٹری "ایلی منٹس" پر مشتمل ہے کیونکہ یوکلید کی جیومیٹری باقی جیومیٹریز کی نسبت زیادہ واضح ہے اور ہمیں اس پر زیادہ آسانی سے یقین بھی آجاتا ہے۔ بادشاہ ٹولمی اول نے جب "ایلی منٹس" کی طوالت اور مشکل پر اعتراض کیا (جیسا کہ میٹرک کرنے والا کوئی بھی طالب علم کرتا ہے) تو غالباً یوکلید نے جواب دیا کہ مصری جانب تو کوئی شاہی راستہ جاسکتا ہے لیکن جیومیٹری کی جانب نہیں۔ خشک موضوعات میں دلچسپی اور مزاح پیدا کرنے کے خواہش مند سکول ٹیچرز ایک دور میں اس قسم کی کہاوتیں بڑے شوق سے سنایا کرتے تھے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ یوکلید کوئی بلند پایہ یا حتیٰ کہ اوریجنل ریاضی دان نہیں تھا: اپنے تقریباً ہم عصر ارشمیدس کے مقابلے میں اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ محض اپنے بہت سے ذرائع سے اچھی طرح واقف تھا: Theaetetus، بقراط آف کیاس، یودوکسس (Eudoxus) اور متعدد دیگر ...... ایلی منٹس میں بیان کردہ بہت سے تھیورم پہلے ہی معلوم کیے جاچکے تھے۔ ایک مشہور تھیورم فیثا غورث سے منسوب ہے۔ جس نے اسے دریافت کرنے پر بیل کی قربانی دی تھی۔ یہ مسئلہ یا تھیورم قائمۃ الزاویہ مثلث کے بارے میں ہے۔ لہٰذا یوکلید محض ایک تحریک یافتہ مولف تھا۔ لیکن وہ ایک کامل استاد بھی تھا، اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ سادہ جیومیٹری کے متعلق تھیورم اسی کی ایجاد ہیں۔ بیسویں صدی کے ایک عظیم ماہر ریاضی برٹرینڈ رسل نے لکھا: "آپ جیومیٹری کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں، یہ نظام اسی قدر قابل

تعریف لگنے لگتا ہے" اور ایلی منٹس "آج تک لکھی جانے والی عظیم ترین کتب میں سے ایک ہے۔" اس نے نشاندہی کی کہ Conic Projections[1] کے بارے میں یوکلید کا کام سترہویں صدی میں ایک دم "جنگ وجدل اور علم فلکیات کی کنجی بن گیا۔"

"ایلی منٹس" تقریباً 800 عیسوی میں عربی زبان میں ترجمہ کی گئی، لیکن 300 برس بعد (1120ء) میں اسے ایڈ لارڈ آف باتھ نے دوبارہ یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ موجودہ دور کا مستند متن 1814ء میں ویٹیکن لائبریری سے F-Peyrard کے دریافت کردہ مسودے پر مبنی ہے۔ ایلی منٹس کے ایک ہزار سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایڈلارڈ (Adelard) کو یہ کام سرانجام دینے کے لیے ایک مسلمان محقق کے بھیس میں چھپ جانا پڑا تھا۔ علم کے متلاشیوں کو ایذائیں دینے والے بیوروکریٹس ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ ان کبھی نہ مل سکنے والی لائنوں میں (جن کے متعلق ہم سب نے سکول میں پڑھا ہے) کیا کوئی چیز خلاف ایمان تھی؟

یوکلید اپنے واضح بالذات طریق کار کی وجہ سے نہایت متاثر کن نظر آتا ہے: ثبوت کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے اس کا استعمال کردہ انداز لوگوں پر اثر انداز ہوا حتیٰ کہ کچھ ایک کو تو یہاں تک یقین ہو گیا کہ اس قسم کے طریقے کی مدد سے کائنات کے متعلق بنیادی سچائیوں کا منظم اور اطمینان بخش مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ یوکلید کا سادہ پن اس کے خلاف نہیں جاتا۔ وہ تو محض دو جہتی چپٹی سپیس کی حدود کے اندر بے مول قیاسی استخراجی (Hypothetico deductive) طریقہ استعمال کر رہا تھا۔ وہ غیر ثابت شدہ مفروضوں کے ساتھ آغاز کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے مفروضے غلط تھے، لیکن یہ غلطی درست سمت میں تھی۔ یاد رہے کہ یوکلید کی زندگی میں ہی متشکک Pyrrho نے اصرار کیا تھا کہ اس قسم کی واضح بالذات سچائیاں ناقص یا بے وقعت ہیں۔ لیکن یوکلید کی متاثر کن کامیابی "تمام امور" میں منطقی قطعیت کے نمونہ کے طور پر موجود رہی ہیں۔ یوکلید کو اس کا الزام دینا جائز نہیں۔

چنانچہ یوکلید کی اہمیت صرف اسی وجہ سے نہیں کہ وہ دو ہزار سال کے دوران دنیا بھر کے سکولوں میں اسے پڑھایا جاتا رہا۔ تاہم، سادہ (Plane) جیومیٹری پڑھانے کے لیے اس کی کتاب کا

موزوں پن بلاشبہ اس کو مشہور کرنے کے لیے کافی ہے۔ ''ایلی منٹس'' غیر معمولی طور پر اطمینان بخش اور جاذب نظر ہے۔ خالصتاً مجرد استدلال پر انحصار نے جبر اان کا مطالعہ کرنے والے لڑکوں لڑکیوں کو گہرائی میں اپیل کیا...... نوجوانی کے دور میں وہ ہمیں اپنی استدلالی قابلیت پر مطمئن ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ درحقیقت فلسفہ اور نتیجتاً بحیثیت مجموعی دنیا سے متعلق رویوں پر اس کا اثر ریاضی پر اثر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

فلسفہ کے لیے ریاضی اہم ہے کیونکہ یہ علم کی نوعیت کا مظاہرہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے: یہ خالصتاً منطق اور غیر تجربی علم کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تجربہ ہمیں دو جمع تین کا نتیجہ پانچ اخذ کرنے کو کہتا ہے، لیکن ہمیں اس کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے لیبارٹری میں تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اگر دو جمع تین برابر ہیں پانچ تو کمرے میں دو بلیوں اور تین بلیوں کے گروپ موجود ہونے کا مطلب ہے کہ کمرے میں پانچ بلیاں ہیں۔ اعداد دو، تین اور پانچ محض بلیاں، یا سیب یا انگلیاں وغیرہ نہیں۔ وہ ''اعداد'' ہیں...... لیکن اعداد اصل میں ہیں کیا اور وہ کوئی وجود رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر ان کا وجود ہے تو یہ وجود کس قسم کا ہے؟ ان سوالات کے جواب نہیں دیے گئے...... لیکن افلاطون نے ان فلسفیانہ اعداد (جو آج بھی نہایت متنازعہ ہیں) کو اپنے اس نظریہ کی حمایت میں استعمال کیا کہ ایک ماورائے حیات دنیا موجود ہے جس تک رسائی صرف منطق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

صرف حسیاتی ادراک کے ذریعہ معلوم ہونے والی دنیا پر یقین رکھنے والے تجربیت پسند اس پر بہت چیں بہ جبیں ہوئے۔ اب ایک تھیوری ہے...... logistic theory ...... جو زور دیتی ہے کہ ریاضی محض کلیوں کا ایک مجموعہ ہے اور ہر کلیہ اپنے سے پہلے والے کلیے میں سے اخذ ہوا ہے۔

ایک زیادہ عام سطح پر کوئی شخص باطنیت کے بغیر منطق کو پسند کرتا ہے جب کہ کسی کو اس پر بھروسہ نہیں اور وہ ''اشکال'' کے ''آسمان'' کا حامی ہے۔ یہ کافی حد تک مزاج کا معاملہ ہے۔ لیکن اس سب کچھ کی بنیاد پر اس افلاطونیت پر یقین کرنے کی وجہ موجود ہے جو پروکلس نے یوکلید سے منسوب کی، کیونکہ افلاطون کو یوکلید پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ یوکلید مندرجہ ذیل طریقے

سے زیادہ چالاکی دکھا سکتا تھا: یوکلید اپنے مسلمات کو استرداد بہ ثبوت حماقت کے ذریعہ ''ثابت'' کرتا ہے...... یعنی کسی قضیے یا مسئلے کا اس کے منطقی نتائج تک پہنچنے سے ظاہر ہو جانے والی حماقت کی بنا پر استرداد/ (Reductio ad absurdum) چنانچہ وہ سادہ سے انداز میں اپنے پانچ قضیوں کو پیش کرتا ہے:

1۔ کسی نقطے سے دوسرے نقطے تک ایک سیدھی لائن کھینچنا؛ 2۔ ایک سید ھ میں متواتر محدود سیدھی لائن بنانا؛ 3۔ کسی بھی مرکز یا فاصلے سے دائرے کو بیان کرنا؛ 4۔ کہ تمام قائمہ زاویے ایک دوسرے کے برابر ہیں؛ اور 5 (جسے سمجھنا ذرا مشکل ہے) کہ اگر دو سیدھی لائنوں پر رکھی ہوئی ایک سیدھی لائن کے اندرونی زاویے ایک ہی طرف دو قائمہ زاویوں سے کم ہوں اور اگر انہیں لامحدود طور پر کھینچا جائے تو وہ اس سائیڈ یا طرف پر ملتے ہیں جہاں زاویے دو قائمہ زاویوں سے کم ہوں۔

یہ پانچواں قضیہ اصل میں یہ کہنے کا ایک دلچسپ طریقہ ہے کہ دو متوازی خطوط کبھی بھی آپس میں نہیں ملتے۔ اسے اس انداز میں کہنے کا مقصد ''نہیں ملتے'' کہنے سے گریز کرنا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے جان پلے فیئر نے یہی بات نسبتاً سادہ انداز میں کی۔ یہ قضیہ بہت سے یونانی ریاضی دانوں کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ وہ سب ہی اسے ثابت کرنے میں ناکام رہے۔

بعد ازاں، عرب ریاضی دانوں نے بھی اس کا تجزیہ کیا۔ کسی کو بھی کامیابی نہ ہوئی اور انہوں نے خود کو دلائل کے ایک چکر میں گھرا ہوا پایا۔ (رومانوی فلسفی شوپنہاور نے تو یوکلید کے قضیوں کو ''کٹر کیاں'' تک کہہ دیا)

☆ ترجمہ میں گڑبڑ سے بچنے کے لیے ہم اسے انگریزی میں بھی لکھ دیتے ہیں۔

"That, if a straight line falling on two straight lines make the interior angles on the same side less than two right angles, if produced infinitely, meet on that side on which are the angles less than two right angles."

اٹھارہویں صدی کے دوران ایک اطالوی ریاضی دان Saccheri نے رائے دی کہ کچھ قسم کی جیومیٹریز میں متوازی کا قضیہ درست نہیں۔ 1868ء میں Beltrami نے ثابت کیا کہ اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ تین دیگر ماہرین ریاضی، جوہان بولیائی، فریڈرک Gauss اور نکولائی لیو بچوسکی نے ایسی جیومیٹریز وضع کیں جن میں parallels کا وجود نہیں تھا۔ ان میں یوکلید کی جیومیٹری سے ''زیادہ سچائی'' نہیں، کیونکہ کوئی بھی جیومیٹری دوسری جیومیٹری سے زیادہ سچی نہیں ہو سکتی۔ بعد ازاں برن ہارڈ ریمان نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ تین جیومیٹریز موجود ہیں: یوکلیدی جیومیٹری جس میں مثلث کے زاویے مل کر 180 ڈگری بنتے ہیں، ریمان کی جیومیٹری جس میں زاویوں کا مجموعہ 180 ڈگری سے زیادہ ہے، اور Gauss کی Hyperbolic جیومیٹری جس میں زاویوں کا مجموعہ 180 ڈگری سے کم ہے۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ یوکلیدی مثلث زمین کی سطح کے حوالے سے محض ایک افسانہ ہے کیونکہ زمین ایک کرہ ہے۔

14

دھمپد

"The Dhammapada"

اندازاً 252 قبل مسیح

مہاتما بدھ موجودہ نیپال کے قریب ہندوستانی علاقے کے گوتم قبیلے میں پیدا ہوا (غالباً چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں)۔ اس کا نام سدھارتھ رکھا گیا جس کا مطلب ہے: ''جس نے مقصد حیات پا لیا ہو۔'' وہ مذاہب کے تمام بانیوں میں سب سے کم عقیدہ پرست (راسخ العقیدہ) تھا۔ اس کا بصیرت کا راستہ تجربی اور روزمرہ زندگی سے منسلک تھا: اسے عموماً درمیانہ یا معتدل راستہ کہتے ہیں...... بربط کو مؤثر طور پر بجانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تار زیادہ کسے ہوئے اور نہ ہی زیادہ ڈھیلے ہوں۔

گوتم نے رسوم اور توہم پرستی کی مخالفت کی؛ لیکن وہ اس چیز کے بھی خلاف تھا جسے آج سائنس پسندی کہتے ہیں۔ سائنس پسندی (Scienticism) کی تعریف ایک غلط یا غیر سائنسی نظریے کے طور پر کی جا سکتی ہے جس کے مطابق سائنسی معیار پر پوری نہ اترنے والی چیز وجودی نہیں رکھتی۔ بدھ حد سے بڑھی ہوئی دانشورانہ مابعد الطبیعیاتی قیاس آرائی کے بھی خلاف تھا جو لوگوں کو "راستہ" حاصل کرنے میں مدد نہیں دیتی...... لہٰذا اسے فلسفی کہنا بمشکل ہی موزوں ہوگا۔ اگر "فلسفی" سے مراد "عقل کا دوست" لی جائے تو ہم اسے فلسفی کہہ سکتے ہیں۔

اس کی زندگی کے واقعات (جو ہمیں معلوم ہیں) بہت جلدی جلدی ہوئے۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی طرح کے شہزادوں جیسی پر تعیش اور کاہل زندگی گزارنے لگا، لیکن ایک موقع ایسا آیا جب اس نے اپنی اور دیگر تمام مخلوقات کی زندگی کے مقصد کے متعلق غور کیا۔ اس نے مایوسی بھرے تاسف کے ساتھ سوچا کہ ہر چیز کے مقدر میں بگاڑ لکھا ہے...... کیا انحطاط اور نیستی کے سوا کچھ بھی موجود نہیں؟

وہ اپنے باپ کے محل سے نکلا اور جنگل میں مختلف گروؤں کے ساتھ مراقبہ کیا۔ اس نے فاقہ کشی کی مگر اسے پتہ چلا کہ شدید فاقہ کشی سے ذہنی سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ روایت ہے کہ وہ ایک برگد تلے بیٹھا اور خود سے بولا: "میں اتنی دیر تک یہاں سے نہ اٹھوں گا جب تک کہ انحطاط اور موت سے ماورا ہونے کی راہ نہ پا لوں۔" مسیح کی طرح اس کو بھی ایک شیطان (مار) نے بھٹکانا چاہا، لیکن گوتم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ مراقبہ کی حالت سے باہر آنے پر اس نے خود کو دوبارہ جنما ہوا محسوس کیا: وہ بدھ یعنی بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے کامل داخلی آزادی یعنی نروان کی منزل پا لی تھی۔ اس بارے میں بہت بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے کہ نروان سے مراد مکمل نیستی ہے یا لاشیئیت کی تفہیم۔ یقیناً نروان عیسائی بہشت کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور کم "غیر سائنسی" ہے۔ نروان میں سمسار یعنی جنم مرن کے چکر سے نجات مل جاتی ہے۔ بہر کیف بدھ نے جذبۂ رحم کے تحت زمین پر ہی رہنے اور دوسروں کو نروان پانے میں مدد دینے کا فیصلہ کیا۔

اب بدھ کا پیغام اپنی اصل قوت کھو چکا ہے۔ بدھ مت کئی فرقوں میں بٹ گیا ہے: مثلاً تھیرواد (جنوبی)، مشرقی اور شمالی بدھ مت۔ عیسائی روایات کے برخلاف یہ تینوں روایات دیگر

فرقوں کے ساتھ روادارانہ طور پر موجود رہی ہیں (جاپان میں زین بدھ مت شنتو کے ساتھ، چین میں تاؤ مت اور کنفیوشس مت کے ساتھ)۔ ابتدائی بودھیوں اور بلاشبہ خود بدھ نے بھی دیگر مذاہب کے گروؤں کے متعلق رواداری کے ساتھ بات کی۔ وحشی اور نیوراتی (Neurotic) عیسائی ترتولیان یا پیوریطانی ایڈ اور سال جان کیلون اس قسم کی رواداری کا کیا کرتے؟

بودھی صحائف میں لاکھوں الفاظ ہیں۔ ان میں کچھ کا انگریزی ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا۔ ان میں سے ایک دھمپد بھی ہے...... 423 شلوکوں پر مشتمل...... جو نہایت خوبصورت، مختصر اور مکمل صورت میں ہے۔ بودھیوں اور غیر بودھیوں دونوں نے اسے عزیز رکھا اور اس کی دانش کو مسترد کرنا مشکل ہے۔ دھمپد کے ایک مترجم ایکناتھ ایشورن کا کہنا ہے کہ اس میں بدھ کے پیروکاروں کے جمع کردہ ریکارڈز شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 252 ق۔ م تک یہ مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن ان دنوں یہ کتاب تحریری صورت میں موجود نہ تھی۔ اس کا اولین ورژن پالی میں ہی ملا جو سنسکرت کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کے طویل اور مختصر ورژن موجود ہیں۔ دھمپد میں سادہ طریقے سے بات کی گئی ہے۔ نظریۂ کرم یوں پیش کیا گیا:

ایک آدمی دور افتادہ زمینوں سے صحیح سلامت واپس آیا۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اسی طرح جب کوئی آدمی اس دنیا سے جاتا ہے۔ اس کے نیک اعمال کے باعث اسے اگلی دنیا میں خوش آمدید کہا جاتا ہے

لیکن یہ اچھے اعمال محض خیرات دینا نہیں، جیسا کہ اسلحہ بنانے والے اکثر کرتے ہیں۔ بلکہ نیک اعمال کی بنیاد نیک ارادوں پر ہے...... "ہم وہی ہیں جو کچھ ہم سوچتے ہیں۔" یہ بات قابل ذکر ہے کہ محققین کے ایک گروہ کے مطابق تقریباً 20 اہم اپنشد بدھ ازم سے بعد کے ہیں۔ یہ ممکن بھی ہے۔ لیکن قدیم اپنشد یقیناً بدھ مت سے پہلے کے ہیں۔ اور بدھ خود بھی ویدک سوچ سے متاثر ہوا تھا۔

بدھ کے دور میں دو قسم کا مذہبی اثر موجود تھا...... برہمن سنیاسی جو جین مت کے پیروکار تھے، اور زیادہ دور پر فکر، کپڑوں میں ملبوس؛ اور جنگل جنگل گھومنے والے مرتاض جن میں سے متعدد پرانی ویدک روایت سے منسلک تھے۔ موخر الذکر نے بدھ کو اپنے نتائج اخذ کرنے میں مدد دی۔

اپنشد کے مصنفوں کی قسم کے لوگ جنگل میں کئی کئی سال گزارتے تاکہ اپنے ذہنوں میں موجود خیالات کا ہر ممکن حد تک بغور اور سائنسی تجزیہ کر سکیں۔ بدھ نے بھی یہ کام کیا۔ اپنشدوں کے مطابق کرم (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) علت اور معلول کا ایک خالصتاً قدرتی معاملہ ہے، نہ کہ کوئی مذہبی اصول۔ فلسفیانہ اعتبار سے یہ قبل از سقراطی فلسفیوں کی سوچ کے سوا باقی سب کی نسبت کہیں زیادہ پیچیدہ اور لطیف ہے۔

ابتدائی ترین اپنشدوں کے مصنفین بدھ سے پہلے کے تھے، کیونکہ بدھ اور پھر اس کے پیروکاروں نے اپنشدوں کے بنیادی تصورات کی تشریح و وضاحت کا ایک عملی طریقہ وضع کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے لیے یہ عقلِ سلیم یا زیادہ درست طور پر "روحانی عقلِ سلیم" کا معاملہ تھا۔ کوئی ایسا وحشی خارجی بھگوان موجود نہیں تھا جو انسانوں کو ان کی نافرمانی پر سزا دیتا۔ ویدک مذہب میں جب ہمیں سزا دی جاتی ہے تو ہم خود کو سزا دیتے ہیں۔ اگر آپ کی ظالم ساس آپ کو مارتی ہے تو آپ "بدقسمت" نہیں بلکہ اپنے کرموں کا پھل پا رہے ہیں۔ اور ہستی کے قید خانے سے نکلنے کے لیے اپنے کرموں کا حساب چکانا لازمی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے وجود کی حالت ہماری زندگیوں کی نوعیت کی بنیاد ہے۔ مثلاً "میری بیویاں مجھے مارتی ہیں" سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں بیویوں سے مار کھانے کا خواہش مند اور ضرورت مند بھی ہوں چاہے مجھے اس بارے میں معلوم ہو یا نہ ہو۔ جب میں معاملے کی اصل نوعیت سمجھ لیتا ہوں تو میری یہ بدبختی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن ہماری اپنی زندگیوں میں کچھ دیگر واضح اور آسان مثالیں بھی موجود ہیں۔ فرض کریں کہ ہم دوسروں کے احساسات کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے۔ انجام کار یہ بے احساسی دوسروں کو غصہ دلاتی یا ہم سے انتقام لینے پر مائل کرتی ہے...... تب ہمیں بھی نقصان پہنچایا جائے گا۔ آگے چل کر نظریہ کرم اور بھی پیچیدہ اور پائیدار ہو گیا، اور اسے ہمارے کئی جنموں میں غیر مختتم طور پر کارفرما خیال کیا گیا۔ بدھ مت کی زیادہ لطیف صورتوں میں "روح" کا کئی جنموں میں جاری رہنا فرض نہیں کیا جاتا، اس کی بجائے روح مرنے والے کی چھوڑی ہوئی ایک توانائی ہے جو موزوں حالات میں خود کو دہراتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے جوہر کو جی کر گزارنے کے متعدد

انداز ہیں۔ اور زندگی کو اچھے یا برے حالات میں جیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بدھ نے غالباً خود آواگون کی نہیں بلکہ ایک کہیں زیادہ پیچیدہ عمل کی تعلیم دی تھی۔ مرتے ہوئے شخص کی سوچیں اس کی ساری ہستی، بالخصوص اس کی نیتوں کی کیفیت کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ خواہش اور لاعلمی کے خاتمے تک دوبارہ جنم لینے کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ "نئی زندگی" کا پرانی زندگی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو نئے شعلے کا اپنے پرانے شعلے سے۔ تاہم، اس میں شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ بودھیوں (اور ہندوؤں) کی بہت بڑی اکثریت باقاعدہ تجسیم نو پر یقین رکھتی ہے۔

بدھ کی ابتدائی دلیل یا قضیے کو قبول کرنا مشکل نہیں: ساری ہستی "دکھ" ہے۔ موت کا خوف، بڑھاپا، بیماری اور خواہشات کی عدم تکمیل...... یہ سب بھی دکھ ہے۔ بلاشبہ دائمی مسرت موجود ہے، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے دکھ سے ماورا ہونا لازمی ہے۔

کچھ لوگوں کی نظر میں موت ایک مطلق نجات فراہم کرتی ہے۔ یہ لاشے (نیستی) اور قطعی اختتام ہے۔ لیکن یہاں بدھ مت اختلاف کرتا ہے۔ جسمانی موت اختتام نہیں۔ قانونِ کرم نافذ العمل ہے۔ کسی شخص کی امنگیں اور ارادے تعین کرتے ہیں کہ اس کا آئندہ جنم کیسا ہو گا۔ اور دو چیزیں یعنی خواہش اور لاعلمی اس غیر مختتم سلسلے کو جاری رکھتی ہیں۔ اس سب پر غلبہ پانے کے لیے بدھ نے آٹھ نکاتی راستہ پیش کیا۔

قانونِ کرم کی مشینی کارفرمائی کو ختم کرنے کے لیے بدھ کی آٹھ سفارشات یہ ہیں: 1) راست نظر: دکھ کا منبع اور اسے ختم کرنے کے طریقہ کی تفہیم۔ 2) درست ارادہ: خواہش پرستی سے شعوری طور پر بچنا۔ 3) درست گفتار: گپ بازی اور فضول باتوں سے احتراز۔ 4) درست عمل: ہر قسم کے قتل (اسلحہ سازی، سپاہیانہ زندگی) یا چوری سے بچنا۔ 5) درست رہن سہن: نقصان دہ کاموں کے ذریعہ دولت نہ کمانا۔ 6) درست کوشش: صحت مند اور مفید زندگی گزارنے کی کوشش کرنا۔ 7) درست غور و فکر: اندرونی طمانیت کا حصول جس میں آپ حقیقی بصیرت پانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور 8) درست ہوشیاری: داخلی حالتوں پر شعوری کنٹرول پانے کی کوشش کرنا۔ دھمپد میں اس کا ذکر کیا گیا:

تمام برائی سے بچنا اور سود مند زندگی گزارنا

اپنے ذہن کو پاک بنانا

یہی بدھ کی تعلیم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دھمپد کا ایماندارانہ مطالعہ فرد اور معاشرے دونوں کو بہتری کی جانب مائل کرتا ہے۔ لیکن اہل مغرب کے لیے قانون کرم اور نروان کی نوعیت کو قبول کرنا مشکل ہے۔ اپنشدوں کے فلسفہ میں ہماری روح برہما کی روح کل کے ساتھ متحد ہو سکتی ہے۔ لیکن گوتم بدھ نے لافانی روح کو ماننے سے انکار کیا۔ کوئی شخص محض مظاہر کا مجموعہ ہے: کوئی حقیقی ذات موجود نہیں۔ اس مجموعہ مظاہر کا خاتمہ ہی دکھ کے خاتمہ کی نشانی، نروان کا حصول ہے۔ نروان کی تعریف صرف منفی جملوں کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔ مسرت کا نہ ہونا مسرت ہے: یعنی جب خواہشات اور ولولے باقی نہ رہ جائیں۔ لہٰذا بدھ مت تمام مذاہب میں سب سے زیادہ منطق پسند اور ساتھ ساتھ نہایت صوفیانہ (باطنی) بھی ہے۔

rekhta

15

اینیڈ

"The Aeneid"

ورجل

70 تا 19 قبل مسیح

روم کا شہنشاہ آگسٹس واضح طور پر آرٹسٹک ذوق رکھتا تھا۔ ورجل کی تحریر یا جرأت تحریر کو شناخت کرنے میں آگسٹس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آگسٹس کی Res Gestre(Acts) زمانے کی دست برد سے بچی رہی، اور غالباً یہ ہمارے لیے تاریخی اعتبار سے اہم ترین رومن دستاویز ہے۔ آگسٹس نے شاہی روم کی بنیاد رکھی۔ یہ

rekhta

کتاب وضاحت کرتی ہے کہ آگسٹس کے اختیارات اور ری پبلکن آزادی کے احترام نے اسے ایک خصوصی مقام دیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خصوصی مقام اس کی ذاتی خوبیوں کا حاصل ہے؛ اس کی تمام فتوحات روم کی خاطر تھیں۔ وہ شیخی بگھارتا کہ اس نے روم شہر کو اینٹوں سے بنا ہوا پایا اور اسے سنگِ مرمر کا بنا دیا۔

آگسٹس عیاری، دوغلے پن اور منافقت اور بالخصوص اپنی شدید اخلاقی اصلاحات میں ماہر تھا۔ عظیم فاتح سکندر نیم پاگل حالت میں مرا۔ پھر بھی انیسویں صدی کے زیادہ تر مورخین کے خیال میں وہ ایک ''وسیع ترنگ'' کا باعث تھا جس نے سب سے پہلے ''مہذب انسان کو ہمہ گیر انسانی بھائی چارے کی تعلیم دی۔'' اس کے برعکس آگسٹس کو ''بنیادی طور پر ایک Reactionary'' خیال کیا گیا...... بالخصوص رومن مذہب کو نافذ کرنے کے معاملے میں۔

ورجل کی شاعرانہ کامیابیوں کا آگسٹس سے تعلق ہونا قابلِ ترس ہے۔ آگسٹس نے دیگر تحریریں بھی چھوڑیں جو اب موجود نہیں۔ اس نے بحرِ مسدس میں سسلی پر ایک نظم، اور ایک ٹریجڈی بھی لکھی جسے اپنے معیار کے مطابق نہ پا کر خود ہی ضائع کر دیا۔

پبلئس ورجیلئس مارو (70 تا 19 ق م)' جو ہمارے لیے صرف ورجل ہے، میتوآ کے قریب ایک زمیندار ایٹروسکن گھرانے میں پیدا ہوا۔ جوان ہو کر وہ لمبا تڑنگا اور گہری رنگت والا بن گیا۔ اس کی صحت بہت خراب تھی...... خونی بواسیر، السر، سر درد۔ اس نے اچھی تعلیم پائی اور بہترین اساتذہ کی زیرِ نگرانی علمِ بیان کا مطالعہ کیا۔ وہ ایک ''الیگزینڈری'' کے طور پر ادبی حلقوں میں داخل ہوا۔ الیگزینڈری گروہ ایسے شاعروں پر مشتمل تھا جنھوں نے تیسری صدی قبل مسیح کے یونانی شاعروں کی لطیف تحریروں سے تحریک پائی۔ رومنوں نے تیکنیکی کاملیت کو اپنا مقصد بنایا، یعنی ''فن برائے فن'' لیکن انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش بھی کی کہ لاطینی شاعری بھی یونانی شاعری جیسی بلند پایہ ہو سکتی تھی۔

ورجل نے 49 قبل مسیح میں سول جنگ شروع ہونے پر کیریئر بنانے کا خیال دل سے نکال دیا (یہ جنگ جولیئس سیزر اور پومپے کے درمیان تھی) اور اپی کیوری فلسفہ کا مطالعہ کرنے نیپلز چلا گیا۔ اس نے ولی صفت سیرو (Siro) کی شاگردی اختیار کی اور اس کا بنگلہ ورثے میں پایا۔ پھر

جولیئس سیزر کے قتل کے بعد آگسٹس اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ 41 ق۔م میں اس نے اپنی نجی جائیداد جنگجوؤں میں بانٹ دی۔ اس طرح ورجل کے باپ کی جائیداد بھی چھن گئی اور وہ اپنے بیٹے کے پاس نیپلز چلا آیا۔ ورجل کی ابتدائی نظموں میں سے ایک اسی موضوع پر ہے۔ تاہم، بعد میں جب ورجل کا شمار روم کے اعلیٰ ترین شاعروں میں ہونے لگا تو آگسٹس نے اسے نولا کے مقام پر ایک گھر دیا...... بہر حال اس نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ کیمپانیا میں ہی بسر کیا۔

آگسٹس اپنے قریبی اور بااعتماد دوست میسی نس (Maecenas) کے توسط سے ورجل کی جانب متوجہ ہوا۔ میسی نس ایک امیر ہم جنس پرست شاعر اور لکھاریوں (مثلاً ہوریس) کا سرپرست تھا۔ اس نے دو مرتبہ آگسٹس کی غیر موجودگی میں روم پر حکومت بھی کی۔ ان کے تعلقات میں اس وقت کھچاؤ پیدا ہوا جب زناکاری کے خلاف سخت نئے قوانین کے خالق آگسٹس نے میسی نس کی بیوی کے ساتھ اسی جرم کا ارتکاب کر لیا۔ لیکن میسی نس اس واقعہ سے کافی عرصہ پہلے ہی ورجل کو آگسٹس سے متعارف کروا چکا تھا۔ جلد ہی بادشاہ اور شاعر نے ایک عظیم رومن رزمیہ کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ رزمیہ نظم کا ہیرو روم کو بننا تھا، لیکن آگسٹس خود کو ہی روم سمجھتا تھا۔ ہم اس سلسلے میں ورجل کی رائے نہیں جانتے: لیکن ضرور وہ پوری طرح اس بات کا قائل نہیں ہوگا، کیونکہ بسترِ مرگ پر اس نے کہا تھا کہ اس کی نظم کو ضائع کر دیا جائے۔

ورجل کی نظموں کے دو ابتدائی مجموعوں "Eclogues" (انتخاب) اور "Georgics" (زراعت سے متعلق) نے اسے شہرت دلائی۔ مجموعوں کو یہ نام اس نے خود نہیں دیے تھے۔ پہلے مجموعے کی دس نظموں میں سے ایک ہم جنس پرستی کے بارے میں ہے جس میں چرواہا Corydon شکوہ کرتا ہے کہ ساتھی گڈریا Alexis اس کی محبت کا جواب محبت میں نہیں دیتا۔ یہ اور دیگر نظمیں اس اعتبار سے الیگزینڈری ہیں کہ اس پر تیسری صدی ق م کے یونانی شاعر تھیوکریٹس کی گہری چھاپ ہے۔ Georgics زراعت کے بارے میں، چار حصوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے: اپنے ملک کے بارے میں ایک قصباتی کے خیالات۔ اس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ آگسٹس (اوکتاویان) دنیا میں امن قائم کرے گا۔ اس نے ایسا کیا بھی، لیکن اس کے قائم کردہ امن میں جنگ کے بیج بھی بوئے ہوئے تھے۔

31 قبل مسیح میں آگسٹس نے اپنے سابق اتحادی مارک انتونی کے خلاف Actium کی جنگ جیتی۔ 29 ق م میں اس کے لیے راستہ کھل گیا تھا۔ اسی نے خیال پیش کیا کہ روم کے بہترین شاعر کو اس عہد میں روم کی شان و شوکت کے متعلق ایک نظم لکھنی چاہیے۔ اپنی ادبی کاوشوں کے باوجود وہ خود کو اس کام کا اہل نہ سمجھتا تھا۔ اس نے ''اپنے'' شاعر پر زور دیا، لیکن ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں کہ اس اصرار کی نوعیت کیا تھی۔ واضح ہے کہ ورجل اولوالعزم ہونے کے باوجود اس معاملے میں حقیقتاً خوش نہیں تھا۔ 26 ق۔م میں آگسٹس نے سپین سے شکایت نامہ ارسال کیا کہ ابھی تک اسے نظم دیکھنے کو نہیں ملی۔ جواب میں ورجل نے نظم دکھانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ''بدحواسی کے ایک لمحہ میں'' پروجیکٹ شروع کیا تھا اور اسے سامنے لانے سے پہلے زیادہ عمیق مطالعہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اسی برس شاعر پروپرٹیس نے ''The Aeneid'' کو ہومر کی ایلیڈ سے بلند پایہ قرار دے دیا۔

23 قبل مسیح میں ورجل نے تیسری اور چوتھی کتب آگسٹس کو خود پڑھ کر سنائیں۔ 19 ق م میں وہ یونان اور ایشیا کے تین سالہ دورے پر روانہ ہو گیا۔ اس نے نظم کی نوک پلک سنوارنے کے عزم کا اظہار کیا...... مگر فلسفہ میں غرق ہو گیا۔ وہ یونان پہنچا اور وہاں میگارا کے مقام پر آگسٹس سے ملاقات کی۔ آگسٹس نے اسے اپنے ساتھ واپس اٹلی چلنے پر ''راضی'' کیا۔ مگر وہ ابھی یونان میں برندیسی کے مقام پر ہی تھے کہ ورجل بیمار ہو کر چل بسا اور آخری لمحوں میں اپنی نظم ضائع کرنے کی ہدایت کر گیا۔ چنانچہ وہ اینیڈ میں ''اضافی'' خوبیوں سے ناخوش تھا: خوف، جھوٹ، بدخواہشات، خودمختاری کا فقدان۔ آگسٹس نے اس وصیت کو نظر انداز کرنے کا حکم دیا، اور نظم شائع ہو گئی۔ یہ نظم جلد ہی کلاسیک بن گئی اور ورجل ایک ''عیسائی ہیرو'' قرار پایا۔ اس کے حوالے سے ایک کہانی تراشی گئی: وہ پہلا عیسائی تھا: وہ ساحر، پیغمبر، عظیم مقرر وغیرہ تھا۔ حالیہ دور میں اسے ایک قسم کا ہم جنس پرست ولی بنا دیا گیا ہے...... البتہ اس کے عیسائی معترفین اب بھی اسے ہم جنس پرستی جیسے ''مکروہ جرم'' کا مرتکب تسلیم نہیں کرتے۔ دانتے نے اپنی نظم ''دی ڈیوائن کامیڈی'' میں اسے اپنا ہیرو بنایا...... مگر اسے بہشت میں نہ بھیجا کیونکہ وہ 19 قبل مسیح میں فوت ہوا تھا۔

ورجل کے دور میں ہی یہ جان لیا گیا تھا کہ اینیڈ کا نصف اول ''اوڈیسے'' اور نصف دوم ایک

''ایلیڈ'' تھا۔ لیکن ورجل نے بھی رزمیہ نظموں کے اولین لاطینی مصنفین سے رجوع کیا۔

ورجل میں مزاح بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے اور ایک محقق کے مطابق وہ روم کو معلوم دنیا کے مطلق اور صاحب بصیرت حکمران کا سا بلند رتبہ دیتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ میں ٹروجن اینیاس کا ذکر ایک ایسے آدمی کے طور پر آیا ہے جس کے مقدر میں ایک بادشاہت کی بنیاد رکھنا ہے۔ ابتدائی لاطینی شاعروں نے اسے اٹلی کے بانی ٹروجن کے طور پر لیا۔

ورجل کارتھیج کے مقام پر آمد کے ساتھ آغاز کرتا ہے۔ پھر ٹرائے شہر کو لوٹے جانے کا فلیش بیک ہے۔ اس کے بعد سب سے مشہور اقتباس آتا ہے: کارتھیج میں اینیاس اور ڈیڈو (Dido) کا معاملہ عشق، اینیاس کا اس سے منہ موڑ لینا اور Dido کی بددعا جو اس نے محبت میں خود کو قتل کرنے سے پہلے اینیاس کو دی۔ تب اینیاس جہنم میں اترتا ہے۔

نظم کا نصف آخر، آگسٹس کے لیے سپاسناموں کے ساتھ (جسے محتاط انداز میں اینیاس کے ساتھ جوڑا گیا ہے) ٹروجنوں اور لاطینیوں کے مابین جنگوں کے لیے وقف ہے۔ لاطینیوں کے رہنما ٹرنس (Turnus) کو ہومر کے اکیلیز سے جوڑا جاتا ہے۔ اس دور میں رومن محض ''اطالویوں'' کو بنظر تحقیر دیکھتے تھے۔ اور رومن شہریت کا حصول ان اطالویوں کے لیے اعلیٰ ترین رتبہ حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ ورجل نے اینیاس کو روم کے بانی کا جد امجد بتایا۔ خدا ولکن اینیاس کے لیے ایک خصوصی ڈھال بناتا ہے: اس ڈھال کے درمیان میں جنگِ Actium کا منظر دکھایا گیا ہے جو آگسٹس نے جیتی تھی۔

ورجل نے آگسٹس کے خواہش کردہ موضوع کو ماہرانہ انداز میں پیش کیا۔ لیکن اس میں ایک خصوصیت کا فقدان ہے...... مزاح اور انسانیت پسندی کے مابین ایک چیز۔ بالخصوص Dido اور اینیاس سے متعلق حصے ایک اعلیٰ اور حقیقی جاں گدازی رکھتے ہیں۔ محققین کی نظر میں ورجل کی نظم کافی حد تک کامل ہے۔ لیکن ہم اسے حد سے زیادہ مکمل بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک مکار اور مہذب حکمران اور اخلاقی لحاظ سے پست آدمی کے کہنے پر لکھی گئی تھی۔ شاعر کا ضمیر اس امر سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

اگر ورجل میں جرأت ہوتی تو وہ خوفناک آگسٹس کے بارے میں کس قسم کی نظم لکھتا؟ یا کیا اس میں جرأت تھی ہی نہیں؟

16

حقیقت کی نوعیت

"On the Nature of Reality"

لوکریٹیئس

اندازاً 55 قبل مسیح

اعلیٰ ترین لاطینی شاعر قرار دیے جانے والے طٹس لوکریٹیئس کیرس (99 تا 55 ق۔م) کے بارے میں ہم بمشکل ہی کچھ جانتے ہیں۔ کچھ اچھے نقادوں نے تو اسے ورجل پر بھی فوقیت دی۔ مرکزی ریکارڈ عیسائی دانشور سینٹ جیروم کی ایک تحریر میں ہے: سسرو نے اس کا ذکر کافی

rekhta

سازگار انداز میں کیا (حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سسرو نے اس کی شاعری کی اصلاح کی تھی)۔ غالباً اس کا تعلق طبقہ اشراف کے ایک خاندان سے تھا اور شاید وہ پومپئی کے نزدیک کچھ جائیداد کا مالک بھی تھا۔ اسی لیے اس نے اپی کیوری فلسفہ سیکھا۔ یہی اس کی واحد (معلوم) نظم "چیزوں کی نوعیت کے بارے میں" کا موضوع ہے۔ عموماً اس عنوان کا ترجمہ حقیقت کی نوعیت (On the Nature of Reality) کیا جاتا ہے۔

جیروم کہتا ہے کہ لوکریٹیئس کو ایک پریم جڑی (Love-philtre) کے زہر نے متاثر کیا، نتیجتاً وہ دیوانہ ہو گیا اور اسی دیوانگی کے عالم میں اپنی نظم لکھنے کے بعد خودکشی کر لی۔ کچھ حضرات نے اس بات کے ثبوت میں کتاب چہارم میں رومانوی محبت پر شدید مگر جائز حملے کا حوالہ دیا؛ لیکن سینٹ جیروم کے خیال میں یہ کہانی من گھڑت ہے۔

> محبت میں توقع کی جاتی ہے جسم کا پیدا کردہ شعلۂ جوش اسی کے ذریعہ ٹھنڈا ہوا گا۔ لیکن یہ امید فطرت کے برخلاف ہے۔ جنسی مسرت ایسی چیز ہے کہ اسے جتنی زیادہ تسکین دی جائے یہ اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ جسم میں کھانا اور مشروب داخل ہونے پر ہماری بھوک اور پیاس مٹ جاتی ہے۔ لیکن ایک دلکش چہرہ یا پیاری رنگت ہمارے جسموں کو حظ اٹھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیتی: محض تخیلات امید کے ہاتھوں ادھر ادھر بکھرتے رہتے ہیں۔

آگے چل کر وہ پوچھتا ہے: "کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ وفورِ شوق کے باعث باہم مربوط جوڑے عموماً اپنے مشترکہ بندِ حسن کے ہاتھوں کس طرح عذاب جھیلتے ہیں؟"

"حقیقت کی نوعیت" کا انتساب سی میمیئس نامی ارسٹوکریٹ کے نام ہے جو ایک اور مشہور اور برتر شاعر کاتولس کا سرپرست تھا۔ بدقسمتی سے یہ انتساب ہمیں لوکریٹس کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتاتا کہ وہ پیسوں کے لیے میمیئس کا محتاج رہا ہوگا۔

اپی قوریت (Epicureanism) اس جدید ایٹمی دور میں بھی بدستور ایک بااثر فلسفہ ہے۔ تو پھر اسے خود اپی قورس (341 تا 270 ق م) کی تحریروں کے ساتھ کیوں نہ پیش کیا جائے؟ وجہ بہت سادہ سی ہے۔ اپی قورس کی اہم تحریر "On Nature" کا بہت کم حصہ سلامت بچا ہے۔

جبکہ لوکریٹیئس کی نظم اپی قورس کی وفات کے تقریباً 200 برس بعد لکھی گئی اور یہ اپی قوری فلسفہ کا سب سے واضح اور ڈرامائی بیان ہے۔ نیز شاعری پر اثر اور فعال نوعیت فلسفہ کی غایتِ نہایت کو چیلنج کرتی ہے۔ (فلسفہ امن، خوشی اور خوف سے نجات دلانے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔) چنانچہ ''حقیقت کی نوعیت'' ایک تناؤ کا اظہار کرتی ہے جو سہل پسند فلسفہ میں نفسیاتی اعتبار سے کسی اور چیز کی نسبت زیادہ حقیقی ہے۔

Henri Patin نے لوکریٹیئس کے متعلق ایک مقالے (1883ء) میں کہا تھا کہ ''لوکریٹیئس کے ہاں ایک ''اینٹی لوکریٹیئس'' موجود ہے......یعنی ایک اینٹی اپی قوری۔ لوکریٹیئس کے خیال میں محبت اور لڑائی بے معنی ہیں، لیکن مخالفین اس کے برعکس ثابت کرنے کو تلے ہوئے ہیں۔ البرٹ کامیو (جو اس نظم کا شیدا تھا) نے کہا کہ یہ نظم ''انسانی تکالیف کے حوالے سے الوہیت پر پہلا حملہ'' تھی۔

اپی قورس نے اپنا مکتبہ فکر 306 ق۔م میں ایتھنز کے قریب قائم کیا۔ اس کی خرید ہوئی جائیداد اور باغ تقریباً 500 برس تک موجود رہا۔ اس کی تعلیمات سارے مہذب یورپ میں وسیع پیمانے پر پھیلیں اور کہیں دوسری صدی عیسوی میں آ کر رواقیت (Stoicism) نے اس پر غلبہ پایا۔ ایک نسبتاً نرم مزاج رواقی Epictetus نے تو اپی قوریت کو محض ''کھانا، پینا، مجامعت کرنا، رفع حاجت کرنا اور سونا'' قرار دیا۔ عیسائیوں کا اپی قوریت کے مخالف ہونا قابلِ فہم ہے۔

اپی قورس

اپی قوریت نے لوگوں کو ''نظر میں آئے بغیر زندگی گزارنے'' کا درس دیا اور (ہماری جدید اصطلاح میں) ایک قسم کی منطقی انسانیت پسندی کا پرچار کیا۔ یہ امر قابلِ بحث ہے کہ آیا اپی

قوریت نوعِ انسانی کو متاثر کرنے والے عظیم فلسفوں میں سب سے زیادہ سطحی ہے، لیکن لوکریٹیئس کے ہاں اس کا شدید اظہار یقیناً سطحی نہیں۔

اپی قورس اور اس کے جانشینوں (ہیمارکس، پولی سٹراٹس اور دیگر) نے لوگوں کو عیش و عشرت اور لذت کوشی کی زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دی تھی۔ اپی قوری فلسفہ کے بنیادی حصہ کو موزوں طور پر Hedonism (نظریہ لذتیت) کا نام دیا گیا ہے۔ مگر Hedonism کا ترجمہ ''لذت کوشی'' کرنا جائز نہیں۔ خود اپی قورس نے راہبانہ زندگی بسر کی۔ البتہ وہ تھوڑے سے پنیر کا مزہ اٹھانا پسند کرتا تھا۔ اس نے جنسی اور دیگر بے اعتدالیوں کے ''خلاف'' پرچار کیا: کیونکہ ان بے اعتدالیوں میں پڑنے والوں کو ناگزیر طور پر ناخوشگوار ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لذت پسندی کا الزام اپی قوریت کے مخالف رواقیوں کی جانب سے دشنام طرازی کا ایک حصہ تھا۔

اپی قوری فلسفہ غالباً افلاطونیت کے خلاف ایک ری ایکشن تھا۔ یہ تکنیکی اعتبار سے لیوسی پس اور دیمقراطیس کی جوہریت (atomism) میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ افلاطون نے پانچویں صدی قبل مسیح کے ان دونوں فلسفیوں کو مسترد کر دیا تھا۔ اس مادیت پسندانہ فلسفہ نے تعلیم دی کہ دنیا لاتعداد نظر نہ آنے والے خلا اور ایٹموں پر مشتمل ہے۔ ایٹم اس خلاء میں روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز سفر کرتے ہیں۔ ہمارے ادراک میں آنے والی ہر ایک چیز کو ایٹموں کے ٹکراؤ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ روح بذاتِ خود بہت لطیف ذرات سے مل کر بنی ہے اور موت انہیں منتشر کر دیتی ہے۔ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔

اپی قورس نے 'Clinamen' کی تفسیر کا اضافہ کیا جو چند ایک ایٹموں کی ہلکی سی اور شاذ و نادر گمراہی کا نتیجہ ہے۔ ایٹموں کا یہی احتراز کائناتوں کی تشکیل کا ذمہ دار ہے۔ لوکریٹیئس اسے یوں بیان کرتا ہے:

> جب ایٹم اپنے وزن کے باعث خلاء میں سے سیدھے نیچے گر رہے ہوں تو وہ اپنی راہ سے بہت کم احتراز کرتے ہیں......لیکن ان کی سمت میں فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔ اگر یہ ذرا سا انحراف موجود نہ ہوتا تو ہر چیز عمودی بارش کی طرح نیچے گرتی۔ تب ایٹم کا ایٹم سے ٹکراؤ نہیں ہو سکتا تھا: ایسی صورت میں کچھ بھی موجود نہ ہوتا۔

اپی قورس نے معبد کے دیوتاؤں کے وجود کو ایک تجربی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا۔ لیکن یہ دیوتا کوئی دینیاتی رتبہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا اپی قورس تیکنیکی معنوں میں ملحد نہیں تھا۔ اپی قورس کے دیوتا الگ تھلگ اور دور ہیں۔ اس کا ان پر یقین ہونا خلاف قیاس ہے۔

ارسطو نے نظریہ جوہریت کو مسترد کیا۔ اس نظریے نے سترہویں صدی میں فرانسیسی کیتھولک پادری پیئر ے Gassendi کے ہاں فتح پائی جس کے خیالات نے جدید سائنسی تفتیش کی کچھ بنیادیں فراہم کیں۔ پیئر ے نے اپی قوریت کی بنیاد پر ہی وضاحت کی کہ ذہنی وقوعے دماغ میں فزیکل (طبعی) بگاڑ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیئر ے اور اپی قورس نے آئزک نیوٹن کی فکر پر گہرا اثر مرتب کیا۔

اگرچہ دنیا کی اپی قوری وضاحت نے جدید سائنس میں حقیقی طور پر حصہ ڈالا، لیکن چند جدید مفکرین اس فلسفے پر پُرسکون انداز میں عمل پیرا ہے۔ یہ ممکنا طور پر محض ایک فلسفہ سے زیادہ ''لادین مذہب'' ہے۔ یقیناً اخلاقی اعتبار سے یہ قابل تعریف ہے۔ اپی قوری مطمع نظر ataraxia یا ''ذہن کا سکون'' تھا۔ اپی قورس نے اس سوچ سے آزاد ہونا خوشگوار تصور کیا کہ دیوتا اگلے جہان میں اسے اذیتیں دیں گے۔ وہ اس بنیاد پر حیات بعد از موت کو مسترد کرتا ہے کہ تجربہ صرف حساسیت (Sensation) پر مشتمل ہے: ''موت کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیز موجود نہ ہو وہ حساسیت پیدا نہیں کر سکتی۔'' لوکریٹیس کہتا ہے:

> آپ کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ جسم کے تباہ ہونے پر روح کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔
> ایک محدود چیز کو ابدی چیز کے ساتھ جوڑنا اور ان کے درمیان کسی ہم آہنگی کا تصور کرنا دانشمندی نہیں۔ اس سے زیادہ نامناسب اور بے تُک بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک فانی اور لافانی چیز کو اکٹھا کر دیا جائے؟

حیات بعد از موت پر یقین نہ رکھنے والوں پر بھی اس دلیل کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

ارسطو کے خیال میں سوچنا انسان کا فطری فعل ہے، لیکن اپی قورس نے سوچنے کے عمل کو صرف مسرت یا دکھ پر غور و فکر تک محدود کیا۔ لہٰذا اس کے لیے شاعری کی اہمیت بہت کم تھی کیونکہ اگر سچائیوں کا نہایت آسانی کے ساتھ تعین نہ کیا جا چکا ہو تو مختلف صورت حالات کی خلقی سچائیوں

پر غور و فکر میں بمشکل ہی کوئی حقیقی اہمیت ہو سکتی ہے: ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں جلد ہی مر جاؤں گا اور اس سب سے ماورا ہو جاؤں گا۔''

اپی قورس نے تلاش حق کی جگہ پر دوستی کو دی۔ اس نے زیادہ با اثر، اور غالباً زیادہ سنجیدہ طریقے سے اپنی کمیونٹیز میں غلاموں اور عورتوں دونوں کو شامل کیا۔ اسے ان کو باہر رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔

اپی قوریت ایک توہمات مخالف فلسفہ ہے۔ چنانچہ جدید سائنسی طریقہ کار پر اس فلسفہ کا اتنا زیادہ بڑا ہاتھ ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپی قوری نکتہ نظر ''اچھا'' لیکن جدید سائنس کی طرح روحانی اعتبار سے کمزور اور ناکافی ہے۔ یہ فلسفہ مسئلہ تخلیق کے ساتھ کیسے نمٹ سکتا ہے (جس کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی)؟

لوکریٹیس ہمیں اپنے نظام فکر سے بھرپور انداز میں متعارف کرواتا ہے۔ لیکن جو چیز اسے اس سے اوپر لیجاتی ہے وہ اس کی شاعری ہے، اور یہ جزوی طور پر اس کے خوف کی پیداوار ہے۔ یہاں وہ ہمیں ایک ایسے آدمی کے طور پر دکھائی دیتا ہے جو طمانیت اور سکون کا پرچار تو کرتا ہے لیکن یہ چیز خود اسے میسر نہیں۔ وہ نہ صرف جنسی اذیت (misery) سے مغلوب ہے، بلکہ اپنی نظم کا اختتام ایک ایسی خوفناک تباہی کے بیان...... مثلاً ایتھنز میں 430 ق۔م کا طاعون...... پر کرتا ہے کہ اپی قورس کا فلسفہ تقریباً بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی نظم کے آخر میں ہمیں ایک ایسی وباء کے متعلق بتا رہا ہے جو کسی بھی ذریعے سے دبائی نہیں جا سکتی:

> یہاں موت اپنا شکار بننے والوں کی لاشوں کے ڈھیروں کے ڈھیر لگا رہی تھی۔ میٹھے چشموں کے ساتھ راستوں پر پیاسے مرنے والوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ موت نے ہر مقدس درگاہ کو بھی لاشوں سے پر کر دیا تھا...... وہ متبرک مقبرے اب ویران پڑے تھے جہاں کبھی پجاریوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ موزوں تدفین ممکن نہیں تھی۔ قوم خوف کا شکار تھی اور ہر خاندان نے اپنے اپنے مُردوں سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔

بلاشبہ موت شخصیت کا خاتمہ نہیں تھا، جیسا کہ لوکریٹیس بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی نظم میں ایسا کچھ بھی نہیں جسے روح یا جوہر کہا جاتا ہے۔

17

مقدس قوانین کی تمثیلی تشریحات

" Allegorical Expositions of the Holy Laws "

سکندریہ کا فیلو

پہلی صدی عیسوی

سکندریہ کے فیلو کو اکثر فیلو جوڈیئس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نے یہودی مذہب اور یونانی فلسفہ کے بارے میں لکھا۔ وہ حضرت عیسیٰ مسیح اور حضرت پولوس کا ہمعصر تھا (پیدائش 30 ق م)۔ اس کی وفات غالباً پہلی صدی عیسوی کی پانچویں دہائی میں ہوئی۔ اسے

عموماً اور بجا طور پر پہلا (عیسائی) عالم دین قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم، وہ خود ایک یہودی تھا اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں کہ اس نے کبھی عیسائیت کا ذکر بھی کیا تھا۔

درحقیقت اس بارے میں بھی اتفاق نہیں کہ اس نے کن لوگوں کے لیے لکھا...... یہودیوں، غیر یہودیوں یا پھر دونوں کے لیے؟ بہترین اندازہ یہ ہے کہ کثیر التصانیف ہونے کے باعث اس نے ہر اس شخص کے لیے لکھا جو پڑھ سکتا تھا۔ ہزاروں برس کے دوران اس کی تحریریں بہت سوں نے پڑھیں اور آگسٹائن کی تصنیف "خدا کا شہر" پر اس کا اثر ویسا ہی ہے جیسا "اینیڈ" پر پلوٹینس کا۔ چنانچہ فیلو زبردست اہمیت کا حامل ہے جس کی وجوہ بہت انوکھی ہیں۔ ہم میں سے چند ایک نے ہی اسے زیادہ تفصیل سے پڑھا ہوگا۔ ہمیں اس کے بارے میں پہلے کچھ معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ اس نے یونانی زبان میں لکھا۔ لیکن اس کی کچھ تصانیف صرف لاطینی اور ایک تصنیف آرمینیائی زبان میں ہی ہم تک پہنچی۔

فیلو کی زندگی کے بارے میں تفصیلات میسر نہیں۔ ہم بس یہی جانتے ہیں کہ وہ سکندریہ کے ایک اہم یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا بھائی الیگزینڈر محصولات کا افسر تھا۔ اور وہ خود انجام کار سکندریہ میں ایک کافی بڑی یہودی برادری کا سربراہ بنا۔ اگرچہ وہ مذہب کی حقیقی نوعیت کے بارے میں کچھ ذاتی خیالات رکھتا ہوگا، مگر بطور شہری ایک محب وطن اور حتیٰ کہ کٹر یہودی تھا جس کے لیے اپنی برادری کے مفادات قابل ترجیح تھے۔

اس کی زندگی کے واحد واقعے میں بظاہر یہی معاملہ تھا جس کے متعلق ہم تھوڑی بہت تفصیل جانتے ہیں۔ 37 قبل مسیح میں جرمانیکس اور اگیری پینا (12 تا 41 عیسوی) کا بیٹا جولیئس سیزر روم کا شہنشاہ بنا۔ چونکہ چار برس کی عمر میں وہ اپنے والدین کے ساتھ دریائے رائن کے کنارے تھا اور اسے فوجی بوٹوں میں پریڈ کروائی گئی اس لیے وہ "Baby Boots" کے طور پر مشہور ہوا۔

سیزر کے بارے میں کچھ معلومات فیلو ہی دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اکتوبر 37 میں ایک بیماری کے باعث اس کا ذہن خلل کا شکار ہو گیا۔ یہ واقعہ اس کے شہنشاہ بننے کے فوراً بعد کا ہے۔ وہ رومن شہنشاہوں میں سے نہایت مطلق العنان اور نہایت خبطی بھی تھا۔ اس نے رومن حکومت کے تحت یہودیوں میں شدید بے چینی پیدا کی۔ وہ مصر تھا کہ سکندریہ میں آباد یہودی اسے بطور

دیوتا پوجیں۔ فیلو اور دیگر لوگ اسے سمجھانے کی غرض سے 39 تا 40 عیسوی میں روم گئے۔ وہ ناکام رہے لیکن اگلے ہی برس جولیس سیزر قتل ہو گیا۔

فیلو کی ہم تک پہنچنے والی کتب غالباً اصل کتابوں کے حصے ہیں۔ ان میں ''کائنات'' کی تخلیق کے بارے میں''، ''جولیس سیزر کی سفارت کے بارے میں'' اور ''استغراقی زندگی کے بارے میں'' شامل ہیں۔

لیکن فیلو کی اہم ترین بات یہودی عہد نامہ عتیق کے بارے میں اس کا نکتۂ نظر ہے۔ عہد نامہ عتیق میں اس نے یونانی افلاطونی فلسفہ دریافت کیا جو اصل میں وہاں موجود نہ تھا۔ (بہر حال یہ فلسفہ تاریخی مفہوم میں نہیں تو فلسفیانہ اعتبار سے ضرور موجود ہو گا) اپنے مقدس صحائف کے تشبیہات معانی تلاش کرنے کی کوشش میں وہ عیسائی کلیسیا کے فادرز کے لیے بائبلی تفسیر کا تسلیم شدہ انداز بن گیا۔

دوسری صدی عیسوی میں سکندریہ کے کلیمنٹ جیسوں نے لوگوس (Logos) پر فیلو کے اصرار کو اپنا لیا۔ لوگوس عیسائی تثلیث میں شامل ہے۔ ہم اس کا ترجمہ کلام الٰہی کر سکتے ہیں۔ یہ لفظ قبل از سقراط عہد کے یونانی فلسفی ہیراکلیٹس نے دنیا پر حکمران ہمہ گیر منطق کے معنوں میں استعمال کیا۔

فیلو کا عقیدہ تھا کہ یونانی فلسفہ، بالخصوص افلاطون کی عہد نامہ عتیق کی پہلی پانچ کتب' میں پیش بینی کی گئی تھی۔ اس کے خیال میں خدا نے اپنا پیغام نشر کرنے کے لیے ان پانچ کتب کے مصنفین کو ذریعہ بنایا تھا۔ تشبیہاتی تفاسیر کرنے یعنی مخفی مفہوم دریافت کرنے کا طریقہ فیلو کے عہد میں نیا نہیں تھا۔ ہومر کے مفسرین نے بھی یہ طریقہ استعمال کیا۔ بدترین بات یہ کہ اس طریقہ کے تحت آپ جس تحریر میں چاہیں اپنا مابعد الطبیعیاتی نظام ''دریافت'' کر سکتے تھے۔ بعد

کے رواقیوں (Stoics) نے یہ طریقہ یونانیوں کی اساطیر پر لاگو کیا، اور ایک اور سکندریائی یہودی ارسطوبولس (تیسری اور چوتھی صدی ق م) نے عہد نامہ عتیق کی تفسیر یونانی فلسفیانہ خطوط پر کر دی تھی۔

فیلو نے منظوری دی کہ لوگوں کو شریعت موسوی کی اطاعت کرنی چاہیے لیکن اس کے مفہوم کی گہرائی کو تمثیلی انداز میں لینا چاہیے۔ شریعت مقدس اور لازمی طور پر قابل پیروی ہے: اس کی منظوری خدا نے دی۔ لیکن حقیقی افلاطونی اعتبار سے یہ محض ایک سایہ ہے: یہ سایہ ڈالنے والی چیز ہی عمیق ترین صداقت ہے۔ جب عیسائیوں نے اپنے مذہب اور ہیلینیائی سوچ میں مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی تو یہ چیز ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ فیلو پہلا لکھاری تھا جس نے فلسفۂ یونان کو عہد نامہ عتیق سے متحد کرنے کی کوشش کی:

> چونکہ خدا زمان کو بھی بنانے والا ہے، چونکہ وہ زمان کے باپ کا بھی باپ ہے......اس لیے خدا کے ساتھ اس کا تعلق ایک پوتے والا ہے......اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے یعنی قابل محسوس کائنات کو پہلے بچے کا مقام تفویض کیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ شروع میں یہودیوں کی بجائے عیسائیوں نے فیلو کو اپنایا۔ لیکن یہودیوں اور مسلمانوں دونوں پر بھی فیلو کا اثر کافی گہرا پڑا۔ قرونِ وسطیٰ کا متکلمانہ (Scholastic) فلسفہ بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہا، اور نتیجتاً فلسفہ کو دینیات کی ''خادمہ'' قرار دیا گیا۔

خدا کی فطرت سے متعلق یونانی نظریات پر فیلو کی تشریحات یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مشترکہ فلسفہ کی بنیاد بن گئیں۔ اس لحاظ سے اس نے مذاہب عالم کی ترقی میں زبردست حصہ ڈالا۔

18

عہد نامہ جدید

"The New Testament"

64 تا 110 عیسوی

پیغمبر یرمیاہ نے اعلان کیا: ''دیکھ وہ دن آتے ہیں خداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔'' (یرمیاہ 31:31)۔ عیسائیوں نے عہد نامہ عتیق کے اس اقتباس کو اپنے اس یقین کے جواز کے طور پر پیش کیا کہ شریعت یسوع مسیح کی ذات میں کالعدم ہوگئی۔ لیکن یہودی یسوع کو اپنا مسیحا نہیں مانتے اور ان کے مذہب کی ترقی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ تاہم، یہ کہنا پڑے گا...... یسوع کی اہمیت کے خلاف تعصب سے کام لیے بغیر...... کہ عہد نامہ جدید تاریخی لحاظ سے غیر معتبر اور نہایت غیر مکمل مجموعہ دستاویزات

ہے۔ یہ کتاب ہمیں یسوع مسیح کے حقیقی ارادوں سے گمراہ کرنے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ اگر لوگوں کو حقیقی مذہب کی خواہش ہے تو وہ اس بات کو تسلیم کریں گے۔ ہمیں شواہد کے ٹکڑے ہی جوڑ کر اکٹھے کرنے ہوں گے۔ بھرپور تفصیلی تصویر بنانا ممکن نہیں۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر قرار دیا گیا۔ خدا کے بیٹے کے طور پر حضرت عیسیٰؑ کی حیثیت کو قرآن بالکل مسترد کرتا ہے۔ لیکن بالعموم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ روز قیامت خدا کے ساتھ تشریف فرما ہوں گے۔ زیادہ کٹر عیسائی ایسا ہی جوابی رویہ اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔ ابھی تک ان لوگوں کی تعداد بہت قلیل ہے جو تمام مذاہب کو ایک ہی منزل کی جانب جانے والی راہیں تسلیم کرتے ہوں۔

حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے بارے میں ہماری معلومات بدستور کم ہیں۔ عہد نامہ عتیق میں جوزیفس ''تواریخ'' میں عیسیٰؑ کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ ایک عیسائی کی جعلسازی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ گلیلی کے ایک یہودی تھے اور وہ رہبانیت پسند یوحنا پا تسمہ سے متاثر ہوئے۔ یوحنا اپنے عہد کے دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر پرچار کیا کرتا تھا کہ دنیا کا اختتام قریب ہے اور ''آسمان کی بادشاہت'' قائم ہوگی۔ یہ ممکن اور غالباً قرین قیاس ہے کہ عیسیٰؑ نے ایسینی گروہ کے ساتھ زندگی گزاری۔ اب اس گروہ کا تعلق بحیرہ مردار کے طوماروں کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ تاہم، کوئی عیسائی جتنا زیادہ کٹر ہوگا وہ اس اندازے کو اسی شدت کے ساتھ مسترد کرے گا: ابتدائی عیسائی کلیسیا نے سیکولر طاقت اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کی خاطر آرتھوڈوکسی کے نظریہ پر بہت زیادہ انحصار کیا...... آرتھوڈوکسی کا مطلب ہے: ''موجودہ حالات میں درست سمجھے جانے والے پر ایمان لانا۔'' کلیسیا کے انفرادی ارکان پر نہیں تو کلیسیا کی اقدار پر سوال کرنا لازمی ہے۔

یقیناً عیسیٰؑ ادھر ادھر گھومے پھرے، اپنے پیروکار حاصل بنائے اور پرچار کیا کہ خدا کی بادشاہت کچھ ہی عرصہ میں قائم ہونے والی ہے۔ فریسیوں کے ساتھ ان کے تضادات کو اناجیل میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہ نکتہ نظر اپنایا کہ مسیحائی مشن پورا کرنے کی خاطر انہیں تکلیف اٹھانا اور مرنا ہوگا، اور غالباً یہ قرین قیاس ہے کہ انہوں نے اپنے پسندیدہ شاگرد یہودا اسکریوطی کو اپنے ساتھ دغا بازی کرنے پر مائل کیا۔ لہٰذا یہودا اسکریوطی اس کے بالکل

rekhta

برعکس ہے جیسا کہ تاریخ میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔ یہودا تصوف کے ملاحتی رنگ کی ایک دلچسپ مثال ہو سکتا ہے۔ دوسری صدی میں کافروں کو پکڑ کر سزا دینے والوں میں سب سے نرم دل آئرینیئس کہتا ہے کہ Cainites کے خیال میں یہودا اسقریوطی ''ان معاملات سے پوری طرح آگاہ تھا، اور اس کے سوا کسی اور کو سچائی کا علم نہ تھا۔ اسی لیے اس نے دھوکے کی غلط فہمی پیدا کی۔'' چاروں مرکزی اناجیل میں اس کے ارادوں کے متعلق کچھ بھی زور دے کر نہیں کہا گیا۔

رومن گورنر Pilate نے حضرت عیسیٰؑ کو غالباً کچھ یہودیوں کے اصرار پر ہی صلیب دی تھی۔ یہودی خوفزدہ تھے کہ ان کی تعلیم امن خراب کرنے کا باعث بن سکتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مرنے کے بعد ان سے ملاقات کی تھی (لیکن کچھ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ صلیب سے مرے نہیں تھے۔ طبی اعتبار سے ایسا ممکن بھی ہے)۔ ان کے اولین پیروکاروں نے Jewry کے اندر ایک فرقہ تشکیل دیا (آج بھی ایک قلیل التعداد یہودی گروہ انہیں خدا کا بیٹا تسلیم کرتا ہے)۔ لیکن نئی عیسائیت غیر یہودی دنیا میں پھیلنے لگی۔ بالخصوص 70 عیسوی میں معبد کی تباہی کے بعد عیسائیت قبول کرنے کا رجحان بڑھا۔ عہد نامہ جدید کے صحائف کے معتبر بننے کا عمل کافی حد تک اتفاقی تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے اقوال دوسری صدی عیسوی تک لکھے نہیں گئے تھے، البتہ اناجیل (مرقس 64 تا 65ء متی، لوقا اور یوحنا 80 تا 110ء) پہلے سے موجود تھیں۔

زیر عتاب نئے عیسائی فرقہ کے ارکان کو دو رجحانات کے خلاف اپنا دفاع کرنا پڑا۔ پہلا رجحان حضرت عیسیٰؑ کو محض ایک اچھا یہودی ربی قرار دینے کا تھا۔ اس طرح ان کا خدا کے بیٹے والا مقام چھن جاتا تھا۔ لیکن دوسرا رجحان زیادہ سنگین تھا۔

ایک ''طے شدہ'' عہد نامہ جدید تیار کرنے کی کوشش سب سے پہلے مارسیون نے کی جو پونٹس (کیپاڈوشیا) میں سینوپے کے مقام پر جہازوں کا دولتمند مالک تھے۔ مارسیون کو اس کے وطن سے کافر قرار دے کر نکال دیا گیا۔ اس نے پیروکار تلاش کرنے کے لیے ایشیائے کوچک میں سفر کیا، تقریباً 140ء میں روم آیا اور 160ء میں اپنی وفات تک وہیں سرگرم عمل رہا۔ سامری

عیسائی جسٹن اور قابل تحسین مصری ''لادین'' ویلنٹینس بھی اس دور میں روم میں ہی تھے۔ وہ یقیناً ان دونوں کو جانتا بھی ہوگا۔ مارسیون نے عیسائی کاز کے لیے بہت بڑی رقم کا عطیہ دیا، لیکن اسے دوبارہ مسترد کر دیا گیا۔ چنانچہ اس نے 144ء میں سرکاری کلیسیا سے تعلق توڑ لیا۔ وہ اس امر کا قائل تھا کہ عہد نامہ عتیق کی تشبیہاتی تفسیر کرنے کا عیسائی طریقہ کار غیر تسلی بخش تھا۔

مارسیون نے عہد نامہ عتیق کو سچا مانا، لیکن حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کو اس سے آزادی کا اشارہ خیال کیا: دو خدا موجود تھے...... ایک عہد نامہ عتیق کا خالق خدا اور دوسرا عہد نامہ جدید کا کریم اور رحیم خدا۔ مارسیون کی شخصیت بے پناہ اہمیت کی حامل ہے۔ وہ بلاشبہ ایک تمناسطی تھا، البتہ ہمیں اس کے نظریات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ اس نے تعلیم دی کہ عہد نامہ عتیق کی شریعت اور نئے عہد نامہ کی رحم دلی کے درمیان ایک بنیادی اختلاف موجود تھا، اور اس نے یہ اختلافات "Antitheses" میں پیش کیے۔ مارسیون کا عہد نامہ عتیق والا خالق مشکلات پیدا کرنے کا ماہر تھا، اور اگر ایمیلی ڈکنسن اگر اس کے بارے میں جانتی ہوتی تو شاید یہودا کی بجائے اسے زیادہ پسند کرتی۔

مارسیون کے ایک عیسائی ہم عصر نے لکھا کہ ''اگر غناسطیت غلبہ پا لیتی تو عیسائیت کا خاتمہ ہو جاتا: کیونکہ اس کی وجہ سے عیسیٰ مسیح ''علم کے نظام میں مدغم ہو جاتے''؛ اور کیونکہ جسم سے نکل کر روح تک جانے کی واحد راہ ''علم'' میں ہی تھی جس کے بارے میں معدودے چند لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اس دور میں یہ ''علم'' کافی حد تک عام تھا، جیسا کہ مارسیون کی زندگی اور کام سے بھی پتہ چلتا ہے۔''

عیسائیت نے دنیاوی بنیادوں پر فتح پائی۔ تھیوڈوسیئس کے دور حکومت (379ء تا 395ء) تک عیسائی تمام دیگر عقائد کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد عیسیٰؑ کے پیغام کے عین برعکس ہونے لگا۔

تھیوڈوسیئس کے فرمان کے دور میں عہد نامہ جدید کی شریعت تقریباً 200 برس سے معطل یا نیم معطل تھی۔ کامیابی سے سرشار 419ء کی کارتھیجی مجلس نے انجام کار فہرست پر نظر ثانی کی۔

ابتدائی عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے قول وفعل کی زبانی روایات پر یقین کیا تھا، لیکن کافی حد تک سامری جسٹن (100 تا 165ء) کی کوششوں کے باعث تحریری مواد احترام حاصل کرنے لگا۔ کافروں کے شکاری آئیرینیس نے علم الاعداد کے ذریعہ اسے مزید ترقی دی۔ وہ لکھتا ہے کہ چار مرکزی اناجیل اور دیگر مواد ''الہامی'' تھا، لیکن کا قرانہ اناجیل اور اسی طرح کا دوسرا مواد ''غیر الہامی'' تھا۔

لیکن کیا یہ غناسطی اناجیل واقعی غیر الہامی تھیں؟ اور حضرت عیسیٰ کا کیا ہوا؟ کیا ان کے حقیقی پیغام پر کان دھرا گیا؟ کیا خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد کچھ اور تھی؟ کافی متنازعہ یوحنا کی انجیل کو شامل کرنے سے کچھ ادبی اذہان کو دنیا کے خاتمے میں تاخیر کا مسئلہ سمجھنے میں مدد ملی، لیکن کلیسیا نے خود کو اس خاتمے میں تاخیر کا عادی بنالیا۔

19

زندگیاں

"Lives"

پلوٹارک

اندازاً 50 تا 120 عیسوی

264 قبل مسیح تک رومنوں نے Po وادی کے سوا سارے اٹلی پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ اس سے گیارہ برس قبل اپی رس کے بادشاہ Pyrrhus کے خلاف ان کی فتح نے یونانیوں کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ 146 سے قبل مسیح میں Scipio Aemilianus نے کارتھیج کو جلا کر راکھ کر دیا اور یوں تین Punic جنگوں کا خاتمہ ہوا۔

یونانی اخلاقیات پسند، سوانح نگار اور مذہبی پیشوا ایل میسٹریئس پلوٹارکس یا مختصراً پلوٹارک (50ء تا 120ء) کے دور حیات میں روم کو پہلے شہنشاہ اوکتاویان کی سرکردگی میں مطلق اختیار حاصل تھا۔ پلوٹارک کی کتاب ہمیں کافی کچھ بتاتی ہے کہ روم اپنے عہد عروج میں خود کو کیا سمجھتا تھا۔

رومنوں نے اپنی وسیع وعریض سلطنت کو متحد رکھنے میں (یونانیوں کی نسبت) کہیں زیادہ مہارت اور عیاری کا بھی مظاہرہ کیا۔ بیمار آگسٹس (63 ق م تا 04ء) کو نہ صرف عام لوگ بلکہ ہوریس اور ورجل جیسے شعراء بھی الوہی سمجھ کر پوجتے تھے۔ لیکن کیا 14ء میں اس کی ترکہ میں چھوڑی ہوئی سلطنت کسی بھی روحانی جہت سے محروم تھی؟ وہ ادوار کئی لحاظ سے ہمارے دور جیسے تھے۔

عظیم کامیابی کا آغاز 43 قبل مسیح میں اچانک ہوا جب جولیس سیزر کو قتل کر دیا گیا۔ نتیجتاً ''حکم قتل'' کے تحت 7,500 لوگوں کا خون بہایا گیا۔ آگسٹس نے کبھی بھی رحم سے کام نہ لیا، بلکہ ہمیشہ مصلحت کے تحت ہی رحمدلی دکھائی۔ 43ء میں قتل ہونے والوں میں عظیم ترین رومن مقرر سسرو بھی شامل تھا۔ جولیس سیزر کے قاتلوں نے اس پر اتنا اعتماد نہ کیا تھا کہ اسے اپنے منصوبے میں شریک کرتے۔ لیکن ایک موقع پر اس نے مارک انتونی کے خلاف تحریریں لکھیں (قتل کے بعد تشکیل پانے والے اتحاد ثلاثہ میں مارک انتونی بھی شامل تھا)۔ سسرو مجرم قرار پایا...... اس کے قطع کیے ہوئے ہاتھ اور سر کو کلوپیٹرا کے مستقبل کے عاشق نے انتقاماً سرعام لٹکا دیا۔ تاہم، پلوٹارک ہمیں بتاتا ہے کہ سسرو کی ''فصیح البیانی کی شان وشوکت ہنوز قائم ہے۔''

ایک ''عظیم ترین'' رومن کی حیثیت میں سسرو کی کامیابی پر اچٹتی سی نظر ڈالنا قابل قدر ہے۔ انتونی کی طرح وہ بھی پلوٹارک کی مشہور ''زندگیاں'' میں شامل ہے۔ پلوٹارک نے سسرو کو یونانی مقرر ڈیموستھینز کے ساتھ رکھا۔ اگر یہ خطیب، وکیل، سیاستدان، نقاد، تکنیکی اعتبار سے قابل شاعر، خطوط نویس اور فلسفی سسرو ذاتی تجلیل کے علاوہ بھی کوئی مقصد رکھتا تھا تو وہ روم کو عظیم بناتا تھا۔ لیکن روم ماضی کے یونان کے سائے میں پھل پھول رہا تھا۔ روم یونان کا نقال اور حاسد بھی تھا۔ خود ظالم روم کی طرح سسرو بھی ڈرپوک اور غیر محفوظ تھا، لہٰذا اس نے جارحیت

اختیار کی۔ اس نے دربار میں نہایت گھناؤنا کردار اپنایا، اور نتیجتاً اس کی شہرت بہت بگڑ گئی۔ استبدادی روم کو مثالی نمونہ ماننے والے مسولینی کی طرح سسرو بھی اپنی تعریف سے بہت خوش ہوتا تھا اور مرتے دم تک شان وشوکت کا دلدادہ رہا۔ یہ خامی سسرو کی کامیابیوں کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔

پلوٹارک کلاڈیئس کے عہد حکومت میں بیوشا میں تھیبز کے قریب پرانے اور انحطاط پذیر شہر کیرونیا میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین متوسط طبقے کے تھے۔ وہ فلسفہ پڑھنے ایتھنز گیا اور بعد ازاں اپنے شہر واپس آ کر ایک سکول میں فلسفہ پڑھایا۔ 40 برس کی عمر میں اسے کسی کام سے (جو شاید کیرونیا سے متعلق تھا) روم بھیجا گیا۔ اس نے ڈومیشان (Domician) کے دور میں وہاں اخلاقیات پر لیکچر دیے۔ اس کے کچھ معترف اور مداحین پیدا ہو گئے۔ لیکن اسے اصل شہرت اپنی تحریروں کے ذریعے ملی۔

پلوٹارک نے اپنی زندگی کا نصف آخر اپنے شہر کی خدمت کرتے ہوئے آبائی علاقے میں گزارا۔ وہ اپنی عمر کے آخری تیس برس میں ڈیلفی کے مقام پر اپالو دیوتا کے معبد میں پادری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ تاہم، ان ذمہ داریوں کے باوجود اس نے ایک دانشورولی جیسی پرامن زندگی بسر کی۔ لوگ اپنے مسائل سلجھانے کے لیے اس کے پاس آتے۔ اس نے تقریباً 200 کتب لکھیں۔ ہم تک ان میں سے آدھی کتب ہی پہنچ پائی ہیں جن میں ''زندگیاں'' بھی شامل ہے......ایک رومن اور ایک یونانی ہیرو کے 23 جوڑوں پر مشتمل۔ ''زندگیاں'' میں نہ آنے والی دیگر تحریروں اور ڈائیلاگز کو غلط طور پر "Moralia" کا نام دیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ٹراجن اور ہیڈریان شہنشاہوں نے پلوٹارک کو جائز مقام دیا تھا۔

''زندگیاں'' میں پلوٹارک تاریخ کی بجائے سوانحات لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا طریقہ کار بھی...... جو نیا نہیں تھا......ایک ممتاز اور مشہور یونانی اور رومن کی زندگی کا اخلاقی تقابل پیش کرنا تھا۔ اس کا مقصد جزواً نفسیاتی اور جزواً تو ہم پرستانہ تھا: ہیرو کو سنگین حالات اور مشکلات سے دوچار کرنے کے بعد یہ دکھانا کہ وہ ان مسائل میں سے کیسے باہر آتا ہے۔

لیکن پلوٹارک ''زندگیاں'' اور نہ ہی موجودہ دور میں قابل ترجیح "Moralia" کی روشنی میں

ایک عظیم مصنف ہے۔ ہمیں ہلکی پھلکی خوشگوار گپ شپ کے لیے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس کا انداز ا عام سا ہے۔ اس میں دانش کا فقدان ہے۔ اپنے استاد آمونیئس سے سیکھی ہوئی افلاطونیت اور قبیح خورت پسندی کا اس نے یونانی دیوتاؤں پر اپنے کھوکھلے یقین کے ساتھ سمجھوتہ کرا دیا۔ رومنوں نے ان دیوتاؤں کو تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ ہی اپنا لیا تھا۔ اس کی کردار نگاری ناقص ہے۔ کبھی کبھی وہ محض تفصیل ہی بتاتا ہے، لیکن سب کچھ اس کے اس یقین سے داغدار ہے کہ کردار ایک غیر متغیر چیز ہے جس کا تعین پیدائش کے وقت ہی ہو جاتا ہے۔ وہ کردار کو تبدیل یا ترقی پذیر ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ وہ ایک عام قسم کا محقق (Antiquarian) ہے جو اپنے تفتیش و رجعت پسند قارئین کو چھوٹی موٹی تفصیلات بتاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی حکایات کے ذریعہ پڑھنے والے کی توجہ ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ 60 قبل مسیح کی مجلس ثلاثہ (کراسس، جولیئس سیزر اور پومپے) کے ایک امیر کبیر رکن کراسس کے متعلق اس کی کہانی بہت سوں کو یاد ہو گی: رومن مکان بہت آسانی سے جل جاتے تھے، چنانچہ کراسس نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جب بھی کسی گھر کو آگ لگتی تو کراسس وہاں جاتا اور مکان کا رقبہ خرید لیتا۔ یوں سستے داموں زمین خریدتے ہوئے وہ روم کے زیادہ تر حصے کا مالک بن گیا۔

پلوٹارک تاریخی تبدیلی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ وہ صرف اپنے زمان و مکان تک محدود ہے۔ اسے اپنے خاندان پر فخر ہے۔ وہ مذہبی کی بجائے توہم پرست ہے۔ وہ ذرائع پر کوئی خاص توجہ دیے بغیر محض زندگیوں کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کا مقصد صرف روم کے ساتھ اپنی حب الوطنی کا اظہار کرتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ یونانی بھی رومنوں جتنے ہی عظیم اور اعلیٰ ہیرو تھے۔ وہ ہیرو کا پجاری ہے...... جو ہرگز ایک مفید چیز نہیں...... اور کسی شخص کی پستی بیان کرتے وقت ایک قسم کی اخلاقیات کا پرچار کرتا ہے۔

وسیع اور کھوکھلے علم کا حامل پلوٹارک اپنے دور میں بہت مقبول ہوا کیونکہ اس نے رومنوں کو وہ کچھ فراہم کیا جسے سننا وہ پسند کرتے تھے: کہ ان کی تہذیب و ثقافت یونانی تہذیب کی قابل قدر جانشین تھی۔ بہرحال رومنوں کی اپنی تہذیب بہت کم تھی۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد پلوٹارک کی تصنیف نظر انداز ہو گئی۔ لیکن بعد میں جب بازنطینی اور پھر وسطی ادوار میں اس کی

کتاب شائع ہوئی تو وہ دوبارہ اہمیت اختیار کر گیا۔ نشاۃ ثانیہ میں فرانسیسی انسانیت پسند Jacques Amyot نے "Lives" (1559ء) اور Moralia (1572ء) کے تراجم شائع کیے۔ Amyot نے ''قدما کی دانش'' کا ایک جھوٹا نظریہ رواج دیا جس نے مانٹینی (Montaigne) کے مضامین میں سکہ بند حیثیت حاصل کر لی (یہ نکتہ نظر 400 برس کے عرصہ میں درجہ بدرجہ زائل ہوا)۔ نشاۃ ثانیہ پر اس کا اثر کچھ حوالے سے ایک اتفاق تھا کیونکہ اس کے پیش کردہ حقائق کی دولت گراں بہا معلوم ہوتی تھی۔ اس سے متاثر ہونے والوں میں شیکسپیئر، مانٹینی، ڈرائیڈن اور روسو شامل ہیں۔ ''بروٹس'' جیسی چند ایک زندگیوں نے فرانس میں جذبۂ انقلاب کو تحریک دلانے میں کردار ادا کیا۔

20

مقدس آگسٹس کی موت کے بعد سے تواریخ

" Annals, From the Death of the Divine Augustus "

کورنیلیئس ٹیسی ٹس

اندازاً 120 عیسوی

روم کی زیادہ تر تواریخ سلطنت کی تباہی اور زوال کے دوران ہی ضائع ہو گئیں۔ اگر روم کے تمام مشہور مورخین میں سے دو کا ذکر کیا جائے تو ہمارے پاس لائیوی (Livy) کی 142

کتب میں سے صرف 35 اور کورنیلیئس ٹیسی ٹس کی کتب میں سے نصف موجود ہیں۔

تاہم ٹیسی ٹس ہمیں خود بتاتا ہے کہ رومن مورخین کے فرائض بھی یونانی تھیوسی ڈائیڈز جیسے ہی تھے: سب سے بڑھ کر اپنے ملک کی تاریخ ریکارڈ کرنا...... ''بڑی بڑی جنگیں، شہروں کی لوٹ مار، بادشاہوں کی شکست اور فتح، یا کونسلوں اور ٹرائمیونز کے درمیان جھگڑے، زمین اور اناج کی تقسیم کے متعلق قانون سازی، اشراف اور عوام کی کھینچا تانی۔'' وہ لکھتا ہے کہ ''تواریخ'' کا مقصد نیک کاموں کو محفوظ رکھنا لیکن برے کام کرنے والوں کی بے توقیری کرنا ہے۔ اس وقت تک مکمل معروضی انداز میں ''تاریخ'' لکھنے کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن ٹیسی ٹس ''تاریخ'' نگاری کے کافی قریب پہنچا۔

اولین رومن مورخین نے یونانی زبان میں میڈی ٹرینین سمندر کے ممالک پر فتح کو یادگار بنانے کے ریکارڈز لکھے۔ انہوں نے ایسے ریکارڈ بھی رکھے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں ان کی جمہوریہ کی بناء ڈالے جانے تک کے واقعات پر مشتمل تھے۔ حقیقت کے ساتھ کافی فسانہ بھی شامل ہو گیا، اور یوں رومیولس اور ریمس (Remus) کے شجرے قطعاً مصنوعی انداز میں اختراع کر لیے گئے۔ کسی بھی لحاظ سے اہمیت کا حامل پہلا رومن مورخ میگالوپولس سے تعلق رکھنے والا یونانی پولی بئیس (202 تا 120 ق۔م) تھا جس نے روم کی فتح کی وجوہ بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی ''تاریخ'' کی صرف پانچ پہلی کتب بچی ہیں۔ یہ سادہ اور دوٹوک تحریر مفید لیکن حد سے زیادہ ڈکٹیٹ کروائی ہوئی اور ادبی اہمیت سے عاری ہے۔

تاہم، سیزر کا رفیق Gaius Sallustius Crispus (86 تا 35 ق م) ہی حقیقی معنوں میں پہلا سائنسی رومن مورخ تھا۔ بدقسمتی سے اس کی بہت کم نگارشات باقی بچی ہیں۔ اس کا طریقہ کار بھی تھیوسی ڈائیڈز والا تھا۔ اور اس نے بھی اپنے مرکزی کرداروں کے لیے موزوں تقاریر ایجاد کیں۔

لیکن جمہوریہ کی تاریخ لکھنا پدوان پیڈوآ لائیوی (Titus Livius-59 ق م تا 17ء) کے ہی مقدر میں تھا۔ ہم پیچھے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ اس کی 142 کتب میں سے صرف 35 باقی بچی ہیں۔ اس مجموعہ کتب میں اٹلی پر روم کے اصل غلبہ کا حال بیان کیا گیا ہے، زیادہ تر گمشدہ کتب میں کہانی 9 قبل مسیح تک آتی تھی۔ یوں اس میں شہنشاہ آگسٹس کے عہد حکومت کے ایک حصے کا

حال بھی شامل ہو گیا۔ لا ئیوی شہنشاہ کا قریبی دوست تھا۔ اس کی تاریخ واضح طور پر آگسٹس کی خوشنودی حاصل کرنے اور روم کو عظیم ترین قوم ثابت کرنے کی غرض سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسے کوئی اور مفہوم دینا آسان نہیں۔ ٹیسی ٹس نے اس کی بہت تعریف وتوصیف کی۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں اس تحریر کے انگریزی تراجم (1600ء) بہت پر اثر ثابت ہوئے۔

آگسٹس کی جانب سے روم کو دی گئی عظمت کے انسانی تقصانات میں سے ایک یہ تھا کہ فیصلے خفیہ مجلس مشاورت میں کیے جاتے تھے۔ چنانچہ روم کا عظیم ترین مورخ ٹیسی ٹس محدود اور پابند حالات میں کام کرنے کی حقیقت سے آگاہ تھا۔

ٹیسی ٹس 57ء میں پیدا ہوا اور تقریباً 117ء عیسوی میں دنیا سے گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے متعلق زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ اس نے 78 میں برطانیہ کے گورنر (جولیس اگریکولا) کی بیٹی سے شادی کی اور یوں روم میں ممتاز سیاسی کیریئر حاصل کر لیا۔ 13-112ء میں وہ ایشیا کا عامل (Proconsul) تھا۔ اس نے زیادہ تر شہنشاہ ٹراجن کے عہد میں ہی لکھا۔ اس کی ''تواریخ'' 69ء تا 96ء کے زمانے پر محیط ہیں، اور بعد کی تحریر ''روزنامچے'' (Annals) میں اس سے آگے کا دور ہے...... یعنی آگسٹس کی موت کے بعد سے۔ موخر الذکر کتاب میں سے صرف آگسٹس کے جانشین ٹائبریئس اور کلاڈیئس وغیرہ کی حکومت سے متعلقہ حصے ہی باقی بچے ہیں۔

وہ اپنا مقصد ''کسی لگاوٹ یا تعصب کے بغیر لکھنا'' بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ اصل میں سرد کے واضح انداز کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے زبردست المیہ (Tragedy) لکھتا ہے۔ اس نے اپنے ایک شدید اخلاقیات پسند کے کردار میں کمال حاصل کیا، اور اپنے سے پہلے کے کسی بھی تاریخ نگار کی نسبت فنی اعتبار سے زیادہ الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ کہیں انیسویں صدی میں آ کر رومن تاریخ کے بارے میں اس کے تاریک نکتہ نظر کو جھٹلایا گیا، لیکن بیسویں صدی میں وہ اپنے رنگ میں واپس آیا۔ یہ دکھانے کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے کہ رومن زندگی اور اخلاقی اصول کس قدر پستی سے دوچار ہو گئے تھے۔ رابرٹ گریوز نے تنزلی کے بارے میں اپنے جدید نکتہ نظر کی بنیاد ٹیسی ٹس پر ہی رکھی۔

ٹیسی ٹس پیچیدہ، ڈرامائی، اخلاقی اعتبار سے متنفر اور طنزیہ تھا۔ کوئی بھی مورخ اس جیسے غیر

ہموار اور پھوہڑ انداز میں شاعری کے قریب نہیں پہنچ سکا۔ وہ لکھتا ہے: ''وہ دور نیکی سے اقدر عاری نہ تھا کہ اس نے راست رویے کی کچھ عمدہ مثالیں پیدا نہ کیں۔'' اگر چہ وہ جانتا تھا کہ تاریخ ایک اعلیٰ موضوع ہے، لیکن وہ روم کی عظمت کے بارے میں لائیوی جیسا مشتاق نہیں، اور آپ کو شک گزرنے لگتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر کچھ تحفظات رکھتا ہوگا، اور اس نے عظیم تر سچائی کی خاطر اس قسم کی عظمتوں سے بالاتر ہونا سیکھا۔

ٹیسی ٹس نے ٹائبریئس کا پورٹریٹ کافی درست انداز میں پیش کیا اور جدید مورخین نے اسے دبانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے: مشکلک، منافقانہ، ذہین اور روشن ذہن لیکن اندر سے بدخواہ۔ کسی نے بہت خوب کہا کہ ٹیسی ٹس کے لیے تقدیر انسانی طرز عمل کو واضح تو کر سکتی تھی...... لیکن یہ اس کا عذر نہیں بن سکتی تھی۔ کلاسیکی دور کے متعدد جدید ماہرین ٹیسی ٹس کے مداح ہونے کے باوجود اسے ناپسند بھی کرتے ہیں۔ وہ اسے بہت زیادہ یاسیت پسند اور ''غیر منصفانہ'' محسوس کرتے ہیں۔ اگر دنیا مزید دو ہزار برس قائم رہی تو شاید تب ہماری موجودہ دور کی تواریخ کو بھی ''افسردہ'' قرار دے کر مسترد کر دیا جائے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ٹیسی ٹس کی اہمیت محض ایک مورخ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک آدمی کی حکومت کو (بین السطور) خلقی طور پر بد قرار دیتے ہوئے بیسویں صدی کے متعلق قیاس آرائی کرتا ہے۔ اس پر ہرگز حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ انیسویں صدی نے تاریخ کے بارے میں اس کے نکتہ نظر کو مسترد کر دیا اور اس کی بنیادی انسانیت پسندی کو شناخت کرنے میں ناکام رہی۔

ٹیسی ٹس آگسٹائن سے پہلے تک آخری لاطینی لکھاری تھا۔ قدیم دور اور قرون وسطیٰ دونوں میں اسے صدیوں تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ تب اس نے سولہویں صدی کے مفکرین کے ضمیروں کو جھنجوڑا (البتہ ان میں میکیاویلی اور ایراسمس شامل نہ تھے)۔ مورخین کی اکثریت اس کا یہ جرم معاف کرنے کو تیار نہیں کہ وہ پڑھے جانے کے قابل اور حقیقت سے حقیقی لگاؤ رکھنے والا ہے۔ چنانچہ بہت سوں نے اس کا جائز مقام جھٹلانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ مقام اتنا طاقتور ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گبن کا اس کی تعریف کرنا باعث حیرت نہیں۔

21

سچائی کی انجیل

"The Gospel of Truth"

اندازاً پہلی صدی عیسوی

یہ انجیل عہد نامہ جدید میں شامل نہیں۔ اس کا آغاز اس جملے کے ساتھ ہوتا ہے: ''سچائی کی انجیل مسرت ہے۔'' اسے ویلنٹائنی قیاس آرائی (Valentinian Speculation) بھی کہتے ہیں۔ انجیل یا Gospel کا مطلب یہاں صرف ''اچھی خبر'' ہے۔ عہد نامہ جدید کی دیگر اناجیل کے برعکس یہ حضرت عیسیٰ کی مکمل زندگی کا احاطہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتی۔

کہا جاتا ہے کہ ''سچائی کی انجیل'' ویلنٹائنس نے خود لکھی تھی' تاہم، یہ بات ثابت نہیں ہوسکی۔ ہمیں اس سے کوئی غرض بھی نہیں۔ ہمارے پاس اس کا ایک قبطی ورژن موجود ہے لیکن

اس کو اصل میں یونانی زبان میں تحریر کیا گیا تھا...... یہ تحریر اندازاً پہلی صدی عیسوی کے وسط کی ہے۔ یہ 1945ء کی کرسمس سے کچھ روز پہلے دریافت ہوئی اور کئی برس بعد ہی چھپی۔ تو پھر ہم نے اسے دنیا کی پراثر کتب میں کیسے شامل کرلیا؟ ویلنٹائنس کون تھا اور اس کی (یا اس کے قریبی شاگردوں کی) یہ تحریر اس قدر اہم کیوں ٹھہری؟

درحقیقت یہ اپنے ہی جیسی نادر مواد کی حامل متعدد کتب میں سے ایک ہوگی؛ پرجوش بنیاد پرست عیسائیوں نے اس جیسی سینکڑوں یا شاید ہزاروں کتب انسانیت سے چھین لیں۔ تاہم، سچائی کی انجیل میں شامل غناسطی سوچ عیسائیت سے بچی رہی...... اور یہ اب بھی موجود ہے۔ انارکی سمیت متعدد ''ممنوعہ'' نظریات سے کافی قریب ہونے کے باعث غناسطی فکری دھارے کو کبھی بھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوسکی۔ ہم نہیں جانتے کہ جب یہ تھوڑے سے عرصے کے لیے ریاستی مذہب بنی (بطور مانویت) تو اس کی اہمیت کیا تھا؛ لیکن اس کے مخالف زرتشت مت کی بیخ کنی نہ کی گئی تھی۔

ویلنٹائنی نامی لامذہب عیسائی فرقے کا بانی ویلنٹائنس مصر میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کے خیالات غناسطی رنگ میں رنگے ہوئے سینٹ جان کی زیادہ یاد دلاتے ہیں' لیکن اس کے شاگردوں نے دعویٰ کیا کہ اس نے سینٹ پال کے ایک شاگرد تھیوداس (Theodas) سے تعلیم پائی تھی۔ وہ تقریباً 136 اور 165 عیسوی کے دوران روم میں تھا (جب مارسیون بھی وہاں موجود تھا) اور اسے بشپ منتخب ہونے کی امید تھی۔ لیکن یہ امید بر نہ آئی اور وہ واپس قبرص آ کر تقریباً 175ء میں فوت ہوگیا۔ وہ نہایت متاثر کن غناسطی عیسائیوں میں سے ایک تھا۔ اگر ہم اس کے بارے میں مزید جان سکتے تو ہمیں دوسری صدی عیسوی میں عیسائیوں کے باہمی عقائدانہ تضادات کے متعلق زیادہ کچھ معلوم ہوجاتا۔ چند ایک اہل قلم کو یقین ہے کہ Irenaeus جیسے چرچ فادرز نے مذہب میں سے تمام باطنی عناصر نکالنے کی سازش تیار کی تھی۔ لگتا ہے کہ واقع بھی یہی تھا۔

یقیناً فادرز نے ایک مصنوعی مذہبی قانون بنانے کے لیے دستیاب مواد میں سے من مانے طور پر انتخاب کیا۔ اس قانون کے اندر غناسطیوں کے ہاں مسیح کی ابتدائی زندگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ خود چرچ نے بھی حضرت عیسیٰ کے پیغام کا جبرواستبداد کے ذریعہ بنا۔ شہنشاہ فریڈرک سوم

rekhta

نے 1232ء کی عدالت احتساب غناسطیوں کو پکڑنے کے لیے ہی تشکیل دی تھی۔ سیکولر اور پاپائی حکام اس بات پر آپس میں جھگڑے کہ عدالتِ احتساب کو کون چلائے گا۔ 1252ء میں پوپ انوسینٹ سوم نے ایذا رسانی اور تشدد کو جائز قرار دیا۔ یوں عیسائیت اپنی ہی متضاد بن گئی۔

ناگ حمادی کتب

7 مئی 1945ء کی رات کو بالائی مصر کے ایک علاقہ جبل الطریف میں آلات آبپاشی کے چوکیدار نے ایک ڈاکو کو قتل کر ڈالا۔ بلاشبہ یہ اس کے فرائض کے عین مطابق تھا۔ لیکن اگلے روز وہ خود بھی مارا گیا۔ یہ کلائمیکس ناگ حمادی مسودات کی دریافت تھا جن میں سچائی کی انجیل بھی شامل تھی۔ یہ ہزاروں سال قبل قبروں کے طور پر استعمال ہونے والے غاروں سے ملی۔

دسمبر 1945ء میں مقتول چوکیدار کا ایک بیٹا محمد علی السمان اپنے بھائی خلیفہ کے ساتھ مل کر اس علاقے میں نائٹریٹس تلاش کرنے کے لیے کھدائی کر رہا تھا۔ دیگر کاشتکاروں کی طرح وہ بھی سال کے اواخر میں اس کھاد کو القصر میں واقع اپنے کھیتوں میں لے جایا کرتا تھا۔ کھدائی کے دوران انہیں تارکول سے سیل بند کیا ہوا ایک مرتبان ملا۔

علاقہ کے ویران غار زہد و ریاضت کے علاوہ تدفین کے لیے بھی نہایت موزوں تھے۔ اور بلاشبہ سینٹ Pachomius (290ء تا 346ء) نے بھی انہیں اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ

ان کے قریب ہی رہتا تھا اور اس نے وہاں راہبانہ برادریوں کے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی تھی۔ یرمیاہ 32 میں یہودیوں کے خدا کو اعلان کرتے ہوئے بتایا گیا کہ ان کتابوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر ایک مٹی کے مرتبان میں رکھ دیا جائے' البتہ باب 36 میں ناگوار ادب کو جلا دینے کا بھی کہا گیا۔ چنانچہ ناگ حمادی مسوادات کو مرتبان میں چھپا دینے والے لوگ اسے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں کس سلسلے کے لوگوں نے اور کیوں چھپایا؛ لیکن امکان ہے کہ اس دور میں اس قسم کی کتابیں رکھنا جرم قرار دیے جانے کے باعث کچھ بھکشو ...... 350 اور 400 عیسوی کے درمیان ...... فاتح کلیسیا کے لوٹ مار کرنے والے سپاہیوں سے چھپ کر یہاں آ گئے تھے۔

علی اور اس کا بھائی مرتبان کو کھولنے سے خوفزدہ تھے کہ کہیں اس میں کوئی جن نہ ہو۔ ایک لحاظ سے اس میں واقعی "جن" بند تھا۔ سونے کا لالچ ان کے خوف پر غالب آ گیا اور انہوں نے مرتبان کو توڑ ڈالا۔ دولت تو نہ ملی لیکن پیپرس کے ٹکڑے باہر نکل آئے۔

علی اور خلیفہ نے ان کتب کو اپنے کپڑوں میں لپیٹا اور گھر لے آئے۔ کچھ دیر تو وہ ان کی ماں کا چولہا روشن رکھنے کے لیے اچھا ایندھن ثابت ہوئے' اور پھر باقیماندہ کتب کو علی نے نہایت سستی قیمت پر بیچ دیا۔

1946ء میں علی کو بتایا گیا کہ اس کے باپ کا مبینہ قاتل کسان احمد اپنے گھر کے قریب سڑک پر آرام کر رہا تھا۔ علی اپنے چھ بھائیوں کو اطلاع کرنے بھاگا بھاگا گھر گیا اور بے قصور احمد کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تب اہل خانہ نے احمد کا دل نکالا اور انتقامی دعوت میں کھایا۔

احمد کا باپ ایک بارسوخ آدمی تھا جس نے علی کے گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ علی نے ہر ایسی چیز گھر سے نکال دی جو اسے مجرم ثابت کرنے کا باعث بن سکتی تھی۔ اس کے بعد کی کہانی ابھی تک پوری طرح معلوم نہیں۔ نہ ہی اس سے آرتھوڈکس عیسائیوں کا یہ کیس مضبوط ہوگا کہ خدا شر کی اجازت خود نہیں دیتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انجام کار ان نوادرات کی باقیات کو اکٹھا کر کے شائع کیا گیا (1972-84)۔ 1978ء کے ایک جلد پر مشتمل ایڈیشن کی ایڈیٹنگ کرنے والے پروفیسر ڈی رابنسن نے لکھا: "اس اشاعت کے ساتھ کام ابھی شروع ہوا ہے ...... کیونکہ یہ غناسطیت کے مطالعہ میں ایک نئی ابتدا ہے"۔

22

مراقبات

"Meditations"

مارکس اوریلیئس

167 عیسوی

رومن شہنشاہ مارکس اوریلیئس (Marcus Aurelius) رواقی فلسفہ کا اوریجنل مفسر نہیں تھا' بلکہ اس کا شمار آخری اور دوٹوک مفسرین میں کیا جاسکتا ہے۔ تیز فلسفیانہ اعتبار سے اپنے زیادہ قابل پیشروؤں کے برخلاف اس کے پاس ایک سلطنت بھی تھی۔ اسی کے دور حکومت (161 تا

180 عیسوی) میں مشہور و معروف Pax Romana ٹوٹی اور بربریوں' یعنی ''تہذیب'' کی برائیوں سے پاک افراد نے سلطنت روما کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی۔ ان حقائق نے مارکس اوریلیئس کو تمام رواقیوں میں سب سے زیادہ پراثر بنا دیا۔ یہاں ہمارے پاس ایک ایسا صاحب عمل موجود ہے جو فلسفہ کو حقیقی طور پر استعمال کرتا ہے۔ اگر مارکس اوریلیئس ایک رواقی نہ ہوتا تو ایک زیادہ موثر شہنشاہ ہوتا۔ لیکن حالات اس کے خلاف تھے۔

رواقی یعنی Stoic فلسفہ کا نام دراصل ایتھنز میں ایک مسجع ستون Stoa poikile کی نسبت سے ہے جہاں رواقی فلسفی تعلیم دیا کرتے تھے۔ دو ہزار برس سے کسی بھی ایسے شخص کو رواقی سمجھا جاتا ہے جو بدقسمتی کو بلا شکایت قبول کر لے۔ رواقی نظام فلسفہ کا ایک اہم عنصر یہ تھا کہ ہر چیز دوبارہ وقوع پذیر ہوگی۔ ساری کائنات آگ بن جاتی اور پھر خود کو دہراتی ہے۔

فلسفہ کا بانی زینو (335 تا 263 ق م) تھا جس کی تحریریں اب موجود نہیں۔ اسے کلینتھس (331 تا 232 ق م) اور کرائسی پس (280 تا 207 ق م) نے ترقی دی اور منظم کیا۔ پھر بعد ازاں پوسیڈونیئس (50 تا 135 عیسوی) کی رواقیت آزاد کردہ غلام Epictetus (55 تا 135 عیسوی) کے ذریعہ مارکس اوریلیئس تک پہنچی۔

رواقیت بھی دیگر فلسفوں جیسی ہی ناپائیدار ہے۔ لیکن یہ حیرت انگیز طور پر مکمل فلسفہ ہے اور نوفلاطونیت اور عیسائیت دونوں پر اس کا اثر پڑا۔ ''مراقبات'' سے آشنائی حاصل کرنے والے بے شمار افراد بھی متاثر ہوئے۔ اس کا مغز یہ ہے کہ نیک اور عقل مند بننے کے لیے انسان کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ زندگی گزارنی چاہیے۔ رواقیوں نے فطرت کو سمجھنے کے لیے اپنے فلسفہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا: کائنات اور اس کے قوانین کی تفہیم کے لیے ''فزکس''؛ درست اور غلط بیانات میں تمیز کرنے کے لیے ''منطق'' اور ان دو علوم سے اخذ کردہ نتائج کو طرز عمل پر لاگو کرنے کے لیے ''اخلاقیات''۔ پہلے دو حصے تکنیکی اعتبار سے آج بھی موثر ہیں' لیکن زیادہ عمومی مفہوم میں ہمارے ادوار کے ساتھ ''اخلاقیات'' کا ہی تعلق بنتا ہے۔

رواقیت اپنی اصلیت میں مذہبی ہے' لیکن افلاطون کے برخلاف ...... جو صرف اعیان کو حقیقی مانتا تھا ...... یہ فلسفہ ہر چیز کو مادی مانتا ہے۔ رواقی اولین باقاعدہ وحدت الوجودی تھے: خدا

rekhta

کائنات ہے' کائنات خدا ہے۔ دانا اور نیک انسان اس سارے منصوبے میں اپنا مقام شناخت کرتا ہے۔ ہر فرد میں ایک روح' ایک الوہی چنگاری موجود ہے جو کائنات میں سے آئی اور واپس اسی میں جذب ہوگی۔

پوسیڈونیئس نے ایک تھیوری کی تفصیلات پر کام کیا جس کے تحت کائنات میں تمام قوتیں مل کر کام کرتی ہیں؛ انفرادی طرزِ عمل کا مقصد اسی کی تفہیم ہونا چاہیے۔ انسان سب سے بڑھ کر دنیا کا شہری تھا۔ وجود کے نکتۂ نظر اور سپائنوزا کے فلسفہ کے درمیان مشابہتیں واضح ہیں۔ سپائنوزا اور دیگر کی طرح رواقیوں نے بھی ایک ''مفاہمتی تھیوری'' بنائی۔ یوں کہہ لیں کہ انہوں نے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہونے اور آزادارادے کے درمیان مصالحت کرائی۔ درحقیقت ان تمام پیچیدہ دلائل کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آزادی کی تعریف کیسے کی جاتی ہے۔ رواقیوں کے معاملے میں آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اگر دانا آدمی نے کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی بہترین کوشش کی ہے تو اس کی تسکین ہونی چاہیے۔ ہمارے افعال اگر پہلے سے طے شدہ ہوں تب بھی ہم ان کے لیے ذمہ دار ہیں۔

رواقیوں کی نظر میں حقیقی دانا آدمی سونے جیسا کمیاب بھی ہے۔ چنانچہ رواقیوں نے لوگوں کے ایک ایسے طبقے کو شناخت کیا جو صحیح معنوں میں نیک تو نہیں تھے لیکن اس جانب ترقی کر رہے تھے اور جو اس دنیا میں برائی پیدا کرنے والی اخلاقی اقدار کی تہہ میں موجود کائناتی اخلاقیات کی کچھ بصیرت رکھتے تھے۔

ہسپانوی النسل مارکس اوریلیئس نے بچپن میں ہی شہنشاہ ہیڈریان کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں اسے ایک قدیم سلسلے کا پادری بنا دیا گیا۔ ہیڈریان نے اسے اس کے اصل نام مارکس آنیئس (سچائی) سے بھی زیادہ سچا قرار دیا۔ ہیڈریان کے جانشین شہنشاہ انٹونینس نے مارکس اوریلیئس کو منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ وہ 161ء میں تخت نشین ہوا۔ مارکس اوریلیئس کے ہی غلط مشورے پر اسے ایک قسم کا جونیئر شہنشاہ قرار دے دیا گیا۔ مارکس اوریلیئس کو انٹونینس کا جانشین بنانا تھا جو خوش قسمتی سے 169ء میں ہی مر گیا۔

مارکس نے اپنا سارا عہد لڑائیوں میں گزارا۔ ایک موقع پر اسے دولت جمع کرنے کے لیے

شاہی زیور بیچنا پڑے۔ اور آخر میں اسے Avidius Cassius کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جسے وہ بہت سراہا کرتا تھا۔ (بہرکیف Avidius کو قتل کر دیا گیا)۔ مارکس کی بیوی فوسٹینا بھی اس سازش میں ملوث رہی ہوگی؛ لیکن اس کے بطن سے جنم لینے والے بچوں میں مارکس کا جانشین کوموڈس بھی شامل تھا۔ 180ء میں اپنی وفات کے وقت مارکس بخوبی آگاہ تھا کہ کوموڈس ہرگز شہنشاہ بننے کے قابل نہیں۔ شہنشاہ کی حیثیت میں وہ بنیاد پرست اور (رومن معیاروں کے مطابق) عادل تھا؛ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس کے عہد میں عیسائیوں کے قتل میں نمایاں اضافہ ہوا۔

مارکس اوریلیئس کی لاطینی تحریریں بے روح ہیں (یہ تحریریں ایک استاد فرونٹو کے نام خطوط پر مشتمل ہیں)۔ لیکن ''Writings to Himself'' شاندار ہیں۔ یونانی زبان میں ان تحریروں کو اکٹھا کر کے ''Meditations'' یا مراقبات کی صورت دی گئی۔ یہاں ایک نہایت عظیم ذمہ داریوں کے حامل آدمی کے خیالات رقم ہیں۔ ایک جدید فلسفی نے بجا طور پر کہا کہ

> ان کی اہمیت یہ ثابت کرنے ہے کہ اگر ایک انسان اپنی طاقت کے عہدِ عروج میں رواقیت کے نظریۂ دنیا اور اخلاقی اصولوں کی مطابق میں باعزت اور دانستہ طور پر زندگی گزارے تو کیا ہوتا ہے۔ رواقیت کہتی ہے کہ ''کل'' ایک عظیم فطری قاعدہ اور مجموعی کاملیت ہے' انسان کو اس قاعدے کو جاننے کی جستجو کرنی اور ناگزیر کو قبول کرنا چاہیے۔

مارکس اوریلیئس نے اپنی کتاب کو خود ترتیب نہیں دیا تھا۔ کتاب کے بارہ حصوں میں سے پہلا حصہ صرف اظہارِ تشکر کے لیے وقف ہے۔ باقی کے حصوں کا مواد پڑھے جانے کے قابل اور اکثر ناقابلِ تردید خیالات پر مشتمل ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ مارکس اوریلیئس نے اپنے بہت سے خیالات پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ عام رومن شہنشاہوں میں ایک استثنیٰ ہے اور اسے اس حوالے سے یاد رکھا جانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت اپنی سلطنت کے لیے یورپ میں مزید علاقے حاصل کرنے کی منصوبہ کر رہا تھا اور اس کی دانائی یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی کہ کمال کو پہنچی ہوئی چیزوں میں ان کے انحطاط کے آثار بھی ظاہر

ہو جاتے ہیں۔

مارکس اور ویلیس کی کتاب قائل کر لینے والی ہے۔ اگرچہ مصنف ایک اوریجنل فلسفی نہیں تھا' لیکن وہ یقیناً ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتا اور مانتا تھا جن کی تعلیم دیتا تھا۔ آپ سوچنے لگتے ہیں کہ اسے حد سے زیادہ دشمن اور حتیٰ کہ خبطی اس لیے قرار دیا گیا کیونکہ اس کا عقیدہ بہت کم راحت فراہم کرتا ہے۔ تاہم، اس "ترقی" کی صدی کے اختتام پر اس کا یہ نظریہ یقیناً کچھ راحت فراہم کرتا ہے کہ ہمیں اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ شائستہ اور بے لوث رویہ اپنانا چاہیے۔ جو لوگ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں ان کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

> جس شخص کی سانس یا بغلوں سے بو آتی ہے اس پر غصہ نہ کرو۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ اس کی سانس اور بغلیں قدرتی طور پر ہی ایسی ہیں' اور ان سے یقیناً ایسی بو ہی آئے گی۔ لیکن تم کہتے ہو کہ اس شخص کو خود بھی معلوم ہے کہ وہ نزدیک کھڑا ہو کر ناگواری پیدا کرتا ہے! اور تم بھی تو سمجھ رکھتے ہو۔ اپنی موزوں، منطقی صلاحیت کو اس کی منطقی صلاحیت پر کارگر ہونے دو۔ اسے اس کی غلطی بتاؤ اور اس کی فہمائش کرو۔ اگر وہ تمہاری بات سن لے تو تم نے اس کو ٹھیک کر دیا۔ اس طرح مزید ناگواری پیدا نہیں ہوگی۔

البتہ مارکس اور ویلیس نے یہ بھی کہا کہ لوگوں کو اپنے تمام نکتہ ہائے نظر ترک کر دینے چاہئیں:

> اپنی رائے ختم کر دو' بس تم محفوظ ہو جاؤ گے۔ اور کیا چیز تمہیں اپنی رائے ترک کرنے سے روکتی ہے؟ جب تم دکھی ہوتے ہو تو یہ بھول جاتے ہو کہ سب کچھ کائنات کے فطری نظام کے تحت ہو رہا ہے' اور جو کچھ اب ہوا ہے وہی ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے' اور ہمیشہ ہوتا رہے گا . . .

یہاں بیان کردہ نکتہ نظر دھمپد سے کافی قربت رکھتا ہے۔ تاہم، چند برس بعد ہی مغرب توہمات پرستی یا "عیسائی" فتح کی دہشت میں ڈوب گیا۔

23

شک پرستی کے بنیادی پہلو

"Outlines of Pyrrhonism"

سیکسٹس ایمپیریکس

اندازاً 150 تا 210 عیسوی

یونانی طبیب اور فلسفی سیکسٹس ایمپیریکس (Sextus Empiricus) کی جائے پیدائش معلوم نہیں لیکن غالباً اس نے کچھ عرصہ روم اور سکندریہ دونوں شہروں میں گزارا۔ فلسفیانہ اچھوتا پن میں دلچسپی کے فقدان کے باعث اس کی تحریریں اہمیت کی حامل ہیں۔ سیکسٹس کا نام اسے

طبیبوں کے تجربی (Empirical) مکتبہ میں شامل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس کی تحریریں اس وقت اچانک نہایت بااثر صورت اختیار کر گئیں جب 1569ء میں ان کے لاطینی تراجم دوبارہ شائع ہوئے۔ یہ ڈیکارٹ کی پیدائش سے ربع صدی پہلے کا واقعہ ہے۔ مانٹین (Montaigne) انہیں پڑھنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی تحریروں سے صرف مانٹین ہی واقف نہیں تھا؛ کافی بعد میں ڈیوڈ ہیوم نے بھی ان کا کافی اثر لیا۔

سیکسٹس ہمیں فلسفہ تشکیکیت کے متعلق نہ صرف ''شک پرستی کے بنیادی پہلو'' میں بلکہ ''Against the Professors'' میں بھی بھرپور طریقے سے بتاتا ہے۔ یونانی تشکیکیت کا آغاز Pyrrho سے ہوتا ہے۔ Pyrrho کی اہمیت سیکسٹس سے بڑھ کر ہے۔ لیکن یورپ میں تشکیکیت کا تعارف سیکسٹس کے ذریعہ ہی ہوا۔

سیکسٹس کے توسط سے ہی سولھویں صدی نے یونانی تشکیکیت کا مزہ چکھا۔ سیکسٹس Pyrrho کے فلسفہ کا دفاع بڑے ذوق وشوق سے کرتا ہے۔ Pyrrho نے کچھ بھی نہ لکھا اور صرف اس کے شاگرد ٹیمون آف فالکیس کی تحریروں کے چند ٹکڑے ہم تک پہنچے ہیں۔ شاگردوں نے اسے ایک ایسے شخص کے طور پر بیان کیا جو شک پرست ہونے کی تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو پار کر گیا۔ Pyrrho نے آغاز میں پینٹنگ شروع کی' پھر سکندر کے عہد میں ہندوستان گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان سے کچھ خیالات مستعار لیے۔ یہ عین ممکن ہے کیونکہ ہندوستانی مذاہب اور بالخصوص بدھ مت کی طرح Pyrrho کا مقصد بھی فلسفہ نہیں بلکہ انداز حیات تھا۔ وہ واپس آ کر اپنے آبائی شہر میں مقیم ہوا اور اس کی اس قدر تعظیم وتحسین کی گئی کہ پروہت اعلیٰ مقرر کر دیا گیا...... ساتھ ہی فلسفیوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے کا فرمان جاری کیا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا ایک مجسمہ ایستادہ کیا گیا۔

فلسفیانہ اعتبار سے Pyrrho یہ دعویٰ کرنے والا پہلا شخص تھا کہ کوئی مثبت علم ممکن نہیں' اور صرف منطقی طریقہ کار ہی تمام امور کا حتمی فیصلہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ تشکیکیت پسند ''سورج کل طلوع ہوگا'' کی بجائے یہ کہے گا: ''میرے علم کے مطابق میری زندگی کے تمام دنوں میں سورج طلوع ہوتا رہا ہے' چنانچہ کل بھی ایسا ہی ہوگا۔'' بعد کے کچھ شک پرست اپنے رویوں میں زیادہ

کٹر تھے اور انہوں نے اپی قوری اور رواقی دونوں مکاتب فکر کے عقیدہ پرستوں کی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہیں (البتہ خود اپی قورس Pyrrho سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس کا مداح تھا)۔

Pyrrho کا اصل مقصد نفسیاتی نوعیت کا تھا' کیونکہ وہ ذہنی طمانیت کی حالت (ataraxia) حاصل کرنا چاہتا تھا۔ درحقیقت Pyrrho ایک تشکیکی طرز عمل کی منظوری دینے میں زیادہ پرجوش نہ تھا۔ اس نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اپنی توجہ براہ راست تجربے سے باہر کی دنیا تک محدود رکھی۔ رواقیوں اور اپی قوریوں نے بھی ''ذہنی طمانیت'' کو اپنا مقصد بنایا' مگر مختلف راہوں سے ataraxia ایک سنگین بیماری abulia کی صورت اختیار کر گیا۔

پیرے ہا کے قدیم تشکیکیت کا مرکزی مورث

لیکن یہی چیز اس کی عملی دقت کی جانب اشارہ کرتی ہے: سکون اور بے حسی کب لاپروائی اور تساہل میں بدل جاتے ہیں...... اور توجہ کی کمی کب ایک طبیب کو نیم حکیم بنا دیتی ہے؟ لیکن مجہول مطابقت پذیری یعنی Passive Conformity کے ہمراہ تمام امور میں داخلی عدم رائے بھی ہوتا ہے۔

سیکسٹس کی تصنیفات کی سولھویں صدی کے وسط میں دوبارہ اشاعت نہایت اہم ثابت ہوئی۔ اس دور میں عیسائی مذہب اور اسے اہمیت نہ دینے والے فلسفے ایسے شکوک میں گرفتار ہو گئے تھے کہ عیسائی یا راسخ العقیدہ عیسائی بھی اپنے عقیدے کو نئے سرے سے ایجاد کرنے لگے تھے۔ یہ اشاعت تو ڈیکارٹ کے لیے نقطۂ آغاز بنی۔ اسی کی بنیاد پر اراسمس نے لوتھر کی تردید کی۔ سب سے بڑھ کر ڈیوڈ ہیوم نے اس کا اثر لیا جسے نہایت ثابت قدم شک پرست قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا وہ سیکسٹس کے بغیر نامور ہو سکتا تھا؟ یہ بات درست ہے کہ ہیوم نے Historical and Critical Dictionary پر انحصار کیا جو فرانسیسی فلسفیانہ مفسر بیلے Bayle (1647ء تک

1706ء) کا شاہکار ہے۔ بیئر ے کا یہ قول ایڈورڈ گبن نے نقل کیا ہے: ''میں حقیقی پروٹسٹنٹ ہوں' کیونکہ میں تمام فکری نظاموں اور فرقوں کے خلاف غیر جانبداری کے ساتھ احتجاج (Protest) کرتا ہوں۔'' بیئر ے نے لوگوں کو سیکسٹس کے مقابلہ میں زیادہ متاثر کیا' لیکن اس نے خود بھی Pyrrho اور اس کے مختلف پیروکاروں سے اکتساب علم کیا تھا۔ برٹرینڈ رسل کے بقول' سیکسٹس ''قدیم دور کا واحد ایسا تشکیکیت پسند ہے جس کی تصنیفات ہم تک پہنچی ہیں۔''

سیکسٹس نے دیگر تشکیکیت پسندوں کے متعلق بھی بتایا جن میں ایتھنز کی تیسری اکادمی کا بانی Carneades (214 تا 129 ق۔م) بھی شامل ہے۔ Carneades نے خود تو کچھ بھی تصنیف نہ کیا لیکن اس کے خیالات دوسروں کے توسط سے مقبول ہوئے۔ اس نے 155 ق م میں ''منصفانہ رویہ'' کے خلاف اور حق میں دو متاثر کن تقریریں کیں۔ لہٰذا سسرو اس حوالے سے اسے سراہتا ہے کہ اس نے یہ دکھا دیا تھا کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ فلسفہ میں قدیم تشکیکیت کی نہایت مثبت حصہ داری تھا۔ یہ سیکسٹس ہی تھا جس نے بیئر ے' ہاکے' Adam' Eve' ماتویں' متعدد پولیس' کین' اہیل' ہوبس' سپنوزا' کپلر اور بہت سے دوسروں کو تحریک دلائی۔

اگرچہ تشکیکیت یا شک پرستی کی تاریخ میں Pyrrho' Carneades' مانٹین' ہاکے اور دوسروں کی اہمیت سیکسٹس کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ لیکن سیکسٹس نے ہی ایک موقع فراہم کیا اور یورپی فکر کی نہج بدل کر رکھ دی۔

24

اینیڈز

"Enneads"

پلوٹینس

تیسری صدی عیسوی

پلوٹینس تمام افلاطونیت پسندوں میں سب سے زیادہ عظیم ہے۔ وہ نہایت باا‌ثر صوفی تھا جس نے کبھی لفظ ''صوفی'' استعمال نہ کیا اور نہ ہی یہ اسے پسند تھا۔ قرون وسطیٰ میں اسی کی تحریروں کے ذریعہ لوگوں نے افلاطون فلسفی کو جانا۔ پلوٹینس کی نظر میں افلاطون استاد کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ ''Enneads'' میں پلوٹینس نے افلاطون کے خیالات کو یونانی مذہب اور

ارسطو کے نظریات سے ملا کر ''نوفلاطونیت'' فلسفہ تشکیل دیا (اس دور میں اس کا نام افلاطونیت تھا)۔ یہ فلسفہ آج بھی بے جان نہیں ہوا اور پلوٹینس کے خیالات مزید فروغ کے قابل ہیں۔

خود پلوٹینس کے متعلق زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ حتیٰ کہ اس کا نسلی تعلق بھی واضح نہیں۔ البتہ زیادہ تر کو یقین ہے کہ وہ اپنے لاطینی نام کے باوجود یونانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی کے غیر مستند مصنف Eunapins کے مطابق وہ تقریباً 205ء میں بالائی مصر کے علاقہ لائیکوپولس میں پیدا ہوا' سکندریہ میں فیثاغورث پسند استاد آمونیس ساکس سے تعلیم حاصل کی (آمونیس نے ہی ترتولیان اور عیسائی ماہر دینیات اوریگن کو بھی پڑھایا تھا)۔ پلوٹینس غالباً خود ایک غناسطی تھا۔ اس نے عیسائیت کا ذکر تک نہیں کیا۔ لیکن انجام کار اس نے غناسطیوں کی قنوطیت پسندی اور مادہ سے نفرت پر شدید حملے کیے۔ البتہ دیگر حوالوں سے اس کی اپنی تعلیمات بھی غناسطی نظریات سے کافی قریب ہیں' اور افلاطون کی طرح اس نے بھی مادے کو حقیقی اہمیت نہ دی اور اسے ناقص و شرانگیز قرار دیا۔ لیکن وہ اسے اس کی ترتیب میں خوبصورت تصور کرتا ہے۔

عیسائیوں کے برخلاف اس نے آزاد خیالات کو اپنانے کی غلطی کی۔ وہ نئے مشرقی خیالات کی تلاش میں سفر کرنے کا خواہشمند تھا۔ 242ء میں اس نے فارسیوں کے خلاف شہنشاہ گورڈیان سوم کی فوجی مہم میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن وہ فارس نہ پہنچ سکا: گورڈیان کو 244ء میں میسوپوٹیمیا میں قتل کر دیا گیا۔ پلوٹینس اسی برس روم آ گیا اور جلد ہی ایک دانشور رہنما اور استاد کے طور پر شہرت پائی۔ وہ فلسفی شہنشاہ جالینوس (Gallenius) کا مفید حلیف اور دوست بن گیا۔ اس نے ایک افلاطونی بستی قائم کرنے کی کوشش کی اور ایک تکلیف دہ بیماری (غالباً کوڑھ) کے باعث 270ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے یونانی شاگرد Porphyry (232 تا 305ء) کے بقول وہ عملی مفہوم میں ایک مہربان شخص کے طور پر شہرت رکھتا تھا۔

تقریباً 301ء میں پورفائری نے پلوٹینس کے تمام لیکچرز کو نو حصوں پر مشتمل 6 کتابوں میں ترتیب دیا (یونانی زبان میں ennea کا مطلب 9 ہے)۔ یہ تحریریں اسی صورت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک موقع پر ''ارسطو کی الٰہیات'' نامی کتاب (جو درحقیقت اینیڈز

کے سلسلہ وار اقتباسات پر مشتمل تھی) ایک ہسپانوی Moses de Leon نے پڑھ کر سنائی۔ Moses نے ہی قبالہ کا مرکزی متن Zohar لکھا تھا۔

ابتدا میں پلوٹینس کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ وہ دانشورانہ بت پرستی کی خاطر دو محاذوں پر جدوجہد کرنے والی تحریک کا سرکردہ رکن تھا: ایک راسخ العقیدہ عیسائیوں کے خلاف اور دوسرے غناسطیت میں ثنائی (Dualistic) عنصر کے خلاف۔ آج کے دور میں ہمارے لیے یہ سوچنا دشوار ہے کہ عیسائیوں کی نظر میں نوفلاطونیت کس حد تک قابل اعتراض تھی۔ یقیناً یہ ان کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھی؛ بہرحال وہ اس کے دین دار تھے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ سینٹ آگسٹائن نے بت خانوں کی تباہی پر اور بت پرستوں (Pagans) کی سرکوبی کو جائز قرار دینے میں خوشی محسوس کی۔ وہ اپنی تصنیف ''شہرِ خدا'' میں لکھتا ہے: ''کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں قتل کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔'' درحقیقت آگسٹائن نے پلوٹینس کو ''عظیم افلاطونی'' کہا اور پورفائری کے لیے اپنی ناراضگی برقرار رکھی جس کی تحریروں میں عیسائیت کی مخالفت پائی جاتی تھی۔ آگسٹائن کے مطابق پورفائری ''حاسدانہ قوتوں'' کے زیر اثر تھا اور اس نے مسیح کی اصولی حیثیت کو تسلیم نہ کر کے غلطی کی۔ اصل میں پورفائری بھی مذاہب کے بارے میں تشکیکیت پسند تھا اور اس کا 15 کتب پر مشتمل مقالہ ''عیسائیوں کی مخالفت میں'' اتنا پر اثر ضرور تھا کہ اسے جلانے کا حکم دیا گیا (448ء)۔ وہ مسیح کو الوہی نہ ماننے کے باوجود ان کا زبردست مداح تھا۔ ان موضوعات پر اس کے خیالات یقیناً پلوٹینس سے مطابقت رکھتے تھے۔ پورفائری کی اصل اہمیت پلوٹینس کی مبہم سوچ کو واضح کرنے میں ہے۔

پلوٹینس نے کائنات کو بذات خود ایک جاندار شے تصور کیا۔ اپنے بعد کے قبالہ کے پیروکاروں کی طرح اس نے بھی کائنات کو خدائے واحد میں سے ''مکاشفات'' (صدور) کے ایک سلسلے کے طور پر دیکھا۔ پلوٹینس کی نظر میں یہ خدائے واحد یا ہستی مطلق انسانی تفہیم سے ماورا ہے اور اس کے بارے میں عام انسانی اصطلاحات کے ذریعہ غور و فکر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی کائنات مذکر ہے' البتہ وہ ''واحد'' یا ''خیر'' کی مذکر صورت استعمال کرنے پر مائل ہے۔ یاد رہے کہ آگسٹائن کا خدا واضح طور پر مذکر یا مرد تھا۔ آگسٹائن نے خود کو اپنے فطری شکوک' تشکیکیت

اور جنسی سرگرمی میں اپنی دلچسپی کے احساس جرم سے محفوظ رکھنے کے لیے خدا کو اس صورت میں پیش کیا۔ اس کے خیال میں جنسی سرگرمی کو روکنے کا مطلب خدا کو پانا ہے۔ پال کی طرح وہ بھی یہ نہ سوچ سکا کہ محبت جنسی سرگرمی میں بھی مل سکتی ہے۔ آگستائن نے عورتوں کو اپنی ماں کے عکس کے طور پر دیکھا۔

پلوٹینس کا مطلق یا اولین ماخذ تمام حقیقت سے ماورا ہے۔ حقیقت کی ہستی کا دارومدار صرف مطلق سے صادر ہونے والی طاقت اور توانائی پر ہے۔ اس انداز فکر کا موازنہ بدھ مت کے ساتھ کرنے پر کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ اگر وہ بدھ مت سے واقفیت کے بغیر ہی ان نتائج تک پہنچا ہوتا تو یہ بات بہت متاثر کن ہوتی۔ گرجیف کی تکوینیات (Cosmology) میں بھی ہمیں یہی چیز ملے گی۔ وہ پلوٹینس سے متفق تھا کہ شر کی وجہ مادے کی خدائے مطلق یا خیر سے دوری ہے۔ یہ جتنا دور ہوتا ہے اس میں اسی قدر شر بڑھتا جاتا ہے۔

یہاں ایک ایسا خدا موجود ہے جو اپنی تخلیق پر پوری طرح قادر نہیں۔ یہ خدا تخلیق کی تاریکی میں اپنا عکس دیکھتا اور بس اسی عکس سے محبت کیے جاتا ہے۔

یہ یہودیوں یا آگستائن والا خدا نہیں۔ آگستائن اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ اپنی شہوت کو محبت کا روپ نہیں دے سکتا : یہ خدا ''خدا'' نہیں اور اسے یہ تک نہیں معلوم کہ ہر انسان کے سر پر کتنے بال ہیں ...... اور یہ ''کافروں'' یا لادینوں کو اذیت دینے یا قتل کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہ امر دنیا کے لیے المناک ہے کہ آگستائن اور کچھ دیگر پرجوش افراد اپنی عیسائیت میں اس قدر ڈوب گئے اور اسے اس کی رحمدلی سے محروم کر دیا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ نو فلاطونی لوگوں کو اذیت دے رہے یا آگ میں زندہ جلا رہے ہیں؟ بلاشبہ خود اعتقادی کی کمی نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ عیسائیوں نے ان کی دانش چرا لی ...... لیکن کیا اس قسم کے بت پرستوں کو زندہ رہنے کی اجازت دی گئی؟ اور چونکہ پورفازی مسیح کے لیے اس قدر جذبہ احترام رکھتا تھا' اس لیے غالباً پلوٹینس بھی ان کی عزت کرتا ہوگا۔ شاید اپنے مکتب کی طرح وہ بھی یقین رکھتا تھا کہ حواریوں نے مسیح کے پیغام کو زہر آلود کر دیا۔ جارج مور کے ناول "The Brook Kerith" کا یسوع مسیح صلیب سے زندہ اتر آنے کے کافی عرصہ بعد پال کو یہی بتاتا ہے۔

پلوٹینس کے چشمہ ''خیر'' میں سے موجودات کا ایک سلسلہ نکلتا ہے۔ عظیم یہودی فرانسیسی ہنری برگساں (1859ء تا 1941ء) کے نہایت بااثر فلسفہ کی طرح یہاں بھی کائنات میں دو تحریکات موجود ہیں: ایک مطلق سے نیچے کی جانب' اور دوسری نیچے سے اوپر مطلق کی جانب۔ پلوٹینس نے کہا کہ تاریخ طویل عرصوں کے بعد خود کو ہر لحاظ سے دہراتی ہے۔ وہ ہر چیز میں زندگی کی کارفرمائی دیکھتا ہے۔ نیچے یعنی فطرت کی جانب حرکت ''بری'' نہیں ...... یہ بس بہتر خصوصیات سے عاری ہے۔

پلوٹینس نے بھی تسلیم کیا کہ معجزات رونما ہوتے ہیں: لیکن انسانوں کو اپنی ذاتی کوششوں کے ذریعہ واحد کے ساتھ اتحاد حاصل کرنا چاہیے۔ پلوٹینس کی نظر میں انسان اپنی زندگی کا درجہ خود منتخب کرتے ہیں (پلوٹینس نے یہ تصور قبل از سقراط فلسفیوں سے اخذ کیا)۔ کچھ روحیں واقعی مردہ ہوتی ہیں۔ پورفازی ہمیں بتاتا ہے کہ پلوٹینس نے بھی کئی مرتبہ واحد کے ساتھ وصال پانے کا دعویٰ کیا تھا...... لیکن یہ اتحاد پائیدار نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے یہ کہا کہ اس قسم کا اتحاد کوئی نہایت مشکل عمل ہے۔

پلوٹینس کو بنیادی طور پر ایک دانشور صوفی قرار دینا درست ہے۔ لیکن وہ کوئی زیادہ بڑا دانشور نہیں۔ اینیڈز میں کچھ حصے بہت خوبصورت ہیں' اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا مصنف بھی شہوانیت سے اسی قدر تکلیف زدہ تھا جتنا کہ آگستائن۔ کچھ لوگوں کی رائے میں پلوٹینس کا روحانی وجدان رہبانیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی پاکیزگی کے لیے جدوجہد سے بھی عبارت تھا۔ اس کے مطابق سب سے پہلے واحد' پھر دانش اور اس کے بعد روح وجود میں آئی۔ لیکن پلوٹینس کی دانش استدلالی نہیں۔ اسے ''بصیرت'' کہا جا سکتا ہے۔ پلوٹینس کی تحریر کو سمجھنے میں کافی مشکلات پیش آتی ہیں' لیکن وہ اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور جھوٹ بولنے والا نہیں۔ وہ دنیا میں خوش نمائی اور نفاست کا متلاشی ہے۔ فادرز نے اس خوش نمائی کو داغ دار کیا۔ وہ اس کی خود روی اور بد جنگی کے حق میں نہیں تھے۔

25

اعترافات

"Confessions"

ہپو کا آگسٹائن

وفات 400 عیسوی

یسوع مسیح اور حواریوں کے بعد کوئی بھی انسان عیسائیت کی ترقی کے انداز کو آگستائن آف ہپو سے زیادہ متاثر نہ کر پایا۔ اگرچہ اس کی زندگی صرف 75 سال تھی، لیکن وہ پاگان روم اور قرونِ وسطیٰ کے درمیان خلا کو پر کرنے کے قابل ہوا۔ ہم اس کے حق یا پھر مخالفت میں ضرور کوئی نہ کوئی ردعمل دیتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں اور بصیرتیں شاید کسی بھی عورت یا آدمی جتنی بھرپور

تھیں۔ چند ایک لوگ ہی ''اعترافات'' کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر رہ سکتے ہیں۔ آگستائن نے دو قطبین کے درمیان زندگی گزاری: ایک نرگسیت اور دوسرا خدا۔ اس نے لکھا: ''میں تمہیں (خدا کو) جاننا چاہتا ہوں' میں خود کو جاننا چاہتا ہوں!''

سینٹ آگستائن

لیکن کیا اس کے اصل ورثے' مسائل کے لیے اس کے پیش کردہ حل نے حساس لوگوں کو اسی طرح متاثر کیا تھا جیسے کہ ماہرین الٰہیات ہمیں بتاتے ہیں؟ یا کیا وہ (اور اس کی کٹر عیسائی ماں) ایک راہ گم کردہ بیوریطانی تھا؟ اور کیا انجام کار اس نے شہوانیت' جنسیت کے اظہار کو سیدھی سادی نرگسیت کے برابر لا کھڑا نہیں کیا تھا؟ کیا اسے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ حقیقی محبت کیا ہے؟ یا اس محبت کے طبعی اظہار کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

کیا آگستائن کا خدا محض ایک پرجوش ذہین انسان کا ہسٹیریائی ترفع ہے جو انجام کار اپنی زندگی کا مفہوم ہی بھلا بیٹھا تھا؟ کیا وہ ایسے لوگوں کے لیے بھی کوئی معنی رکھتا تھا جو آرتھوڈوکس عیسائی نہیں تھے...... وہ جنہیں عیسائی کلیسیا کے ظلم و ستم کی تاریخ کے باعث اس

پر بھروسہ نہیں تھا؟

آگستائن کے لیے خدا کی مطلق اچھائی اور علیم وخبیر ہونے کی خصوصیات عظیم ناقابل گریز حقائق تھے۔ اسے یہ یقین تھا کہ تمام انسان ازل سے ہی ملعون ہیں لیکن خدا رحیم ہے۔ آگستائن کے آخری فیصلہ کن دور کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے عقیدے کی خطرناک نوعیت بذات خود اس کے ممکنہ طور پر سچے ہونے کے خلاف دلیل نہیں...... اور وہ اتنا عقل مند ضرور تھا کہ اس نے دنیا کا چہرہ بدلنا چاہا۔ تاہم' اس امر کی اہمیت بہت کم ہے کہ وہ ایک فلسفیانہ کی بجائے ذاتی وجہ کی بناء پر اپنے عقیدے تک پہنچا: اس نے اپنے عقیدے کی فلسفیانہ توجیہہ بھی تو پیش کی تھی' اور اس کی عظیم تحریر کو'' کا قرانہ'' قرار دیا گیا۔

اگر ہم تسلیم کرلیں کہ مغرب میں عیسائیت کا عروج محض ایک'' حادثہ'' تھا تو مسیح کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم'' عیسائی'' نہیں۔ اس صورت میں ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ تمام ادارے اپنے بانیوں سے دغا ہی کیا کرتے ہیں۔ محاورہ عام ہے کہ'' اگر تم خدا پر یقین رکھتے ہو تو پادریوں سے دور رہو۔''

لیکن اگر ہمارا یقین ہے کہ عیسائیت اس لیے'' کامیاب ہوئی'' کیونکہ خدا نے تمام دیگر مذاہب کو جھوٹا اور گمراہ کن ثابت کردیا تھا تو تب ہم ہر مفہوم میں عیسائی ہیں' اور ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس دور کے ہزاروں کلیساؤں میں سے کون کون سے'' سچے'' ہیں۔

مسیح کے بعد ابتدائی صدیوں میں جب کلیسیا خود کو قائم کرنے میں مصروف تھا تو دو قسم کی عیسائی قیادت موجود تھی۔ ترتولیان اور جیروم نے عیسائیت کو ایک دلی معاملے کے طور پر پیش کیا۔ عیسائیت کی اس قسم کے مطابق'' خدا نے خود کو ظاہر کردیا ہے اس لیے **تمھارے لیے** سوچنا ضروری نہیں' بلکہ غلط ہے۔'' اس دلیل کی کوئی دانشورانہ اہمیت نہ تھی: لیکن تب اس کی شدید ضرورت تھی کیونکہ عیسائی کلیسیا میں نئے داخل ہونے والوں کی وسیع اکثریت عقلی بنیاد کو ہرگز سمجھ نہ پاتی۔

دوسری قسم کے عیسائی (جن کی اولین مثالوں میں آگستائن بھی شامل ہے) آج بھی زیادہ

مبہم شخصیات ہیں...... درحقیقت یہ'' دانشور'' عیسائی نہیں بلکہ نوفلاطونی تھے۔ آگستائن کلیسیا کے کسی فادر کی بجائے'' لادین'' پیغمبر مانی اور نوفلاطونی پلوٹینس کے ذریعہ عیسائیت میں داخل ہوا تھا۔

آگستائن یونانی حروف تہجی سے کچھ زیادہ بمشکل ہی جانتا تھا' اس لیے یہ واضح نہیں کہ اس نے ان مفکرین کا علم کیسے حاصل کیا۔ لیکن وہ ان کا ذکر کرتا اور حوالہ دیتا ہے اور یہ بات ہمہ گیر طور پر تسلیم شدہ ہے کہ وہ ان کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھا۔ خود ایک دانشور ہوتے ہوئے بھی وہ انجام کار دانشوروں کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے سب کے لیے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ اب انہیں یہ کام خود کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ الجیریا میں تیونس کے ساتھ لگنے والی سرحد پر ایک چھوٹے سے قصبے Tagaste (موجودہ Souk Ahras) میں پیدا ہوا۔ وہ ایک پاگان باپ اور عیسائی ماں مونیکا کا بیٹا تھا۔ آگستائن کی زبان لاطینی تھی۔ اس کی پرورش ایک عیسائی کے طور پر ہوئی (اس دور میں رومن افریقہ کا مذہب عیسائیت تھا)' لیکن کارتھیج کی یونیورسٹی میں قانون کا مطالعہ شروع کرنے پر اس نے عیسائیت سے تعلق توڑ لیا۔ وہ اپنی ایک محبوبہ بنا چکا تھا' اور اس کے ساتھ 15 برس گزار کر ایک بیٹے کا باپ بھی بنا۔ رومن قانون دان اور سیاستدان مارکس تولیس سسرو (106 تا 43 ق م) کی گمشدہ تحریر Hortensiaus کے مطالعہ نے اسے ادبی ذوق دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ فلسفیانہ کھوجی بھی بنا دیا۔ نوجوانی کے دور میں وہ شدید متجسس تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ مانی مت کا پیروکار بن گیا۔ '' اعترافات'' میں وہ مانویت پر کافی تفصیل سے بات کرتا ہے۔

جدید مفسرین غناسطی مانی کا ذکر فلسفیانہ حوالے سے قابل نفرت اور مکار شخص کے طور پر کرتے ہیں' اور ان کی اس رائے کی بڑی وجہ آگستائن کا نکتہ نظر ہے...... البتہ آگستائن نے مانوی اختلافیات کو برا بھلا کہنے کی عیسائی عادت نہ اپنائی تھی۔

مانی (Manes) کی تعلیمات دراصل بہت گہری تھیں' لیکن انہیں سمجھنے میں ہمیشہ مشکل پیش آئی کیونکہ اس کے بارے میں زیادہ کچھ دشمنوں نے ہی لکھا ہے۔ یہ تعلیم سوچ اور عقیدے کے کئی بظاہر مختلف دھاروں کا نہایت منظم حاصل تھی۔ ہمیں ان دھاروں کا ماخذ کھوجنے کی ضرورت

ہے' کیونکہ ثنویت (Dualism) کے متعلق آگسٹائن کی پریشانی نے ہی اسے اپنی ماں کے کیمپ میں دھکیل دیا۔

اول' زرتشت کی ثنویت موجود تھی: ابتدائے آفرینش میں شر اور خیر کے دو خدا برسرپیکار ہوئے اور وہ بدستور لڑ رہے ہیں...... زمانے کے اختتام پر ہی خیر کی فتح ہوگی۔ اس کے بعد افلاطون کی فلسفیانہ ثنویت موجود تھی۔ افلاطون کی نظر میں ازلی' روحانی اعیان (Ideas) صرف اپنا مادی دنیاوی عکس رکھتے ہیں۔ ''قوانین'' میں حتیٰ کہ ایک کمتر روح (یا روحوں) کا اشارہ بھی موجود ہے جو ''غیر منظم'' حرکت پیدا کرتی ہے۔

بدھ مت میں بھی ''ہستی'' اور ظاہری ''روپ'' کے درمیان ایک متوازی قسم کی ثنویت پائی جاتی ہے (مانی کو جب نوزرتشتی پروہتوں نے فارس سے نکالا تو وہ ہندوستان کی جانب گیا تھا)۔ مانی سے پہلے کے غناسطی بھی موجود تھے جن کے نظریات کے مطابق مادہ ''شر'' تھا۔

مانی فارسی غناسطی فرقے میں پیدا ہوا' اس نے 24 برس کی عمر میں اپنے گروپ کی بنیاد رکھی۔ آگسٹائن کی طرح وہ بھی نہایت ایمانداری سے پرچار کرتا تھا کہ ازل سے ہی ''سلطنتِ نور'' کے ساتھ ساتھ ایک ''سلطنتِ ظلمت'' بھی موجود ہے۔ ان فکری نظاموں میں مادہ ایک قسم کا نقص یا حادثہ ہے۔ مانی کے نظام میں بدھ اور یسوع مسیح نجات دہندہ ہیں' اس نے خود بھی ایک نجات دہندہ ہونے کا دعویٰ کیا۔

مانوی فرقے دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے : ''کامل'' اور کثیر التعداد ''سامعین'' جو ابھی اعلیٰ حالت تک نہیں پہنچے تھے۔ آگسٹائن خود بھی ایک دور میں سامع ہی تھا۔ وہ اعترافات میں خدا کے نور کا ذکر کرتا ہے جو ایک انجیر میں سے خارج ہو کر ایک منتخب بندے کے پیٹ میں جا رہا تھا۔

آگسٹائن نو برس تک اس فرقے سے وابستہ رہا' البتہ وہ اس کے متعلق شکوک کا شکار تھا۔ شاید اس نے ابن الوقتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روم میں (ایک پاگان کی دعوت پر) علم البیان کے ایک سکول میں صدر کا عہدہ قبول کر لیا تھا۔ اپنے طلباء کی دھوکہ دہی سے دلبرداشتہ ہو کر وہ

میلان گیا اور ایک متشکک بن گیا...... یوں کہہ لیں کہ اس نے عارضی طور پر اس عقیدے میں پناہ لی کہ مسیح تک پہنچنے کا کوئی یقینی راستہ موجود نہیں۔ پھر میلان کے ایک باغ میں حواری پال کی ایک تحریر پڑھتے ہوئے ایک جملہ اس کی نظر سے گزرا: ''جسم کے لیے کوئی رعایت نہ دو۔''

بہ امرِ حقیقت آگسٹائن اپنی من پسند جنسی مسرت کے باعث ہمیشہ مشکلات کا شکار رہا۔ وہ ایک ہیجانی تھا جو دلجمعی کے ساتھ جسمانی مسرت کا حظ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بہت سے لوگ اسی الجھن کا شکار رہے ہیں یا شکار ہیں۔ میلان کے بشپ ایمبروز کے زیرِ اثر اس نے ایک کہانی سنی جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح دو بیوروکریٹ سینٹ انتونی کی سوانح پڑھ کر راہب بن گئے تھے۔ آگسٹائن نے 385ء میں بپتسمہ لیا اور 385ء میں ہپو (Hippo) کا بشپ بن گیا۔ اس کی باقی زندگی کفر کے خلاف لڑتے ہوئے گزری۔

آگسٹائن نے اپنی کتاب ''اعترافات'' 397ء اور 401ء کے دوران لکھی' اور یہ بلاشبہ اس کی مقبول ترین کتاب ہے۔ صرف عیسائی ماہرین دینیات نے اس کی کٹر عقائد پر مبنی تحریروں کو پڑھا ہے۔ وہ علم البیان کا ماہر ہے' اور اپنے تمام گر استعمال کرتا ہے۔ اس نے اپنی دوسری عظیم کتاب ''شہرِ خدا'' 413ء اور 426ء کے دوران وقفے وقفے سے لکھی۔ یہ کتاب قرونِ وسطیٰ میں کلیسیائی پالیسی کی بنیاد بنی۔ اس کا مقصد اصل میں اس الزام کا جواب دینا تھا کہ عیسائیت سلطنتِ روما کے زوال کی ذمہ دار تھی۔

پاگان سے عیسائی فلسفہ تک کے عبوری مرحلے میں آگسٹائن کی شخصیت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ بہرحال وہ ایک فلسفی سے زیادہ ماہرِ دینیات ہے کیونکہ اس کا فلسفہ ہمیشہ ہی الہیات کا خدمت گار نظر آتا ہے۔ اس نے کیلون ازم کے لیے راہ ہموار کی۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی رحمت سے ہی انسان بہشت کے لیے منتخب ہوتے ہیں' لہٰذا بہشت کا ملنا تقدیر میں پہلے سے متعین ہو چکا ہے۔ بعد میں کیلون نے ابدی دوزخ کا نظریہ ایجاد کیا۔

ہم آگسٹائن کو جدید معیاروں پر نہیں جانچ سکتے۔ حالانکہ اس کا دور بھی کچھ حوالوں سے ہمارے عہد جیسا ہی تھا۔ لیکن ایک عیسائی دنیا کے بارے میں اس کی پیش گوئی درست ثابت نہیں

ہوئی۔ اب ہم ایک بعد از عیسائیت دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگر مسیح نہیں تو مسیحی دعوے مردہ ہو چکے ہیں۔ کلیساؤں کو ناکامی ہوئی اور اب وہ آزاد خیالوں اور ہم جنس پرستوں کے لیے کلب بن گئے ہیں۔ فاتحین نے تاریخ کو اپنے مقاصد کے مطابق تحریر کیا ہے۔ لیکن عیسائی کلیسا کا یسوع مسیح اب حیات نہیں۔

آگسٹائن بلاشبہ قابل تعریف اور قابل قدر ہے' لیکن وہ انسانیت پسندی کے حق میں نہیں۔ اس نے پاگان روایات کے پیروکاروں کے قتل و غارت کو سراہا۔ اس نے واضح طور پر جنسی خواہش کو ہر حالت میں ازلی گناہ کا ایک حصہ تصور کیا۔ یہ درست ہے کہ اس جیسے نفیس اور شستہ آدمی کی موجودگی میں عدم رواداری کو لگام ڈالی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اس عدم رواداری کا خود بھی حامی تھا۔

26

قرآن کریم

"The Koran"

ساتویں صدی عیسوی

قرآن کریم (کے نزول) سے پہلے ہی اسلامی مذہب اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ عربی زبان میں ''اسلام'' کا مطلب ''اللہ کی اطاعت'' ہے۔ اسلام مغربی مفہوم میں محض ایک مذہب سے بڑھ کر ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور خدا کی مرضی کے سامنے اطاعت ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے کبھی بھی الوہی اختیارات کے حامل ہونے کا دعویٰ نہ کیا: ان کی پوجا ایک سنگین شرک ہے' لیکن انہیں ایک خاص اور ماورائے انسان رتبہ دیا جاتا ہے کیونکہ کسی عام انسان سے وحی کا بوجھ برداشت کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مذہبی اور سیکولر کے درمیان اہل مغرب کی تفریق اسلام کے معاملے میں لاگو نہیں ہوتی۔ یہ ایک دین' ایک ضابطہ حیات' ایک قسم کی تہذیب ہے۔ اسلام نے ساتویں اور آٹھویں صدی کے دوران شمالی افریقہ' مغربی اور وسطی ایشیا' سندھ اور سپین میں عرب فتوحات کے ذریعہ تیزی سے فروغ پایا۔ بعد کی صدیوں میں دوسرے علاقے بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے: جنوبی روس' ہندوستان' ایشیائے کوچک' بلقان' انڈونیشیا اور چین۔

اسلام کا بنیادی منبع اور سند قرآن کریم ہے۔ عربی لفظ "القرآن" کا مطلب بول کر پڑھنا ہے۔ مسلم روایت کے مطابق ایک فرشتے حضرت جبریلؑ نے حضرت محمدﷺ کو اللہ کا کلام پڑھایا۔ اسی قسم کا فرشتہ یہودیت اور اس سے بھی پہلے زرتشت مت میں ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ حضرت مریمؑ کے حاملہ ہونے کی بشارت بھی اسی نے دی تھی۔

واضح رہے کہ فرشتے خدا اور انسان کے درمیان پیغام رسانی کرتے ہیں۔ وحدانیت پرست مذاہب میں ان کا وجود لازماً ملتا ہے' کیونکہ یہ اپنے معتقدین کو خوش رکھتے ہیں۔ فرشتے ایسی ہستیاں ہیں جن کا جسم نہیں ہوتا۔ ٹامس آکوئنس نے فرشتوں کو یوں بیان کیا: وہ غیر مادی ہیں اور کسی جگہ پر موجود نہیں ہو سکتے لیکن اگر چاہیں تو کوئی عمل یا کام کر سکتے ہیں۔ مختلف مکاتب فکر کے فلسفیوں کے درمیان فرشتوں پر بحث کافی دلچسپ رہی ہے (مثلاً یہ مسئلہ کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے ناچ سکتے ہیں)۔ پروٹسٹنس نے فرشتوں کے متعلق زیادہ بات نہ کی۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے خیال میں ان پر حد سے زیادہ توجہ دینا بت پرستی کے مترادف ہے۔

حضرت محمدﷺ تقریباً 570 عیسوی میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کی سوانح کے لیے ماخذوں میں قریبی لوگوں سے روایت کردہ بیانات شامل تھے' لیکن انہیں آٹھویں صدی سے پہلے تحریری شکل میں نہیں لایا گیا تھا۔ حضرت محمدؐ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ شہر مذہبی زیارت کے علاوہ تجارت کا مرکز بھی تھا۔ یہ شہر شمالی عرب اور میڈی ٹرینین ممالک کے درمیان مصروف تجارتی راستے پر واقع تھا۔ بچپن میں ہی باپ اور ماں کی جدائی کا دکھ سہنے کے بعد آپؐ نے اپنے دادا اور پھر چچا حضرت ابوطالب کے پاس پرورش پائی۔ 25 برس کی عمر میں آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا اور ان کے بطن سے تین بیٹیوں کے باپ بنے۔ کامیاب تجارتی زندگی

گزارنے کے دوران آپ کو غور و فکر کی عادت ہوگئی اور آپؐ نے تجلیاں دیکھیں۔ 40 برس کی عمر میں آپؐ نے مکہ کی گلیوں میں اعلان کیا کہ آپ کو ایک خدا (اللہ) کی عبادت پر لوگوں کا مائل کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے کے عرب بہت سے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔

مکہ کے تاجروں اور خانہ کعبہ کے پجاریوں کو بت پرست قرار دیا جانا محض اقتصادی بنیادوں پر شہر کے سرکردہ خاندانوں کے لیے تشویشناک تھا: انہوں نے حضرت محمدؐ اور ان کے اہل قبیلہ کو شہر بدر کر دیا۔ آئندہ دس برس کے دوران آپؐ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حمایت اور معاونت حاصل ہوگئی۔

622ء میں رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کی یہودی اور عرب آبادی نے آپؐ کو دعوت دی تھی۔ اسلامی کیلنڈر کا آغاز اسی واقعہ کے سن سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے رسول اللہؐ کی قیادت میں وہاں کی آبادی کو سیاسی طور پر مستحکم کیا' مخالف یہودیوں کو باہر نکالا اور مکہ کے تجارتی قافلوں کی راہ میں رکاوٹ بننے لگے۔

630ء میں مکہ نے پرامن طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں سے بت پرستی کا خاتمہ کر کے اسے ایک خدا کا گھر بنا دیا گیا۔ 632ء میں رسول اللہؐ کے وصال پر حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنائے گئے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنے۔

حضرت محمدؐ حقیقی معنوں میں ایک سچے' عابد و زاہد اور پارسا انسان تھے۔ آپؐ نے ذات الٰہی میں غرق ہونے کے کئی مراحل طے کیے۔ ان چند مخصوص موقعوں کے سوا آپؐ نے کبھی بھی اللہ کے ساتھ اتحاد کا دعویٰ نہ کیا۔ آپؐ کو تو لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا تھا۔ اور یہ کام آپؐ نے نہایت ایمانداری اور استقلال کے ساتھ انجام دیا۔

آپ مکہ سے کچھ میل دور غار حرا میں زہد و عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک صبح اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ آیا اور آپؐ سے مخاطب ہوا: "آپ اللہ کے رسول ہیں!" آپؐ پر دہشت طاری ہوگئی۔ فرشتہ دوبارہ ہم کلام ہوا: "پڑھو۔" آپؐ نے پوچھا: "میں کیا پڑھوں۔" اس کے بعد قرآن کے اولین الفاظ نازل ہوئے۔ یہ 610ء کے ماہ رمضان کا واقعہ ہے۔ آئندہ بیس برس کے دوران آپؐ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان آیات کو چمڑے کے ٹکڑوں' ٹوٹے کچے برتنوں'

اونٹ کی ہڈیوں' کھجور کے پتوں اور درختوں کی چھال پر لکھ لیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے ان سب کو اکٹھا کیا اور تقریباً 651ء میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے قرآن پاک کا مستند نسخہ مرتب کر دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ کے وقت سے لے کر اب تک قرآن کے ایک حرف میں بھی تحریف یا ترمیم نہیں ہوئی۔

پہلی سورۃ کو چھوڑ کر قرآن کی تمام سورتوں کو طوالت کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یعنی طویل سورتیں شروع میں ہیں اور چھوٹی آخر میں۔ پینگوئن پبلشرز نے ترتیب نزولی میں بھی قرآن کا ایک نسخہ شائع کیا گیا' لیکن اس کے بارے میں تمام محققین کی رائے متفقہ نہیں۔

قرآن نثر نہیں بلکہ منظوم شاعری کی صورت میں ہے۔ اعلیٰ ادبی معیار بذات خود کوئی چیز نہیں۔ ادبی کسوٹی کے علاوہ بھی متعدد عوامل موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی غیر مسلم کے لیے قرآن پاک اعلیٰ پایہ کی باطنی یا وجدانی شاعری ہے۔ اس سے ہمیں اسلام کی ابتدائی ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس عہد کی عرب دنیا میں وحدانیت پرستانہ سوچ پہلے بھی موجود تھی۔

کچھ مغربی دانشوروں کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قرآن تخلیق کیا۔ صوفیاء نے رسول کریم کی زہد و ریاضت کے رجحان کو اپنایا۔ ذکر الٰہی ایک خصوصی قسم کی آگہی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ سورج کے گرد سیاروں کی گردش کی نقل میں مشہور "گھومنے والے ترک درویشوں" کا رقص بھی ذکر کی ایک قسم ہے۔

بہت سے غیر مسلموں کے لیے اسلام کی روحانی معتبریت کا ثبوت تیرہویں صدی کے فارسی صوفی مولانا جلال الدین رومی کی شاعری میں ہے۔ (رومی ہی گھومنے والے درویشوں کے "مولوی" سلسلے کے بانی ہیں)۔ وہ کٹر یا راسخ العقیدہ مسلمان نہیں تھے' لیکن انہوں نے مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کو ہی متاثر کیا۔ ترکی کے شہر قونیہ میں ان کا مزار مقدس زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا روم کی شاعری کی کتاب (دیوان شمس تبریز) اور مثنوی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں بلاشبہ تاریخ کے چھ یا سات چوٹی کے شاعروں (بشمول ہومر' شیکسپیئر اور دانتے) میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حضرت محمدؐ کے پیغمبر خدا ہونے پر رومی کا یقین غیر مسلموں کو بھی اس بات کا قائل کرتا ہے۔

27

زبوں حالوں کے لیے ہدایت نامہ

"Guide for the Perplexed"

موسس میمونائیڈز

1190ء

ہمارے ناخوش دور کا کوئی درست سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص میمونائیڈز (المشہور RamBam) کو "اشرافیت پسند" (ellitist) قرار دے گا۔ لیکن اس کی کتاب "زبوں حالوں کے لیے ہدایت نامہ" بے وقوف اور استبدادیت پسند لوگوں کے لیے نہیں تھی...... ایسے لوگ خود

rekhta

کو" زبوں حال" نہیں سمجھتے۔

ایک ربی روایت کے مطابق غیر ہدایت یافتہ لوگوں کے ایمان کو ایسے معاملات پر بحث کے ذریعہ خراب نہیں کرنا چاہیے جو ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر کتابوں کو رسائی میں اور عقیدے کی سادگی کو محترم نہ رکھا جائے تو یہ نظریہ درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

میمونائیڈز کا رڈوبا (قرطبہ) کے ایک مسلمان (الموہادی) علاقے میں 1135ء میں پیدا ہوا۔ لیکن ابھی وہ تیرہ برس کا ہی تھا کہ اس کے خاندان کو الموہاد کی فتح کے باعث وطن چھوڑنا پڑا۔ شمالی افریقہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ 1165ء میں درباری طبیب کے طور پر پرانے قاہرہ میں مقیم ہو گیا۔ انجام کار وہ مصر میں یہودیوں کا لیڈر رہا۔

وہ نہ صرف اپنی کتاب "زبوں حالوں کے لیے ہدایت نامہ" بلکہ یہودی شریعت پر اپنے زبردست کام کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہودی شریعت کی 14 جلدوں پر مشتمل تشریح عبرانی زبان میں جبکہ اس کی دیگر زیادہ تر کتب عربی زبان میں ہیں۔ تاہم 'ہدایت نامہ کے یہودی اور لاطینی تراجم نے زیادہ اثر ڈالا۔

میمونائیڈز اس مفہوم میں عظیم یورپی کلاسیکی منطق پسندوں ...... ڈیکارٹ' سپنوزا اور لیبنز ...... کا پیش رو تھا کہ وہ یقین رکھتا تھا کہ منطق کے ذریعہ علم کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہدایت نامہ کو جان بوجھ کر سنگین تضادات سے بھرپور معمائی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس دور میں پرہیزگار اور ادبی ذوق رکھنے والے یہودیوں نے اس کی بہت مخالفت کی۔ میمونائیڈز کے خیال وہ مخالفین تو ہم پرستانہ نکتہ نظر رکھتے تھے۔ یہودی شریعت کے متعلق تحریر میں بھی وہ اپنے اصول پر کاربند رہا: "انسان کو منطق کو کبھی بھی پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ آنکھیں آگے کی طرف ہوتی ہیں نہ کہ پیچھے کی طرف۔" اس نے ہمیشہ سادہ ترین مفہوم پر انحصار کیا۔

ہدایت نامہ ان لوگوں کے لیے تھا جو عقیدے کی تعلیمات اور فلسفے کی تعلیمات کے درمیان الجھنوں کا شکار تھے: "اس مقالے کا مقصد مذہبی آدمی کو بصیرت دینا ہے جسے ہمارے مقدس قانون کی سچائی پر ایمان لانے کی تربیت دی گئی ہے ...... اور جو اپنی فلسفیانہ تحقیقات میں بھی کامیاب ہے۔"

میمونائیڈز بنیاد پرستی کا مخالف تھا۔ اس نے ان بنیادوں پر صحائف کی تشبیہاتی تعبیر کو مسترد کیا کہ انسانی فہم سے ماورا خدا انسانی خصوصیات کا حامل نہیں ہو سکتا ...... وہ "محبت کرنے" یا "چلنے" یا "انتقام لینے" کی صفات نہیں رکھتا۔ اس کی نظر میں یہ تمام خصوصیات ایک ماورا ہستی کے افعال کے لیے انسانی استعارے تھے۔ ہماری موجودہ دنیا میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے بنیاد پرست یقیناً اسے سرد ست مسترد کر دیتے ہیں...... لیکن ان میں سے چند ایک نے ہی میمونائیڈز کے متعلق سنا ہے۔

میمونائیڈز نے اپنے متعدد دلائل کے لیے سابقہ عرب فلسفہ پر بہت زیادہ انحصار کیا۔ اس نے ابن سینا (980ء تا 1037ء) اور ابن رشد (1126ء تا 1198ء) سے بہت کچھ لیا' چنانچہ اس کی سوچ پر پلوٹینس کا نقش کافی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ فارسی شاعر ابن سینا نے نوفلاطونیت کے ذریعہ ارسطوئی فکر اور اسلام میں مفاہمت پیدا کی۔ ابن رشد سب سے بڑھ کر ارسطو کا مفسر تھا جس کی تحریروں کے عربی تراجم تقریباً 800ء میں بھی ہوئے۔ تاہم' ان فلاسفہ کے برعکس میمونائیڈز نے عیسائیت اور اسلام دونوں کو یہودیت کی پیداوار خیال کیا۔ اس نے پاگان سوچ کو بے وقعت اور خالی قرار دیا۔

میمونائیڈز اپنے عرب پیش رووں سے پوری طرح متفق ہے کہ ارسطو کے فلسفہ کو اگر مخصوص حوالوں سے تھوڑا بہت بدل کر موزوں بنا دیا جائے تو وہ سچائی بیان کرتا ہے۔ اس نے عقیدے اور فلسفے کو بالکل علیحدہ لیکن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی چیزوں کے طور پر دیکھا۔ عقیدے کی صداقت کی توثیق کرنا فلسفے کا کام تھا۔ اس نے یہودی "عقیدے کے تیرہ اصول" مرتب کیے۔

میمونائیڈز ارسطو کے فلسفہ میں ایک اہم حوالے سے ترمیم کرتا ہے۔ ارسطو نے دنیا کی تعبیر ایک خارجی وجود کے طور پر کی: یہ کبھی بھی غیر موجود نہیں تھی۔ خدا نے اس میں سے صورت تخلیق کی لیکن مادہ نہیں۔ میمونائیڈز نے مفروضہ قائم کیا کہ مادہ کی تخلیق عدم میں سے ہوئی' اور اسے تخلیق کرنے والے خدا کی حقیقی خصوصیات کا علم حاصل کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اور خدا کو صرف منفی طور پر ہی جانا جا سکتا ہے...... یعنی جو کچھ وہ نہیں ہے۔ یہ غنا سطی کے ساتھ ساتھ

یہودی انداز فکر بھی ہے۔ مثلاً ہمیں ''خدا زندہ ہے'' کی بجائے یہ کہنا چاہیے کہ ''خدا بے جان نہیں ہے۔'' جدید ثبوتیت پسند یہ خیال کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ خدا وجود نہیں رکھتا' کیونکہ وہ وہ کسی ایسی چیز کے وجود کو تسلیم کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں جسے وہ سمجھ نہیں سکتے۔ چنانچہ جب مادہ کی تخلیق اور عدم کی حالت کے سوالات سامنے آتے ہیں تو وہ (عموماً ٹی وی شوز میں) اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ ''بگ بینگ سے پہلے طبعیات کے قوانین سرگوشی کر رہے تھے۔'' اس رویے کا جوہر نامعلوم خوف ہے: وہ خود کو خوفزدہ کرنے والی چیز کو احترام دینے یا حتیٰ کہ زیر غور لانے کے بھی قائل نہیں۔

شاید زیادہ تر لوگ بجا طور پر یہ خیال قائم کریں کہ میمونائیڈز تصوف کا شدید دشمن تھا۔ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ بہت سا تصوف خود بھی نہایت عقلیت پسند ہے۔ پوپ کو یہودی بنانے کی غرض سے روم جانے والے تیرہویں صدی کے ہسپانوی یہودی ابراہام بن سیموئل ابولافیہ کو یقین تھا کہ اس کی تعلیمات محض ''زبوں حالوں کے لیے ہدایت نامہ'' کا ہی منطقی حاصل ہیں۔ وہ اس معاملے میں زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔

اور بھی حیرت انگیز بات یہ کہ ڈومینیکی صوفی میستر ایکہارٹ (1260ء تا 1327ء) نے میمونائیڈز کو آگستائن کے بعد دوسرا درجہ دیا۔ لیکن اس کا اثر کچھ زیادہ روایتی حوالے سے پڑا: ٹامس آکوئینس اور سپنوزا نے بھی اس کا مطالعہ کیا؛ لائبنز نے اسے سراہا؛ روشن خیال یہودیت کے جرمن بانی اور ''یروشلم'' کے مصنف موسس مینڈل سوہن اور دیگر بہت سوں نے بھی میمونائیڈز کا اثر قبول کیا۔

28

قبالہ

"The Kabbalah"

12 ویں صدی عیسوی

ہسپانوی زبان میں Kabbalah کی مختلف صورتیں ملتی ہیں: Cabala، Cabbla/ اور Quabala/ ہ اسے کتاب قرار دینا بھی مشکل ہے۔ تاہم، اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی اکثریت کے خیال میں یہ ایک کتاب ہی ہے۔ چنانچہ میں بھی ان کی ہی پیروی کروں گا۔ اگر میں اس مجموعہ تحریر کو کوئی اور نام دیتا تو کسی کو مشکل ہی سمجھ آ سکتا۔ درحقیقت قبالہ نے ہم سب پر ایک بے اندازہ اور خصوصی اثر ڈالا ہے' کیونکہ اسی قسم کی مرتکز سوچ اور احساس دنیا میں کی گئی متعدد کوششوں کی بنیاد ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی بہت سی اچھائی میں خرابی قبالہ کی

rekhta

وجہ سے ہی پیدا ہوئی۔ تاہم' یہ دعویٰ ثابت نہیں کیا جا سکتا' اور نہ ہی یہ دعویٰ کرنے والے کو ثبوت میں کوئی دلچسپی ہوگی۔

قبالہ کا لفظی مطلب ''وصول کیا گیا'' ہے۔ ہم اس کا ترجمہ ''روایت'' بھی کر سکتے ہیں۔ بارھویں صدی کے اختتام پر جنوبی فرانس میں ایک مبہم اور پیچیدہ یہودی باطنی روایت پیدا ہوئی جو خمسہ موسوی یعنی تحریری یہودی شریعت سے باہر تھی۔ یہ یقین کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ عیسائی اور یہودی مفکرین میں تعلقات موجود تھے' لیکن اب اس کا بہت کم ثبوت ملتا ہے۔ چھوٹے اور بڑے تمام مذاہب کی اپنی اپنی باطنی یا صوفیانہ صورت بھی ہے۔ لفظ تصوف کے بھی دو اطلاقی پہلو ہیں: پہلا' الوہی ہستی کو ''داخلی طور پر'' جاننا اور اس کا علم حاصل کرنا' ذاتی تجربہ کی سطح پر اس کی معرفت پانا' خدا کو براہ راست طور پر جاننا؛ اور دوسرا' اس طرح حاصل کی ہوئی معلومات کو صرف مبتدیوں تک پہنچانا۔

اس نہایت پیچیدہ اور بظاہر مرموز مظہر کے بارے میں ہماری موجودہ تفہیم کا سہرا صرف ایک اسرائیلی شخص گرشوم شولیم (1897ء تا 1982ء) کے سر ہے۔ اس نے تقریباً تن تنہا یہودی باطنیت کے اکیڈمک مطالعہ کا جدید شعبہ تعمیر کیا' اور ایسا کرنے کے ذریعہ اس نے یہودیت کے جوہر کے بارے میں ہماری تفہیم کو بدل کر رکھ دیا۔ انیسویں صدی میں یہودیت کے رہنما اسے ایک عقلیت پسند اور legalistic مذہب سمجھتے تھے۔ تاہم' شولیم نے خود ایک صوفی نہ ہونے کے باوجود دکھایا کہ یہودی تاریخ میں تصوف ایک زوردار قوت رہا تھا اور اب بھی تھا۔ اسے یقین تھا کہ جھوٹے مسیحا قبالہ کے لیے چیلنج ہے۔ شولیم نے مزید وضاحت کی کہ قبالہ کی کتب باہر (Bahir) اور سفر (Sefer) قدیم دور کی لکھی ہوئی نہیں تھیں بلکہ انہیں بہت بعد میں لکھا گیا۔ اس نے ثبوت پیش کیا کہ باہر (یعنی ''چمکدار'') یقیناً بارھویں صدی میں لکھی گئی اور اس میں غناسطیت سے براہ راست آنے والے قدیم اور مشرقی خیالات شامل نہیں تھے۔ ''باہر'' میں ہی ہمیں تناسخ ارواح کے عقیدے کا اولین یہودی ریفرنس ملتا ہے۔ Sephirot کے اہم ترین نظریہ (جو قبالہ ازم کی جان ہے) کا ایک شائبہ بھی موجود ہے۔ شولیم نے اپنی کتاب ''یہودی تصوف کے اہم رجحانات'' (1941ء) میں نشاندہی کی کہ قبالہ ازم کے دروازے پچھلی صدی

کے عقلیت پسند یہودیوں پر بند تھے' جبکہ مختلف عیسائیوں نے اس کی درست طور پر تعبیر کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن ان کی بصیرتوں کی راہ میں ''تاریخی مواد کے تنقیدی مفہوم'' کی کمی حائل تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کی تو بری طرح ناکام ہوئے۔ تاہم' ان کی کتابیں اب بھی شائع ہو رہی ہیں اور بہت سے قاری اب بھی انہیں مستند مانتے ہیں۔ وہ شولیم کی تصنیف کے متعلق جانتے تک نہیں۔

چنانچہ قبالہ کے اصل معنی کے متعلق بھی بہت زیادہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ ایک قسم کا رسوماتی سحر ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی اقلیت ہی اسے باطنی تجربے کے لیے ایک نہایت پیچیدہ مگر خوبصورت حل سمجھتی ہے۔ اس کی اپنی جداگانہ تکوینیات (Cosmology) بھی ہے۔

قبالہ غناسطیت کی یہودی صورت ہے جس کی نمائندگی یہاں ''سچائی کی انجیل'' کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر مظلوم عوام کے داخلی وجدانی سفر کی رہنمائی کرنے والے قبالہ نے غناسطیت کی جدید صورتوں کو کافی کچھ دیا ہے (مثلاً سارتر کی وجودیت)۔ قبالہ میں اہم ترین کتاب ''ظہر'' (شان و شوکت) ہے۔ ایک دور میں اسے بائبل اور تالمود کے ساتھ شمار کیا جاتا تھا۔ شولیم نے دو باتیں ثابت کیں: اول' یہ ایک ہسپانوی قبالہ پسند موسس ڈی لیون (1250ء تا 1305ء) نے لکھی تھی؛ اور دوم یہ کہ اس میں کوئی قدیم تحریریں شامل نہیں تھیں۔ درحقیقت قبالہ ازم کی جڑیں نہ صرف حقیقی معنوں میں قدیم یہودی تحریروں کے صوفیانہ رنگ' بلکہ موسس ڈی لیون سے قبل کی صدی میں پراونس میں یہودی بود و باش میں بھی تھیں۔ ''ظہر'' کو محض ایک قسم کے صوفیانہ ادب کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے جس کا مقصد بائبل کی شرح کرنا ہے۔ اس میں ربی سائمیون بن یوہائی اور اس کے بیٹے ایلیازار کے درمیان موت و حیات کے مفہوم پر بحث کا ریکارڈ موجود ہے۔

قبالہ سے متعلقہ تمام فکر میں Sefiroth (اعداد) کا نظریہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تخلیق کے بارے میں قبالہ کا بیان ہے؛ تاہم خدا کا ناقابل معرفت ہونے کا امر اس کا لازمی جز ہے۔ بہت سے قارئین نے Sefiroth کا ایک شجرہ نسب جیسا علامتی درخت دیکھا ہوگا جو خدا کے تخلی

چہرے دکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ انسان کے اندر الوہی ذات موجود ہے۔ فلسطینی قبالہ پسند آئزک لوریا (1534ء تا 1572ء) کے مطابق تخلیق تبھی ممکن ہوئی جب ایک ناقابل بیان خالق اپنے آپ سے پیچھے ہٹا اور ایک آفت آئی جسے ''برتنوں کا ٹوٹنا'' کہتے ہیں' اس طرح تخلیق کا نور بہہ نکلا اور زیریں اقلیموں میں چمکنے لگا۔ پھر شر اور زندگی کی تخلیق ہوئی۔ کافی سابقہ دور کے مانوی ''کفر'' میں بھی ہمیں تقریباً ایسی بیان ملتا ہے۔ لوریا کے قبالہ ازم میں ہستی کا مقصد tikkun (بحالی) ہے : تمام گری ہوئی چنگاریوں' یعنی روحوں کو لوٹ کر اپنی اصل جگہ پر واپس جانا ہے۔ اس طرح gilgul یعنی تناسخ ارواح کا نظریہ پیدا ہوا...... اور حتیٰ کہ ہمیں مشرقی نظریہ کرم سے دلچسپ طور پر مشابہت رکھنے والا ایک نظریہ بھی ملتا ہے۔ قبالہ ازم کے ابہام اور پیچیدگیاں ابتداً میں بہت گھمبیر لگتی ہیں' لیکن جذباتی اور دانشورانہ سطح پر اور متعدد دیگر عقائد کی روشنی میں دیکھنے پر وہ سہل ہو جاتی ہیں۔ انیسویں صدی کے ایک محقق نے درست طور پر نشاندہی کی تھی کہ خدا کے پیچھے ہٹنے (Tzimtzum) کا نظریہ لاشئے سے کچھ تخلیق ہونے کی واحد سنجیدہ کوشش ہے...... عیسائی فلسفیوں نے بھی اس موضوع سے دامن بچایا۔ بلاشبہ یہ ایک عمیق النظر تصور ہے۔

آپ قبالہ کے بارے میں جتنا کچھ چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ کتابوں کا ایک سلسلہ ہے' مگر میں نے اسے بجا طور پر ایک کتاب قرار دیا کیونکہ غیر یہودی لوگ اس کی تفسیروں کا مطالعہ کیے بغیر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ ابھی مختصراً یہ بیان کرنا باقی ہے کہ یہ اپنی موجودہ صورت میں ہمیں کیا کچھ بتا سکتی ہے۔

Sefiroth اور لوریا کے Tzimtzum کی تشبیہات جدید فزکس کی تمام ''دریافتوں'' کی پیش بینی کرتی ہیں۔ تاہم، یہاں یہ کام ایک جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ جبکہ جدید ملحد سائنسدان تخلیق حیات یا ''قوانین فطرت'' جیسے معاملات کو اس طرح لیتے ہیں کہ جیسے انہیں صرف ایک عقلی انداز میں ہی سمجھا جا سکتا ہو۔ یقیناً عقل بھی ہماری تفہیم میں اہم کردار ادا کرتی ہے...... لیکن صرف اور صرف منطق کا طریقہ اپنانے سے اپنی ہستی کے متعلق ہمارا نکتہ نظر ناقص اور کمزور ہو جاتا ہے۔ خود عظیم مذاہب کی تہہ میں موجود تحریکات اور امنگیں بے کار و بے اثر ہو گئی ہیں: انہوں

نے اپنا عین متضاد روپ دھار لیا ہے۔ مثلاً عیسائیوں نے عقیدے کے نام پر لوگوں کو آگ میں ڈالا' اور مسلمان بھی مذہب کے نام پر مذہب ہی کی اقدار کو پامال کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ رویہ یہودیوں کے ہاں بھی معلوم ہے۔ شولیم عربوں کے ساتھ اسرائیل کے سلوک سے ناخوش تھا۔ قبالہ کے پیروکار بھی خطاکار ہوئے: وہ حد سے زیادہ دانشور' اذیت دینے والے اور مغرور بن گئے۔ لیکن خود قبالہ ازم زندہ اور پائیدار ہے۔ یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو کامل بنا سکتا ہے' یا کم از کم کاملیت حاصل کرنے کی ایک راہ موجود ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی اور اس کے تمام حصوں میں خالق نے ازل سے ہی توانائی بھر دی ہے' لیکن ہم عام انسان حقیقت میں بس وہی کچھ جانتے ہیں جو ہمارے ری ایکشن ہمیں بتاتے ہیں۔ ہم خود حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ ہم اشیاء یا ہستیوں...... مثلاً محبت...... کے جوہر کو نہیں جانتے' بلکہ ان کی جانب ہمارا ردعمل ہی ان کے متعلق ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ بدھ مت کی مختلف صورتوں کے ساتھ اس کی مشابہت عیاں ہے۔

جدید قبالہ پسند ایک مثالی قصہ بیان کرتے ہیں۔ ایک اچھا آدمی بدبختی کا شکار ہو جاتا ہے...... اس کی بیوی اور بچے مر جاتے ہیں' ساری جائیداد چھن جاتی اور وہ خود بھی دکھ کے باعث مر جاتا ہے۔ اس کا مقدمہ اعلیٰ ترین عدالت میں ہے: طویل دکھ سہنے والی اس قسم کی روح کو کیا دیا جا سکتا ہے؟ عدالت اسے یہ دینے کا فیصلہ کرتی ہے: زندہ ہونے اور اپنی ہر چیز سے لطف اٹھانے کا احساس۔ پرجوش اور ہوشیار پیشوا جو ہمیں اذیت دیتے ہیں' غیر منصفانہ وکلاء' سخت گیر بیوروکریٹس' مذہب کا غلط استعمال کرنے والے مذہبی لوگ' لوگوں کو کچلنے اور دبانے والے...... یہ سب کے سب خود کو زندہ اور تخلیق کا ایک حصہ محسوس نہیں کرتے' اور اپنی ہستی کے لیے شکر گزار نہیں ہیں۔ تاہم، قبالہ پسند محسوس کرتا / کرتی ہے کہ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہو کر پرے دیکھ سکتا / سکتی ہے۔ البتہ اسے سب سے بڑھ کر انکساری اور صداقت کے لیے ذوق و شوق کا حامل ہونا چاہیے۔

29

"Summa Theologiae"

ٹامس آکوینس

1266ء تا 1273ء

ٹامس آکوینس نے Summa Theologiae 1266ء میں لکھنا شروع کی اور ابھی اسے مکمل نہ کر پایا تھا کہ دنیا سے چلا گیا۔ یہ قرون وسطیٰ کی دینیات میں اس کی شاندار تحریر ہے۔ یہ اس دور تک لکھی جانے والی ایسی موثر ترین کتاب تھی جس میں علم کے نہایت وسیع تنوع کو اکٹھا کیا گیا۔

اور ٹامس اپنے دور کے تمام فلسفیوں سے زیادہ مصروف بھی تھا: اپنی مختصر زندگی کے دوران اس نے تقریباً 80 لاکھ الفاظ لکھے۔ اس کی لاطینی زیادہ ''گتھی ہوئی اور جذبات سے عاری'' ہے: یہ اس کے کئر منطقی مقاصد کے لیے عین موزوں تھی۔ دانتے نے اس کے دینیاتی نظام فکر کو

کافی حد تک کامل قرار دیا' اور صدیوں تک وہ عیسائی دنیا میں نمایاں سند بنا رہا۔ اس کے اپنے ایمان پر شک کرنا ناممکن ہے۔ اس کا طرز حیات ایک لحاظ سے خلقی لگتا ہے۔

ٹامس کی نہایت غیر معمولی کامیابیوں میں سے ایک عیسائیت اور ارسطو کی فزکس میں مفاہمت پیدا کرنا تھی۔ اس کے دور حیات میں یہ فزکس ابھی عیسائیوں کے لیے مکمل ترجمہ کی صورت میں دستیاب نہ ہوئی تھی۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے عہد کی سائنس کا عیسائی مذہب کے ساتھ سمجھوتہ کروایا۔ کوئی بھی جدید فلسفی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکا۔ Summa کے علاوہ دیگر تحریروں میں بائبل کی کتب اور ارسطو کی تحریروں پر شرحیں شامل ہیں۔ کل تصنیفات 92 ضخیم ہیں۔

آج ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک باغی تھا..... اور وہ بھی نہایت ثابت قدم باغی۔ اس نے اپنے گھر والوں' ساتھیوں اور اہل کلیسیا کی مخالفت مول لی۔ وہ اپنی تصنیف کی مقبولیت دیکھنے کو زندہ نہ رہ سکا۔ 1277ء میں' اس کی موت کے تین برس بعد (اس نے بمشکل 50 بہاریں دیکھی تھیں) اس کی ساری تحریر کو دبا دینے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ کینٹر بری کے دو آرک بشپس نے تمام ٹامس ازم کو مسترد کر دیا۔ تاہم' 1323ء میں اسے مذہبی قانون میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اگرچہ اس نے خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لیے ضروری معجزات نہیں دکھائے تھے' مگر پوپ نے محض یہ اعلان کر دیا کہ اس نے ہر ایک پریشان کن سوال کے جو جواب دیے تھے وہ بذات خود ایک معجزہ تھے......

سائنسی مفہوم میں اب ہم جانتے ہیں کہ اس کے بہت سے نکات (مثلاً یہ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے) قطعی غلط تھے اور اس لحاظ سے وہ بھی اپنے ہم عصروں سے کچھ مختلف نہ تھا۔ تاہم' بیسویں صدی کی الٰہیات اور حتیٰ کہ فلسفہ میں بھی اس کی بصیرتیں بدستور اصول اور وسیع پیمانے پر زیر بحث ہیں۔

وہ 1224ء یا 1225ء میں نیپلز کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا جس کا اثر و رسوخ زوال پذیر تھا۔ اس کا باپ کاؤنٹ لینڈلف آف آکوینو فریڈرک دوم کا فرماں بردار تھا جس نے 1228ء میں خدا کا آلہ کار ہونے کا دعویٰ کیا۔ پانچ برس کی عمر میں ٹامس کو بینیڈکٹی سکول (واقع

مونٹ کاسینو) میں بھیج دیا گیا۔ اس کی ماں اسے وہاں کا ایبٹ (Abbot) بنانے کی خواہشمند تھی۔ 1243ء میں اس نے ڈومینیکی سلسلے میں شامل ہونا چاہا لیکن غضب ناک ماں نے اپنے بڑے بیٹوں کو کہہ کر اسے اپنے ہی گھر میں پندرہ ماہ تک قید رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بھائیوں نے ایک عورت کے ذریعہ ٹامس آکوینس کو ورغلانے کی کوشش کی مگر وہ اس عورت کے ساتھ بڑی بری طرح پیش آیا۔ وہ اپنے ارادے پر اس قدر سختی سے قائم تھا کہ ماں کو ہار ماننا پڑی: وہ 1244ء میں ڈومینیکی سلسلے میں شامل ہوگیا۔ وہ کیتھولک تعلیم کے مرکز پیرس میں گیا اور وہاں جرمن البرٹ اعظم (1200ء تا 1280ء) کے فیصلہ کن اثر میں آیا۔ ٹامس نے البرٹ کے مقصد کو ہی عملی جامہ پہنایا۔

وہ البرٹ کے ساتھ جرمنی گیا اور پھر ڈومینیکی لیکچرر بن کر واپس پیرس آیا۔ اس نے سارے اٹلی اور پھر 1269ء سے 1272ء تک دوبارہ پیرس میں پڑھایا۔ اس کا آخری سال نیپلز میں بسر ہوا۔ جہاں کی یونیورسٹی میں وہ طالب علم رہ چکا تھا۔ اپنی موت سے کچھ روز پہلے ایک دن عبادت کے دوران اس پر وجد طاری ہوگیا اور اس نے کہا ''اب مجھ پر جو کچھ ظاہر ہوا ہے اس کے سامنے میرے لکھے ہوئے تمام الفاظ ایک تنکے کی مانند ہیں۔'' اس نے مزید ایک لفظ بھی نہ لکھا اور جلد ہی مر گیا۔

البرٹ اعظم بھی ٹامس جتنا ہی اہم ہے۔ اس نے ٹامس کی زندگی کی سمت متعین کی اور موت کے بعد اس کا دفاع کیا۔ اس نے عظیم عرب فلسفیوں کے ذریعہ ارسطو کے متعلق جانا تھا...... وہ یہ تفہیم رکھنے والے اولین عیسائیوں میں سے ایک تھا کہ ارسطو اور نہ ہی اس کے عرب شارحین (بالخصوص ابن سینا اور ابن رشد) کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اس کی نظر میں ان کے ''کافر'' ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ البتہ ٹامس کے لیے اس کی عظیم ترین میراث یہ اصرار تھا کہ فلسفے کے مسائل کو فلسفے کے ذریعہ ہی حل کرنا چاہیے۔ اس نے ٹامس کو اس نظریہ کے ساتھ تحریک دلائی کہ عیسائیت کو ارسطو ازم کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی منطق اور مذہب میں مفاہمت ممکن ہے۔

ٹامس نے تسلیم کیا کہ کچھ مخصوص معاملات کا علم صرف الہام کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے' لیکن

پھر بھی اسے یقین تھا کہ منطق ہمیں ہر ممکن حد تک سچائی کے قریب پہنچا سکتی ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ ہم خدا کی فطرت کو نہیں جان سکتے۔ لیکن وہ خدا کی ہستی کا ثابت کرنے کا شوقین تھا اور اس نے پانچ مشہور ثبوت پیش کیے۔ یہ تمام ثبوت ایک الوہی مظہر'' دنیا کی ایک قابل تفہیم حقیقت'' سے شروع ہوتے اور پھر اس کی علت پر دلائل کے ساتھ ختم ہوتے ہیں۔ اس نے ایمانداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصرار کیا کہ تمام دلائل دنیا کے قابل تفہیم حقائق پر مبنی ہونے چاہئیں۔

اس کے پیش کردہ پانچ ثبوتوں کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے (1) چونکہ تمام چیزیں حرکت میں ہیں' اس لیے انہیں حرکت دینے والا بھی لازماً موجود ہوگا۔ (2) کوئی علت اول لازماً موجود ہے جس کی اپنی کوئی علت نہیں۔ (3) موازنے ایک کاملیت کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں۔ (4) کچھ ایسی چیزوں کا وجود ایک لازمی ہستی کی جانب اشارہ کرتا ہے جو اپنی وضاحت آپ نہیں۔ اور (5) فطری چیزوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے کوئی طاقت ضرور موجود ہوگی۔ ان دلائل کو رد کیا جاچکا ہے' مگر یہ آج بھی غیر اہم نہیں ہوئے۔

ٹامس ایک استعارے کے ذریعہ آزاد مرضی کے معاملے سے نمٹا۔ اگر خدا علیم و خبیر ہے تو انسان آزاد کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا اسی طرح دیکھ رہا ہے جیسے کوئی پہاڑی پہ بیٹھا ہوا شخص نیچے وادی میں بل کھاتے ہوئے رستوں پر چلتے مسافروں کو دیکھتا ہے' البتہ یہ مسافر ایک دوسرے کو زیادہ نہیں دیکھ سکتے۔ خدا کا علم ہر وقت ''حاضر'' ہے اور اس کی موجودگی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان آزاد مرضی کا مالک نہیں ہے۔ یہ دلیل زمان اور متعلق کے موضوع پر الجھنوں پر مبنی ہے جنہوں نے بہت سوں کو پریشان کیا' لیکن اب بھی اس میں کافی جان باقی ہے۔

1323ء میں ٹامس آکوینس کی مذہبی شریعت میں شمولیت کے باوجود ٹامس ازم کو کئی صدیوں تک جائز احترام نہ ملا۔ کیتھولکس نے اس کے فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ محض اسے قبول کرلیا۔ اور پروٹسٹنس اور دیگر نے فرض کرلیا کہ یہ کوئی خصوصی نظریہ ہے (حالانکہ ایسا ہرگز نہیں)۔ کہیں بیسویں صدی میں آکر ہی وہ باقاعدہ فلسفی کے طور پر سامنے آیا۔ اب وہ ایک کٹر عقیدہ پرست نہیں رہا تھا جیسا کہ کلیسیا نے اسے پیش کیا۔ اب غیر کیتھولکس کے پاس اسے نظر انداز کرنے کی وجہ ایسی ہی ہے جس کی بنیاد پر غیر عیسائی لوگ بے کلے کو نظر انداز کرتے ہیں۔

نیز اس نے قوائیت (Potentiality) اور واقعیت (Actuality) کے درمیان ارسطو کے بیان کردہ امتیاز کو موثر انداز میں واضح کیا جو محض ایک تیکنیکی کامیابی ہی نہیں۔ اور حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ارسطو پر افلاطون کی تنقید کے بہترین حصے کو محفوظ کر دیا۔ یہ بھی یقینی نظر آتا ہے کہ ایک فلسفی کے طور پر اس کی نسل بڑھتی چلی جائے گی۔ کائناتی اصولوں (Universals) کی نوعیت کے بارے میں اس کا پیش کردہ حل عمیق ترین ہے۔ آگسٹائن کے پیروکاروں جیسے تو فلاطونیوں نے دلیل دی تھی کہ اگر لوگوں نے مادہ پرستی (میٹیریلزم) سے کنارہ کشی اختیار کر کے افلاطونی قسم کے آسمان کے وجود پر اعتبار نہ کیا تو عقیدے کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ ان کے مخالفین نے کائناتی اصولوں کی حقیقت سے انکار کیا لیکن انہیں ایک رتبہ بھی دیا۔ ٹامس کی دلیل ہمارے اس اقرار پر مبنی ہے کہ مادہ کو دنیا میں سے خارج نہیں کیا جاسکتا...... یعنی وہ لازماً موجود ہے۔ ٹامس نے دو مخالف نکتہ ہائے نظر میں مفاہمت پیدا کی۔ اس نے انسانی عقل کے ساتھ غیر متغیر سچائیاں 'مگر بدلتی ہوئی تفہیموں کے ذریعہ' تخلیق کرنے کی ایک قوت منسلک کی (ٹامس کا خدا بھی خالق خدا ہے)۔

30

اُلوہی طربیہ

"The Divine Comedy"

دانتے الگیری

1321ء

کچھ کلاسیکی تحریروں کے برعکس دانتے کی نظم کے عام قاری ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ ڈیوائن کامیڈی (الوہی طربیہ) آسان اور مختصر ہونے کے باوجود جدید قاریوں کو فوری طور پر سمجھ نہیں آتی۔ دانتے کے حریف جان ملٹن کی ''گمشدہ بہشت'' کی نسبت ''الوہی طربیہ'' کو

قارئین نے زیادہ پسند کیا۔ ملٹن روک ٹوک کرتا ہے۔ دانتے سخت گیر لیکن کہیں زیادہ ''انسانی'' ہے۔ چودہویں صدی میں ابھی پیوریٹان ازم ایجاد نہیں ہوا تھا۔

دانتے نے اپنی تحریر کو Commedia قرار دیا۔ یہ ہمارے جدید مفہوم میں نہیں بلکہ تکنیکی وجوہ کی بناء پر کامیڈی ہے۔ دانتے کا مطلب تھا کہ یہ لاطینی زبان میں ایک المیہ (ٹریجک) تحریر نہیں تھی۔ ''کامیڈیا'' گمشدہ بہشت کی نسبت پڑھنے والوں کے ساتھ زیادہ دوستانہ اور گھریلو قسم کی سچائیوں سے بھری پڑی ہے (مثلاً یہ لائن: ''دوسرے کی روٹی کھانے پر تم جان لو گے کہ وہ کتنی ترش ہے۔'' کامیڈیا کے ساتھ ''ڈیوائن'' کا سابقہ بعد میں لگایا گیا۔ یہ شاعری کا ذوق رکھنے والے ہر شخص کیلئے قابل قدر ہے۔'' ''کامیڈیا'' کا زبردست اثر کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ فریڈرک اینگلز نے اسے ''ہمارے عہد کا پہلا ہمہ گیر ذہن'' قرار دیا' کیونکہ کامیڈیا تشبیہاتی طور پر خدا کے آسمان کی جانب انسان کے مشکلات سے بھرپور سفر کو بیان کرتی ہے۔

تاہم' بہت سوں نے دانتے کو ناپسند کیا اور والٹیئر ''اپنی فلاسفیکل ڈکشنری'' (1764ء) میں لکھتا ہے: ''اطالوی اسے الوہی کہتے ہیں' لیکن یہ الوہیت مخفی ہے...... چند ایک لوگ ہی اس کی کہاوتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی شرحیں لکھے جانے کی وجہ غالباً اس کا آسانی سے سمجھ میں نہ آنا ہی ہے۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا' کیونکہ شاذ ونادر ہی کوئی اسے پڑھتا ہے۔''

والٹیئر اگرچہ خود بھی ایک اچھا شاعر بننا چاہتا تھا' لیکن اس نے خود اسی قسم کی شاعری کی' اور ''نثر کے'' آگسٹس عہد میں (اٹھارہویں صدی) دانتے کی عموماً تحقیر کی گئی۔ لیکن اسے ہر ایک نے ہی ناپسند نہیں کیا اور جلد ہی وہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ایک اہم ہیرو بن گیا۔

ٹی ایس ایلیٹ یقیناً دانتے کو شیکسپیئر پر ترجیح دیتا تھا (اس کی نظر میں ''ہیملٹ'' ایک ناکامی تھا)۔ تاہم' اس بارے میں شک کیا جاسکتا ہے کہ آیا دانتے کی حقیقی قدر وقیمت ایک اشرافیہ پسند اور یہودیوں سے پاک فاشزم کی پیش بینی میں مضمر تھی یا نہیں۔ یاد رہے کہ ایلیٹ نے یورپ کے لیے اسی فاشزم کی منظوری دی تھی۔ یہ درست ہے کہ دانتے کو اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے یہ صورت دی جاسکتی ہے۔ لیکن دانتے کا دور ہمارے دور سے بہت مختلف تھا' اور ہمارے لیے واپس اس کے دور میں جانا ممکن نہیں۔

دانتے کی نظر میں آگسٹائن اور آکوینس (اور افلاطون جیسے چند دیگر افراد) نے سچائی کی بنیادیں قائم کی تھیں۔ وہ اس سچائی کو یوں بیان کرتا ہے: اپنی نظم کی دنیا کو اپنے عہد کے عیسائی خدا کی دنیا کا عکس بنانا۔ اس نے تصور کیا کہ آکوینس نے ارسطو کے فلسفہ اور عیسائی عقیدے میں حتمی طور پر مفاہمت پیدا کر دی تھی: کہ عیسائی عمارت کا آخری پتھر بھی اپنی جگہ پر لگایا جاچکا تھا؛ کہ مزید تبدیلی کی ضرورت تھی اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن تھا۔ اب تو وہ بس ایک مقدس رومن شہنشاہ چاہتا تھا جو انحطاط زدہ ریاست کو آکوینس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پاکیزہ کلیسا بنا دے' اور وہ شہنشاہ یورپ پر اولیت رکھتا ہو۔ اس نے سوچا کہ یہ عظیم مقصد حاصل کرنے کے لیے اسے بلند ذہن' غیر حقیقت پسند ہنری ہفتم (1274ء تا 1313ء) کی صورت میں ایک آدمی مل گیا تھا' لیکن ہنری ناکام رہا...... وہ سینا کے نزدیک ایک دلدلی علاقے میں ملیریا کے باعث مر گیا۔

چنانچہ دانتے نے اپنی شاہکار تصنیف (جو 1307ء میں شروع ہوئی) میں اس نکتہ نظر کو ایک مثالی صورت دینے کا ارادہ باندھا۔ اس کی فطرت میں تشکیکیت کا شائبہ تک نہ تھا: یہ خاصیت صرف اس کی تصنیف ''تاریکی کا بادشاہ'' (Prince of Darkness) میں ہی نظر آتی ہے۔ لیکن گناہ کی جانب دانتے کا رویہ غیر ہمدردانہ نہیں تھا۔ کامیڈیا میں کافی جگہوں پر اس کے ناگزیر ہونے کی بات کی گئی۔

جامد' بے جان اور انسانی جذبات کی مخالف راسخ العقیدگی (آرتھوڈوکسی) سے خیر کی کچھ امید رکھنا عبث ہے...... البتہ سماجی لحاظ سے تمام اچھائی اس فطری سلسلے کی دین ہے جسے آرتھوڈوکسی طاقت' دولت اور روحانی کاہلی کے باعث تباہ کر دینا چاہتی ہے۔ بہر حال ''کامیڈیا'' کو آرتھوڈوکسی کے لیے ایک خراج عقیدت کہا جاسکتا ہے۔ تاہم' اس دور میں یہ بہت نئی نویلی آرتھوڈوکسی تھی' اور نظم میں اس نے سیاسی صورت اختیار نہیں کی۔ نظام قائم تو ہو چکا تھا لیکن ابھی اس پر عمل ہونا باقی تھا۔ ہنری ہفتم فوت ہو چکا تھا؛ فلورنس پر ایک ایسے دھڑے کا قبضہ تھا جو کسی دیوتا کو نہیں مانتا تھا۔ اور ''کامیڈیا'' ایک ایسے شخص نے لکھی جو اتنا راسخ العقیدہ نہیں تھا کہ اسے آسانی سے نجات مل جاتی...... یا کم از کم اسے نجات پانے کے لیے ایک اعلیٰ رہنما' اپنی بیٹرائس کی ضرورت تھی۔ تب آکوینس کے جادو نے کام دکھانا شروع ہی کیا تھا۔

اس لحاظ سے دانتے کو بجا طور پر قرون وسطیٰ کا اعلیٰ ترین شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اسے کسی نہ کسی طرح ''نشاۃ ثانیہ سے پہلے'' کا شاعر بنانے کی کچھ کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ جی ہاں وہ پہلا ''ہمہ گیر انسان'' تھا' لیکن ہم اسے نشاۃ ثانیہ کا آدمی نہیں کہہ سکتے۔ اس کے عقائد قرون وسطیٰ والے تھے۔ چنانچہ اس کی نظم بھی ایک گزرے ہوئے دور کی ہے۔ ہمارے عہد میں اس قسم کے جامد اعتقادات کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا۔

لیکن اگر انسانی سوچ میں نہیں تو انسان فطرت میں کچھ مخصوص خواص بدستور وہی کے وہی ہیں۔ کاپرنیکس یا نیوٹن یا آئن سٹائن بھی بہشت (Paradiso) سے آنے والے نور کی اہمیت کو گہنا نہیں پائے۔ دانتے کی پیاری محبوبہ بیٹرائس پوٹی ناری مر گئی؛ ایلیٹ میں شاعری کا جذبہ بیدار کرنے والی پہلی بیوی کو پاگل قرار دے کر قید کرنا پڑا' اور ایلیٹ نے عظیم سرکاری شاعر بننے کی خاطر اپنی شاعری کی دیوی کو تباہ کرنے کا جرم کیا۔ اور چونکہ دانتے نے حقیقتاً نظام کی سچائی کو بلا اعتراض قبول کر لیا تھا اس لیے وہ خود کو اس کے محض ایک ناچیز جز کے طور پر دیکھنے کے قابل ہو سکا: اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ بھی کس قدر غلطی پر تھا۔ وہ اپنی نظم کی ابتدا میں کہتا ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ اس نے سچی راہ کو کیسے کھو دیا۔ بنیادی طور پر وہ اپنی نظم میں ایک زائر ہے۔ جہنم' برزخ (Purgatory) اور بہشت میں تقسیم شدہ ڈیوائن کامیڈی کی مشہور ابتدائی سطریں یہ ہیں:

سفر حیات کے وسط میں مجھے ادراک ہوا
کہ میں ایک تاریک جنگل میں بھٹک رہا تھا'
اور درست راستہ کہیں بھی بجھائی نہیں دیتا تھا۔
آہ' زبان اس تکلیف کو بیان کرنے سے قاصر ہے'
وہ جنگل اس قدر مایوس کن اور بے رحم تھا کہ
اس کا خیال ہی میرے سینے میں درد بن جاتا ہے۔

''کامیڈیا'' کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں کیونکہ شاعری اپنی زبان کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے۔

دانتے کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات میسر ہیں۔ وہ فلورنس شہر کے ایک افلاس زدہ

گھرانے میں پیدا ہوا اور فرانسسکیوں (Francisans) کے پاس تعلیم پائی۔ وہ اور اس کا خاندان Guelph فرقے کے پیروکار تھے۔ یوں کہہ لیں کہ وہ شاہی اختیارات کی دست وپیکار میں پاپائیت کے طرف دار تھے۔ 1260ء میں مونٹی ویٹو کے مقام پر جنگ کے بعد اٹلی سامراجی طاقت کے اثر سے نکل گئے۔ اس وقت دانتے چند ماہ کا تھا۔

فلورنس دو Guelph دھڑوں کے درمیان منقسم تھا...... سفید اور کالے۔ سفیدوں نے (جن کا دانتے حامی تھا) پاپائیت اور استبدادی قوتوں دونوں سے فلورنس کی آزادی کی حمایت کی۔ کالے کلیسیا کے حامی بننے پر زیادہ خوش تھے۔ دانتے اپنے عہد جوانی میں فلورنس میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہا اور حتیٰ کہ وہ اپنے دوست شاعر Guido Cavalanti کی وطن بدری میں بھی فریق بنا۔ یہ اس امر کی محض ایک مثال ہے کہ دانتے کس طرح ریاست کے مفاد کی خاطر اپنی ذاتی ترجیحات کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ دانتے کو انسانی حیثیت میں حد سے زیادہ سراہنا غلط ہوگا۔ تاہم' اگر اس نے اس اور دیگر معاملات میں خطا کی تو اس کا نتیجہ بھی بھگتا۔

دانتے نے مصور سیمون دی باردی کی بیوی بیٹرائس پوٹی ناری کی موت (1290ء) کے بعد فلسفے میں اپنا غم غلط کیا۔ بیٹرائس کے لیے دانتے کی مشہور محبت پاکیزہ' تخیلاتی اور افلاطونی قسم کی تھی۔ اس کی اپنی بیوی (جو باپ نے منتخب کی تھی) کا اس معاملے سے بمشکل ہی کوئی تعلق تھا (ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ بعد میں جب دانتے کو وطن بدر کیا گیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ تھی یا نہیں)۔ بیٹرائس کے لیے دانتے کی محبت کی جڑیں قرون وسطیٰ کے ''شائستہ محبت'' کے نظریہ میں ہیں۔ یہ عورتوں کو تصوراتی روپ دینے کی اوج ہے جو قرون وسطیٰ اور پھر نشاۃ ثانیہ کا ایک عمومی رجحان تھا' اور اس میں اہم افلاطونی عناصر بھی موجود ہیں۔

1302ء میں دانتے ایک سفارتی کام کے سلسلے میں پوپ سے ملنے گیا ہوا تھا کہ کالوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا (پوپ جان بوجھ کر اسے انتظار کرواتا رہا)۔ وہ پھر کبھی بھی فلورنس کی فضا میں سانس نہ لے سکا۔ اسے جرمانہ اور وطن بدری کی سزا سنائی گئی لیکن اس نے مجسٹریٹوں کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ فیصلہ سنایا گیا کہ اگر وہ کبھی فلورنس کی حدود میں پایا گیا تو اسے زندہ جلا دیا جائے گا۔ بعد میں اسے اس شرط پر واپس آنے کی دعوت دی گئی کہ وہ اپنی

''وطن دشمنی'' سے باز آجائے' لیکن وہ نہ مانا۔ اپنی شہرت کی وجہ سے اسے مالی سرپرستوں کی کمی نہ تھی۔ اس نے اٹلی میں مختلف جگہوں پر وقت گزارا۔ وہ راوینا کے مقام پر دنیا سے رخصت ہوا۔ محققین نے عموماً دانتے کو سیاسی لحاظ سے راست باز قرار دیا ہے' لیکن یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں: اس کا طرز عمل کسی بھی دانشور' سیاستدان سے مختلف نہیں۔ تاہم، فلورنس سے اس کی محبت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

تقریباً 1292ء میں دانتے نے اپنی پہلی بڑی کتاب لکھی: ''La Vita nuova'' (نئی زندگی)۔ یہ کتاب واضح طور پر بیٹرائس کے ساتھ تعلق کے بارے میں ہے۔ دانتے نے پہلی مرتبہ جب بیٹرائس کو دیکھا تو اس کی عمر نو برس تھی۔ وہ اس کے جسم کے بارے میں ہمیں یوں بتاتا ہے: ''وہ میرے سے زیادہ طاقتور دیوی ہے' جو آئے گی اور مجھ پر حکومت کرے گی۔'' اور یہ بیٹرائس ہی تھی جس نے اسے ''بہشت'' کا افکار فراہم کیا۔ اس کی دیگر تحریروں میں فلسفہ پر ایک مقالہ (غیر مکمل) اور سیاسی تھیوری کے بارے میں ایک کتاب De Monarchia (1313ء) شامل ہیں۔ لیکن وہ اپنی ''کامیڈیا'' یا ڈیوائن کامیڈی کی وجہ سے ہی مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اسے اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے مکمل کیا تھا۔

''ڈیوائن کامیڈی'' اس عہد کے مذہبی اور اخلاقی مثالی تصورات کی تجسیم ہے۔ اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ کیا دانتے کا کیتھولک ازم کامیڈیا سے بھرپور حظ اٹھانے کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ یہ سوال یوں ہونا چاہیے: کیا نظم میں بیان کردہ غلط سائنسی مفروضات اس سے حظ اٹھانے میں رکاوٹ بنتے ہیں؟ اس کا جواب ''نہیں'' میں ہے۔

31

حماقت کی مدح میں

"In Praise of Folly"

ڈیسیڈریئس اِراسمس

1509ء

اِراسمس کا ڈچ نام Gerhard تھا' لاطینی زبان میں جس کا مطلب ''محبوب'' بنتا ہے۔ اسی سے Desidrius نکلا۔ وہ اپنے پادری باپ (راجر جیرارڈ) اور اس کی محبوبہ (ایک طبیب کی بیٹی) کی ناجائز اولاد تھا۔ وہ 1466ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں پہلے بھی پادری کے ایک بیٹے بیٹر

کی ماں بن چکی تھی۔ اراسمس نے ہالینڈ میں Deventer کے مقام پر سکول میں داخلہ لیا اور پھر Utreht میں ایک بھجن بچہ (Choirboy) بن گیا۔ سکول میں اس نے لاطینی زبان کافی اچھی طرح سیکھی اور اسی میں اپنی تحریریں لکھیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران کسی نے بھی اچھی لاطینی زبان استعمال نہیں کی۔

اپنے والدین کی وفات کے بعد اسے سرپرستوں کے سپرد کیا گیا جنہیں وہ ظالم کے طور پر بیان کرتا ہے۔ درحقیقت سرپرستوں نے اس کی رقم ہتھیا لی اور پھر اسے ایک خانقاہ میں داخل کرا دیا۔

راہب اور پھر پادری بننے والے تمام عظیم افراد میں سے ایک اراسمس ہی ایسا تھا جو اس قسم کی زندگی گزارنے پر بہت کم مائل تھا۔ تاہم، سرپرستوں نے اسے 1488ء میں ایک آگسٹائی قانون کے تحت حلف لینے پر مجبور کر دیا۔ تب اس کی عمر 20 سال تھی۔ چار سال بعد وہ پادری بن گیا۔ اس کے بعد کی اس کی زندگی پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کی بجائے اپنے عہد کے اعلیٰ اذہان سے ملنے کی جستجو سے عبارت ہے۔

اس لحاظ سے وہ موقع پرست تھا' مگر اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ پیرس یونیورسٹی میں مطالعہ کے دوران مالی اعانت کے لیے اسے ایک بشپ مل گیا۔ وہ پیرس میں انسانیت پسندوں کی صف میں جا کھڑا ہوا اور انجام کار ان سب سے بڑا انسانیت پسند بن گیا۔ وہ نشاۃ ثانیہ کے نہایت عالم افراد میں سے ایک تھا۔ مثلاً اس نے اپنے دوست سرتھامس مور کی نسبت کہیں زیادہ علم حاصل کیا۔ زیر بحث کتاب تھامس مور کے نام ہی انتساب کی گئی ہے۔

اراسمس نے عہد اصلاح (Reformation) کی راہ ہموار کرنے میں اپنے عہد کے کسی بھی فرد واحد سے زیادہ کردار ادا کیا۔ جرمن پروٹسٹنٹ آرٹسٹ البرخت Dürer نے لوتھر کی موت کی افواہیں سننے پر اپنی ڈائری میں توقع ظاہر کی کہ اراسمس کلیسیا کے خلاف آواز احتجاج بلند کرے گا۔ بہت سے لوگوں کو اس سے یہی توقع تھی۔ لیکن اراسمس نے دیکھا کہ نتائج اپنی وجوہ جتنے ہی خوفناک ہوں گے' جیسا کہ جلد ہی جان کیلون کے معاملے میں ثابت ہو گیا۔

اراسمس نے فلسفہ کی خاصی سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود اس پر زیادہ توجہ نہ دی' بالخصوص وہ

فلسفہ کے مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں میں اتنی دلچسپی نہ رکھتا تھا جتنا کہ پادریت میں۔ جس قسم کی مابعد الطبیعیات کی وہ پروا نہیں کرتا تھا وہ اس جھگڑے پر مشتمل تھی کہ سبت (اتوار) کے دن کام کرنا بڑا گناہ ہے یا ایک ہزار لوگوں کو قتل کرنا' وغیرہ۔ اراسمس کو فلسفی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کلیسیا غیر ضروری' منافقانہ اور بیہودہ رسوم و رواج سے متنفر ہوا تھا تو اس کی نظر میں بہت سا فلسفہ بھی سرد اور بے جان تھا۔

اراسمس بنیادی طور پر ایک تخیلاتی مصنف تھا...... ایک ایسا مصنف جس نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ دنیا کو ایک پرامن اور آرام دہ مقام بنانا چاہا۔ وہ حماقت اور بے وقوفی سے تنگ آ گیا' چنانچہ اس کا جنگجو بن گیا۔ غالباً وہ سب سے بڑھ کر جنگ کا مخالف تھا۔ اس کی تصنیف میں جنگ کے خلاف دلائل ملتے ہیں۔ یوں وہ اپنے دور کے حقیقی طور پر بااختیار سرکاری عیسائیوں کے لیے موزوں نہ بن سکا۔

لیکن مورخین اور محققین نے اراسمس کی زیادہ قدر افزائی نہیں کی: اسے ایک خداداد صلاحیت کے مالک شخص کے طور پر دیکھا گیا جو حقیقت پسندی کے فقدان کے باعث غیر موثر رہا۔ اراسمس یقیناً اپنی ایک دو حرکات کی وجہ سے مورد الزام ٹھہرتا ہے (مثلاً غیر حاضر پادری)! لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید ایک آزاد مفکر کی حیثیت میں وجود بھی قائم نہ رکھ پاتا۔ اس نے اپنی ذہنی آزادی کی خاطر شاندار عہدے ٹھکرا دیے۔ زندگی کے وسطی دور میں وہ بھی مالی مسائل کا شکار ہوا۔ اچھی تنخواہیں پانے والے ماہرین الٰہیات اور مورخ عموماً اس مشکل سے بچے رہے۔

اراسمس اپنے دور میں بھی مشہور تھا۔ اس نے بنیادی طور پر اپنے جیسے روشن خیال لوگوں کے لیے لکھا جو ارد گرد پھیلی ہوئی طاقت کا تدارک کرنے میں خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ لیکن مفسرین نے عموماً اسے کلاسیکی ماڈلز کے حوالوں سے پرکھا نہ کہ اس کے اپنے اچھوتے پن کے تناظر میں۔ انہوں نے اسے حد سے زیادہ دانشور (Overintellectual) قرار دیا' جبکہ دانشوری' اعلیٰ علم ایک ایسی دنیا میں اس کا واحد ہتھیار تھا جہاں نہ صرف اس کی کتابوں کو ممنوع قرار دیا بلکہ جلا بھی دیا گیا۔ اس دور میں انسانیت پسندانہ فکر کی بجائے لوتھر اور کیلون والا جذبہ تھا۔ اراسمس کی تحریریں ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتی ہیں کہ شدید بنیاد پرستی کی مزاحمت

میں کیا کچھ موجود تھا۔ کافی مزاحمت موجود تھی لیکن وہ بہت کم اثرات مرتب کر سکی۔

تقریباً 1500ء میں اراسمس انگلینڈ گیا اور وہاں تھامس مور اور دیگر انسانیت پسندوں سے دوستی قائم کی۔ وہ 1505ء میں واپس آیا اور 1509ء میں "حماقت کی مدح میں" میں لکھی۔ اس نے یونانی زبان پر عبور حاصل کیا (بڑے بڑے لوگ یونانی زبان سیکھنے میں ناکام رہے تھے)۔

اس نے کلیسیا کے خلاف لوتھر کی آواز میں آواز ملائی' لیکن اس کی ہسٹیریائی بنیاد پرستی کے جذبہ میں شراکت نہ کر سکا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دن یورپ میں ادھر ادھر سفر کرتے' کلاسیکی تصنیفات کے تراجم کرنے میں گزارے۔ لیکن وہ زیادہ تر سوئٹزرلینڈ میں ہی رہا اور وہیں Basle کے مقام پر فوت ہوا۔

اگر اراسمس نے کوئی غلطی کی تو وہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنے بنیاد پرست مخالفین کو پریشان کرنے میں بے جا مسرت اٹھائی۔ وہ شخص کیسا ہوگا جس نے ایک خط میں لکھا کہ وہ "ہمارے دور کے کچھ نام نہاد ماہرین الہیات کا تماشہ بنانے کا بہت مزہ لیتا ہے جن کے دماغ سڑے ہوئے' زبان بربری' ذہن کند' جن کا علم کانٹوں کی سیج' انداز و اطوار جاہلانہ' زندگی منافقانہ' جن کی گفتگو زہریلی اور دل سیاہی جیسے سیاہ ہیں۔" کسی بھی پارٹی کی اسٹیبلشمنٹ اراسمس کو محترم کیسے جان سکتی تھی؟ بالانجام کار لوتھر نے بھی اسے ایک اپیکوری قرار دے کر ذلیل کیا۔

اراسمس کو غلط طور پر لیے جانے کی مرکزی وجہ اس کا ایک تخیلاتی مصنف ہونا تھی۔ اسے ایک ناکام مصلح کے طور پر لیا گیا...... ایک ایسا شخص جو انسانی ترقی میں یقین رکھتا تھا لیکن اس سلسلے میں اپنا فرض ادا نہ کر سکا: اس نے عہد اصلاح کے وقوع پذیر ہونے میں اہم کردار ادا کیا لیکن جب یہ دور آیا تو اسے خود سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے خود کو ایک غیر اہم اور بے بس شخصیت میں بدل دیا۔ یوں کہہ لیں کہ اس کی کتاب "حماقت کی مدح میں" کو ایک شاعری کی بجائے سیاسی کتاب کے طور پر لیا گیا۔

"حماقت کی مدح میں" کے اصل موضوعات انسانی تنوع اور توانائیت (Vitality) ہیں۔ اسے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس میں بیک وقت کئی خوبیاں ہوں۔ اراسمس ایک پیچیدہ

طنز نگار تھا جو خود کو پیش آنے والے تمام تکلیف دہ معاملات کے مقابلے میں کچھ اطمینان بخش اور دل موہ لینے والی سادگی کا متلاشی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسان کبھی بھی مستقل مزاج نہیں رہتے کیونکہ ان کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تاریخ...... ماضی کے "حالات حاضرہ"...... زیادہ تر تصنع بازی تھی۔ یہ درحقیقت حرص' جرم' افراتفری اور فریب کا ایک ریکارڈ تھی۔ آخر اراسمس کیلون کے دور کا ہی تو تھا چنانچہ اسے حقیقت نا آشنا قرار دینا درست نہیں: اس نے دیکھا کہ ہمیں معلوم حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی' اس کے باوجود اس نے اس قدر مشکل صورتحال کی ایک کارآمد تصدیق کرنا چاہی۔

حماقت یا احمق کا کردار عام ہو گیا۔ جرمن مصنف سیباستیان برانٹ کی "احمقوں کا جہاز" (1594ء) ہر ایک نے پڑھی اور اس پر بحث کی۔ برانٹ کی اس اخلاقی تحریر کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کر لینے میں ہی دانائی ہے۔ اراسمس نے لوسیان کی مثال استعمال کرتے ہوئے حماقت کو بیان کیا۔ سب سے پہلے حماقت خود کہتی ہے "یہ کتاب حماقت نے حماقت کی ہی مدح میں لکھی۔" اس قسم کا عنوان یقیناً طنزیہ ہے۔ لیکن حماقت کی جانب سے حماقت کی مدح ایک حقیقی مدح ہے۔ یہ ایمان دارانہ اور فطری احساس' جبلت' توانائی اور سادگی کو ایک خراج تحسین ہے۔ حتیٰ کہ یہ غیر ذمہ داری کے لیے بھی ایک خراج عقیدت ہے۔ جیسا کہ اراسمس لکھتا ہے "کم از کم اتنا تو یقینی ہے: تھوڑی بہت حماقت کے بغیر کسی پارٹی میں مزہ پیدا نہیں ہوتا۔"

32

بادشاہ

"The Prince"

نکولو میکیاولی

1532ء

سفیر، شاعر، ڈرامہ نگار، سیاسی نظریہ ساز اور عسکری منتظم نکولو میکیاولی 1469ء میں فلورنس کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس نے اپنے آبائی وطن کو ایک قوم خیال کیا لیکن اس کے جوان ہونے تک فلورنس کی حقیقی عظمت غائب ہو چکی تھی: مثلاً اٹلی کے اندر یہ وینس کے مقابلہ میں ایک درجہ دوم کی طاقت تھی۔ دو واقعات نے میکیاولی کی مغرور سوچ کو متشکل کیا۔

پہلا واقعہ 1494ء میں فرانس کے چارلس ہشتم کی فوجوں کی اٹلی پر چڑھائی تھا جس نے اسے خوفزدہ کر دیا: اطالوی جاگیرداریوں کے حکمران اپنی تمام تر نخوت کے باوجود بے کار ثابت ہوئے۔ دوسرا واقعہ فلورنس کو جلائے جانے کا تھا۔ یہ کام عظیم گیرالو موساوونا رولا نے کیا۔ اس نے درشتی کے ساتھ کہا "غیر مسلح پیغمبروں کو ہمیشہ مار دیا گیا' جبکہ مسلح پیغمبروں نے ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔" یہ لیجیے بہر حال پندرھویں صدی کے اواخر کا نہیں تھا۔

لارڈ مکاؤلی نے میکیاولی کے بارے میں کہا کہ "ہمیں شک ہے کہ آیا ادبی تاریخ میں کوئی نام اس قدر عمومی سطح پر نفرت انگیز ہو سکتا ہے یا نہیں۔" سولہویں صدی کے وسط تک "The Prince" (بادشاہ) غالباً لکھی جا چکی تھی۔ عہد الزبتھ کے انگریزوں کے لیے "میکیاولی" نام "ملحد" کے مترادف تھا۔ میکیاولی کے نام کے پہلے حصے کی وجہ سے شیطان کے لیے مقبول عام اصطلاح نے ایک نئی مقبولیت حاصل کی۔

میکیاولی نے اپنے ذاتی تجربے سے بھی یہ جانا کہ ایک بری طرح کمزور ہو چکی ری پبلک اپنی بقاء کو کیسے قائم رکھ سکتی تھی: اس نے 1498ء سے 1512ء تک فلورنس کی حکومت کے لیے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ اور سیکنڈ چانسلر کے طور پر کام کیا۔ ان سالوں کے دوران اس کی اپنی توجہ کا سب سے بڑا مرکز ایک مستعد ملیشیا بنانا تھا جو کرائے کے سپاہیوں کی بجائے محب وطن شہریوں پر مشتمل ہو۔

پھر 1512ء میں یہ ری پبلکن حکومت ایک دم منہ کے بل آن گری۔ میکیاولی کو برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا گیا' اس سے پوچھ گچھ ہوئی اور اذیت دی گئی۔ اس کے بعد اسے اپنے چھوٹے سے دیہی فارم میں جلاوطن ہونا پڑا جہاں سے وہ اپنے عزیز فلورنس شہر کی عمارات کی محض ایک جھلک ہی دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً وہ ایک شکست خوردہ آدمی کے طور پر اس دنیا سے گیا۔ تاہم، اگر وہ اس بدقسمتی کا شکار نہ ہوتا تو اس کی حیثیت تاریخ میں محض ایک حاشیے جیسی ہوتی۔

تاریخی محققین میکیاولی کے "Discourses" کو اس کی اہم ترین تصنیف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک سیاسی مفکر کے طور پر اس کی حیثیت کو جاننے کے لیے اس تصنیف کو مدنظر

رکھتا ہوگا۔ لیکن چند ایک لوگ ہی اس کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ البتہ ادبی نقاد اس کے شاندار ڈرامے "The Mandrake Root" کو اہم ترین قرار دیں گے۔ جبکہ جنس کے سوشیالوجسٹ بھی کہیں گے کہ اس کے دوست فرانسسکو ویٹوری کے نام اس کا خط (جس میں وہ ایک فاحشہ کے ساتھ ملاقات بیان کرتا ہے) سب سے دلچسپ تحریر ہے۔ حال ہی میں غضبناک اور بے ذوق نام نہاد حقوقِ نسواں کی حامیوں نے اس مثالی تحریر پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ میکیاویلی کی زندگی کے بارے میں ہم بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس نے 32 برس کی عمر میں ماریتا کورسینی سے شادی کی اور چھ بچوں کا باپ بنا۔ متعدد دیوتیں کی طرح اس کے بھی بہت سے لوافیئر تھے۔

لیکن اس کی شہرت کی وجہ Discourses کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ Discourses تحریر کرنے کے دوران اس کا واسطہ ایک خصوصی کیس سے پڑا جس پر اس نے الگ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے خود سے پوچھا کہ اگر کوئی ری پبلک کسی جانب سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے خطرے سے دوچار ہو تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کے ذہن میں صرف ایک عملی مقصد تھا: میڈیچی (Medici) خاندان کو ترغیب دلانا (اگرچہ وہ میکیاویلی کی سابقہ سرپرست حکومت کا دشمن رہ چکا تھا) کہ بیرونی شورش انگیزوں کے خلاف صلیبی لڑائی شروع کی جائے۔ جووانی دی میڈیچی پوپ تھا اور اس کا بھائی گویلیانو طاقتور پوزیشن کا مالک نظر آتا تھا۔ میکیاویلی نے ان کی ملازمت میں جانے کی آس لگائی۔ اس نے 1513ء کے اواخر میں "بادشاہ" کا پہلا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ اسے 1516ء میں حتمی صورت ملی۔ میکیاویلی نے اسے لورینسو دی میڈیچی کے نام انتساب کیا۔ "بادشاہ" میکیاویلی کی موت کے پانچ برس بعد 1532ء میں شائع ہوئی اور ایک نہ ختم ہونے والی بحث شروع کی۔ 1640ء میں اس کا پہلا انگریزی ترجمہ منظرِ عام پر آیا۔ میکیاویلی کھیل کا آغاز ناظرین سے اس خطاب کے ساتھ کرتا ہے:

دنیا سمجھتی ہے کہ میکیاویلی مر گیا ہے۔
مگر اس کی تو محض روح ہی کوہ آلپس کے اس پار پرواز کر گئی ہے۔ . .

میں مذہب کو بچوں کا ایک کھلونا خیال کرتا'
دیکھو! گناہ نہیں بلکہ صرف جہالت موجود ہے۔
فضا میں اڑتے پرندے قاتل کا ماضی بتائیں گے'
میں اس قسم کی حماقت سننے پر شرمسار ہوں . . .

لیکن کیا یہ میکیاویلی کی جانب سے حمایت یافتہ بدمعاشی کی ایک قسم ہے جو "بادشاہ" میں بھی ملتی ہے؟ اس کا صاف اور دوٹوک جواب نہیں میں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہرگز اس کا پرچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک کٹر اخلاقیات پسند ہے؛ لیکن یہی اس کے اور دیگر ہم عصر روایتی نظر سازوں کے درمیان اہم فرق ہے۔ یہاں میکیاویلی صرف اور صرف ریاست کے مفادات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ "کسی کے فیصلہ کرنے کا دارومدار اس کے ملک کی بقا پر ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر انصاف یا ناانصافی' رحمدلی یا سفاکی' نیک اور برے اعمال کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ وہی راہ اختیار کرنی چاہیے جو ریاست اور اس کی آزادی کو محفوظ رکھے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے؛ بہرحال اس کی بنیاد سیاستدانوں کا طرزِ عمل ہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس سے اخلاقیات بچی رہے گی۔

میکیاویلی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بے باک حقیقت پسند انسان تھا جس نے موقع شناسی کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے روایتی اصولوں کو میدانِ عمل میں لانے سے انکار کر دیا اور وہ ایک مخلص محبِ وطن بھی تھا۔ لیکن وہ اپنی تمام تر ایمانداری اور حقیقت پسندی کے باوجود اس بات سے واقف نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک "براثر" مرتب کر رہا ہے۔ اول اس لیے کہ اس جیسے ایک رواقی کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ایمانداری کی قیمت کبھی وصول نہیں ہوتی اور دوم وہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ عیسائیت (یا کوئی بھی مذہب) قوانینِ فطرت کی نفی کرنے کے نتیجہ میں ناکارہ ہو سکتا ہے: "چنانچہ دنیا بدمعاشوں کے قبضے میں آ گئی جو سزا کے خوف کے بغیر حکومت کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی رعایا جنت میں جانے کی خاطر . . . انہیں سزا دینے کی بجائے

ان کی زیادتیاں برداشت کر لیتی ہے۔" یہ چیز ہمیں کارل مارکس کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔اور جو کچھ بھی کہا گیا وہ درست ہے۔لیکن یہ سچائی حقیقتاً عمیق نہیں۔

ہوبس' مارکس اور ہیوم کی طرح میکیاویلی نے بھی ایک مسئلہ دیکھا اور اسے حل کرنے کی کوشش کی۔"ہے" اور "چاہیے" کے مابین ایک غیر ایماندارانہ گڑبڑ کو دور کرنے کی خاطر میکیاویلی نے اپنا ذہین کردار ادا کیا اور اب بھی کر رہا ہے۔وہ انسانی فطرت کے شر انگیز اور گھٹیا پہلو کے متعلق کافی کچھ جانتا تھا' لیکن حقیقت کے بارے میں اس کے نظریات حیرت انگیز طور پر عالمانہ ہونے کے باوجود خدا کے احساس سے عاری ہیں...... نیز وہ بھی انسانی تجربے کے اس اہم پہلو کو بیان کرنے میں ناکام رہا۔ بلاشبہ مذہب اکثر ایک سراب یا دھوکہ نظر آتا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ واقعی ایک فریب ہے۔

33

کلیسیا کی بابلی اسیری

"On the Babylonian Captivity of the Church"

مارٹن لُوتھر

1520ء

احیائے علوم (ریفارمیشن) یا انسانی محرکات کا بنیادی غیر منطقی پن شناخت کرنے (فرائیڈ' ویبر' کوہن) جیسی تحریکیں بھی ایک مرد یا عورت کی پیداوار نہیں ہوتیں۔اور نہ ہی ان کے

نتیجے میں ایک دم سچائی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کاپرنیکس کی تھیوری کو بھی مزید توثیق کے لیے کافی انتظار کرنا پڑا اور سورج اور اس کے سیارچوں کے متعلق کچھ باریک تفصیلات اب بھی معلوم نہیں ہو سکیں۔ جان وِکلف' ولیم Tyndale' اراسمس اور بے شمار دیگر نے بھی پروٹسٹنٹ ازم کے وقوع پذیر ہونے میں زبردست کردار ادا کیا۔ لیکن مارٹن لُوتھر (1483ء تا 1546ء) خوش قسمت تھا کہ یہ سلسلہ اسی سے شروع ہوا۔

مارٹن لُوتھر ساکسونی میں ایک کسان کان کن Hans کے گھر پیدا ہوا۔ باپ اس کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے سے قاصر تھا۔ بچہ اپنے والدین سے ناخوش تھا اور اسے خود ہی کچھ بن کر دکھانا تھا۔ اس کا بچپن اس قدر درشت تھا کہ مسرت بیان کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا حالانکہ وہ اسے محسوس کر سکتا تھا۔ ایک موقع پر سکول میں اسے ایک ہی دن میں 15 مرتبہ سزا دی گئی۔ اس نے Erfurt کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور قانون کا پیشہ اختیار کرنے کو تھا کہ (ایک شدید طوفان کے دوران) اسے وہ کردار یاد آیا جو اس نے تاریخ میں ادا کرنا تھا۔ 22 برس کی عمر میں وہ آگستائی سلسلے کے راہبوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ (1507ء میں وہ باقاعدہ طور پر سلسلے کا رکن بنا اور 1511ء تک وٹنبرگ کی یونیورسٹی سے ڈاکٹر بن چکا تھا۔ وہ اپنے کلیسیا میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر سکتا تھا۔

لیکن اس کا کلیسیا پہلے سے ہی افراتفری میں مبتلا تھا' حتیٰ کہ اس دور کی پاپائیت بھی سنجیدگی سے اصلاحات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اراسمس اور تھامس مور جیسے عیسائی انسانیت پسند اندر سے تبدیلی کی بات کر رہے تھے۔ نیدرلینڈ کی ''Modem Devotion'' نامی تحریک کا مقصد مذہبی اور گھریلو زندگیوں کی اصلاح کرنا تھا۔ اس میں اراسمس جیسے لوگ شامل ہوئے۔ ان ''جدیدیت پسندوں'' نے رسم و رواج' احمقانہ توہمات اور کلیسیائی عہدوں کی فروخت پر شدید تنقید کی اور صحائف کے تازہ تراجم کے لیے آواز اٹھائی۔ ستمبر 1517ء میں اراسمس نے کہا' ''مجھے خوف ہے کہ ایک عظیم انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ اگلے ہی ماہ وٹنبرگ کے راہب مارٹن لوتھر کے ایک فعل نے یہ انقلاب بپا کر دیا۔

ابتداً میں لوتھر بھی اپنے عہد کے دیگر جرمن راہبوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس نے روم

کا دورہ کیا اور وہاں مذہبی طبقے کی اخلاقی بے راہروی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اسے مغفرت ناموں کی فروخت پر بھی بہت حیرت ہوئی جو گناہوں سے چھٹکارے کے لیے معاوضہ لے کر دیے جاتے تھے۔ انگلینڈ میں چوسر نے اپنی ''کینٹربری ٹیلز'' میں مغفرت ناموں کے اس غلط استعمال پر طنز کی تھی' دیگر کئی اہل قلم بھی اس کی پیروی کر چکے تھے۔ جب ایک کارڈینل کچھ مزید مغفرت نامے فروخت کرنے کی خاطر جرمنی آیا تو احتجاج کرنے والا صرف ایک پادری یا راہب لوتھر ہی نہ تھا۔ وہ ''Modern Devotion'' کی جانب سے قائم کردہ حجروں کا مداح بن چکا تھا جس میں راہب' راہبائیں اور عام لوگ نہایت سادہ اور شائستہ انداز میں زندگی گزارتے تھے۔

مگر لوتھر صورت حالات سے نالاں دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ احتجاج کرنے والا تھا اور اسے اپنی نجات کی بھی بہت فکر تھی۔ اس بارے میں وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ کلیسیا کے خلاف اس کی خفگیاں اس عہد کے جرمنی میں شامل متعدد ریاستوں کے عوام کی اکثریت کے ساتھ مطابقت اختیار کر گئیں۔

لوتھر کو دین بدر کرنے کے لیے پاپائی فرمان

نومبر 1517ء میں اس نے ایک کھلا جھگڑا شروع کرنے کے لیے غیر معمولی طریقہ اختیار کیا: اس نے اپنے مشہور ''95 مقالے'' وٹنبرگ میں Castle کلیسیا کے دروازے پر لٹکا دیے جن میں اس نے خود کو دو سال قبل پیش آنے والے بحران پر غور و فکر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس واقعے کے ذریعے خدا نے اسے حواریوں والا جوہر عطا کر دیا تھا: اعمال سے قطع نظر اکیلا عقیدہ ہی نجات

کو یقینی بنا سکتا ہے۔

ایک ماہ کے اندر اندر یہ مقالے دور دراز تک پہنچ گئے اور جلد ہی شائع ہوئے۔ کلیسیا نے خطرے کی بو سونگھ کر لوتھر کو رام کرنے کا سوچا' لیکن اس نے کلیسیا کی حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کچھ ہم خیال افراد کو اپنا حامی بنا لیا اور آبائی ریاست ساکسونی کے الیکٹر (elector) کا تحفظ حاصل کر لیا جو بالخصوص سیاسی وجوہ کی بناء پر مان گیا۔ جب پوپ کی جانب سے جاری ہونے والے ایک فرمان میں اس کو لعنت ملامت کی گئی تو لوتھر نے غصے میں فرمان کو پھاڑ کر پھینک دیا۔

1520ء میں لوتھر نے تین ڈاکومنٹس جاری کیے جو کلیسیا کے ساتھ تعلق قطع ہونے میں سنگ میل ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک ''بابلی اسیری'' بھی تھا جو اس کے خیالات کا واضح ترین ترجمان ہے۔ لاطینی زبان میں لکھی گئی یہ تحریر جلد ہی جرمن میں ترجمہ ہوئی۔ اس کی دیگر تحریروں مثلاً ''Catechism'' مختلف دینیاتی مسائل کے بارے میں تھیں' اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے عہد نامہ جدید کا ترجمہ اور سب سے بڑھ کر مناجات نے کافی وسیع پیمانے پر اثرات مرتب کیے۔

تاہم' اس کے برعکس یہ بھی کہنا پڑے گا کہ تقریباً 1524-25ء کے بعد کسانوں کی جنگ شروع ہونے کے ساتھ عہد اصلاح کی تحریک پر لوتھر کا اثر ماند پڑنے لگا۔ نہایت گہرائی میں ایک سیاسی رجعت پسند ہونے کے باعث وہ افراتفری سے خوفزدہ ہو گیا جسے اس نے خود ہی تقویت پہنچائی تھی' اور اس نے کسانوں کی پرزور مخالفت کی ...... یوں اس نے کئی دوست کھو دیے۔ کیتھولک کلیسیا والوں' مثلاً اراسمس نے اسے مغرور اور شور مچانے والا قرار دیا۔ دوسری طرف اسے ایک خطرناک بنیاد پرست کے طور پر دیکھا گیا۔

لوتھر کے احتجاج کی تہہ میں اس کا یہ ذاتی اعتقاد موجود تھا کہ بنی نوع انسان گناہ اور بھوک کے سامنے بے بس ہیں اور صرف اللہ کی رحمت ہی انہیں نجات دلا سکتی ہے۔ انسان مکمل طور پر برائی کی طاقت کے اختیار میں ہے اور گناہ کے سوا کچھ نہیں کر سکتا (لوتھر نے جنسی خواہش کو بھی گناہ کے ساتھ جوڑا)' لیکن خدا اپنے بیٹے یسوع کی نیکیوں کے طفیل اب بھی انسان کو گناہوں سے پاک سمجھتا ہے۔

''بابلی اسیری'' میں لوتھر نے سات روایتی ساکرامنٹس (Sacraments) سے انکار کیا...... داخلی روحانی اعجاز کی ظاہری علامات ...... بپتسمہ' توثیق' یوخرست' مجاہدہ' کٹھن ریاضت' مقدس سلسلے' شادی۔

مجھے ساکرامنٹس کی موجودگی سے انکار کرنا پڑے گا' اور میں یہ بھی کہوں گا کہ اس وقت صرف تین ساکرامنٹس یعنی بپتسمہ' مجاہدہ اور روٹی ہیں۔ [کیتھولک رسوم میں عوام کو صرف روٹی ملتی تھی اور وائن صرف پادری کی ہوتی تھی] . . . اور میں یہ بھی کہوں گا کہ صرف ایک ساکرامنٹ اور اس کی تین علامات ہوا کرتی تھیں۔

لوتھر نے اصرار کیا کہ یہ دونوں قسم کی شراکت (عوام کا روٹی اور وائن لینا) ہی مصدقہ تھی۔ مسیح کا اصل خون اور جسم altar پر ہونے یا نہ ہونے کے تنازع کے متعلق بات کرتے ہوئے لوتھر نے حقیقی موجودگی کی حمایت کی' لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ان میں سے کوئی بھی رائے تسلیم کرنا لوگوں کی اپنی مرضی ہے۔

1524ء میں انجام کار لوتھر نے اپنے سلسلے کو چھوڑ کر ایک سابقہ نن سے شادی کر لی۔ شاید لوتھر متلون مزاج آدمی رہا ہو...... جیسا کہ اس کا باپ بھی تھا۔ لوتھر میں بھری ہوئی نفرت نے اس کی کامیابی میں نہایت زبردست کردار ادا کیا' اس نفرت کا اظہار عموماً عمدہ فصیح البیانی کے ساتھ ہوا لیکن وہ اس منطقی پھندے میں پھنستے پھنستے رہ گیا جس نے فرانسیسی پادری جان کیلون کو جکڑ لیا تھا: اس نے بڑی آسانی سے اس سوال کا جواب دے دیا کہ اگر میں پہلے سے ملعون ہوں تو پھر زندگی میں اچھا رویہ کیوں اختیار کروں؟ یا ہر چیز کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ لوتھر نے اس چیز سے بھی انکار نہ کیا کہ نیک اعمال نے عقیدے کی مدد کی۔ لیکن اہمیت صرف عقیدے کو ملی۔

تاریخ کے بہاؤ پر فوری اثر ڈالنے والے متعدد دیگر لوگوں کی طرح لوتھر کی سوچ میں بھی تضادات موجود تھے۔ وہ بھی ناقابل برداشت حد تک بنیاد پرست ہو سکتا تھا' جیسا کہ 1525ء کے پمفلٹ میں اس نے حکمرانوں پر زور دیا:

بے فکر ہو کر اور ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس کیے بغیر ان (کسانوں) کا پیچھا کرو حتیٰ کہ ان کے دل دھڑکنا بند کر دیں۔ کسانوں کا برے ضمیر اور غیر منصفانہ مقصد کا حامل ہونا

ان کے فائدے میں ہے۔ یہ کسان متعدد بار موت کے مستحق ہیں . . .

عہد احیاء ناگزیر تھا۔ اس کے لیے سیاسی اور عقائدانہ میدان تیار ہو چکا تھا۔ لوتھر کوئی ایسا انسان نہ تھا کہ حلیم مزاج عیسائی اس کی پیروی کرتے۔ اپنی خداداد ذہانت کے باوجود اس نے اپنے جذبات پر قابو پانا بہت بعد میں سیکھا۔ لیکن یوں اس نے انسانوں کو ان کے گناہوں کے متعلق کچھ راحت کا احساس دلایا۔ اس نے منطق کو ''شیطان کی داشتہ'' قرار دیا...... یقیناً یہ ایک احمقانہ بات ہے۔ لوتھر کا کہنا تھا کہ استدلال کی صلاحیت ازلی گناہ سے داغدار ہو گئی تھی لہٰذا اس کے ذریعہ خدا کے بارے میں غور و فکر کرنا مناسب نہیں۔

افسوس کہ لوتھر نے عدم رواداری کو فروغ دیا اور قابل محبت نہ بن سکا۔ اس نے جس ''رحیم و کریم'' خدا کو پکارا وہ عام مسیحی مفہوم میں رحیم نہیں تھا۔ تاہم، لوتھر کو سینٹ پال سے چلی آ رہی روایت میں ایک اہم مرحلے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی آخری تصنیف (1545ء) زیادہ زور دار تھیں' جو پاپائیت کے خلاف ایک شدید اور غیر متوازن احتجاج سے عبارت ہے۔ یہ تحریر اس کے آخری دنوں کی خراب صحت کی عکاس اور جنسی اعتبار سے فحش ہے۔

سیکولر انصاف کے معاملے پر بات کرتے وقت لوتھر کی دینیات کمزور ہے۔ ہٹلر سے پہلے تک کوئی اور شخص جرمن عوام کو اس قدر مسحور نہ کر سکا۔

34

گارگنتوآ اور پنٹاگروئل

" Gargantua and Pantagruel "

فرانسوئز رابلیس

1534ء اور 1532ء

''گارگنتوآ اور پنٹاگروئل'' اپنے رتبہ کی دیگر کتابوں کے مقابلہ میں غالباً سب سے زیادہ زیر بحث آنے والی کتاب ہے۔ یہ چار حصوں میں منظر عام پر آئی: پنٹاگروئل (1532ء)؛ گارگنتوآ (1534ء)؛ تیسری کتاب (Tiers Livre، 1546) اور چوتھی کتاب (1549ء؛

(Quart Livre) ۔1562ء کی ایک اور "پانچویں کتاب" غالباً رابلیس کی تصنیف نہیں ہے یا اگر ہے تو محض جزوی طور پر۔

سترہویں صدی میں رابلیس کو بالعموم عام طور پر بنیادی حیثیت میں ایک مزاح نگار خیال کیا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں اس تصنیف کو اکثر استعاراتی یا تشبیہاتی انداز میں تشریح کیا گیا۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں نے اسے کافی مختلف نظر سے دیکھا......رواقی، منطق پسند، فطرت پسند، آزادی پسند......اور حال ہی میں اسے کٹر مذہبی رنگ دیا گیا۔ رابلیس کی مشہور فحش نگاری اپنے دور میں غیر معمولی نہیں تھی، اگرچہ حاسد جان کیلون اس کی کتاب کے متعلق جانتا تھا اور اس نے اسے ملعون بھی قرار دیا۔ تاہم، ان تمام تعبیروں اور تفسیروں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ لیکن کتاب کو ایک محتاط انداز میں لکھی ہوئی منظم تحریر خیال کرنا غلطی ہوگی۔ مصنف نے اسے لکھنے کے بعد کبھی اس پر نظر ثانی نہ کی۔ مگر یہ ہر عہد میں کافی اہمیت کی حامل رہی اور ہر صاحب مطالعہ فرد کو اس پر توجہ دینا پڑی۔

رابلیس کے متعلق زیادہ تر کتب دانشورانہ نوعیت کی ہیں۔ چنانچہ طنز نگار کی شہرت ایک حد تک ماند پڑ گئی کیونکہ بہرحال وہ اصلاً عوامی رنگ رکھتا تھا۔ درحقیقت وہ صحیح معنوں میں "عوامی لکھاریوں" میں سرفہرست ہے اور نشاۃ ثانیہ کے فرانسیسی ادب میں اس کی کتاب اولین قابل قدر کتاب ہے۔ اس کا اثر بے اندازہ ہے۔ موجودہ دور کا امریکی ناول نگار جیمز برانچ کیبل بھی اس سے متاثر ہے۔ تاہم، مانٹینی کی طرح والٹیئر نے بھی رابلیس کو ایک "بدمست شرابی" قرار دے کر مسترد کیا جس کی تحریریں نشے کی حالت میں لکھی گئی تھیں۔ البتہ بالزاک کے خیال میں اس کا "ذہن عظیم ترین" تھا اور پراؤست اور جوائس جیسے جدیدیت پسندوں نے رابلیس کی بنیادی سنجیدگی کو نئے سرے سے دریافت کیا۔

رابلیس کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ وہ ٹورین میں Chinon کے قریب ایک وکیل کے گھر پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ابتدائی سال ایک فرانسسکی راہب بن کر گزارے اور پھر پادری بنا۔ نئی انسانیت پسندی اور نتیجتاً یونانی زبان میں دلچسپی کے باعث اسے اپنے سے برتر عہدے والوں کے ہاتھوں اذیت اٹھانا پڑا......وہ یہ بات کبھی نہ بھولا اور اپنی ساری کتاب میں

متعدد جگہوں پر ان کے خلاف طنز کے نشتر استعمال کیے۔ 1524ء میں اسے نسبتاً کم سخت گیر بینڈ کٹی سلسلے میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اس وقت تک وہ اہم لوگوں کا تحفظ حاصل کر چکا تھا۔ 1528ء وہ پادری کا عہدہ ٹھکرانے کے قابل ہو گیا۔ رابلیس نے پیرس میں طب کا مطالعہ کیا اور بعد ازاں اپنے عہد کے ایک سرکردہ طبیب کے طور پر مشہور ہوا۔ 1526ء سے 1530ء تک کا عرصہ اس نے ضرور سیاحت اور سفر میں گزارا ہوگا۔ اس دوران اس نے نہ صرف بہت کچھ سیکھا بلکہ عام لوگوں کے انداز و اطوار سے بھی روشناس ہوا۔

1530ء میں مونٹ پیلیئر کے مقام پر اس نے گیلن اور بقراط کے متعلق لیکچر میں یونانی حوالے استعمال کیے اور یوں تشویش کی لہر دوڑا دی۔ یہ امر کافی واضح ہے کہ وہ دولت کی خاطر رومانٹک تحریروں کی جانب متوجہ ہوا اور لائنز کے ایک ہسپتال میں طبیب بن گیا۔ وہ اپنے سرپرست ژاں دو بیلے (Jean Du Bellay) کے ہمراہ تین مرتبہ روم گیا اور مئی 1554ء میں اپنی موت تک کلیسیائی حکام کی مخالفت کرتا رہا۔

رابلیس نے اپنی پہلی کتاب (جو اب ہمیشہ "دوسری کتاب" کے طور پر شائع کی جاتی ہے) کے لیے تحریک اپنے عہد کی ایک عوامی تصنیف سے حاصل کی جو گارگنتو نامی دیو کی زیادتیوں اور دست درازیوں کے بارے میں ہے۔ 1532ء کے بدترین قحط نے بھی اسے یہ کتاب لکھنے پر مائل کیا۔ یہ اس کا دیو پنٹاگروئل گارگنتوا کا بیٹا ہے۔ اس پہلی کتاب میں ایک اور اہم کردار Panurge ہے۔ اراسمس کی طرح رابلیس نے بھی یونانی طنز نگار لوسیان سے کافی کچھ مستعار لیا۔ ایک اور اثر اراسمس کی "حماقت کی مدح میں" نے مرتب کیا۔ یہاں زبان کے ساتھ کافی کھیل بازی موجود ہے اور متعدد نکتہ ہائے نظر پر طنزیہ تنقید بھی کی گئی ہے۔ رابلیس نے ہمیشہ زور دیا کہ سچائی مختلف آوازوں میں کلام کر سکتی ہے، حالانکہ اس کے عہد میں عقیدہ اور علم الکلام کا غلبہ بدستور جاری تھا۔ اس کا نہ صرف ایک ناقابل مفتوح طنز نگار بلکہ ایک زبردست Polymath ہونا بھی عیاں ہے۔

"گارگنتوا" میں رابلیس اپنے "خانقاہیت مخالف" ایبے ڈی تھیلیمے کو متعارف کراتا ہے جس سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ رابلیس ایک سنجیدہ مذہبی اور تعلیمی مقصد رکھنے والا

طنز نگار ہے۔ نہ کہ محض ایک ہجو گو۔ اراسمس اور چند دیگر انسانیت پسندوں کی طرح اس نے بھی مشاہدہ کیا کہ بہتر زندگی گزارنے کا ایک طریقہ تعلیم میں مضمر ہے۔ اس کے ایبے (Abbaye/خانقاہ) میں دو قسم کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں: راہب اور منافق۔ تاہم، انسانیت پسندوں کو کھلی اجازت ہے:

منافق اور دو غلے لوگ برائے مہربانی باہر رہیں: . . .
لیکن شریف اور شائستہ افراد ضرور آئیں . . .
یہاں تمام ٹیکس معاف ہیں،
اور آمدنی کثیر ہے . . .

رابلیس اپنی تیسری کتاب کی ابتدا میں قارئین سے التماس کرتا ہے کہ 78 ویں کتاب تک اپنی ہنسی روکے رہیں۔ یہ کتاب پہلی دو کتاب سے کافی مختلف ہے۔ ان کے درمیان بارہ سال کا وقفہ پڑا۔ پنٹا گروئل کی دیو قامت شخصیت تقریباً بھلا دی گئی ہے۔ یہاں بنیادی طور پر فرانس کی پر زور شورش کا ذکر ہے۔ یہ شورش اور تحریک مزاحیہ اور ہجویہ سے لے کر نہایت علمی سطحوں تک تقریباً 100 سال جاری رہی۔ اس تحریک کا نام ''عورت کا سوال'' (Querelle des femmes) تھا۔ یہ عموماً موجودہ دور کی نام نہاد حقوقِ نسواں کی تحریکوں جیسی مضحکہ خیز بن گئی، لیکن اکثر اس میں کافی سنجیدگی بھی پیدا ہوئی اور دونوں جنسوں کے درمیان فرق کے ساتھ نمٹنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ رابلیس اپنے کردار Panurge کو واپس لاتا اور اس سوال کو ساری تحریر کا موضوع بناتا ہے کہ اسے شادی کرنی چاہیے یا نہیں۔

بالعموم رابلیس نے ''عورت سے نفرت کرنے والوں'' کی طرفداری کی؛ اور Pantagruelist عورت سے نفرت کرنے والوں کے لیے ایک نیا نام بن گیا۔ لیکن رابلیس کے ایک بہترین مترجم سیموئیل پٹنام کے خیال میں یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں۔ یہاں ہم اس سوال کی گہرائی میں تو نہیں جا سکتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ کتاب تو فلاطونی مارگریٹ، نوارے کی ملکہ کے نام انتساب ہے، جو اپنے عہد میں حقوقِ نسواں کی ممتاز ترین علمبردار تھی۔ اپنے جانشین سروانتیس کی طرح رابلیس بھی اپنے عہد کی ''مصنوعی شجاعت'' پر تنقید کر رہا تھا جو عورتوں کا رتبہ

گھٹانے پر مائل تھی۔

چوتھی کتاب میں پنٹا گروئل کی بحری مہمات کا بیان ہے۔ یہ کتاب در حقیقت سولہویں صدی کی جغرافیائی دریافتوں اور اس کے نتائج کی عکاس ہے۔ والٹیر کلیسیائیت کے خلاف اپنے تمام خیالات کے باوجود رابلیس سے نفرت کرتا تھا، لیکن اس نے اس کتاب کے بارے میں ایک بصیرت افروز رائے دی: ''فرانس میں کبھی بھی اس پر پابندی نہیں لگی (لیکن اصل میں لگی تھی) کیونکہ اس میں ہر بات یاوہ گوئی میں اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ آپ مصنف کے اصل مقصد کے بارے میں سوچنے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔''

رابلیس کی پہلی کتاب کے شروع میں ایک مشہور اقتباس ذیل میں دیا جا رہا ہے:

''کتے کی مثال پر عمل کرتے ہوئے آپ کو ان عمدہ اور کیمیائی کتب کو سونگھنے اور ان کی اہمیت جانچنے کی عقلمندی کرنا ہوگی: تعاقب میں سبک رفتاری اور حملہ کرنے میں بہادری کی ضرورت ہے، جس کے بعد آپ محتاط انداز میں پڑھنے اور غور و فکر کے ذریعہ ہڈی کو توڑ کر اصل مفہوم کا گودا کھائیں گے۔''

زیادہ تر دیگر صوفیوں کے برعکس رابلیس نے طربیہ انداز اختیار کیا۔ اگر زندگی موزوں اور منصفانہ ہو تو قہقہے کی کوئی وجہ بھی نہ ہوتی۔ اس کی تحریروں کو مجموعی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے جو زندگی کی صورتحال کے بارے میں ہیں۔ وہ اپنے قہقہے کے باوجود کسی سیاسی یا استدلال پسند لکھاری کی نسبت افلاطون، Buber، ژیان اور دھمپد کے زیادہ قریب ہے۔ وہ قہقہے میں سنجیدگی کا مفہوم دریافت کرتا ہے۔

35

عیسائی مذہب کی روایات

" Institutes of the Christian Religion "

جان کیلوِن

1536ء

کیلون تمام تر ''المناکی'' کو تسلیم کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اس کا کوئی حل نہیں: ''کچھ افراد ماں کی کوکھ سے ہی مخصوص موت مرنے کا مقدر لے کر پیدا ہوتے ہیں تاکہ ان کی تباہی میں خدا کا نام رفعت حاصل کرے۔''

کیلون کے خیال میں خدا نے ابتدائے آفرینش سے پہلے ہی فیصلہ دے دیا تھا کہ اس کے کچھ بندے ابدی طور پر ملعون ہوں گے: ''اگر کوئی سزا دینے والا موجود نہ ہوتا تو خدا یہ مظاہرہ نہ کر پاتا کہ وہ باطنی طور پر انتقام لینے والا خدا ہے۔'' مضحکہ خیز بات یہ کہ اس دور کی کیتھولک تعلیمی پریکٹس بھی اس نظریہ خدا سے متاثر ہوئی۔ جیمز جوائس نے فخریہ انداز میں اس کو واضح بھی کیا۔

نجات اور ابدی زندگی کے لیے خدا کے منتخب بندوں نے (جو ملعونوں کی نسبت کم تعداد میں ہیں) اپنے اوپر کی گئی اس عنایت کے شایان شان کچھ زیادہ نہیں کیا۔ کیلون ازم میں محروم نجات نہ ہونا ناممکن ہے' لیکن منتخب فرد ایک قسم کی فضیلت رکھتا ہے۔ انہیں ''یقین دہانی کرا دی جاتی ہے'' کہ وہ منتخب بندے ہیں۔ کیلون واضح طور پر اپنے ''منتخب'' ہونے کے بارے میں پر یقین نظر آتا ہے۔ اس دینیات میں یقین رکھنے والے چند ایک لوگ ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ''منتخب بندے نہیں ہیں...... لیکن ان بدقسمت لوگوں نے بھی زندگی گزاری۔ اپنے ملعون ہونے کا یقین رکھنے والے انگریز فرانسس سپائرا کا کیس سب سے زیادہ مشہور ہے۔ انگلینڈ جب کیلون ازم کے زیر اثر آیا تو وہاں اس قسم کی کتابیں شائع ہوئیں: ''ضمیر کا مقدمہ'' . . . ''خدا کی اولاد ہونے یا نہ ہونے کا علم کیسے حاصل کیا جائے'' (1952ء)۔

کیلون نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا کہ ''انسان میں روح کی برکت والی زندگی سے متعلقہ ہر چیز معدوم ہو چکی ہے۔'' اس نے کہا کہ کلیسیا ظاہری ایمان رکھنے والوں سے بھرا ہوا ہے: وہ منافق ہیں جن کے ذہن میں خدا اب بھی سرایت کیے ہوئے ہے تاکہ وہ اس حالت میں بھی روح کی نیکی کا ذائقہ چکھ سکیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ''خدا مسترد کیے ہوؤں کو حشر میں اٹھاتا ہے تاکہ انہیں سزا دے کر اپنی عظمت کا مظاہرہ کر سکے۔''

کیا سولہویں صدی کی اس نہایت فیصلہ کن دینیاتی کتاب کا منبع زندگی سے شدید نیوراتی (neurotic) نفرت میں ہے یا اپنی نجات پر یقین میں؟ (کیلون کی نظر میں نجات پر یقین کا نام ایمان ہے)۔ بہر صورت دنیا کو معاندانہ اور اس کے خدا کو انتقام پرور دیو کے طور پر دیکھا گیا۔ اس کے مقابلہ میں لوتھر اپنی تمام تر درشتی اور اکھڑپن کے باوجود رحمدل نظر آتا ہے۔ لوتھر نے کروڑوں لوگوں کے سزا پانے پر خوشی نہیں منائی۔ کیلون نے محسوس کیا کہ اس کی اپنی نجات یقینی تھی کیونکہ وہ اپنی ''آزمائشوں'' میں پورا اترا تھا: مخلصانہ عقیدہ' راست روزندگی' خدا کی ضیافت

rekhta

کے ساکرامنٹ پر حاضری۔ لوتھر نے اس قسم کی آزمائشوں کے وجود سے انکار کیا۔

لیکن کیلون ازم اور اس کے نہایت جابر و ظالم خدا کی کراہت کوئی ایسی دلیل نہیں جسے ہم کیلون ازم کے خلاف استعمال کر سکیں۔ اس خدا کی ہیبت ناکی کچھ حد تو ان فلسفیانہ مشکلات کا نتیجہ ہے جو ابتدائی عیسائیوں کو پیش آئیں۔ کارل یوپر کے الفاظ میں دینیات (علم دین/Theology) محض ایمان کی کمی ہے؛ اور کلیسیائی فادرز کے ایجاد کردہ تشبیہی خدا نے ان کے لیے عقلی مسائل پیدا کیے۔ سابق ''لادین'' آگسٹائن خاص طور پر پیلاگیئن ازم کی وجہ سے پریشان ہوا۔ پیلاگیئس نے تعلیم دی تھی کہ انسان خدا کی رحمت کے بغیر بھی اپنی نجات حاصل کر سکتے ہیں (تاہم، اس نے خدا کی رحمت سے انکار نہیں کیا)۔

آگسٹائن کا خدا قادر مطلق تھا۔ لہٰذا وہ کیلون والے نکتۂ نظر سے کافی قریب پہنچ گیا۔ لیکن اس نے آزاد ارادے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور خدا کی پیش بینی اور اپنی مرضی کے درمیان فرق کرنے کا بھی خواہشمند تھا۔ وہ خدا کی جابرانہ صفات کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آگسٹائن اور کیلون دونوں نے ہی اپنے نظریات کی بنیاد مسیح کی بجائے سینٹ پال کو بنایا۔ دونوں کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے concupiscence یعنی جنس اور دنیا کی خواہش کو بہت برا اور ازلی گناہ کی علامت خیال کیا۔ آدم اور حوا باغ عدن میں ''گناہ سے پاک'' زندگی گزار رہے تھے' حتیٰ کہ حوا نے شیطان کا دیا ہوا سیب کھا لیا'' یعنی جنس کا دوسرا نام گناہ ہے۔ پولینڈ کے عظیم ماہرین بشریات نے درست کہا تھا کہ جنس نے اس قدر پریشانی پیدا کی ہے اور اس کے گرد اس قدر معموز ہیں کہ کوئی بھی اس کے پیش کردہ مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوا۔

آگسٹائن اور (کمتر ذہن کے مالک) کیلون دونوں ہی اپنی جنسی اشتہا کے ہاتھوں بے چین ہوئے ..... چنانچہ انہوں نے ایک مصنوعی خدا بنایا جو جنسی اشتہا کا خالق ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے ماورا بھی تھا۔ کیلون ایک لحاظ سے ''دقیقن زدہ آگسٹائن'' ہے۔ چونکہ اس کا مسلک ''اصلاح یافتہ'' ہونے کے دعویدار ہر کلیسیا کی تہہ میں ایک حد تک لازماً موجود ہے' اس لیے اسے بے جا دانشورانہ رتبہ حاصل ہو گیا۔

کان کن کے بیٹے لوتھر کے برعکس کیلون (1509ء تا 1564ء) کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ فرانس میں پکارڈی (Picardy) کے علاقے Noyon کے ایک اٹارنی کے گھر پیدا ہوا۔ اس نے قانون کی تربیت حاصل کی مال کے زیر سایہ ایک اچھے کیتھولک کے طور پر پرورش پائی لیکن مذہبی امامت کے فرائض کبھی بھی انجام نہ دیے۔ پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ 20 برس کی عمر میں ایک ''تبدیلی'' کے عمل سے گزرا اور نہ صرف پروٹسٹنٹ ازم کا حامی بن گیا بلکہ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ خدا نے اسے ایک مقدس فریضہ سونپا ہے: کلیسیا کی اصل پاکیزگی بحال کرنے کا فریضہ۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا نے سب کچھ پہلے ہی طے کر دیا تھا تو کیلون نے یہ کیوں سوچا کہ اس سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ وہ ایک فلسفی نہیں تھا؛ وہ دنیاوی طاقت کے پیچھے بھاگنے والا ایک ظالم اور بے قرار انسان تھا اور اسے اپنی منزل مل بھی گئی۔

اس نے مارچ 1536ء میں ''Institutes'' شائع کی اور جلد ہی شہرت حاصل کرنے کے بعد فرانس کے فرانسس اول کی ایذا رسانی سے بچنے کے لیے فرار ہوا۔ سوئس شہر جنیوا سے گزرتے ہوئے ایک اسی جیسے ظالم مصلح گویلام فاریل (Guillaume Farel) نے اسے وہیں ٹھہرنے اور ''اصلاح'' کے قیام میں مدد دینے پر مائل کر لیا۔ کہتے ہیں کہ فاریل نے اسے دوزخ کی تکالیف سے ڈرایا..... لیکن یہ چیز بھی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ معاملہ ابتدائے آفرینش میں ہی طے ہو چکا تھا!

کیلون کو جنیوا میں دینیات کا پروفیسر تعینات کیا گیا' اور حزب اختلاف کی بالادستی کے دوران دو سال کی غیر حاضری کے سوا وہ آخری سانس تک وہیں رہا۔ سٹراسبورگ میں جلاوطنی کے دن گزارنے (1538ء تا 1541ء) کے دوران اس نے ایک ایناباپٹسٹ کی بیوہ Idellette de Bure سے شادی کی؛ ان کا بیٹا پیدا ہوتے ہی مر گیا (1541ء) اور Idellette نے 1549ء میں وفات پائی۔

وقت آنے پر کیلون نے جنیوا میں ایک خاموش عذاب کی حکومت قائم کی۔ شہر نے ایک معاشی اکائی کے طور پر ترقی پائی لیکن وہاں سخت گیر اخلاقیات اور عدم رواداری کا دور دورہ تھا۔ ''غافلوں'' کے پیچھے جاسوس لگا دیے جاتے اور ''بے لگاموں'' کو دین سے خارج کر دیا جاتا۔

ہر کسی کی زندگی کی تفصیلات کی جانچ پڑتال کی جاتی اور 1552ء میں جنیوا کی کونسل نے ''Institutes'' کو ''مقدس عقیدہ'' قرار دے دیا'' جس کے خلاف بولنے کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہوگی۔'' 1547ء میں Jacques Gouet نامی شخص کو ''فسق و فجور'' کے الزام میں مارا جا چکا تھا۔ تشدد اور سزائے موت کی دیگر مثالیں بھی موجود تھیں۔ ایڈورڈ گبن کی نظر میں کیتھولک عدالت احتساب کی نسبت کیلون کی ذاتی سادیت زیادہ خوفناک ہے۔

کیلون کے بغض، حسد اور سادیت کا بہترین مظاہرہ طبیب اور ''لادین'' مائیکل سروٹس (1511ء تا 1553ء) کے ساتھ سلوک میں ہوتا ہے۔ 1531ء میں سروٹس (Servetus) نے اپنے مقالے میں تثلیث سے انکار کیا...... جو دوسرے الفاظ میں ایک قدیم وحدت الوجودی رائے تھی۔ کیلون نے خط و کتابت کے ذریعے اس کے ساتھ مناظرہ کیا اور خود کو لاجواب ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے قسم کھائی کہ اگر سروٹس جنیوا میں مل گیا تو اسے زندہ بچ کر نہیں جانے دے گا۔

اب بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ آج جسے ہم عیسائیت کہتے ہیں اس کا ماخذ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات نہیں (جو غالباً ایک غناسطی رہے ہوں گے) بلکہ پال کی پیش کردہ تفسیر ہے۔ تمام کلیساؤں اور بالخصوص کیلون نے پال پر بہت زیادہ انحصار کیا۔ فلسفیانہ و تاریخی اعتبار سے کلیسیا اور نہ ہی لوتھر یا کیلون کو پائیداری نصیب ہوئی۔ لیکن ان کنفیوژنز سے برآمد ہونے والے مسخ شدہ مذہب نے کافی صداقت اور گہرائی برقرار رکھی، حالانکہ مارسیون اور دیگر غناسطیوں کو وحشیانہ انداز میں نظر انداز بھی کیا گیا۔ کوئی بھی شخص آگسٹائن کو صرف اس وجہ سے نہیں کھونا چاہتا کہ وہ ایک کھلا ذہن رکھنے میں ناکامی کے باعث گمراہ ہو گیا تھا۔

عیسائیت کے جوہر کو سمجھنے کے لیے تارسس کے شیطان صفت ساؤل (Saul) سے بھی پہلے کے دور میں واپس جانا ہوگا۔ لیکن اراسمس کی طرح لوتھر نے بھی کلیسیا کی برائیوں کا خاتمہ کرنا چاہا تھا...... تاکہ اس کی اصل پاکیزگی بحال کی جا سکے۔ جب کیلون منظر عام پر آیا تو ناشائستگی اور عدم رواداری نے ایک مرتبہ پھر غلبہ پا لیا ہوا تھا۔ یہ بات بہت مضحکہ خیز ہے کہ بیسویں صدی کے ماہر دینیات کارل بارتھ کو اپنے کلیسیا کی تجدید کی بحالی کرنے کے لیے کیلون ازم سے رجوع کرنے کی ضرورت پڑی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ کیلون کا جنیوا تھرڈ Reich کے لیے ایک بلیو پرنٹ ثابت ہوا۔

36

آسمانی مداروں کی گردش

"On the Revolution of the Celestial Orbs"

نکولس کاپرنیکس

1543ء

پولش قانون دان اور ماہر فلکیات کاپرنیکس (1473ء تا 1543ء) کو اہم اور بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن آغاز میں اسے صحیح طور پر سمجھا نہ جا سکا۔ کاپرنیکس پہلا ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے سورج کو نظام شمسی کے مرکز میں رکھا، اور ایسا کرنے کی وجوہ (جو اس نے پیش کیں)

متعدد حوالوں سے بے بنیاد تھیں۔ تاہم، اس کے کارنامے کی عظمت میں کوئی شک نہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں شائع ہونے والی اس کی کتاب کو تب رومن کلیسیا کی ممنوعہ کتابوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام 1616ء میں ہوا۔ اس کا نظریہ قبول ہونے کے کافی عرصہ بعد 1757ء میں ہی کہیں جا کر اسے ممنوعہ کتب کی فہرست سے نکالا گیا۔

کاپرنیکس نے پولینڈ میں کراکو کے مقام پر اور پھر اٹلی میں بولونا (Bologna) کے مقام پر تعلیم حاصل کی۔ تب اس نے مشرقی پروشیا میں فروئنبرگ کے مذہبی قانون دان کا عہدہ قبول کرلیا۔ اس کے فرائض میں کلیسیا کی املاک کا دھیان رکھنا شامل تھا۔ اس نے یہ ذمہ داریاں اچھی طرح نبھائیں، لیکن اپنا زیادہ تر وقت ایک چھوٹی سی رصدگاہ میں گزارا جو اس نے 1513ء میں تعمیر کی تھی۔

ارسطو نے فیثا غورثیوں کے اس نظریہ پر تنقید کی تھی کہ کائنات کی سب سے زیادہ اہم اور انمول چیز یعنی آگ کائنات کے مرکز میں ہے، اور یہ کہ گھومنے والی زمین کے علاوہ ایک نظر نہ آنے والی دنیا بھی آسمانی آگ کے گرد گھومتی ہے۔ زمین کے ساتھ ساتھ سورج بھی اس آسمانی آگ کے گرد محو گردش ہے۔ سورج کو مرکز ماننے کی حمایت میں ارسطارقس آف ساموس (تقریباً 200 ق۔م) کے نظریات کے باوجود یہ نظریہ غالب رہا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور ہم خود بھی تو اپنے آپ کو مرکز میں آباد سمجھتے ہیں۔ ہم کائنات میں جہاں بھی کھڑے ہو کر دیکھتے خود کو مرکز میں ہی پاتے۔

کلاڈیس ٹولمی (دوسری صدی عیسوی) کے نکتہ نظر نے اس فسانے کو کاملیت دی: زمین کے گرد سیاراتی حرکت کے کامل دائرے (جن پر فیثا غورثیوں کے وارث افلاطون نے زور دیا تھا) "epicycles" کے ذریعہ قائم ہیں۔ کامل ترین حرکت دائروی حرکت سے قریب ترین تھی، اور ٹولمی کی تھیوری اسی کے متعلق تھی۔

کاپرنیکس بھی دائروی حرکت کی کاملیت پر یقین رکھتا تھا اور مرکز میں آگ کا پرانا نظریہ بھی اس کے دماغ سے محو نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا:

"تاہم، ہر چیز کے وسط میں سورج ہے۔ کیونکہ اس نہایت

خوبصورت معبد میں آپ اس چراغ کو وسط کے سوا اور بھلا کہاں رکھتے کہ یہ بیک وقت ہر چیز کو منور کرسکتا؟ کچھ لوگوں نے اسے بجا طور پر کائنات کی لالٹین' دماغ یا حکمران کہا ہے۔ ہرمیس اسے دکھائی دینے والا خدا اور سوفوکلیز کی الیکٹرا اسے بصیر مطلق کہتی ہے۔"

چنانچہ یہ ایک مطلق مضحکہ خیز بات ہے کہ کاپرنیکس اپنے انقلابی نظریہ تک پہنچا جس کے لیے سائنس کے مورخین اسے "ہرمیس ازم کی وجوہ کہتے ہیں۔ ہرمیس ازم یا تصوف...... لوگ اسے چاہے کوئی بھی نام دیں...... کو سائنسی صداقت کو مسترد کرنے کی ضرورت نہیں: اس کے برعکس یہ اسے بڑھاوا دیتی ہے' جیسا کہ ابولفیہ اور میسٹر ایکہارٹ نے میمونائیڈز کی تحریروں کو اپنے اندر سموتے وقت تسلیم کیا تھا۔

نکولس کاپرنیکس

درحقیقت اسی قسم کے ہرمیس ازم نے انگریز جادوگر جان ڈی اور اطالوی فلسفی گیارڈیرونو کو سورج کی مرکزیت کا نظریہ اس قدر جوش وخروش کے ساتھ اپنانے پر مائل کیا تھا۔ یہ درست ہے جان ڈی اس بارے میں کچھ نہ بولا اور اپنے شاگرد تھامس Digges کو اس کی تشہیر کرنے کی اجازت دی۔

کیپلر کی طرح کاپرنیکس بھی کائنات کی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے افلاک کی گردش کی سائنس میں کوئی حصہ نہ ڈالا۔ اس نے اپنی بنیاد اس نظریہ کو بنایا کہ سورج "کائنات کی لالٹین" ہے۔ وہ سورج کے گرد ایک مستقل رفتار سے گھومتے ہوئے اجسام کا ادراک نہ کرسکتا تھا...... کیونکہ خدا بذات خود مستقل تھا۔ ہے نا؟ چنانچہ وہ کبھی بھی اپنے نظریہ کو اپنے مشاہدات کے مطابق نہ بنا سکا اور یوں ٹولمی کے epicycles کو برقرار رکھا۔ اپنا مضحکہ اڑنے سے خوفزدہ

کاپرنیکس نے ''ایک چھوٹی سی شرح'' کو مشتہر کیا اور پاپائے وقت نے بھی اسے منظور کرتے ہوئے شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ 1539ء میں کاپرنیکس نے عجلت میں اس نظریہ پر کام شروع کیا اور وٹنبرگ یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر جارج یوآکم بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ کاپرنیکس اپنی کتاب شائع ہونے کا موقع آنے تک بستر مرگ پر جا پڑا تھا۔ بلاشبہ وہ اس قدر استطاعت نہیں رکھتا کہ ایک پروٹسٹنٹ Osiander کے تحریر کردہ دیباچے کو شامل ہونے سے روک سکے جس میں کہا گیا تھا کہ یہ نظریہ صرف بطور مفروضہ پیش کیا جا رہا ہے نہ کہ بطور ایک صداقت...... اس کا ایک مفروضہ ہونا محفوظ تھا۔

کاپرنیکس اپنی تصنیف کو مکمل نہ کر سکا' اور اسے پایہ تکمیل کو پہنچانا ڈینش فلکیات دان ٹائیکو براہے' فیثا غورثی جوہانس کیپلر اور اطالوی گلیلیو گلیلی اور بالآخر آئزک نیوٹن کے حصے میں آیا۔ اکثر اور کافی حد تک بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ کاپرنیکس نے انسان کو کائنات کے مرکز سے نکالنا اور مذہب کی جڑیں کھوکھلی کرنا شروع کیا تھا۔ بیشتر مورخین کے خیال میں یہ بات درست ہے لیکن معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں۔

دراصل کاپرنیکس نے جھوٹی اور مصنوعی عیسائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کیا تھا...... ایسی عیسائیت جو اندر سے گل سڑ چکی تھی اور اس سچائی کو برداشت کرنے کے قابل بھی نہ تھی۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک حکام دونوں ہی اس نا روائی کے مرتکب ہوئے۔

ابتدا میں غیر مصدقہ وجود کی بنا پر سورج کی مرکزیت والے نظریہ کی بہت کم مخالفت ہوئی۔ لوتھر' براہے' ماگینی' بیکن اور بیشتر دیگر نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ لوتھر نے اپنے فطری متشدد انداز میں کاپرنیکس کو ایک خبطی اور صحائف کی شان میں گستاخی کرنے والا قرار دیا۔ نظریے کی مخالفت آہستہ آہستہ پیدا ہوئی۔ انجام کار گلیلیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ عدالت احتساب کے سامنے اس سے انکار کرے۔ دریں اثنا عظیم صوفی گیارڈانو برونو (1542ء تا 1600ء) نے اس کو اپنے غناسطی فلسفہ کا بنیادی امر بنایا۔ متعدد جدید صوفیاء (باطنیت پسندوں) کی طرح برونو بھی ایک خالصتاً مادی کائنات پر یقین رکھتا تھا مگر اس کائنات کے گوشے گوشے میں خدا جلوہ گر تھا۔ بہت سے دوسروں کی طرح اس کے لیے بھی کائنات بذات خود ایک عظیم ذہانت تھی۔ وہ اپنے

عقائد کی وجہ سے جلا دیا گیا (تاہم اس نے ہوشیاری سے کام نہ لیا تھا)۔ یہ امر واضح نہیں کہ کاپرنیکس کی تھیوری کو اپنانے سے اس کو کس حد تک نقصان ہوا۔ نہ ہی وہ تمام حوالوں سے اس کی ریاضی کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن سائنس کے علاوہ مذہبی صداقت کے لیے بھی وقف اس قسم کے انسان کو اس وقت تک زندہ رہنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی جب تک کہ وہ ایک بھرپور انداز میں توبہ نہ کر لیتا۔ اس نے یہ کام نہ کیا۔ وینس کا ایک امیر کبیر نوجوان اسے واپس روم لے آیا' لیکن جب اسے پتہ چلا کہ برونو اسے کالا جادو نہیں سکھائے گا تو عدالت احتساب کو اس کے بارے میں اطلاع کر دی۔ اس کے مقدس قاتلوں میں ایک یسوعی کارڈینل بیلا رمین بھی تھا جسے 1930ء میں ایک مہربان کلیسیا نے اپنا سرپرست تسلیم کیا۔ لیکن برونو کا اثر بالخصوص سپنوزا میں قائم و دائم رہا۔ وہ جیمز جوائس کے "Finnegans Wake" میں بھی مسٹر براؤن' برونو لان اور دیگر ناموں کے ساتھ زندہ ہے۔ نسبتاً زیادہ ڈرپوک کاپرنیکس کو بھی خوفزدہ کیا گیا؛ بہر حال یہ خوف سائنسی ثبوتیت پسندی کی بجائے مذہبی میدان میں تھا۔

برونو نے عدالتِ احتساب کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا: ''میں دیکھتا ہوں کہ کائنات لامحدود ہے...... ایک محدود دنیا خدا کے شایان شان نہ ہوتی۔ چنانچہ میں نے قرار دیا کہ اس زمین کے علاوہ بھی لاتعداد دنیائیں موجود ہیں؛ فیثا غورث کی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ زمین بھی دیگر ستاروں جیسا ایک ستارہ ہے...... خدا نا قابل بیان حد تک...... ہر چیز میں سمایا ہوا ہے۔''

یہ گلیلیو تھا جو کاپرنیکس کے نظریے سے کلیسیا کی اچانک نفرت کا پہلا حقیقی شکار بنا...... ممکن ہے کہ یہ حاسد پادریوں کے مابین کوئی سازشی معاملہ ہو۔ لیکن گلیلیو اپنی جان بچانے میں کامیاب رہا۔ درحقیقت برونو کے خوف نے ہی کلیسیا کو فیصلہ کن انداز میں سچائی کا مخالف بنایا۔

37

مضامین

"Essays "

مائیکل ایوکیوم دی مانٹینی

1580ء

سترھویں صدی کی سوچ اور نتیجتاً ہمارے انداز فکر پر بھی گہرے اثرات مرتب کرنے والے مائیکل دی مانٹینی (1533ء تا 1592ء) کا اپنے کام کو "فضول" قرار دینا بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مضمون نگار مانٹینی کی نثر شیکسپیئر جیسی ہے اور اس کا اثر بھی شیکسپیئر جیسا ہے۔ یہ موازنہ

باعث حیرت ہے' لیکن یہ موازنہ کرنا اس لیے ممکن ہے کیونکہ ایک مضمون نگار' زندگی کے تمام پہلوؤں کے مفسر کی حیثیت سے مانٹینی دانستہ طور پر جذبات کے فقدان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ معتدل نظر آتا ہے اور اپنے تخیل کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا۔ تاہم، وہ بھی بالکل شیکسپیئر جیسا لگتا ہے مگر موخر الذکر اپنے تخیلات' خوابوں اور ڈراؤنے خوابوں کو چھپا نہ سکا۔ شیکسپیئر کی مانند وہ بھی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

مانٹینی شاعری کا بڑا مداح ہے...... اس نے تقریباً 900 اشعار کے حوالے دیے۔ مگر دوسری طرف وہ اس افلاطونی نظریے کا دعویدار بھی ہے کہ بہترین شاعری سب سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے' لیکن یہ رائے ایک غیر شاعر' ایک قاری کی ہے...... اور مانٹینی خود بھی ایک بہت بڑا قاری تھا۔ ایک "عام قاری" ہونا ایک خصوصیت ہے جو بہت کم مصنفوں میں نظر آتی ہے۔ اسی لیے وہ بہت زیادہ "عالم" نہیں۔ جولیس سیزر سکیلا نجر اور اس کے بیٹے جوزف جسٹس (سولہویں صدی کا نہایت فاضل محقق) دونوں نے ہی اپنی نخوت و تکبر کے باعث علم کے ساتھ ساتھ روح کا بھی خون کیا۔ مانٹینی "الفاظ کا مصنوعی پن" میں لکھتا ہے کہ پروفیشنل زبان "شعبدہ بازی" ہے۔ اس نے شکایت کی کہ اس قسم کی "شاندار اور کمیاب" زبان کی اہمیت "گھریلو نوکرانی کی گپ بازی سے زیادہ نہیں۔" یہ بات سکیلا نجر جیسوں کو اچھی نہیں لگے گی: نہ ہی بس جدید بہت کے ہم عصر حمایتی اس سے خوش ہوں گے۔

مانٹینی نے تشکیکی نکتہ نظر اس لیے اپنایا کیونکہ اس کے ہم عصر یا قریبی دور کے اہل علم بہت زیادہ نظریہ یا عقیدہ پرست تھے (مثلاً تعمیر کے میدان میں)۔ یہ عدم احترام کا اظہار بھی ہے: اس دور میں خود نوشت سوانحات کے مصنفین کے پاس لاف زنی کے لیے کچھ موجود تھا: سیزر' سسرو' آگسٹائن۔ مانٹینی کسی طاقت یا شان کا حامل نہیں تھا کہ اس پر اتراتا۔ وہ محض ایک آدمی تھا اور ادبی روایت کسی "نان کوالیفائیڈ" آدمی کو زندگی کی تفسیر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مانٹینی تک یہی صورتحال تھی۔

اس کا انداز تحریر سیدھا سادا' بے تصنع اور آسان ہے۔ لیکن وہ ایک سنجیدہ آدمی تھا جس کی ذہانت اور دنیا کی ہر چیز کے بارے میں با علم آراء نے ساری دنیا کے تعلیم یافتہ افراد کو متاثر کیا۔ وہ نشاۃ ثانیہ کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا نثر نگار بن گیا' اور اب بھی ہے۔ شیکسپیئر نے اسے

پڑھا اور نوٹس لیے۔ کچھ کے خیال میں تو ہیملٹ کا کردار بھی مانٹینی کا عکس ہے...... اس کی ذاتی زندگی کا نہیں بلکہ سوچنے کے خصوصی تشکیکی انداز کا۔ اگر یہ بات بالکل درست نہ بھی ہو تو تب بھی اسے یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

مائیکل 1568ء میں Seigneur de Montaigne بنا۔ وہ گیسکونی میں بورڈکس کے قریب پیری گورڈ کے ایک معزز دیہاتی گھرانے میں پیدا ہوا۔ لیکن طبقۂ اشراف کے جوزف سکیلا نجر (1540ء تا 1609ء) نے بعد میں بھی اس کی شہرت سے جل کر کہا تھا کہ اس (مانٹینی) کے آبا و اجداد نمک لگی ہیرنگ مچھلی بیچا کرتے تھے۔ مانٹینی کے دادا رامون Eyquem نے 1477ء میں مانٹینی کی جائیداد خریدی اور یوں یہ نام اپنے نام کے ساتھ جوڑنے کا حق حاصل کیا۔ اس کے سپاہی اور وکیل بیٹے پیئرے کی پرورش رومن کیتھولک روایت کے مطابق ہوئی۔ اس نے Antoniette de Lopez سے شادی کی جو سپین کے ایک یہودی گھرانے سے (جس نے پروٹسٹنٹ ازم قبول کر لیا تھا) تعلق رکھتی تھی۔

پیئرے اور لوپیز کے 9 بچوں میں سے دو نے ماں کا عقیدہ اپنایا' لیکن مائیکل (جسے فرنچ سے پہلے لاطینی زبان سکھائی گئی تھی) آخر تک برائے نام کیتھولک ہی رہا۔ اس نے انسانیت پسند College de Guyenne میں رواقیت پڑھی جس کا وہ پہلے سے ہی گرویدہ تھا۔ 21 برس کی عمر میں اس نے قانونی کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ ایک اور نوجوان وکیل La Boëtie کا دوست اور شریک کار بن گیا۔ لکھنے کی خداداد صلاحیت کے مالک La Boëtie نے اسے ست مگر پرجوش بیان کیا۔ 1563ء میں جب La Boëtie صرف 32 برس کی عمر میں مر گیا...... اور مانٹینی کے لیے اپنی لائبریری چھوڑ گیا...... تو مانٹینی کو اپنی زندگی کا نہایت کٹھن جذباتی تجربہ ہوا۔ اس کا ایک اہم مضمون ''دوستی کے بارے میں'' اس حوالے سے ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''دوستی میں ہماری روحیں اس حد تک ایک دوسرے میں رچ بس جاتی ہیں کہ ان کو باندھنے والا بندھن بھی نظر نہیں آتا۔ اگر مجھے یہ بتانے پر مجبور کیا جائے کہ میں اس سے محبت کیوں کرتا ہوں تو میرے خیال میں یہی جواب دے سکوں گا' اس کی وجہ وہ ہے' اس کی وجہ میں ہوں۔'' لہٰذا جزوی طور پر مثالی دوستی کے کلاسیکی نمونے کی نقل کرنے کے باوجود وہ اپنے دوست کو موت کے بعد بھی اسی طرح

چاہتا رہا۔ کچھ معاصر ہم جنس پرستوں نے بڑی آسانی سے مانٹینی کو بھی اپنے میں سے ہی ایک قرار دیا' لیکن غالباً انہیں غلطی لگی ہے۔ مانٹینی یقیناً ہم جنس پرستی سے نفرت کرتا تھا اور اس نے ''دوستی کے بارے میں'' کہا ہے کہ دوستی عورتوں کے لیے ناپاک محبت کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہے' اور یہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس نے جب مردوں کے درمیان جسمانی تعلق کو ''بجا طور پر باعث نفرت'' قرار دیا تو تب بھی اس کا مدعا یہی تھا۔ لیکن اس کی بیان کردہ دوستی میں ہم جنس پرستی کا عنصر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق کسی بھی بحث کے دوران دوستی کے بارے میں اس کے مضمون کو ہی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اگر ہم مانٹینی کے خیالات کا جائزہ لیں تو وہ ہم جنس پرست نہیں نظر آتا۔

تب کے بعد اس نے کبھی کوئی اتنا قریبی تعلق قائم نہ کیا...... اس عورت کے ساتھ بھی جس سے اس نے 1565ء میں شادی کی اور اس کے کئی بچوں کا باپ بنا: اس کے بچوں میں صرف ایک بچی ہی بچپن کی عمر سے آگے بڑھ سکی۔ La Boëtie کی وفات کے بعد وہ اپنے آپ میں کھو گیا اور اپنے فرائض میں دلچسپی نہ رہی تھی یا شاید اسے ایک اہم عہدہ ملنے کی امید تھی۔ اسی شوق میں اس کا جوش و جذبہ قبل از وقت دھیما پڑ گیا اور ''مذہب کی خاطر فرانسیسی جنگوں'' کے دوران اعلیٰ سطحی سفارتی بات چیت میں حصہ لیا۔ دربار میں اس کی قدر افزائی ہوئی' لیکن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر وہ 1571ء میں اچانک اپنی جاگیر پر واپس چلا گیا۔

اس نے 1569ء میں ایک Catalan ماہر الہیات کی تحریر کا ترجمہ شائع کیا تھا اور ایک سیاحت نامہ بھی لکھ چکا تھا (جو اٹھارہویں صدی میں شائع ہوا)۔ اس نے Boëtie کی تحریروں کا ترجمہ بھی کیا' مگر اس کے باوجود اپنی مرضی سے کچھ لکھنے میں بہت کم دلچسپی دکھائی۔ سیاحتوں کے علاوہ اس نے اپنی باقی تمام زندگی لائبریری ٹاور میں بسر کی جہاں آج آپ جا سکتے ہیں۔ اپنی چھوٹی سی مطالعہ گاہ کی دیوار پر اس نے لاطینی زبان میں لکھا ہے: ''1571ء میں...... درباروں اور عوامی تقریبات سے اکتائے ہوئے مائیکل ڈی مانٹینی نے باعلم کنواریوں کی چھاتی میں پناہ لی ہے جہاں کی خاموشی اور سکوت میں اسے توقع ہے کہ اگر قسمت نے یاوری کی' وہاں اپنی باقی آدھی زندگی آرام و سکون سے گزارے گا''۔ لیکن اس اعلان میں ایک مصنف بننے کا

کوئی ذکر نہیں۔

یوم سینٹ بارتھولیمیو کی قتل وغارت (1572ء) کے بعد ہی مانٹینی اپنی دلچسپی کے معاملات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھنے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ عادت پختہ ہوگئی۔ پہلی دو جلدیں شائع ہونے تک اس نے ایک نیم راست گو، نیم طنزیہ انداز اپنا لیا تھا۔ اس کا 1580ء میں لکھا ہوا دیباچہ یوں ہے: ''اے قاری' یہ ایک ایماندارانہ کتاب ہے۔ آپ کو پیشگی خبردار کرتا چلوں کہ یہ صرف اور صرف نجی مقصد کی خاطر لکھی گئی ہے۔'' اسے کبھی بھی قاری یا حتیٰ کہ اپنی ''خاطر'' کچھ لکھنے کا خیال تک نہ آیا۔ وہ کہتا ہے: ''میری استعداد اور صلاحیتیں اس کام کے شایان شان نہیں۔ میں نے یہ صرف دوستوں کے لیے لکھی ہے۔ اپنی کتاب کا موضوع میں خود ہوں' بہتر ہے کہ آپ اس قدر فضول اور لاحاصل معاملے میں اپنا وقت برباد نہ کریں۔''

اصل میں وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ محض ایک عام انسان ہے۔ یہ دنیا کے سامنے خود کو ایک نقاب میں پیش کرنے کا انداز بھی ہے۔ اس کے ضعیف ہم عصر رابلیس نے ایک بدمست مے خوار کا نقاب استعمال کیا تھا۔ مانٹینی کے مضامین کا جوہر یہ ہے کہ نخوت وتکبر خطرناک ہے۔ وہ ایک نیا انداز سخن ایجاد کرنے کے عمل سے گزر رہا تھا...... اور آج تک کوئی بھی شخص اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکا۔

اس کے مثانے میں پتھری تھی اور وہ شفا بخش پانیوں کی تلاش میں یورپ کے مختلف علاقوں میں گیا (1580ء کے بعد)۔ وہ سارے فرانس' اٹلی اور جرمنی سے گزرا...... لیکن یہ شاید محض اس کے ناقابل تسکین تجسس کا ایک بہانہ تھا۔ شاہی دباؤ پر اسے (اپنے باپ کی طرح) 1581ء سے 1585ء تک بورڈکس کا میئر بننا پڑا۔ 1586ء کے بعد وہ گھر ہی رہا اور اپنے مضامین لکھتا اور بہتر بناتا رہا۔

مانٹینی نے essay کو ایک essay یعنی'' آزمائش'' خیال کیا: کسی نظریے کی' اپنی' اپنے نکتہ نظر اور تجربے کی آزمائش۔ یہ تشکیکی انداز میں ہر چیز کو پرکھنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی نفسیات کو ایک ایسے طریقے سے دریافت کرنے کے قابل ہو سکا جس میں اس سے پہلے کا کوئی بھی نثر نگار کامیاب نہ ہو پایا تھا۔ اسی کے پیروکار آندرے ژید (Andre Gide) نے لکھا: ''مجھے ایک مانٹینی کے بغیر سفر کرنے میں ہرگز کامیابی نہ ہوتی۔'' وہ پہلا مصنف تھا جس نے انسان کو ایک مستقل وجود ماننے کا تصور مسترد کیا: وہ انسان کے بدلتے ہوئے رجحانات' عادات

اور جذبات کا تجزیہ کرتا ہے...... لیکن انسان کے مستقل پہلوؤں کو بھی دریافت کرنے کا خواہشمند ہے۔ مانٹینی کے ہاں کسی بھی چیز کے بارے میں قطعیت نہیں پائی جاتی۔ درحقیقت 1586ء میں اس نے ایک میڈل بنوایا جس پر کندہ تھا: ''میں جانتا ہی کیا ہوں؟'' چنانچہ وہ جدید بہت کے پیچھے استقامت کے ساتھ کھڑے اولین مصنفین میں سے ایک تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے مفکرین مثلاً فرائیڈ اور مصنفین مثلاً جوائس' پراؤسٹ' ورجینیا وولف' جوزف کونرڈ اور متعدد دیگر نے خود کو اور دوسرے لوگوں کو'' حقیقی حیثیت میں'' پیش کرنے کی کوشش کی نہ کہ مختلف ماہرین الہیات اور فلسفیوں کے مطابق ''جیسا انہیں ہونا چاہیے'' کے لحاظ سے۔ مانٹینی نے راسخ العقیدگی کی طرف داری کرتے ہوئے بھی اپنے طریقہ کار اور انداز کے ذریعہ اس کی جڑ ہی کھوکھلی کر دیں۔

خود مانٹینی نے بھی (معتدل) رجعت پرستانہ اور کیتھولک نکتہ نظر اپنایا' چنانچہ کچھ مفسرین نے اسے ایک بنیاد پرست کیتھولک اور کچھ نے ایک الحاد پرست اور آزاد خیال ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب ہی ایک اہم نکتے کو نظر انداز کر گئے: اس نے دنیا کو دیکھنے کا ایک تشکیکی طریقہ استعمال کیا تھا...... اور یوں وہ حتیٰ کہ اپنے انداز فکر کے عمل کو زیست کے مترادف سمجھنے سے انکار کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہمیں بتاتا ہے کہ'' خود بینی'' دراصل'' خود'' سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ وہ سقراط کا شاگرد ہے۔ اس قسم کا طرز عمل تحمل اور بردباری پر دلالت کرتا ہے جس کے فقدان نے اس کے ملک اور عہد کو جنگوں اور لڑائیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ رومن دنیا کا مطالعہ کرنے کے دوران سیکھی ہوئی رواقیت (Stoicism) اس کے لیے ایک ذاتی چیز تھی اور وہ اس پر عمل کرنا پسند کرتا تھا: تشکیکیت پسندی کی نوعیت ذاتی کم اور معروضی زیادہ تھی۔ گہرائی میں وہ سیکسٹس ایمپریکس کے ساتھ تعلق رکھتا تھا جس نے متعدد بڑی شخصیات کو متاثر کیا۔ مانٹینی دنیائے ادب میں اولین شخص ہے جس نے اکتاہٹ اور بیزاری کا اعتراف کیا اور اسی نے سب سے پہلے اس حوالے سے اپنے خوف کو بیان کیا۔ وہ ادب سے محبت کرتا تھا' مگر حد سے زیادہ ادب پسندی سے خائف بھی تھا۔ ورجینیا وولف نے کہا تھا کہ اس کی اپنے متعلق تحریریں قاری کے لیے ایک آئینہ بن جاتی ہیں۔

38

ڈان کیوٹے

"Don Quixote"

میگوئیل دی سروانتیس

حصہ اول 1605ء؛ حصہ دوم 1615ء

بیسویں صدی میں سپین کے عظیم ترین ادبی نقاد جوزے اورٹیگا (Jose Ortega) نے ''ڈان کیوٹے'' کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی:

ایک کتاب کا مصنف اور متحمل مزاج جنٹلمین سروانتیس تین صدیوں سے Elysian Field میں بیٹھا ہوا ہے' اور وہاں پر وہ خود کو سمجھنے کی اہلیت رکھنے والے انسان کی پیدائش کا انتظار کرتے ہوئے اپنے اردگرد افسردہ نظروں سے دیکھتا ہے۔''

سروانتیس نے بھی اپنے ہم عصر ولیم شیکسپیئر کی طرح اپنی زندگی کے بارے میں بہت کم حوالے چھوڑے۔ اس کے دو حصوں پر مشتمل ناول ''ڈان کیوٹے'' (Don Quixote) کو عموماً اور بجا طور پر دنیا کی عظیم ترین کتاب مانا جاتا ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی کے تقریباً ہر نام نہاد جدت پسندانہ ڈیوائس پر ملے گا۔ ہم یہ بات کہہ کر جدید اہل قلم کی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے۔ سروانتیس کے دور سے بہت پہلے بھی ''جدت پسندی'' کی اصطلاح معلوم تھی لیکن درحقیقت (تمام ادب کو راسخ العقیدگی کی دروغ گوئیوں کے خلاف ایک جدوجہد خیال کرتے ہوئے) وہ کسی بھی عہد کے تمام مصنفین کی نسبت سے زیادہ ''جدید'' تھا۔ سوفوکلیز اور ایسکائی لیس بھی اس جیسے تھے۔

یوں کہہ لیں کہ ڈان کیوٹے میں انتہائی جدت پسندانہ آلات یا ان کے بارے میں خیال آرائی ملتی ہے۔ لیکن یہ بات کہنے کا مقصد بعد کے مصنفین کی قدر گھٹانا نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ سروانتیس نے اپنی واحد حیرت انگیز تحریر کے ذریعہ ہر ممکن حد تک وسیع مقبولیت حاصل کی۔ لگتا ہے کہ وہ فکشن نگاری کے پیدا کردہ تمام مسائل کو بخوبی سمجھتا تھا اور بقول ڈینئل ڈیفو فکشن کا زیادہ تر تعلق ''جھوٹ کو سچ کے انداز میں بیان کرنے'' کے ساتھ ہے۔

ایک مخصوص حد تک اس نے وہیں سے آگے قدم بڑھایا جہاں رابلیس نے اختتام کیا تھا' اور رابلیس کی ہی طرح اس کا جوہر عظیم سرد مزاج پروفیسروں کی شاندار اور اصول گر عموماً مبہم تفاسیر کی نذر ہو گیا جو زندگی کے شعلوں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر انہیں گرم کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔ سروانتیس کا تعلق عام قاری کے ساتھ رابلیس سے بھی زیادہ تھا...... وہ عام قاری جو اکثر و بیشتر دانشوروں کی توجہ حاصل نہیں کر پاتا۔ رابلیس ہی کی طرح سروانتیس بھی ''عام لوگوں'' کی زندگیوں اور انداز و اطوار کی تصویر کشی کرتا ہے۔

سروانتیس 1547ء میں میڈرڈ سے تقریباً 20 میل دور Alcala de Henares کے

مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غیر مشہور سرجن تھا۔ سروانتیس کے بچپن کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس ہمیں اتنا معلوم ہے کہ اس کے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا کوئی ثبوت میسر نہیں۔ 1568ء میں وہ میڈرڈ کے سٹی سکول میں پڑھ رہا تھا اور غالباً فلینڈرز میں آرمی سروس کرچکا تھا۔

ایک ڈوئل کے معاملے میں (جس کے باعث اسے سپین سے بھاگنا پڑا) کچھ مشکلات کا سامنا ہونے پر اس نے اٹلی میں ہسپانوی legion میں شمولیت اختیار کی؛ 1571ء میں وہ عیسائیوں اور ترک ''لادینوں'' کے مابین ایک لڑائی (لیپانتو کے مقام) میں شریک ہوا۔ اس لڑائی کے دوران اس نے زبردست شجاعت دکھائی۔ اس کی چھاتی پر دو مرتبہ زخم لگے اور دایاں ہاتھ مستقل طور پر بے کار ہو گیا۔

وہ کچھ عرصہ تک تیونس میں ہی سپاہی کے طور پر خدمات انجام دیتا رہا اور پھر 1575ء میں اپنی خدمات کی معیاد پوری ہونے پر نیپلز سے واپس سپین روانہ ہوا۔ راستے میں بحری قزاقوں نے اسے قید کرلیا۔ 1580ء میں کہیں جا کر اس کا فدیہ ادا ہوا' لیکن اس نے بدیہی طور پر کافی بارسوخ ہونے کے باوجود Algiers میں فرار ہونے کی کئی کوششیں کی تھیں۔

''ڈان کیوٹے'' میں بیان کردہ قیدی کی کہانی کا تعلق اسی امر سے ہے: اسے ہمیشہ نہایت ''رومانوی'' خیال کیا گیا؛ تاہم، یہ کلیتاً اس کے اپنے تجربات پر مبنی ہے۔ اس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ انسان بدقسمتیوں کو بھی کام میں لانے کی کتنی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔

سروانتیس نے قید کے پانچ اذیت ناک برسوں کے دوران لکھنا شروع کیا۔ اس نے زیادہ تر اپنے ساتھی قیدیوں کو محظوظ کرنے کے لیے ڈرامے لکھے۔ ان میں سے دو ڈرامے ہی باقی بچے اور اس کی موت کے کافی عرصہ بعد شائع ہوئے۔ وہ زبردست ہیں...... اس کی شاعری جتنے ہی زبردست جو اس نے کرنے کی کوشش کی مگر ساری زندگی اس میں کامیاب نہ ہوا۔ شاید وہ عظیم شاعری کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ شاعری کے لیے ساحرانہ زبان دریافت کرنے کی ناکام خواہش ہی غالباً ڈانکیوٹے کی حیرت انگیز ہمہ گیریت کا باعث بن گئی۔ سروانتیس نے ایک متبادل راہ اختیار کر لی تھی۔

1580ء کے بعد سروانتیس نے ڈرامہ نگاری کے ذریعہ دولت کمانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اس کے نثر اور اشعار پر مشتمل کھیل "Galatea" نے زیادہ مقبولیت حاصل نہ کی۔ اس کی ایک ناجائز بچی ازابتل پیدا ہوئی (جس کی ماں کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے) اور پھر 1584ء میں اس نے ایک کھاتے پیتے کسان کی بیٹی کیٹالینا سے شادی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ شادی زیادہ خوشگوار نہ رہی لیکن اس خیال کی حمایت میں کوئی شہادت موجود نہیں ...... شاید کبھی کبھار لڑائی جھگڑا ہوا ہو لیکن زیادہ تر ازدواجی تعلقات پُر محبت ہی تھے۔

1588ء کے بعد سے اس نے جینئیس ہونے کی کم از کم ایک ذیلی خصوصیت کو تو ظاہر کر دیا: وہ سرکاری افسر کے طور پر ناکام ہو گیا۔ اسے مکار اندلسیوں سے رقم وصول کرنے کا کام سونپا گیا' اسے دھوکہ ہوا اور متعدد بار جیل میں ڈالا گیا کیونکہ وہ اپنے کھاتوں کو برابر نہ کر سکا تھا۔ اب کی طرح تب بھی اس قسم کا کام تہذیب یا اخلاق کے دائرے سے باہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ڈان کیوٹے جیل میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہاں اسے لازماً پست درجے کی زندگی کو جاننے کا موقع ملا ہو گا جس سے وہ پہلے بھی واقف تھا۔

فرانسیسی شاعر فرانسوائز ویلون اور متعدد دیگر اہل قلم کی طرح سروانتیس کی توجہ بھی اگر جرم نے نہیں تو مجرموں کی توانائی' اپنے آپ سے ایمانداری اور زندگی کی جانب بھرپور رویے نے ضرور حاصل کی۔ اس نے واضح طور پر دیکھا کہ اچھے انداز واطوار اور اچھے گھرانوں کی دنیا محض پست دنیا کا ایک بیزار کن اور منافقانہ عکس تھی: اور یہ کہ تعلیم مفید ہے مگر سب کچھ نہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ ''بالائی'' دنیا میں کئی سور کے کان ریشمی بٹوؤں کی مانند ملبوس ہو کر گھومتے تھے۔

لیکن یہ چیزیں اس قدر آسانی سے دیکھ لینے والے ایک سخت جان سابق سپاہی اور غیر معمولی ذہانت کے مالک شخص کو احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ یہ ''عدالت احتساب'' کا دور تھا جس نے مذہب کو زندہ رکھنے کی خاطر کج روی اختیار کی اور یوں اپنی ہی بنیادوں کو کھوکھلا کیا۔ اس دور کے انگلینڈ میں بالخصوص ...... ہمارے ذہن میں صرف بین جانسن' تھامس مڈلٹن اور ولیم شیکسپیئر کا نام ہی آتا ہے..... ڈرامے کے میدان میں امراء اور اہل اختیار کے تصنع کو اسی طریقے سے آشکار کیا جا رہا تھا۔

سروانتیس نے اپنے عظیم ترین فن پارے آخری برسوں میں تحریر کیے...... یعنی 58 تا 69 برس کے دوران۔ اگر اس نے صرف ''مثالی ناول'' (1613ء) ہی لکھے ہوتے تب بھی اسے یاد تو ضرور رکھا جاتا۔ اس نے مختصر ناول کی یہ صنف ایجاد کی اور سپین میں متعارف کروائی تھی۔ 1605ء میں اس نے ڈان کیوٹے کا پہلا حصہ شائع کیا اور اس سے زیادہ رقم تو حاصل نہ ہوئی مگر ساری دنیا میں شہرت ضرور ہو گئی۔ اس کی طباعت بہت خراب تھی اور فرانسسکو ڈی روبلس نامی پبلشر نے کاپی رائٹ لینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی ..... جلد ہی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکنے لگی۔

ڈان کیوٹے کا پہلا انگریزی ترجمہ تھامس شیلٹن نے کیا جو 1612ء میں فروخت ہو رہا تھا۔ اب دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے متعدد چوری کے ایڈیشن شائع ہوئے' اور 1614ء میں ایک ''سلسلہ'' منظر عام پر آیا' یہ Alonso Fernandez de Avellaneda کے دستخطوں کی حامل ایک فضول تحریر تھی جس نے سروانتیس کی اپاہج بازو اور غربت کا مضحکہ بھی اڑایا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس خباثت کا ذمہ دار کون تھا۔ عین ممکن ہے کہ سروانتیس نے اپنی کامیابی کو محض فنی سطح پر ایک کامیابی خیال کیا ہو' اور وہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بھونڈی نقالی نے اسے دوبارہ قلم سنبھالنے کی تحریک دلائی۔ اس نے خود ہی ڈان کیوٹے کو مرنے کی اجازت دے کر اس امر کو یقینی بنایا کہ کوئی اور شخص اس کے ناول سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ڈان کیوٹے کا دوسرا حصہ سروانتیس کی موت سے صرف ایک سال قبل شائع ہوا۔

ناول کی کہانی اس قدر زبان زد عام ہے کہ یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کیوٹے ایک کم سن نواب زادہ ہے جو نائٹ اور سورما بننے کے خبط میں مبتلا ہے۔ سانچو پانزا ایک نہایت لالچی اور محتاط کسان ہے۔ کم از کم انیسویں صدی تک مخبوط الحواس ڈان کیوٹے کو خرابیاں دور کرنے کی کوشش میں مصروف سمجھا جاتا رہا۔ نفس مضمون ایک اعلیٰ یا الوہی احمق پر مبنی لگتا ہے' ایسا شخص جس کی پاکیزگی چیزوں کی تہہ تک سرایت کر جاتی ہے اور انجام کار غلط کو ٹھیک کر دیتی ہے۔

لیکن ڈان کیوٹے اپنی دیوانگی میں خرابیوں کو درست نہیں کرتا۔ اس کی دیوانگی ایک علیحدہ

معاملہ ہے جو رومانوی چیزیں پڑھنے کے باعث پیدا ہوئی (جیسے فلوبیئر کے شاہکار ''مادام بوواری'' کی مرکزی کردار محبت کے افسانے پڑھنے کے ذریعہ حماقت کی جانب مائل ہو جاتی ہے)۔ ڈان کیوٹے کی دانش اور ذہانت اس کی نقصان دہ دیوانگی کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ دانائی کا منبع ''دیوانگی'' میں نہیں۔

چنانچہ ڈان کیوٹے ایک حقیقی دیوانگی کے کیس کا بالکل درست مطالعہ ہے۔ ہسپانوی ادب میں یہ خصوصیت بے مثال طور پر طاقتور ہے' اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہم ناول نگار Beneto Perez Galdo's کو تفصیلی نفسیاتی کیسز کے بارے میں لکھتے ہوئے پاتے ہیں۔

لیکن ہماری دنیا میں کسی بھی موقع پر دیوانگی یا احمق پن کا موضوع بے محل نہیں ہوا۔ سکندر اعظم دیوانہ تھا' ہٹلر دیوانہ تھا اور ایک حد تک برطانیہ کی ملکہ مارگریٹ تھیچر بھی۔ (اگر یہ کتاب 2003ء میں لکھی گئی ہوتی تو غالباً مصنف نے امریکی صدر بش کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہوتا' مترجم)

سروانتیس کی کتاب کا پیغام اس آسان اور نفیس نظریے کی نسبت کہیں زیادہ سخت ہے کہ دیوانگی میں ہی صحیح الدماغی مضمر ہے۔ بلاشبہ ایک محدود سطح تک یہ بات درست ہے۔ لیکن ''ڈان کیوٹے'' کی وسعت بہت زیادہ ہے۔ بے شک کیوٹے ایک ہمدردی رکھنے والی (Sympathetic) شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے کارناموں کا قاری بھی سراب اور وسوسے کی بنیاد پر ایک زندگی گزارتا ہے ...... ایک ایسی زندگی جس کا کسی بھی موقع پر حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا۔ تقریباً اسی عہد میں لکھا گیا ڈرامہ ''ہیملٹ'' بھی ایک مرکزی کردار کا حامل ہے جو زبردست رومانوی ہمدردی حاصل کرتا ہے ...... حالانکہ وہ خود ہمارے جتنا ہی قابل ترس ہے۔ یہ ہماری ''نجی'' شہوانی زندگیوں کی فطرت ہے۔ ''ڈان کیوٹے'' رومانٹسزم کی بعثت سے بہت پہلے لکھے گئے ایک رومانوی آئیڈیل پر تبصرہ ہے۔ اس نے ایک اپنی زندگی دھارن کی ہے' لہٰذا اس کی رومانوی تفسیر کو سرے سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ہر کسی کے لیے کچھ ہے۔ لیکن اس کا اختتامیہ ایک واضح پیغام دیتا ہے:

''میں نے جس رحم (خدا کے) کا ذکر کیا ہے'' ڈان کیوٹے نے جواب دیا'' وہ خدا مجھے اس لمحے دکھا رہا ہے...... حالانکہ میں گناہگار ہوں' جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ اب میرا ذہن واضح ہے اور جنگجوئی کے بارے میں مسلسل قابل نفرت کتابیں پڑھنے کے بعد پیدا ہونے والی جہالت کے دھندلے سایوں سے پاک ہے۔ میں ان میں شامل تمام تر بیوقوفی اور دھوکہ بازی کے اس پار دیکھ رہا ہوں' اور مجھے واحد تاسف یہی ہے کہ یہ سراب بہت دیر سے دور ہوا' اور میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ روح کو منور کرنے والی تحریریں پڑھ کر کوئی ازالہ کر سکوں . . . . ''

اور راوی مزید بتاتا ہے کہ اس نے ہمیشہ خوش مزاجی اور شفقت کا مظاہرہ کیا اور اپنے تمام جاننے والوں کا محبوب ٹھہرا۔

39

دنیا کی ہم آہنگی

"The Harmony of the World"

جوہانس کپلر

1619ء

جوہانس کپلر (1571ء تا 1630ء) جنوبی جرمنی کے علاقے سوابیا میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک لوتھری پادری تھا۔ خود لوتھر نے بھی غصیلے انداز میں کاپرنیکس کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ ایک گدھا ہے جو سارے علم نجوم کو تہہ و بالا کرنا اور کتاب یشوع میں

rekhta

بیان کردہ حقیقت سے انکار کرنا چاہتا ہے۔'' لیکن کلیسا کے پرجوش اور غضب ناک بانی کے مقابلے میں ایک زیادہ بے خود آدمی کیپلر اس قسم کے بے دماغ اور روایتی نظریے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا تھا: وہ گلیلیو کی طرح ایک فیثا غورثی صوفی تھا جو یقین رکھتا تھا کہ کائنات کی تفسیر ریاضی کی مدد سے تفسیر کی جا سکتی ہے۔ اسے سچائی پر بھی یقین تھا۔ اس نے ایک سائنسی رویہ اپنائے رکھنے کو نیکی اور پاکبازی جانا۔ وہ سورج کو مرکز ماننے والی تھیوری کو کارآمد ثابت کرنے کے قابل ہوا۔

موجودہ عہد میں سائنس کے مورخین نے کیپلر کے تصوف کو اس کی سائنس سے الگ کرنے کی کوشش' کی مگر بے سود: یہ دونوں ایک دوسرے میں اسی طرح گتھے ہوئے ہیں جیسے سولہویں اور سترہویں صدی کے تمام علوم مذہب کے ساتھ مدغم ہیں۔ وہ مذہب کی وجہ سے ہی وجود میں آئے۔ تاہم، انہوں نے مذہبی بنیاد پرستی کی مخالفت کی جو مذہب سے بالکل الگ چیز ہے۔ بیوروکریٹس اور بیمار ذہن کلرکوں نے کیپلر کے خلاف قانونی کارروائی کی۔ یہ افراد محض انہی باتوں کو قائم رکھنے میں مخلص تھے جو انہیں بتائی گئی تھیں۔ انہوں نے منطق اور استدلال کو ہر طرح سے رد کیا۔ آج کی طرح تب بھی ان کا ہتھیار ایذا رسانی اور تشدد تھا۔ لیکن قرون وسطیٰ کے بھونڈے تشدد کی جگہ آج زیادہ پیچیدہ اور ذہنی تشدد نے لے لی ہے۔

کاپرنیکس کے کام نے ڈینش ماہر فلکیات ٹائیکو براہے (1546ء تا 1601ء) کے مشاہدات کی مدد سے تکمیل کی راہ پر قدم رکھا۔ ٹائیکو براہے جوانی میں ایک ڈوئل کے دوران اپنی ناک کا کچھ حصہ کھوا بیٹھا تھا اور اس کے بعد ہمیشہ دھاتی ناک لگائے رکھی۔ اس کے ہر پورٹریٹ میں یہ چیز صاف نظر آتی ہے۔ غالباً اسے خود کو ایسے پیش کیے جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہ بات اس کی بے باکی پر دلالت کرتی ہے۔

کیمیاگر اور ماہر فلکیات ٹائیکو براہے نے اس دور میں آسمان کے مطالعے کے لیے حیرت انگیز درستگی کے حامل آلات بنائے، اور وہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر بتانے کے قابل تھا کہ پرانی ارسطوئی کائنات بے حقیقت تھی۔ ٹولمی (بطلیموس) کے بجا طور پر متاثر کن ریاضی کے ذریعہ توثیق یافتہ اس کائنات میں کرۂ ارض مرکز میں تھا اور اس کے گرد سیارے اور سورج کامل گولائی

کے مداروں میں محو گردش تھے: اس سے پرے ایک کامل کرہ تھا جو دن میں ایک مرتبہ گھومتا تھا۔

لیکن براہے کاپرنیکس کے اس تصور کو قبول نہ کر پایا کہ سورج کائنات کے مرکز میں ہے۔ چنانچہ اس نے ایک اپنا نظریہ پیش کیا جو تقریباً فراموش کیا جا چکا ہے، لیکن اس دور میں بہت مقبول ہوا۔ اس نے بے حرکت زمین کو بدستور مرکز میں ہی دکھایا اور سورج اور چاند کو اس کے گرد گھومتے ہوئے دکھایا، لیکن دیگر (اس وقت تک معلوم) سیاروں کو سورج کے گرد مداروں میں رکھا۔ یہ ایک دلچسپ اور حیران کن درمیانی راہ تھی۔ اسی لیے وہ اپنے دور کے ناقہم ایذا دہندگان کے غضب سے بچا رہا۔

پروٹسٹنٹ اور یسوعی دونوں ہی کیپلر کی کاپرنیکس پسندی کی وجہ سے اسے عتاب کا نشانہ بنا چکے تھے۔ وہ پراگ میں براہے سے ملا اور اس کا معاون بن گیا۔ کیپلر کی ''کائنات کا راز'' (1597ء) میں براہے نے اس کی ریاضی دانی کا ایک اچھا مظاہرہ دیکھا۔ مگر ''کائنات کا راز'' کی بنیاد ایک غلط مفروضے پر تھی: ایک غلطی کے نتیجہ میں کیپلر نے سمجھ لیا تھا کہ اس نے کائنات کی فطرت کو سمجھنے کی کنجی دریافت کر لی تھی۔ اس نے مخصوص فیثا غورثی جوش کے ساتھ لکھا:

> میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ خدا نے کائنات کی تخلیق اور کاسموس کا نظام مرتب کرتے وقت فیثا غورث اور افلاطون کے زمانے سے معلوم پانچ جیومیٹریکل اجسام کو ذہن میں رکھا تھا، اور اس نے انہی کے مطابق آسمانوں کی تعداد، تناسب اور ان کی حرکت کا باہمی تعلق متعین کیا تھا۔

لیکن جب اس نے اپنے نکتۂ نظر کو غلط راہ پر جاتے دیکھا اور مشاہدات کے نتائج خواہش کے مطابق نہ حاصل ہوئے تو اپنا ذہن بدل لیا۔

کیپلر کے ساتھ طویل اور کٹھن خط و کتابت کرنے والے ٹائیکو براہے نے بالآخر مہربان رویہ اپنایا۔ وہ 1601ء میں مر گیا اور کیپلر اس کی جگہ پر بادشاہ روڈلف کا شاہی ریاضی دان بن گیا۔ اس نے اپنے دور کی مقبول عام ارسطوئی بصیرت کے برعکس کام کیا اور مریخ کے بارے میں ٹائیکو براہے کے مشاہدات کو بنیاد بنایا۔ 1609ء میں کیپلر نے ''نئی فلکیات'' شائع کی جس

میں دو چیزیں ثابت کیں: کہ مریخ سیارہ سورج کے گرد کامل گول نہیں بلکہ ایک بیضوی مدار میں گردش کرتا ہے (اس دور میں بیضوی شکل کو ناقص خیال کیا جاتا تھا)؛ اور سیارے کی گردش کی رفتار کم زیادہ ہوتی رہتی ہے لیکن وہ سورج کی سیدھ کی لحاظ سے بیضوی شکل میں مساوی فاصلہ مساوی مدت میں ہی طے کرتا ہے۔

1619ء میں کپلر نے ''دنیا کی ہم آہنگی'' میں اپنے تینوں قوانین کو بھرپور وضاحت کے ساتھ بیان کیا: آخری قانون یہ تھا کہ سیارے کے ایک سال (یعنی جتنی دیر میں وہ سورج کے گرد چکر مکمل کرتا ہے) کا مربع سورج سے اس کے درمیانی فاصلے کا مکعب ہے۔ یوں اس نے ماہر الہیات کو نہ صرف ریاضی بلکہ طبعیات سے بھی متعارف کروایا۔ اس وقت تک ریاضی اور طبعیات صرف ماہرین الہیات کا کام تھا جو بہت کم ریاضی جاننے کے باعث ارسطوئی نظریات سے ہی چمٹے رہے۔

یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مخصوص پہلوؤں سے سورج کی مرکزیت کا نظریہ غیر منطقی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی ایک وجہ کرہ ارض کی حرکت کے باعث پیدا ہونے والی مشکلات تھیں۔ آخر کار نیوٹن نے کشش ثقل کو بطور قوت بیان کر کے یہ مسئلہ مکمل طور پر حل کیا۔ اس سے پہلے تک خیال تھا کہ اشیا اپنی موزوں جگہ پر واپس آجاتی ہیں...... یہ بہت مبہم قسم کی وضاحت تھی۔

سولہویں اور سترہویں صدی کے عظیم سائنسی موجدوں میں کپلر سب سے زیادہ قابل ذکر اور نمایاں ہے۔ اس کا تصوف یا فیثا غورث پسندی گلیلیو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ واضح ہے۔

برٹرینڈ رسل کپلر کے مذہبی اعتقادات سے اس قدر جھنجھلایا کہ اسے جوہر قابل کی بجائے ہٹ دھرم قرار دیا...... یہ ایک متعصبانہ نکتہ نظر ہے لیکن پرانی قسم کے ثبوتیت پسندوں کے ہاں ایسا رویہ ملنا عام ہے۔

توبنگن یونیورسٹی میں مائیکل Maestlin نے پہلی مرتبہ کپلر کی توجہ کاپرنیکس کے نظریے کی جانب مبذول کروائی۔ مائیکل (1580ء تا 1635ء) نے بظاہر تو ٹولمی کا نظام پڑھایا لیکن نجی طور پر اپنے گریجوایٹ شاگردوں کو کاپرنیکس کے نظام کا مطالعہ کرنے کو کہا۔ رقیق اور طنزیہ انکار

رکھنے والے کپلر نے بعد ازاں کہا کہ وہ ''طبعی یا اگر آپ زیادہ مناسب سمجھیں تو مابعد الطبعیاتی وجوہ کی بنا پر'' کاپرنیکس کی جانب راغب ہوا...... یہ طنزیہ جملہ آج بھی بہت سے جدید سائنس دانوں کو غصہ دلاتا ہے جو اس کی دریافتوں پر خوش تو ہوتے ہیں لیکن ان کے خیال میں کپلر کا روحانی حقیقت کی پیاس ظاہر کرنا درست نہیں۔ وہ قدیم دور کے بعد سائنسی علم فلکیات کا سب سے بڑا بانی تھا۔ اس حوالے سے اس کی تحریروں کو (جن میں جنگوں اور موسمی حالات کے بارے میں کئی حیرت انگیز حد تک درست پیش گوئیاں بھی شامل ہیں) بیسویں صدی میں فرانسیسی ماہر شماریات Michel Gauquelin نے دوبارہ دریافت کیا۔ Gauquelin کی اپنی ایک تحریر نے بھی بیسویں صدی میں ایک نہایت خوفناک سکینڈل کو جنم دیا، جس میں سائنسدانوں نے اپنی سائنسی معروفیت کے فقدان کو شاندار انداز میں عیاں کیا۔ Gauquelin کے اخذ کردہ نتائج کو اس حد تک مسترد اور ناپسند کیا گیا کہ ایک سائنس دان نے ''تفتیشی'' کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا جو Gauquelin کی تحریر کو جانچنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔

کپلر نے ایک قسم کا تھرمامیٹر ایجاد کرنے اور بصریات کے شعبہ میں نئی چیزیں متعارف کروانے کے علاوہ ایک تخلیقی مصنف ہونے کا بھی مظاہرہ کیا۔ کپلر کا تصوف اس کی زبان میں لکھنے والے دیگر باطنیت پرستوں سے مطابقت رکھتا تھا...... پیراسیلسس، بوہمے (Bohme)، فرینک (Franck)-Somnium میں اس نے ایک طنزیہ تمثیل لکھی جسے متواتر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس نے کاپرنیکس مخالف سنسر شپ سے بچنے کے لیے ایسے انداز میں لکھا کہ جیسے چاند پر بیٹھا ہوا ہو (یاد رہے کہ بنیاد پرست چاند کی حرکت سے انکار نہیں کرتے تھے)۔ اس طرح وہ یہ سمجھانے کے قابل ہو گیا کہ ''غیر متحرک'' ستاروں کی حرکت محض ظاہری تھی۔ اگر اس کتاب کو تھوڑی شہرت حاصل ہو جاتی تو یقیناً اسے بھی ایک کلاسیک کا درجہ مل جاتا۔

''دنیا کی ہم آہنگی'' کپلر کے ذہن میں کروں کی موسیقی کے بارے میں فیثا غورثی نظریے کے احیائے نو سے فیض یافتہ تھی۔ اس نے اپنی تحقیقات کو ''دنیا کے نقش اول''، یعنی موسیقی کے ساتھ جوڑا۔ بغض کے ساتھ لکھا گیا کہ ''اسے کوئی سائنسی اہمیت نہیں دی جا سکتی'' لیکن (اس کی ممکنہ

خلقی قدر و قیمت سے قطع نظر) اس نے اگر اس قسم کے علم فلکیات کو تحریک دی تو یقیناً یہ قابل قدر ہے! چنانچہ کپلر کی "روماتوی الجھنوں" کی بات کرنا اور رسل کا اس کو جینئس نہ ماننا محض گستاخی اور ڈھٹائی ہے۔ معدودے چند سائنس دانوں نے ہی کپلر کی سائنس اور اس کے مذہبی تخیل کے مابین تعلق پر غور و فکر کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اس کی نظر میں صرف طے شدہ "سائنسی طریقہ کار" ہی بامعنی نتائج تک پہنچ سکتا ہے، اور ان نتائج کا صرف مخصوص مروج معیار پر پورا اترنا ضروری ہے۔ مائیکل Gauquelin نے جب اپنی کتاب میں توثیق کی کہ "سیاروں کے سلسلے" (Planetary heredity) کے بارے میں کپلر کے خیالات درست تھے تو سائنسی اسٹیبلشمنٹ نے نہ صرف ان اعداد و شمار کو مسترد کر دیا بلکہ فضول بھی قرار دیا۔

40

نووم اورگانم

" Novum Organum "

فرانسس بیکن

1620ء

الیگزینڈر پوپ نے اٹھارہویں صدی کی ایک تحریر "An essay on Man" میں فرانسس بیکن کو نوع انسانی میں "سب سے زیادہ ذہین، سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ کینہ پرور" قرار دیا۔ اور زیادہ تر لوگ آج بیکن کو واقعی ان خوبیوں کا حامل تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن سائنس اور سیاسیات کے مورخین کے ہاں بیکن کے کردار اور اس کے اثرات کی نوعیت اور کوالٹی پر ہنوز بحث جاری ہے۔ اس کی عظیم ترین اور عام طور پر جانی مانی کتاب غالباً "Essays" ہے جو اس نے 1597ء میں شائع کرنا شروع کی اور اس کے آخری ایڈیشن (1625ء) میں 58 مضامین شامل ہیں۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی کتاب لاطینی مقالہ "Novum Organum" تھی جو اس کی "Instauratio Magna" کی دوسری جلد تھی۔ اس نے سائنسی اصلاح کے پروگرام کو بھی یہی نام (Great Instauration یعنی عظیم بحالی) دیا۔ اس سے پہلے ایک کتاب "The Advancement of Learning" (1605ء) کو چند ایک نے ہی "زیادہ اہم" قرار دیا۔ انگلش میں لکھی گئی یہ کتاب اصل میں "نووم اورگانم" ہی کی ایک تفسیر یا شرح تھی۔ لیکن "نووم اورگانم" کا گہرا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

بیکن کی پیدائش ایک اعلیٰ گھرانے میں ہوئی۔ اس کا باپ نکولس ملکہ کی "مُہر عظیم" کا محافظ تھا جبکہ ماں Lord Burleigh ولیم سیسل کی بہن، ملکہ الزبتھ کی چیف سیکرٹری آف سٹیٹ اور سرزمین کے دو یا تین نہایت بااختیار افراد میں سے ایک تھی۔ فرانسس کو اپنی ماں سے توقع کے مطابق ترجیح نہ ملی، تاہم، اس نے اسے پارلیمنٹ میں ایک نشست دلا دی۔ ملکہ الزبتھ اسے بچپن سے ہی جانتی تھی۔ مگر یہ نہیں لگتا کہ اس نے کبھی فرانسس کو پسند یا اس پر بھروسہ کیا ہو۔ اس کے طور طریقوں میں ضرور کوئی ناگواری پیدا کرنے والی بات ہوگی۔ فرانس 23 برس کی عمر میں پارلیمنٹ میں گیا اور ارل آف ایسیکس کی جانب رغبت اختیار کی جس نے اسے کافی مدد دی۔ لیکن جب ایسیکس ملکہ سے باغی ہو گیا تو بیکن نے نہایت جوش و جذبے کے ساتھ اس کے خلاف کارروائی کی اور اس کی موت میں اہم کردار ادا کیا۔ پوپ نے بیکن کی جس "کمینگی" کا ذکر کیا تھا وہ لندن کی نیشنل پورٹریٹ گیلری میں رکھے پورٹریٹ میں دیکھی جا سکتی ہے لگتا ہے کہ وہ فراخدل ہرگز نہیں تھا۔ حقیقی شرافت اس سے کوسوں دور تھی۔

جیمز اول کی تخت نشینی (1603ء) کے بعد سے بیکن ترقی کرتا گیا اور نائٹ بنا۔ 1618ء میں ملک کا اعلیٰ ترین قانونی عہدہ "لارڈ چانسلر" حاصل کرنے کے بعد اسے لارڈ Verulam بنایا گیا۔ 1621ء میں وہ St.Albans کا وسکاؤنٹ بنا۔ لیکن اسی برس اس کے کیریئر میں اچانک تغیر آیا: اس پر رشوت خوری کا الزام عائد ہوا اور اس نے فوراً اقبال کرتے ہوئے اپنے دفاع میں کہا کہ

اس نے مقدمے کا جو فیصلہ کیا تھا ابھی وہ نافذ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس دور میں ایک عام بات تھی' لیکن پھر بھی اس کا مطلب تھا کہ بیکن کو بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خفیہ طور پر تاحیات اپنے سائنسی منصوبوں پر کام کرتا رہا۔

بیکن ایک مضمون نگار کی حیثیت سے دانش اور زبان کے ماہرانہ استعمال کی زبردست خوبی رکھتا تھا۔ البتہ ایک فلسفی کے طور پر اس نے مخصوص علم کے حصول کی راہ میں حائل مشکلات پر قابو پانے کا ایک طریقہ دریافت کیا جو نہایت متاثر کن ثابت ہوا۔ بالخصوص جان سٹوارٹ مل اور پھر کارل پوپر نے اس کا بہت اثر لیا۔

دو تیکنیکی اصطلاحات ''استخراج'' (deduction) اور استقرا (induction) کی تعریف مختلف فلسفیوں کے ہاں مختلف ہے۔ تاہم، استخراج کا انحصار دلیل کی قسم پر ہے جس کا بنیادی قضیہ درست ہو تو حاصل بھی لازماً ٹھیک ہوتا ہے۔ جبکہ استقرائی طریقہ کار میں بنیادی قضیہ تو درست ہو سکتا ہے لیکن نتیجہ اس کے الٹ ہوتا ہے۔

بیکن کی وجہ شہرت اس کا یہ عقیدہ ہے کہ سائنسی دریافت کا انحصار ایک نئی قسم کے استقرا پر ہے: اعداد و شمار اور معلومات کی ایک بہت بڑی مقدار جمع کر لی جاتی ہے اور پھر اس کی تفسیر و تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ ارسطو کے خیالات کی ضد ہے جو بذات خود بہت پر اثر رہا۔ بیکن ارسطو کا کافی احترام کرتا تھا مگر اس کے طریقے کو ''لاحاصل'' قرار دیا۔

استقرا (induction) کا طریقہ خود نیا تھا۔ یہ بات عیاں ہے کہ تمام فلسفیانہ حوالوں سے قطع نظر، لوگ تفصیلات کی بنیاد پر عمومیت کا رویہ اپناتے ہیں۔ لیکن بیکن کے طریقہ کار میں منفی مثالوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بیکن نے لکھا:

> [حقائق کے جدولوں کی بنیاد پر] استرداد اور استخراج کر لینے کے بعد تہ میں صرف ایک قطعی اثبات رہ جاتا ہے اور کم وزن والی تمام آرا دھواں بن کر تحلیل ہو جاتی ہیں۔

بیکن کے سائنسی طریقہ کار کے نظریہ پر دو بڑے اعتراضات کیے گئے۔ اول، اس کا استقرائی طریقہ، چاہے اس کی عملی قدر و قیمت کچھ بھی ہو، سنگین نقائص کا حامل نکلا ہے۔ دوم، بیکن ریاضی سے حیرت انگیز حد تک نابلد تھا اور اس علمی میدان میں وہ مستقبل کی بجائے ماضی کا آدمی نظر آتا ہے۔ اس نے کاپرنیکس کو مسترد کیا اور کیپلر یا گلیلیو پر توجہ دینے کے لیے اس کے پاس

وقت نہ تھا۔ اس طرح وہ استخراجی طریقہ کار کا استعمال دیکھنے میں ناکام رہا جو کچھ مواقع پر ریاضی میں ممکن ہے۔ وہ اپنے ہی ڈاکٹر ولیم ہاروے کی دوران خون کے بارے میں تحقیق کی اہمیت کو بھی نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس کا مشاہدے پر زور دینا اور اس کا سائنسی تحقیق کا جذبہ تحریک انگیز ثابت ہوا۔

بیکن نے انسانی ذہن میں سائنسی تفتیش کو درپیش مشکلات بیان کیں۔ اس نے چار کا ذکر کیا: قبیلے، غار، منڈی اور تھیٹر کے بت (Idols)۔

قبیلے کے بت بنیادی نوعیت رکھتے ہیں: انسانوں کی ادراکی صلاحیتیں کند اور کجی ہیں۔ غار کے بت (جن کے بارے میں نسبتاً زیادہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے) انفرادی مزاج کی پیداوار ہیں۔ مرکزی طور پر خلقی تعصبات، منڈی کے بتوں کو آج ہم ''میڈیا کے بت'' کہہ سکتے ہیں: لوگ روزمرہ میل جول اور تعلقات کے باعث بے شمار لایعنی اختلافات اور خیالات اختیار کر لیتے ہیں۔ آج ہم ان میں فلموں، فلمی ستاروں یا مشہور گلوکاروں وغیرہ پر ''بحث'' کو شمار کر سکتے ہیں۔ تھیٹر کے بت بھی بے کار نظریات اور فلسفیانہ نظام ہیں (بیکن کی نظر میں بالخصوص پرانی قسم کے منطق پسند)۔ کپلر کے حوالے سے ان بیکار نظریات میں یقیناً کپلر کے قوانین بھی شامل ہوں گے!

بیکن بتاتا ہے کہ اس کے سیاسی طرز عمل کا مقصد بہتری اور فلاح حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ایک لحاظ سے وہ Bentham اور جان سٹوارٹ مل کی افادیت پسندی کا پیش رو تھا۔ اس کا سائنسی تجسس بے حدود اور اس کی شخصیت کا سب سے متاثر کن عنصر تھا۔ اس کی ذات میں قرون وسطی اور جدید ذہنیت کا عجیب و غریب ملغوبہ اسے نہایت پیچیدہ اور انتہائی بے ہنگم بھی بناتا ہے۔ اگرچہ ہم اس کی تعریف و تحسین کر سکتے ہیں مگر وہ قابل محبت نہیں۔ اس کے زبردست اثرات پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ کوئی جینئس تھا تو اس کی شخصیت میں کسی چیز نے اسے خود کو شناخت نہ کرنے دیا۔ اس کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں لکھنے والے لکھتے رہیں گے، کیونکہ وہ واقعی ایک مسحور کن شخص تھا۔ ایک طرف وہ سچائی کو پانے کے لیے نہایت متجسس اور منکسر ہے، اور دوسری طرف اس نے ظلم کو پسند کیا، اعلیٰ حیثیت تک پہنچنے کی جدوجہد کی اور دیگر جینئس افراد کو ماننے سے انکار بھی کیا۔

41

کلیات

"The First Folio"

ولیم شیکسپیئر

1623ء

1623ء میں شائع ہونے والی "First Folio" میں شیکسپیئر کے تمام 36 ڈرامے شامل ہیں ماسوائے ''پیریکلیز''۔ بہرحال ہم یہاں اس پر بھی بات کریں گے۔ شیکسپیئر کی زندگی میں ہی اس

کی نظموں (سانیٹس) کے کئی مجموعے شائع ہوئے، لیکن ہم نے انہیں بھی "کلیات" میں شمار کیا ہے۔ (اگر ہم نے اس قسم کی ہلکی پھلکی بے ایمانی نہ کی ہوتی تو شاید 100 پر اثر کتابوں کی یہ فہرست پوری نہ ہو سکتی۔ اگر شیکسپیئر نے کسی کو بھی متاثر نہ کیا ہوتا تو تب بھی میں اسے اس کتاب میں ضرور شامل کرتا اور ایسا کرنے کی کوئی نہ کوئی جھوٹی سچی وجہ بھی بتاتا۔ لیکن فی الحال مجھے کوئی جواز تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم، یہ جاننا آسان نہیں کہ شیکسپیئر نے انسانی طرز عمل یا سوچ پر کیا اثرات مرتب کیے۔ البتہ ایک بات واضح اور یقینی ہے: اس نے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بے تحاشا رقم خرچنے پر مجبور کیا۔ شیکسپیئر کی ایک پوری صنعت موجود ہے۔ "شیکسپیئر انسائیکلوپیڈیا کے ایڈیٹر آسکر جیمز کیمپ بیل نے لکھا: "کوئی بھی اور مصنف ہر نسل اور پشت کے بہترین اذہان کے خیالات کو اتنا متاثر نہیں کر پایا۔"

ٹی۔ ایس ایلیٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ شیکسپیئر کے بارے میں ہر کتاب اپنے مصنف کی زیادہ اور موضوع کی کم عکاسی کرتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے لکھا کہ شیکسپیئر ہر ایک سے "اچھا" یا "بہترین" ہے۔ یہ رائے ہر جگہ پائی جاتی ہے، لیکن اس میں کس حد تک صداقت ہے؟ کیا ہم شیکسپیئر کے حوالے سے سوال اٹھا سکتے ہیں؟

ممتاز شیکسپیئرین اداکار ہنری ارونگ نے شیکسپیئر کی تحریروں کے ایک مقبول عام ایڈیشن کے دیباچے میں اسے سقراط اور حضرت عیسیٰ سے بالاتر قرار دیا۔ صرف جارج برنارڈ شا اور کولن ولسن نے ہی اسے کوئی زیادہ عظمت نہ دی۔ ان سب چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ناظرین اور سرمایہ کاروں نے (ادبی نقادوں سے قطع نظر) شیکسپیئر پر کس قدر توجہ دی۔ یہی امرا سے یہاں اس مقام پر فائز کرتا ہے۔ لیکن آیئے کچھ گہرائی میں اتر کر انسانیت پر شیکسپیئر کے اثرات کے حوالے سے تحقیق کریں۔

مذہبی کتب نے انسانیت کو دو متضاد حوالوں سے متاثر کیا ہے۔ ایک طرف انہوں نے پاکباز رویہ پیدا کیا اور دوسری طرف جنگوں، ظلم و تشدد اور اربوں انسانوں کے لیے آفات کو جنم دیا۔ لیکن کیا کبھی کسی قوم نے شیکسپیئر کی خاطر صلیبی جنگ لڑی ہے؟ البتہ بے شمار بچوں کو عیسیٰ مسیح کی نصیحتوں سے زیادہ شیکسپیئر کی سطور یاد نہ کرنے پر جھڑکیاں اور جھاڑ جھپٹ کا سامنا کرنا پڑا۔

شیکسپیئر کا سانیٹ نمبر 66 عموماً بچوں کو یاد کرنے کے لیے نہیں دیا جاتا، لیکن مستند "محققین اکثر اسے بھول جاتے ہیں"،

Tir'd with all these, for restful death I cry:
As, to behold desert a beggar born,
And needy nothing trimm,d in jollity,
And purest faith unhappily forswom,
And gilded honour shamefully misplac'd
And maiden virtue rudely strumpeted,
And right perfection wrongfully disgrac'd,
And strengthened by limping swag disabled,
And art made tongue-tied by authority,
And folly (doctor-like) controlling skill,
And simple truth miscall'd simplicity,
And captive good attending captain ill,
Tir'd with all these, from these would I be gone,
Save that, to die, I leave my love alone.

(ہم نے شیکسپیئر کی ان سطور کا ترجمہ نہ کرنا ہی بہتر سمجھا ہے، مترجم)

تو پھر شیکسپیئر کی تصویر ڈاک ٹکٹوں پر دینے کا فیصلہ کرنے والے حکام اس قسم کی تخریبی شکوہ گری کو کیسے نظر انداز کر گئے؟ یہاں شیکسپیئر واضح الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ زندگی اس قدر زبوں حال ہو گئی ہے کہ یہ صرف محبت کرنے کے ذریعہ ہی قابل برداشت بن سکتی ہے۔ اور کنگ لیئر کہتا ہے:

Thou rascal beadle, held thy bloody hand!
Why dost thou lash that whore? Strip thine own back.
Thou hotly lusts to use her in that wise
For which thou whipst her.

اور ایک دو جملوں کے بعد سیاست دانوں کے متعلق بات کرتے ہوئے انہیں "گھٹیا" قرار دیتا ہے؟ کوئی ثقافتی بیورو کریٹ آپ کو بتانے کی کوشش کرے گا کہ یہ وہ شیکسپیئر نہیں جو زندگی کی مختلی کا شکار ہے...... وہ تو صرف دیوانے کنگ لیئر کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ کوئی دیوانہ ہی اس

قسم کی بات کرسکتا ہے! جہاں تک سانیٹ کا تعلق ہے تو شاید اس کی حیثیت محض ایک ''ادبی مشق'' کی سی ہو۔ لیکن یقیناً اس قسم کے دلائل احمق پن ہیں اور درحقیقت ثقافتی حکام اس قسم کے سوالات کو زیر بحث نہیں لاتے۔ وہ تو بس شیکسپیئر کی شان میں تقریبات منانے میں مصروف رہتے ہیں؛ بہر حال وہ یہ نکتہ اٹھا سکتے ہیں کہ شیکسپیئر کے عہد میں حکومتیں بہت خراب تھیں اور وہ ہماری تقریباً کامل حکومتوں جیسی نہیں تھیں...... تاہم، یہ اتفاقی سوال کسی کو مشکل میں ڈال سکتا ہے کہ ''میکبتھ: ایک ٹریجڈی'' نہایت معتبر کیوں ہے اور ''کلنٹن ایک ٹریجڈی'' یا ''ریگن: ایک کامیڈی'' کیوں نہیں؟

سچی بات تو یہ کہ اگر شیکسپیئر کسی ایک دھڑے کا حامی ہوتا تو ایسی انوکھی اور پائیدار مقبولیت حاصل نہ کرسکتا...... وہ حکمران، باغی، شکوہ گر، ابن الوقت اور نہ ہی کسی اور دھڑے کا طرف دار تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے بھی کتب لکھی گئیں کہ وہ مارکس سے بھی پہلے ایک مارکسی، مطلق انسانیت کا حامی، رومن کیتھولک، یہودی، اطالوی یا فرائیڈین (قبل از فرائیڈ) تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے منسوب کیے جانے والے ڈرامے اس نے خود نہیں لکھے تھے۔ تاہم، اس دعوے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

چنانچہ آرنلڈ کی بات کم از کم کچھ حد تک تو ضرور درست تھی۔ بے شک شیکسپیئر پر مختلف حوالوں سے سوال اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن وہ ایک بے مثال انداز میں سبھی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ تمام مصنفین میں سب سے کم ''ادبی'' تھا اور پراوسٹ یا جانسن کی طرح نقادوں سے واسطہ نہیں رکھتا۔

ادبی تنقید دومنہ والی عفریت ہے۔ یہ ایک طرف شیکسپیئر جیسے فن پاروں کے متعلق لطافتوں اور اساسی سچائیوں تحفظ دیتی ہے۔ یہ ادبی تصانیف کو ان کے درست سیاق وسباق میں رکھتی، انہیں غلط طور پر سمجھے جانے سے بچاتی بھی ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تنقید بہت گراں قدر اور قطعی لازمی چیز ہے۔

دوسری طرف ادبی تنقید ادب کو اس کی جانداری اور قوت سے محروم کرکے اسے تیکنیکی لغویات کی بھینٹ بھی چڑھا سکتی ہے۔ یہ ادب کو پھیکا، بے جان اور صرف اعلیٰ طبقے کے لیے

مخصوص بنا کر رکھ دیتی ہے۔ مفید ثابت ہونے کے خواہش مند نقاد کو ایک نازک اور منکسر انداز میں چلنا پڑتا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ محض کتب بینی سے حاصل کردہ تجربے کی قوت ہی نہ رکھتا ہو۔ بالخصوص شیکسپیئر کے معاملے میں یہ نہایت اہم سوال اٹھانا موزوں ہے۔ ایک ''عام قاری'' یقیناً شیکسپیئر کے ڈراموں کو کسی پروفیسر کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ تاہم، اسے مزید بصیرت اور فہم شاید پروفیسر سے ہی ملے۔ لیکن افسوس کہ اس کے برعکس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے...... یعنی پروفیسر عام قاری سے بہت کم بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر شیکسپیئر ایک ایسا لکھاری ہے جو ادب کو واپس عوام کی ملکیت میں لے گیا' جو اس کے اصل مالک ہیں۔ اس کے فن پارے بحیثیت مجموعی ''عامیانہ'' تجربے کی غمازی کرتے ہیں۔ لیکن وہ عامیانہ یا عوامی ہونے کے ساتھ ساتھ ''غیر معمولی'' بھی ہے، اگرچہ ادب کے ابتدائی زمانے کے ہومر نے بھی اس خاصیت کا مظاہرہ کیا۔ ''عامیانہ'' صورتحال یا شخص یا چیز عام یا ''روزمرہ'' کی ہوتی ہے۔ دنیا میں جتنے حقائق ہیں اتنے ہی تاریخی نظریات بھی پائے جاتے ہیں۔ پروفیشنل مورخین کی مصنوعی، محدود حسب ذوق ترتیب دی ہوئی ایک ''تاریخ'' ہے جو یقین رکھتے ہیں یا یقین رکھتے تھے کہ تاریخ کا اہم ترین پہلو سیاسی ہے۔ تاریخ کی ایک اور بہت وسیع اور زیادہ درست قسم وہ ہے جسے ہسپانوی فلسفی اور ناول نگار Miguel de Unamuno (1846ء تا 1936ء) نے intrahistoria قرار دیا...... عام لوگوں میں مروج زبانی روایات، کہاوتیں، گیت، ان چھوئے علاقے، ان سنے خطے، ''پروفیشنل مورخین'' کے لیے غیر اہم واقعات۔ یہی ''حقیقی تاریخ'' شیکسپیئر کا موضوع ہے۔ یہ میری، آپ کی اور ہر کسی کی زندگی ہے۔ شیکسپیئر یہ کام ایک کرشماتی انداز میں کرنے کے قابل تھا، یا کم از کم بظاہر تو یہی لگتا ہے۔ لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک خود شعوری فلسفی تھا جس نے اپنی تحریروں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ تخلیق کیا، اور ان سب کا مقصد زندگی کے مفہوم کو عیاں کرنا تھا۔ ایک دفعہ کسی اہم برطانوی ثقافتی حکام (جو برٹش کونسل کا رکن تھا) نے خود میرے سامنے یہ خیال پیش کیا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے عین الٹ بھی کوئی نظریہ (جیسا کہ میرا) موجود ہوسکتا ہے۔ میرا نکتہ نظر اسے ایک نظر نہ بھایا...... میں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کوئی بھی شخص، کوئی بھی مصنف شعوری ارادے

کے تحت تقریباً ہر موضوع کے متعلق بصیرت افروز نہیں ہو سکتا۔

میرا شیکسپیئر زیادہ پڑھا لکھا نہیں؟ وہ ایک جنٹلمین، ایک اعلیٰ رتبے کا شاعر بننا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی کچھ خود پسند تھا لیکن وہ اس خود پسندی کو شناخت کرنے اور اس کا مضحکہ اڑانے میں کامیاب رہا۔

تاہم شیکسپیئر کو مایوسی ہوئی۔ اس کی ''ادبی'' شاعری (مثلاً ''وینس اینڈ ایڈونس'' اور "The rape of Lucrece" میں) بس اوسط درجے کی نکلی۔ اس کے چند ایک ہم عصروں، مثلاً کرسٹوفر مارلو اور جارج چیپ مین نے زیادہ بہتر شاعری کی۔ اسے اپنی بقاء کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا پڑے۔ وہ دریافت کر چکا تھا کہ اس میں اداکاری کی تھوڑی بہت صلاحیت اور ڈرامے لکھنے کی زبردست قدرت موجود ہے۔ اس نے انہی چیزوں کو بنیاد بنایا۔ اس کا ڈرامہ نگار بن جانا محض ایک اتفاق تھا: اسے بہت جلدی جلدی کام کرنا پڑا۔ اس کے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ کسی لائن کو لکھنے کے بعد مٹاتا۔ دانشوروں اور قارئین دونوں نے اس میں پختگی کی جانب بڑھنے کے عمل کو محسوس کیا، یعنی اس کی تحریر آہستہ آہستہ پختہ ہوتی گئی۔ اس نے یہ کام اس لیے کیا کیونکہ وہ عامیانہ تھا نہ کہ خصوصی، خطار کار تھا، نہ کہ بے نقص ...... جیسا کہ ہم سب ہیں۔

42

دو نئے کائناتی نظاموں کے متعلق مکالمہ

"Dialogue Concerning Two New Chief World Systems"

گلیلیو گلیلی

1632ء

گلیلیو (1564ء تا 1642ء) ایک فلسفی سے پہلے تجربیت پسند سائنس دان اور ریاضی دان تھا۔ فلسفے میں اس کا سارا کام سائنسی دلچسپیوں کے حوالے سے تھا۔ لیکن سائنس کی طرح فلسفے پر

rekhta

بھی اس نے کافی گہرا اثر ڈالا۔ سولہویں اور سترہویں صدی کے تمام سائنسدانوں میں سے گلیلیو مذہبی عقیدے یا تصوف کے ساتھ بہت کم تعلق کا حامل نظر آتا ہے۔ لیکن اس نہایت مخلص، کھوجی اور بے لوث شخص کے سائنس کی جانب رجحان کو کچھ مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

انگلینڈ کے ہوبز، برکلے اور ہیوم کی طرح اور جرمنی کے کانٹ کے برعکس وہ اپنی مقامی اطالوی زبان میں صاحب طرز تھا۔ ادبی حوالوں سے اسے ''لسانی استعمالات کا عظیم صورت دہندہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کے انداز میں جذبہ، صراحت اور خوبصورتی ہے۔ ''اس نے ہلکی پھلکی مگر درست شاعری کی اور دانتے، تاسو، آری اوستو و دیگر اہم اطالوی شعراء کے بارے میں اس کی شرحوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اٹلی کے عظیم ترین نقادوں میں سے ایک، فیڈریکو دی سانکٹ لیں(Federico de Sanctis) نے کہا کہ اس نے گلیلیو کے توسط سے ہی تاسو کو سمجھا تھا۔

گلیلیو نے اپنی سائنسی دلچسپیوں کے باوجود (یا کی وجہ سے) ادبی کام کے لیے کچھ وقت نکالا۔ اس نے دانشوروں کی پسندیدہ لاطینی زبان کی بجائے اطالوی میں بھی لکھا۔ اگرچہ وہ فلسفی نہیں تھا مگر اس موضوع پر اس کی گرفت کافی مضبوط اور گہری تھی۔ اس نے واضح طور پر، مگر ارسطو سے کسی عناد کے بغیر دیکھا کہ قرون وسطٰی کے مکاتب ہائے فکر کی ارسطوئیت پسندی جدید دور کی ریاضی اور فزکس کے ساتھ نمٹنے کے لیے کافی نہ تھی۔ وہ اپنے تقریباً ہم عصر جوہانس کپلر کا مداح تھا۔ دونوں نے آپس میں خط وکتابت تو کی لیکن ملاقات نہ کر سکے۔ گلیلیو تصوف کی جانب کپلر جتنا مائل نہ تھا۔ لیکن کلیسیا کا اسے درخور اعتنا نہ سمجھنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں الحاد پرستی ابھی پھلی پھولی نہیں تھی۔

تاہم، خدا اور کائنات کے بارے میں گلیلیو کے تصورات وخیالات کو مکمل طور پر اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ کپلر کے برعکس وہ ایک صاحب طرز لکھاری اور ہجو نگار بھی تھا، اور اسے اپنا منہ بند رکھنے کا طریقہ بھی معلوم تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کپلر کی نسبت زیادہ ''جدید'' تھا، وہ نسبتاً زیادہ ''دنیاوی آدمی'' تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محض دنیاوی آدمی ہی تھا۔ بدقسمتی سے ابھی تک انگریزی زبان میں اس کی کوئی ایسی سوانح موجود نہیں جو اسے سائنسدان اور مفکر دونوں حیثیتوں میں پیش کرتی ہو۔ قرین قیاس ہے کہ کپلر کی طرح وہ بھی فیثا غورثی تھا...... اس نے کم ازکم

کائنات کو اعداد کی بنیاد پر بیان کرنے کی کوشش تو کی۔ وہ سب سے بڑھ کر کلیسیا کی ظالم بیورو کریسی سے نجات دلانے کے لیے اس کی فرسودہ کونیات اور الٰہیات کو الگ الگ کرنا چاہتا تھا۔

''Assayer'' (1623ء) میں سے اس کا ایک مشہور ترین قول ہے کہ:

> اس عظیم کتاب، کائنات میں فلسفہ لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب متواتر ہماری نظروں کے سامنے کھلی ہوئی ہے [لیکن اندر نظر آنے والی چیزوں سے خوف زدہ مشکک اس کی دور بین میں سے نہیں دیکھتے لیکن یہ کتاب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک آپ اس کی زبان اور حروف کا ادراک نہ حاصل کر لیں۔ یہ ریاضی کی زبان میں لکھی ہوئی ہے، اور اس کے حروف مثلثیں، دائرے اور دیگر جیومیٹریکل اشکال ہیں جن کے بغیر کسی انسان کے لیے اس کا ایک لفظ بھی سمجھنا ناممکن ہے: ان کے بغیر آپ تاریک بھول بھلیوں میں ہی سر مارتے رہتے ہیں۔

گلیلیو پیسا میں ایک پرانے فلورنسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا سائنس اور ادب میں دلچسپی رکھنے والا ''ہر فن مولا'' باپ Vincanzo بنیادی طور پر ماہر موسیقی تھا...... گلیلیو نے یونیورسٹی آف پیسا سے تعلیم حاصل کی جہاں نوجوانی میں ہی ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ بعد ازاں (1592ء) وہ ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہی پیڈوا آ گیا۔ وہ اپنے بیباک خیالات کی وجہ سے کچھ مشکلات پیدا کر چکا تھا۔ کچھ لوگ اس کے مقالے ''حرکت کے بارے میں'' (On Motion) کو بھی علم الافلاک کے موضوع پر اس کی تصانیف کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ اس مقالے میں اس نے اجسام کی حرکت کے تصور میں انقلابی تبدیلی متعارف کروائی اور یوں جدید علم الحرکیات کی طرح ڈالی۔ اپنی آخری تصنیف ''دو نئی سائنسیں'' میں اس نے اپنے اس سارے کام کو نئے سرے سے دہرایا۔ اس کا پیسا کے مینار سے وزن گرانے کا واقعہ غیر مستند ہے، مگر اس نے یہ ضرور ثابت کر دکھایا کہ گرتے ہوئے اجسام کے بارے میں اس عہد کے تصورات غلط تھے۔

وہ محتاط مشاہدے کے نتیجہ میں ہی اس اختراع تک پہنچا ہوگا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر ایک ہلکے اور ایک بھاری جسم کو یکساں بلندی سے نیچے گرایا جائے تو بھاری جسم پہلے گرے گا۔ گلیلیو نے اس خیال کو غلط ثابت کیا۔ اس نے بس مختلف اوزان کے گیندوں کو لکڑی کے چینلز میں سے

نیچے کی جانب لڑھکایا اور مخصوص مقامات سے گیند گزرنے پر گھنٹیاں بجانے کا انتظام کیا۔ بعد میں نیوٹن نے قوت کشش ثقل سے پردہ اٹھایا لیکن گلیلیو نے یہ عیاں کر دیا تھا کہ گرتے ہوئے اجسام کی رفتار 32 فٹ فی سیکنڈ کی شرح سے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے تجربات ایسے لوگوں کے سامنے کیا کرتا تھا جو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز پر یقین کر سکتے تھے۔ مگر وہ ابتدا میں یہ محسوس نہ کر سکا کہ بیورو کریٹس کو اس قسم کی باتیں پسند نہیں۔

ان مشاہدات اور دلائل نے پرانی ارسطوئی فزکس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ عدالت احتساب کے پرجوش کلرکوں کو یہ بات قطعی ناقابل برداشت نہیں لگ سکتی تھی۔ بردو کے قاتلوں کے سرغنہ Bellarmine نے گلیلیو کے لیے کچھ ہمدردی دکھائی۔

گلیلیو کی "Starry Messenger" کی اشاعت (1610ء) نے زیادہ راسخ العقیدہ سائنسدانوں پر زیادہ خوش گوار اثرات مرتب نہ کیے۔ گلیلیو ایک ڈچ انعکاسی (Refracting) دوربین کا ڈیزائن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسی کی بنیاد پر 1609ء میں ایک زیادہ بہتر دوربین بنائی۔ وہ چاند پر تصادمی گڑھوں اور سیارہ مشتری کے کچھ سیارچے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ یہ شمسی چکی میں پسے ہوئے دانے تھے۔ گلیلیو نے زبردست حوصلے کے ساتھ کلیسیا کو سورج کی مرکزیت والا تصور منوانے کی کوشش کی: 1610ء سے 1616ء تک اس کی خط و کتابت اس امر کو واضح کرتی ہے۔ شمسی دھبوں کے بارے میں اپنی کتاب میں (1613ء) اس نے سورج کے گرد زمین کا سفر بیان کیا اور اپنے مخالفین کو ہوشیار کر دیا۔ تھامس کاسینی نامی ایک ڈومینکی راہب نے اس کے خلاف ایک خطبہ دیا لیکن گلیلیو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران سے بچ نکلا۔ تب چالاک Bellarmine نے اسے ''مفروضے کی حکمت عملی'' اپنانے کا مشورہ دیا...... یعنی یہ ظاہر کرنا کہ وہ تو محض ایک مفروضہ پیش کر رہا ہے۔

1616ء میں جب کاپرنیکس کو لادین قرار دیا گیا تھا تو گلیلیو کو سورج کی مرکزیت والے نظام کا پرچار کرنے سے روک دیا گیا۔ تاہم، ایک محقق نے قائل کر لینے والے انداز میں دلیل پیش کی ہے کہ کلیسیا کی نظر میں گلیلیو کا اصل جرم دیماکریٹس کا ایٹمی نظریہ اپنانا تھا۔ یہ بات واضح ہے کہ مسئلہ صرف کاپرنیکس کی تھیوری تک ہی محدود نہ تھا اور گلیلیو کے دشمن ایک نہایت ممتاز اور قابل سائنس دان کو الحاد کا مرتکب ٹھہرانے کے بین الاقوامی نتائج سے پوری طرح آگاہ تھے۔

گلیلیو نے لکھنا جاری رکھا اور بدستور اصرار کرتا رہا ہے کہ جو کچھ آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا اسے درست نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ کبھی بہت محتاط اور کبھی بہت بے باک نظر آیا۔ "The Assayer" میں گلیلیو نے اشیاء کی ''بنیادی'' اور ''ثانوی'' خصوصیات کے بارے میں ڈیماکریٹس کے نظریہ میں نئی جان ڈالی۔ غالباً یہ اس کی حکمت عملی کا حصہ تھا کیونکہ کلیسیا کے نظریہ کی مخالفت نہ کرنے والے دلائل کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ تاہم 'بنیادی اور ثانوی خصوصیات کا مسئلہ برکلے تک تمام فلسفیوں کو مشکل میں ڈالتا رہا اور آخر کار ہیوم نے اسے حل کیا۔ ڈیکارٹ اور لاک بھی اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ گلیلیو لکھتا ہے: ''میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ اگر کان، زبان اور ناک ہٹا دیے جائیں تب بھی شکل، کوانٹی اور حرکت کی خصوصیات جوں کی توں رہیں گی، مگر خوشبو، ذائقے اور آوازیں موجود نہیں ہوں گی۔ اور میرے خیال میں جانداروں کے سوا باقی چیزوں کے لیے ان کی حیثیت محض الفاظ کی سی ہے۔''

گلیلیو کا ایک سابق دوست Maffeo Barberini 1623ء میں اربن ہشتم کے طور پر پاپائیت کا سربراہ بنا تو اس نے کچھ تحفظ محسوس کیا ہو گا۔ 1632ء میں اس نے اپنا شاہکار "Dialogue" شائع کیا۔ اس تصنیف کا مقصد سورج کی مرکزیت اور زمین کی مرکزیت والے مفروضوں کا ''موازنہ'' کرنا تھا، لیکن اس میں صاف ظاہر ہو گیا کہ گلیلیو سورج کی مرکزیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مخالفین نے اسے آگ میں جلانا یا کم از کم معافی مانگنے پر مجبور کرنا چاہا: پوپ اربن نے بھی کچھ ''خطرہ'' محسوس کیا۔ ''ڈائیلاگ'' کو ضبط کر کے گلیلیو کو روم بھیجا گیا۔ وہاں اس نے رومی ماہرین افلاک کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ معافی مانگنے کے باوجود اسے لامحدود عرصے کے لیے جیل ڈال دیا گیا اور اس کے بعد اس قید کو فلورنس کے نزدیک واقع گھر میں مستقل نظر بندی کی صورت دے دی گئی۔ وہ وہیں زندگی گزارتا اور کام کرتا رہا۔ وہ اپنی بینائی اور قوت بصارت سے محروم ہو گیا (1637ء) مگر ''دونئی سائنسیں'' کتاب لکھی اور 1638ء میں اٹلی سے باہر لیڈن (Leiden) سے شائع کروائی۔

غیر واضح وجوہ کی بنا پر چرچ کے ہاتھوں گلیلیو کو ایذا رسانی کے نتیجے میں سورج کی مرکزیت والے نظریے کو زیادہ تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی: 1600ء میں سورج کی مرکزیت کا مفروضہ ایک خطرناک پہیلی تھا: لیکن 1700ء میں چند ایک پڑھے لکھے لوگ ہی زمین کی مرکزیت پر یقین رکھتے تھے۔

43

طریقہ کار کے بارے میں

"Discourse on Method"

رینے ڈیکارٹ

1637ء

بجا طور پر جدید فلسفے کا باپ کہلانے والا رینے ڈیکارٹ (1596ء تا 1650ء) آج تک کی انتہائی متاثر کن شخصیات میں سے ایک تھا۔ لیکن کیا زرتشت، عیسیٰ یا حضرت محمدؐ اور چند دوسروں کے سوا کوئی اور بھی اس قدر اثر انگیز ثابت ہو سکا؟ اور کیا اس کے دور کی بے وقوفانہ عدم رواداری

rekhta

نے اسے اپنی بات کہنے سے روکا، جیسا کہ گلیلیو کے ساتھ ہوا تھا؟

جب ہم رینے ڈیکارٹ کے متعلق لکھے گئے لاکھوں الفاظ پڑھتے ہیں تو ہمیں اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا، ہم اس کے لیے فوری گرمجوشی محسوس نہیں کرتے...... جیسا کہ شیکسپیئر، یا فلسفیوں میں سے سپنوزا کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن ڈیکارٹ نے اپنی نجی زندگی کو پردے میں چھپائے رکھا اور اس کے متعلق یقینی طور پر معلوم چند ایک باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ناجائز بیٹی Francine کی موت (جب وہ 44 سال کا تھا) کا اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ ایک فوجی رہ چکا تھا۔ اگرچہ وہ بتاتا ہے کہ فوج میں جانے کا مقصد محض ''تعلیمی'' نوعیت کا تھا، مگر اس کا دو فوجوں یعنی پروٹسٹنٹ اور پھر کیتھولک میں خدمات انجام دینا اہمیت سے عاری نہیں۔

ایک اور واقعہ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی موت سویڈن میں نمونیہ کے باعث ہوئی (وہ ملکہ کرسٹینا کے دربار میں گیا تھا): یہ بیماری لگنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے صبح پانچ بجے لیکچر دینے کے لیے اپنی دیر سے اٹھنے کی عادت کو توڑنا پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موت کا وقت آنے پر اس نے کہا تھا: ''تو اے میری روح، اب الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے۔'' بلاشبہ یہ ایک ایسے شخص کو کہنا ہی چاہیے جس نے روح اور جسم کو ''الگ'' کر دیا۔

اس نے یسوعیوں کے پاس تعلیم پائی، لہٰذا رازدارانہ رویہ اختیار کیا، اور وہ ایک ایسے دور میں زندہ تھا جب آزاد فکر کا پرچار کرنے کے جرم میں موت، ایذا رسانی یا دونوں کی سزا مل سکتی تھی۔ اس کے خلوص کی سطح کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ خدا کی موجودگی کے بارے میں اس کا پیش کردہ مشہور ثبوت خود اس کے لیے کیا مفہوم رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک باطنی فرقے Rosicrucian کا رکن تھا۔ لیکن اگر ایسا تھا بھی تو ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہم نے اس بات کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کیونکہ فلسفے کے تاریخ نگار حضرات اپنی تصانیف کو ایسے معاملات سے بالکل پاک رکھتے ہیں جو ان کی نظر میں فلسفیانہ نہیں ہوتے...... اور یوں وہ انسانی لحاظ سے اہمیت رکھنے والی بہت سی باتوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈیکارٹ کا کام محض کام ہے، اور اسے اس کی شخصیت سے جدا کر کے دیکھنا ہوگا'' لیکن ایک اور لحاظ سے یہ ایک بدحال کردار کی پیداوار بھی ہے...... نقدی کے ضرورت مند

جینیئس کا کام جسے فکری کام جاری رکھنے کے لیے دو فوجوں میں ملازمت کرنا پڑی...... لہٰذا ڈیکارٹ کا کام فلسفے کی تاریخ سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ وہ کس کے لیے قربت محسوس کرتا تھا؟ اپنی بیٹی کی ماں سے؟ کون جانے!

ڈیکارٹ اپنی مطالعہ گاہ میں

ایک مشہور جملے ''میں سوچتا ہوں، لہٰذا میں ہوں'' کے ذریعہ ڈیکارٹ نے اپنے علم کی

افادیت کے بارے میں سب کے شکوک دور کیے۔ اس کے فلسفے میں ''میں'' کا صیغہ بہت سی جگہوں پر موجود ہے۔ میں سوچتا ہوں (Cogito) اس کے ان ابتدائی جملوں میں سے ایک ہے جس پر غیر واضح ہونے کے حوالے سے تنقید کی گئی...... فلسفے کے انڈر گریجوایٹس بالکل اسی طرح ڈیکارٹ کے Cogito کو غیر معتبر ثابت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جیسے فرسٹ ایئر کے میڈیکل سٹوڈنٹس کہتے ہیں کہ ''اوں، مجھے یہ کھانسی کی آواز بہت بری لگتی ہے۔''

لیکن اس کی شہرت بدستور یقینی ہے کیونکہ یہ حقیقت میں چاہے کتنی ہی تسلی بخش ہو لیکن اس نے ڈیکارٹ کو اپنا کام جاری رکھنے کی تحریک دلائی۔ اس تصنیف نے متکلمانہ اصطلاحات سے بھرپور ہونے کے باوجود انسانوں کی فلسفہ آزمائی کے طریقہ کو نئے سرے سے اختراع کیا اور قرون وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے فلسفیانہ انداز کو منتشر کرنے میں مدد دی۔ ڈیکارٹ نے کہا کہ نوجوانی میں اسے پتہ چلا کہ اگرچہ ''بہترین اذہان'' ایک طویل عرصے تک اس پر عمل پیرا رہے ہیں لیکن ''اس میں کوئی ایسا نکتہ نہیں تھا جو متنازعہ اور مشکوک نہ ہو۔

بنیادی طور پر ایک ریاضی دان اور ریاضی کی منطق کا عادی ہونے کے ناطے ڈیکارٹ نے ریاضیاتی استدلال کے یقینی نظر آنے والے طریقہ ہائے کار کو فلسفہ کے متنازعہ شعبوں پر لاگو کرنے کا فیصلہ کیا: ''[میں نے فرض کیا کہ] انسانی علم کے احاطے میں آنے والی تمام چیزیں بالکل اسی طرح [جیسا کہ ریاضی میں] باہم منسلک و مربوط ہیں۔ کوئی شاعر، یا حتیٰ کہ کوئی فکشن نگار یا قبالہ کا پیروکار بمشکل ہی اس بات سے اتفاق کر سکتا تھا؛ مگر کیا افسانوی صوفی فیثا غورث نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہر چیز کی اعداد کے حوالے سے وضاحت کی جا سکتی ہے؟

ثبوتیت پسند بیسویں صدی کے تناظر میں...... جہاں فیثا غورث کو عموماً ملحدانہ بصیرتوں سے عاری ایک دیوانہ اور اسطوریاتی ولی خیال کیا جاتا ہے...... دیکھا جائے تو ہمیں ڈیکارٹ کا عہد فیثا غورث کے عہد سے مشابہ لگے گا۔ مثلاً ہمارے لیے اس امر کو سمجھنا مشکل ہے کہ الکیمیا کے بارے میں پیراسیلسس کی تحریروں کا ڈیکارٹ، سپینوزا اور لیبنز جیسوں نے اس طرح مضحکہ کیوں نہ اڑایا جیسے آج اڑایا جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اس فلسفی نے اس دور میں ان ملحدانہ موضوعات کو کتنی سنجیدگی سے لیا...... اور جدید فلسفی اگر ممکن ہو تو انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیا

ماہر نجوم، شاعر اور فلسفی گیارڈانو برونو جیسے عظیم ذہن کو 1600ء میں عدالت احتساب نے خدا کے مفادات کی خاطر آگ میں نہیں ڈال دیا تھا؟ ڈیکارٹ جیسے آدمیوں نے لازماً ان شعلوں کو اپنے دامن تک پہنچتے ہوئے محسوس کیا ہوگا۔ ''ہیملٹ'' میں (جسے تحریر کیے جانے کے وقت ڈیکارٹ 7 برس کا تھا) ہوریشو کہتا ہے کہ آسمان اور زمین میں اس سے کہیں زیادہ کچھ ہے جس کا ''فلسفے'' نے محض تصور ہی کیا۔ اور یہ شخص ڈیکارٹ اپنی فائدہ بخش خطاؤں اور کامیابیوں دونوں کے لیے یکساں مشہور تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ ریاضیاتی قسم کی قطعیت چاہتا تھا۔ ایک ہندوستانی فلسفی کی جانب سے Cogito کے جواب میں یہ کہنا باعث تسکین ہوتا کہ ''میں یہ کیوں نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں سوچتا ہوں اس لیے سوچ موجود ہے؟'' لیکن کسی مغربی فلسفی نے کبھی ایسا سوال نہ اٹھایا۔ شوپنہاور کی استثنیٰ کے ساتھ، مغربی فلسفیوں نے ہندوستانی فلسفے کو غیر فلسفیانہ خیال کیا...... مگر حقیقت اس سے مختلف ہے۔

ڈیکارٹ کی پیدائش Tours کے نزدیک La Haye (موجودہ۔ La Haye Descartes) میں ہوئی اور اس نے آنجو میں La Fleche کے مقام پر نو قائم شدہ کٹر یسوعی کالج میں تعلیم حاصل کی اور وہیں اس حکیمانہ فلسفے کا بھرپور علم حاصل کیا جسے بعد ازاں وہ چیلنج اور جاوہ کرنے والا تھا۔ اس نے ارسطو، یا کم از کم مکاتب کے ارسطو کو ناپسند کیا۔ وہ ارسطو جسے آکوئنس نے اعزازی کیتھولک کی صورت دے دی تھی۔ وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے Poitiers گیا اور 1616ء میں گریجوایشن کی، لیکن 22 سال کی عمر میں ''غور وفکر کے لیے کچھ وقت نکالنے'' کی خواہش کے ساتھ یسوعی معلمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موراس آف Nassau کی پروٹسٹنٹ ڈچ آرمی میں نام درج کروادیا۔ Ulm کے مقام پر فرائض انجام دیتے ہوئے اس نے ایک خواب دیکھا کہ وہ سائنسوں کو یکجا کرنے کے لیے ایک طریقہ کار وضع کر رہا ہے۔

انجام کار ڈیکارٹ ہالینڈ میں مقیم ہوگیا (1628ء) اور آئندہ بیس برس وہیں گزارے۔ اس نے جلد ہی اپنی پہلی کتاب "Rules for the Direction of the Under Standing" لکھی۔ لیکن یہ تصنیف نامکمل رہی اور اٹھارہویں صدی سے پہلے شائع نہ ہوسکی۔ 1634ء میں اس نے اپنی Le Monde (''دنیا'') مکمل کر لی تھی، وہ اسے شائع کرنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن

جب سنا کہ ایذا رسانی کی دھمکی ملنے پر گلیلیو نے کاپرنیکس کی تعلیمات کے پرچار سے لاتعلقی ظاہر کردی ہے تو ڈیکارٹ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ڈیکارٹ کی "Discourse on Method" 1637ء میں تین سائنسی مقالوں کے دیباچے کے طور پر سامنے آئی۔ 1641ء میں اس کی "Discourses on the First Philosophy" منظر عام پر آئی اور ساتھ ہی ممتاز معترضین (مثلاً ہوبز اور Gassendi) کی جانب سے "Objections" کا ایک سلسلہ بھی۔ "The Principle of Philosophy" 1644ء میں شائع ہوئی۔ اس کی آخری تصنیف "The Passions of the Soul" تھی جس میں اس نے جانوروں کو بالکل مشینی انداز میں پیش کیا۔

شاید ڈیکارٹ عموماً ایک ماہر علمیات (epistemologist) کے طور پر مشہور ہے...... ایسا شخص جو بے فائدہ انداز میں ہمارے علم کے لیے بنیادیں قائم کرنے کا خواہش مند ہو۔ وہ ایک انقلابی نظام وضع کرنے والے کی حیثیت سے بہت کم جانا جاتا ہے۔ اس نے یہ نظام اتنی چالاکی سے بنایا کہ کلیسیا نے اسے آگ میں نہ ڈالا۔ یہ نظام ہی اس کی اصل دلچسپی تھا، لیکن اپنے عہد کے حالات کی وجہ سے وہ وضاحت کرنے پر مجبور تھا کہ اس نے یہ کیوں سوچا کہ وہ تشکیکیت پر غالب آسکتا ہے جس میں ہر کوئی دلچسپی رکھتا تھا (کیونکہ Sextus Empiricus کی تحریریں دوبارہ شائع ہو چکی تھیں)۔ اس قسم کے مفروضات، کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا، یا ایک بدخواہ شیطان جان بوجھ کر اسے گمراہ کر رہا تھا، کا بنیادی مقصد صرف فصاحت تھا، لیکن اس نے اس ''کینہ پرور اور نہایت طاقتور و مکار'' شیطان کے ذریعہ دکھادیا کہ وہ شاعروں، قبالہ کے پیروکاروں وغیرہ کو مسحور کرنے والے مظہر سے آگاہ تھا۔ چاہے یہ بدخواہ شیطان ''باطنی یا غیبی روابط'' رکھتا تھا یا نہیں، مگر اس کی ایک طویل نفسیاتی تاریخ موجود ہے۔ وہ ڈیکارٹ کی طرح ہم سب میں ہی موجود ہے...... تحریص دلانے والا، جنسی گمراہی پر مائل کرنے والا، ابلیس، ہمارے ذہن کو غلط راہ پر چلانے والا! کیا ڈیکارٹ نے اس سمت کی آگہی کو دبانے کی کوشش کی جس میں وہ محدود علم کے لیے جستجو میں آگے بڑھ رہا تھا...... اور کیا اس کے ہاں ذہن اور مادے کے درمیان فرق دراصل ''شیطان'' کی کارگزاری ہے؟ اور کیا وہ ''گمراہ'' ہوگیا تھا؟

اس قسم کے سوالات نہیں پوچھنے چاہئیں۔ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ڈیکارٹ نے ذہن اور مادے کو الگ کر کے ہر ایک کو مشکل میں ڈال دیا۔ "Meditations" میں اس نے کہا کہ ''آج تک کسی نے بھی سنجیدگی کے ساتھ یہ شبہ نہیں کیا کہ واقعی ایک دنیا موجود ہے۔'' (خارجی دنیا کی موجودگی پر موثر انداز میں شک کرنے والا تجربیت پسند برکلے ڈیکارٹ کی موت کے 36 برس بعد پیدا ہوا تھا۔) ہم محفوظ انداز میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ تشکیکیت اس کے لیے ہرگز حقیقی حیثیت نہیں رکھتی تھی...... اس نے یہ سب کچھ استدلال کی خاطر کہا۔

Cogito کو ایک اور حوالے سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے: اگر شبہ موجود ہے تو شک کرنے والا بھی لازماً موجود ہوتا ہے، ورنہ شک کا ہی وجود نہ رہے! ڈیکارٹ نے سوچا کہ یہ قطعیت کا ایک شیطانی نکتۂ ثبوت ہے۔ کیا یہ نام نہاد ''تشکیکی طریقہ کار'' ایک اچھی دلیل ہے؟ خود ڈیکارٹ نے اسے اس قدر ''قطعی اور یقینی'' خیال کیا کہ یہ شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ یہ ایک ثبوت کے طور پر کافی زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہے، اور دوسروں نے بھی اس پر بات کی۔ مثلاً سینٹ آگسٹائن نے "The City of God" میں لکھا: ''میرے موجود ہونے، جاننے اور اس پر خوش ہونے کی قطعیت کسی بھی خیالی یا سرابی تصورات سے آزاد ہے۔''

لیکن تب ڈیکارٹ اپنے قطعیت (Certainty) کے نکتے کو استعمال کرتے ہوئے ایک اور نتیجے پر پہنچتا ہے: اس نے جانا کہ اگر وہ ایک خدائے کامل یا ہستی کامل کا نظریہ رکھتا تھا تو یہ ہستی کامل لازماً موجود ہوگی؟! اگر ایک کامل شے موجود نہ ہو تو اس کا تصور بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ افسوس کہ Cogito کے معاملے میں دیگر مسائل کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس کے مطابق ڈیکارٹ کی موجودگی اسی وقت ثابت ہوتی ہے ''جب وہ سوچ رہا ہے۔'' اور یہ مسئلہ حل کرنے کی خاطر ڈیکارٹ نے دھوکہ بازی سے کام لیا: اس نے کہا کہ وہ ایک پائیدار ''جوہر'' (یا مادہ) ہے کیونکہ وہ سوچتا ہے۔

اگر ڈیکارٹ ایک مادیت پسند ہوتا تو اس کے لیے بہت آسانی پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ مادیت پسندی کے ذریعہ ہر چیز کے متعلق اپنی راستی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ڈیکارٹ کا کامل اور قطعی خدا اصل میں انفرادیت پسند ڈیکارٹ خود ہی تھا۔

لیکن ذہن یا شعور بدستور ایک مسئلہ رہا، کیونکہ مادے کے برعکس آپ اسے چھو نہیں سکتے...... مگر آپ اس کی موجودگی کے متعلق جانتے ہیں۔ کچھ جدید مادیت پسند فلسفیوں کی نظر میں ''ذہن'' محض دماغ کی طبعی (فزیکل) حالتوں کا ایک سلسلہ ہے...... لیکن یہ بات تسلی بخش نہیں کیونکہ کوئی بھی شخص ان حالتوں کا تعین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ہوبز کے لیے ذہن محض ''حرکت کرتا ہوا مادہ'' تھا۔

فلسفہ ایک قابل احترام پیشہ ہے، یا یہ خود کو ایسا سمجھتا ہے۔ یہ یقیناً اس موجودہ دنیا کے لیے ضروری ہے جو اب بدترین مفہوم میں مادیت پسند ہے۔ لیکن یہ اس وقت کسی ہفتہ وار رسالے جیسی بیہودہ صورت اختیار کر سکتا ہے (حتیٰ کہ ڈیکارٹ ہاں بھی ایسا ممکن ہے) جب جذبے اور عقل کے درمیان موزوں توازن قائم نہ رکھا جائے، اور جب ''بے یقینی'' کو مغرورانہ انداز میں مسترد کر دیا جائے۔

تاہم، ڈیکارٹ کا کام نہ صرف برکلے کی تشکیک پسندی بلکہ نیوٹن کی Principia اور کانٹ کی مابعد الطبیعیات پر بھی فتح ہوا۔

ڈیکارٹ ایک تخیلاتی مصنف، ایک تخلیق کار بن کر آزاد خیال مفکرین کی زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والوں کو مات دے سکتا تھا (جیسا کہ شاعر مزاج ہوبز نے کیا) لیکن وہ نخوت اور خوف کے درمیان ڈگمگاتا رہا۔ شک کی بنیادوں پر قطعیت ایجاد کرنے کے لیے کوشاں شخص شک سے آزاد رہا۔

44

لِویاتھن

" Leviathan "

تھامس ہوبز

1651ء

انگلش سیاسی (اور اخلاقی) فلسفے کے بانی تھامس ہوبز (1588ء تا 1679ء) نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا...... نہ صرف فلسفہ، بلکہ مذہب، ریاضی، منطق، نفسیات، زبان اور بصریات بھی اس کے موضوعات میں شامل ہیں۔ اس نے ''دولت مشترکہ'' سے جلاوطنی کے زمانے میں

rekhta

پیرس میں مستقبل کے چارلس دوم کو پڑھایا۔ وہ اپنے دور کے تقریباً ہر عظیم ذہن کا علم رکھتا تھا: گلیلیو، ڈیکارٹ، بیکن، لیبنز...... کسی بھی قوم کا کوئی بھی فلسفی نثر نگاری میں اس پر برتری حاصل نہ کر سکا (چند ایک ہی، مثلاً شوپنہاور، اس کی ہمسری کر پائے) اس میں شاعر والے کچھ اوصاف موجود تھے اور زندگی کے بارے میں اس کی تفہیم صرف ایک فلسفی اور فزیالوجسٹ والی ہی نہیں بلکہ ایک طنز شاعر والی بھی تھی۔

''لویاتھن'' اس کی مشہور ترین تصنیف اور دنیائے ادب میں ایک کلاسیک شمار ہوتی ہے، مگر اسے بہت غلط طور پر لیا گیا۔ ہوبز ڈرپوک مزاج تھا کیونکہ وہ وقت سے پہلے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں ہسپانوی فوج کی پیش قدمی سے ڈر گئی تھی۔ مگر اس کی تحریریں حقیقی معنوں میں نہایت بے باک اور حوصلہ مندانہ ہیں...... یہاں تک کہ وہ ''مالمسبری کا درندہ'' کے نام سے مشہور ہوا، اور ملحد قرار پایا (1666ء کے بعد اس کی مخصوص تصانیف کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی)۔ وہ ہمیشہ جانتا تھا کہ وہ کس وقت ناراضگی اور خفگی کا باعث بن رہا ہے...... درباری حلقہ اس پر خفا ہوا کیونکہ اس نے ''بادشاہ کے الوہی حق'' کو مسترد کیا؛ اس کے علاوہ پیوریٹانی، رومن کیتھولکس اور ہر قسم کے تمام اخلاقیت پسند اس سے ناراض رہے۔ بہت سے لوگ اس کی تصانیف کے ساتھ ساتھ اسے بھی نذرِ آتش کرنے کے خواہش مند تھے۔ ہوبز کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ ایک طنز نگار تھا جسے اپنی خصوصی لانے کی قابلیت کا پورا وقوف تھا۔

ہوبز گلوسیسٹر شائر کی مغربی کاؤنٹیز اور ولٹ شائر کی درمیانی سرحد پر واقع قصبے مالمسبری میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جاہل، جواری اور ظالم پادری تھا جو ایک ساتھی پادری کی پٹائی کرنے کے بعد گمنامی کی دھند میں کھو گیا۔ آکسفورڈ میں ایک شاندار کیریئر کے بعد اس نے زندگی کا زیادہ تر حصہ Devonshire خاندان کی خدمت میں گزارا۔ ایک ساتھی اتالیق کی حیثیت میں براعظم پر آنے جانے کے ذریعہ وہ میکیاویلی اور جدید ترین یورپی فکر کے متعلق جاننے کے قابل ہوا۔ اگرچہ ہوبز نے فرانسس بیکن کا استقرائی طریقہ مسترد کیا، لیکن معمر بیکن کے ساتھ ذاتی دوستی نے اسے ارسطوئی علم الکلام اور اس کے نہایت مجرد طریقہ استدلال کی فیصلہ کن تردید میں مدد دی۔ یقیناً بیکن کے ''منڈی کے معبودوں'' (Idols of Market Place) کے نظریہ نے بھی

اسے متاثر کیا: یعنی الفاظ کے استعمال میں مجرد بے احتیاطی۔ یہ خیال قائم کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں کہ ہوبز نے مذہب کو ناپسند کیا، مگر اس نے مذہب کے مروج استعمالات پر زبردست ناگواری ضرور ظاہر کی۔ اس نے موت کو ''تاریکی میں ایک بڑی چھلانگ'' قرار دیا۔ جب ہوبز نے لکھا:

Put thousands together
Less bad,
But the cage is less gay

یا (Leviathan میں)

''انسان کی مخفی سوچیں تمام پاک، ناپاک، صاف، گندی، تاریک اور
روشن چیز کا کسی شرم یا جھجک کے بغیر احاطہ کرتی ہیں۔''

تو وہ ایک فلسفی سے زیادہ ایک شاعر کی حیثیت میں بات کر رہا تھا۔ لیکن اس کا تجزیہ ہمیشہ ایک فلسفی یا سیاسی نظریہ دان کی حیثیت سے کیا گیا۔ کبھی بھی یہ تفہیم نہ کی گئی کہ وہ دنیا کے بارے میں ہر ممکن حد تک قطعی سائنسی حوالہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے صرف اس لیے بہت کچھ ''پراسرار سوچوں'' کے کھاتے میں ڈال دیا کیونکہ وہ قطعی سائنسی تحقیق کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ اس نے اپنے عہد میں مروج مذہب کو صداقت نہیں بلکہ قانون کے ایک نظام کے طور پر دیکھا۔ لیکن وہ حضرت ایوبؑ سے خدا کے ایک سوال کو بہت پسند کرتا تھا: ''تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے زمین کی بنیادیں قائم کیں؟''

اگرچہ ہوبز کا موازنہ بی ایف سکنر سے کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس جیسا نہیں تھا: وہ ان سب باتوں کو انسانی غور و فکر سے منفی کرنے کا مشتاق نہیں تھا جو اس کے لیے باعث تکلیف تھیں کیونکہ وہ مایوس ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کرداریت پسندانہ (behaviorist) طریقہ کار کے موجدوں میں سے ایک نہیں جس کے تحت سائنسی لحاظ سے قابل بیان چیزوں کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ ولیم جیمز سے زیادہ ماہر کرداریت (behaviorist) نہیں تھا۔ ہوبز کی نثر کا جاہ و جلال اور بازگشت اس کا خاطر خواہ مظاہرہ کرتی ہے: ''جو شخص بھی اپنے اندر دیکھتا اور اپنے اعمال پر غور کرتا ہے وہ سوچتا، رائے دیتا، استدلال کرتا، امید رکھتا

اور خوف کھاتا ہے۔ تب اسے پتہ چلتا ہے کہ باقی تمام انسانوں کی سوچیں اور جذبات اسی قسم کے مواقع پر کیا تھیں۔''

ہوبز نے ''لویاتھن'' کے علاوہ لاطینی زبان میں تین کتاب پر مشتمل فلسفیانہ تصنیف بھی لکھی۔ اس نے لاطینی اور انگریزی زبان میں سوانحات بھی لکھی تھیں۔ اس نے 1628ء میں تھیوسی ڈائیڈز اور بڑھاپے میں ہومر کے ایلیڈ اور اوڈیسے کا ترجمہ بھی کیا۔ انگریزی میں اس کی تصنیفات گیارہ جلدوں اور لاطینی تصنیفات پانچ جلدوں پر مشتمل ہیں۔

''لویاتھن'' کا مقصد انفرادی انسانی تسہیل، تحفظ اور امن کی قیمت بیان کرتا ہے، طبعی کائنات کی تفتیش کے لیے گلیلیو کے استخراجی (Deductive) طریقہ کار سے تحریک یافتہ ہوبز انسانی طرز عمل کا تجزیہ بھی طے شدہ قوانین کے مطابق کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ (یاد رہے کہ استخراجی طریقہ کار میں درست مفروضوں سے ناقابل تردید نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، جبکہ استقرائی یا Inductive طریقے میں صرف ممکنات کو لیا جاتا ہے)۔ ہوبز یقین رکھتا تھا کہ ہر چیز کی وضاحت ''حرکت کرتے ہوئے مادے'' کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ اس نے لکھا: ''صرف ایک چیز حقیقی ہے۔ لیکن یہ ان چیزوں کی بنیاد ہے جنہیں ہم غلطی سے کچھ اور قرار دیتے ہیں...... واحد داخلی حقیقت...... حرکت ہے۔''

سپینوزا کی طرح ہوبز کی کائنات بھی مادی ہے۔ ہمارے تمام خیالات اور جذبات حرکت کرتا ہوا مادہ ہے۔ ''لویاتھن'' کے باب 6 کا عنوان یہ ہے:

"Of the interior Beginnings of Voluntary Motions; Commonly called the PASSIONS."

(خودرو حرکت کی داخلی ابتدا کے بارے میں جسے عام طور پر ''جذبات'' کہتے ہیں)

ہوبز ایک حقیقی بنیادی مفروضہ بیان کرتا اور پھر اس سے ریاست یعنی Leviathan کا تصور اخذ کرتا ہے جسے لاگو کرنا لازمی ہے تاکہ انسان امن کے ساتھ اکٹھے رہ سکیں۔ وہ ہرگز ربط باہم (Harmony) کا ذکر نہیں کرتا، کیونکہ وہ دل کی گہرائی میں ایک شاعر ہے جس کے ہاں یوٹوپیائی نظریات ''برائی کے لیے ایک نوشتہ'' کو تحریک دلاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان آپس میں

تعاون کرنے والی چیونٹیوں یا شہد کی مکھیوں جیسے نہیں: وہ مقابلہ آرائی اور ''دلیل بازی'' کرتے ہیں۔ (کیا وہ طنز کر رہا ہے؟) چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں فطری طور پر باہم رضا مند ہیں: انسان محض ''مصنوعی طور پر'' رضا مند ہو سکتے ہیں۔ میثاق (Covenant) لوگوں اور حاکم کے درمیان نہیں (جیسا کہ روسو یا جان لاک کے ہاں ملتا ہے) بلکہ خود لوگوں کے مابین ہے۔ اسے اس حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی فطرت میں موجود خود غرضی سے مجبور ہو کر غلام بننے پر رضا مند ہیں۔ ہوبز کا حاکم ایک مصنوعی خدا ہے، اور وہ ہمیں ایک خوف ناک خدا کے بارے میں بتاتا ہے۔ کیا یہ سیاسی نظریہ ہے یا سیاسی بیان؟

لیکن سنجیدہ اور سادہ سیاسی نظریے کے نکتہ نظر سے ہوبز خود کو مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔ متعلقہ سوالات کے بارے میں اس کے پیش کردہ جوابات غیر تسلی بخش ہیں (یہ سوالات کہ: اگر حاکم استبدادی فرمانروا ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا: اگر حاکم ضرورت سے کہیں زیادہ آزادی لے لے تو کیا ہوگا: اگر وہ لالچی ہو یا لالچی بن جائے تو کیا ہوگا وغیرہ) یہ بات درست ہے کہ وہ اپنے دور کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ لیکن ہوبز بس یہی کہے گا کہ بدترین استبدادیت بھی طوائف الملوکی (یعنی مکمل انتشار) سے بہتر ہے۔

تاہم، میرے خیال میں یہاں ہوبز طنزیہ اور یاسیت پسند ہے۔ دنیا میں مسرور ترین حالتوں میں سے ایک حالت وہ ہے جس میں یاسیت پسند اپنی یاسیت کا پیغام دیتا ہے۔ ہوبز اپنی ریاست کی تصویر کشی کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے جس میں انسان ایک حاکم کو قطعی و مطلق اختیار دینے پر راضی ہیں کیونکہ وہ موت سے خوف زدہ اور تحفظ کے خواہش مند ہیں۔ غالباً وہ اپنے طنزیہ انداز میں انسانی فطرت کی خود غرضی پر تنقید کر رہا تھا۔ وہ یقیناً انسانوں کی خود کو سمجھنے کی صلاحیت کے بارے میں ناخوش ہوگا۔ شاید وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ اس کے بادشاہ نے امن اور امان کو تحفظ دیا ہے۔ فلسفی عموماً ''لویاتھن'' کو ایک ''غیر معمولی کتاب'' تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی نثر ایک ایسا مسحور کن عنصر رکھتی ہے جو لاک اور روسو کے ہاں نہیں ملتا۔

45

تصنیفات

"Works"

گوٹ فرائیڈ ولہلم لیبنز

1663ء تا 1716ء

جب ہم کسی مرد یا عورت کو ''عظیم'' قرار دیتے ہیں تو ہم ایک نادرستی کے مرتکب ہوتے ہیں جو انتہا پسندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ موجود بھی ہے...... بشرطیکہ ہم ابتدا میں ہی یہ تسلیم نہ کر لیں کہ ہمارا کہنے کا مطلب بس اتنا ہے کہ وہ شخص کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر ہمارے جذبہ شوق کو

بڑا مختلف نظر آتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم ایک پروفیسر ہیں یا باغبان۔ لوگوں پر لفظ ''عظیم'' لاگو کرنے کا مفہوم صرف موضوعی نوعیت کا ہوتا ہے، تاہم، جھوٹے جاہ و جلال کے مالک مگر اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے والے بدمعاش سکندر اعظم جیسے مختلف افراد کو عظیم ثابت کرنے کی کوشش میں کئی گیلن روشنائی ضائع کی گئی۔ اگر ہم اس لفظ کی تعریف میں چھپی اخلاقیت کو تسلیم کر لیں تو معاملہ مختلف ہو گا؛ لیکن چونکہ ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے لہٰذا اسے یکسر مسترد کر دینا چاہیے۔ مگر ہمیں اپنی آراء سے اس قدر رعبت نہیں کرنی چاہیے۔

کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو گوٹ فرائیڈ ولہلم لیبنز (1646ء تا 1716ء) کا نام سن کر فوراً ہی اس کے ''عظیم'' ہونے کی منظوری دے دے۔ برٹرینڈ رسل نے اس سے نفرت کی مگر یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ''عظیم'' تھا۔ یہ بات درست ہے کہ سکندر کے برعکس لیبنز نے دنیا کو زبردست تکلیف و اذیت سے دوچار نہ کیا تھا...... لیکن وہ اس قسم کی قطعی عظمت کا حامل نہ تھا جس کی قدر افزائی تاریخ کے عالم حضرات خود کو عالمی فاتحین کی جگہ پر رکھ کر تصور کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ لیبنز کا اثر بہت زیادہ عملی اور پائیدار تھا۔ علم کا شاذ ہی ایسا کوئی میدان ہے جس میں اس نے حصہ نہ ڈالا ہو۔ مثلاً وہ پہلا لکھاری تھا جس نے لاشعور کا نظریہ متعارف کروایا: اس نے نشاندہی کی کہ ہم کسی چیز کا ادراک تو کر سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس وقت اس سے آگاہ بھی نہ ہوں۔

تاہم، ہم آغاز میں ہی اسے شدید مشکلات میں پاتے ہیں۔ وہ واقعی ''نرالا'' ہے۔ عام تعلیم یافتہ مرد یا عورت شاید اس کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہ ہوں۔ غالباً وہ اتنا ہی بتائیں گے کہ لیبنز نے تقریباً نیوٹن کے ساتھ ہی احصا (Calculus) دریافت کیا، اور اولیت کے معاملے میں اس کے ساتھ تنازعہ کا شکار ہوا؛ یا والٹیئر نے "Candide" میں اس کا مضحکہ اڑایا۔ تاہم، برٹرینڈ رسل نے ''مغربی فلسفہ کی تاریخ'' میں لیبنز کے متعلق لکھا کہ وہ ''تمام تاریخ کے اعلیٰ ترین اذہان میں سے ایک تھا...... وہ بطور انسان قابل توصیف نہیں تھا...... فلسفہ کے دو نظام موجود ہیں: ایک رجائیت پسندانہ، راسخ الایمان، شاندار اور اتھلا جس کا پرچار لیبنز نے کیا، اور دوسرا عمیق، مربوط، سپنوزا والا اور حیرت انگیز حد تک منطقی۔'' ہر کوئی رسل کے ساتھ اتفاق نہیں

کرتا جس نے اکثر فیصلے دینے میں بے احتیاطی سے کام لیا، اور یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا بھی نہیں۔ مگر اس میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہے۔

لیبنز کا اثر لکھے ہوئے الفاظ کے ذریعے پھیلا، لیکن کیا اس کی تحریر کردہ کسی واحد کتاب کو بالاترین اور مقدم حیثیت میں منتخب کیا جا سکتا تھا؟ ایسا ممکن نہیں! اس کی زیادہ زوردار تحریریں اس کی موت سے پہلے شائع نہیں ہوئی تھیں۔ علامتی منطق کے حوالے سے اس کا کام بیسویں صدی سے پہلے منظر عام پر نہ آیا۔ لیبنز ایک جرمن تھا، مگر اس نے زیادہ تر لاطینی اور فرانسیسی میں لکھا، اور اس کے زیادہ پر اثر خیالات اس کے خطوط میں ملتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس کی مجموعی تحریروں یعنی Works کو ہی لینا پڑا، البتہ یہ تصنیفات آج اپنی مکمل صورت میں موجود نہیں، بلکہ عین ممکن ہے کہ کسی فرد واحد نے انہیں پورا کا پورا نہ پڑھا ہو۔ شاید آئندہ بھی کوئی نہیں پڑھ پائے گا۔ چنانچہ ہم حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہیں گے کہ یہاں ہمیں جس کی ضرورت تھی اس میں سے زیادہ تر "Leibniz Selections" (1951ء) میں، یا اسی طرح کے ایک یا دو دیگر مجموعوں میں شامل ہے۔ البتہ اس کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر بیان فوراً اس کی قدر و اہمیت آشکار کر دے گا اور ہمیں اس سوال کا جواب دینے میں مدد دے گا کہ اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا کیسی ہوتی۔

گوٹ فرائیڈ ولہلم لیبنز Leipzig یونیورسٹی کے ایک اخلاقی فلسفہ کے پروفیسر کے ہاں بمقام Lepzig پیدا ہوا۔ لیبنز غالباً نشاۃ ثانیہ کی قسم کا آخری ''ہمہ گیر شخص'' تھا۔ ہر فن مولا لیبنز ایک ریاضی دان، سائنس دان، وکیل، سفیر، انجینئر، مورخ، لائبریرین، درباری اور موجد بھی تھا۔ (اس نے حساب کتاب لگانے والی پہلی مشین ایجاد کی جو roots اخذ کر سکتی تھی)۔ وہ ایک شاعر بھی تھا، مگر بہت برا اور روایتی قسم کا۔ اس حوالے سے میں آگے چل کر بات کروں گا۔ وہ بہت عوامی قسم کی شخصیت تھا: انگلینڈ کے جارج اول نے اسے ''چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا'' قرار دیا۔ وہ غیر معمولی حد تک ذہین نوجوان تھا جو 14 برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوا۔ 1669ء میں اس نے Mainz کے والئی ریاست (Elector) کی ملازمت اختیار کی اور پھر 1672ء میں بین الاقوامی امن کا نظریہ لے کر پیرس گیا تا کہ لوئی XIV کو مصر سے ترکوں کو نکالنے پر مائل کر سکے اور یوں وہ ہالینڈ

پر چڑھائی کا منصوبہ بھول جائے (یہ منصوبہ کارگر نہ ہوا)۔ وہ دو مرتبہ انگلینڈ گیا: 1673ء میں اور پھر 1676ء میں۔ لیکن جب جارج آف ہانوور (Hanover) انگلینڈ کا بادشاہ بنا تو اس نے اسے وہاں آنے کی اجازت نہ دی۔

1676ء میں لیبنز نے سپینوزا کے ساتھ چار دن بسر کر کے اس کی ''Ethics'' کے حواشی بنائے...... اور کیلکولس کے بارے میں اپنی تصنیف مکمل کی۔ بہت سے ریاضی دان ملتے جلتے مسائل پر کام کر رہے تھے۔ نیوٹن بھی ان میں سے ایک تھا۔ اور جب نیوٹن نے اپنے دوستوں کی مدد سے اس پر ادبی سرقہ بازی کا الزام لگایا (جو درست نہ تھا) تو لیبنز کو اپنا کام بے نام حیثیت میں کرنا پڑا...... یہ راز جلد ہی دریافت ہو گیا۔ تاہم، اس کا notation کا نظام نیوٹن والے نظام سے بہتر ہے اور آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ دونوں ہی اس کامیابی میں حصہ دار ہیں۔ ریاضی کے مسائل حل کرنے کے اس نئے طریقے کی دریافت کے نتائج کا ذکر کرنا یہاں زائد از ضرورت ہوگا۔ تاہم، نیوٹن کی طرح لیبنز نے بھی غیر معلوم اور نسبتاً آسانی سے قابل تصدیق کے درمیان خط کھینچنے کا جدید انداز نہ اپنایا۔ لیبنز کو ساری زندگی الکیمیا میں گہری دلچسپی رہی۔ اور اس کے بارے میں کچھ جاننے والے لوگوں کو توقع ہے کہ وہ مغرب کے ان چند افراد میں سے ایک تھا جنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں I Ching کی تحقیق کی۔

عدم اطمینان اور لاچارگی کے احساس کا شکار، گٹھیا میں مبتلا اور خفیہ نگرانی میں رہنے والا لیبنز جب فوت ہوا تو اس کے جنازے میں ہانوور دربار کا ایک بھی آدمی شریک نہ تھا۔ وہ کنجوس، لالچی، بہت سے شعبوں میں متحرک، عام لوگوں کی پہنچ میں اور اقتدار سے محبت کرنے والا تھا...... اور وہ نیوٹن کی استثنٰی کے ساتھ اپنے عہد کا بہترین ذہن بھی تھا۔ اس نے شادی نہ کی، اور کہا جاتا ہے کہ اس نے 50 برس کی عمر میں رشتے کی بات چیت چلائی لیکن فوراً ہی ارادہ ترک کر دیا، ''اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔'' وہ مسحور کن یا شائستہ شخصیت نہ تھا، لیکن سماجی سطح پر امتیاز حاصل کرنے کے لیے اپنی فوقیت اور ''عظمت'' پر انحصار کیا۔ اس کے بارے میں کوئی تاریخی ناول نہیں لکھا گیا۔ وہ تنہائی میں مرا اور آج بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کی سوانحات بہت سنگدلانہ ہیں۔

لیبنز کا مابعدالطبیعیاتی نظام اب ہماری دسترس میں ہے۔ آج ہم اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ اس نے ''حقیقت'' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ غیر مادہ monads کی ایک مخصوص تعداد پر مشتمل ہے۔ monads کا مطلب ناقابل تقسیم اکائی، جوہر واحد، وجود کی آخری اکائی بھی جانے والی قطعی مابعدالطبیعی ذات ہے۔ حقیقت کی یہ تعریف سترھویں صدی میں حقیقت کی تین اہم توضیحات میں سے ایک ہے۔ ڈیکارٹ نے دو اور سپینوزا نے ایک جوہر کو مانا، جبکہ لیبنز لامحدود تعداد پر یقین رکھتا تھا جن میں سے خدا ذہین ترین ہے۔ اس کا پیچیدہ فکری نظام کچھ حوالوں سے باطنی یا kabbalistic تصورہائے حقیقت سے مشابہت رکھتا ہے، اور الکیمیا میں اس کی دلچسپی کے پیش نظر آپ سوچتے ہیں کہ وہ ان معاملات کے ذریعہ کتنا با اثر ثابت ہوا۔ کپلر اور نیوٹن نے اتنا اثر قبول کیا کہ انہیں آج بھی اس بات پر برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اور ان کے سوانح نگاروں کو ''توہم پرستی'' اور سائنس کے درمیان ایک مصنوعی خط امتیاز کھینچنا پڑا۔ لیکن زیادہ بہتر سوچ رکھنے والے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ''توہم پرستانہ عقائد'' کے بغیر سائنسی کامیابیوں کا حصول ناممکن ہوتا۔ ایلفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ نے قرار دیا کہ لیبنز غیر معمولی تھا کیونکہ اس نے ڈیکارٹ اور نیوٹن کے پیش کردہ سوالوں کے علاوہ ''ایک اور سوال کا جواب'' بھی دیا: اس نے ''وضاحت کی کہ ایک ایٹم بننا کیسا ہوگا۔'' شاید یہی نظریہ جوہر واحد (monadology) ہے۔

لیکن لیبنز کے خیالات میں سب سے اہم بات غالباً یہ تھی کہ انہوں نے اعتقادات کے بارے میں طویل عرصے سے تسلیم شدہ مفروضوں کو چیلنج کر دیا۔ بیشتر فلسفی ان اعتقادات کے حامل تھے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ انسان آزادانہ انتخاب کے قابل نہیں ہیں۔ فرانسیسی ماہر دینیات ArnauldAntoine (1612ء تا 1694ء) نے ایک دوست کے نام خط میں لکھا کہ اس نے لیبنز کے غور و فکر میں اتنی بہت سی خوفزدہ کرنے والی چیزیں دیکھی ہیں کہ ان کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ انسان ان چیزوں کو مسترد کر دیں گے۔ لیبنز نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات کے مطابق ہی فرد کی وضاحت کی تھی۔ یہ بذات خود ایک غناسطی مسلک سے قریب تر ہے، کیونکہ اس کی رو سے خود خدا بھی، خالق ہونے کے باوجود اپنے کیے ہوئے کام کو منسوخ کرنے کی آزادی نہیں رکھتا۔

46

افکار

"*Pensées*"

پاسکل

1670ء

میں ڈیکارٹ کو معاف کر دوں گا۔ وہ اپنے تمام فلسفے میں خدا کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ترک کرنے پر تیار ہے۔ لیکن وہ خدا کو یہ رعایت نہیں دے سکا کہ وہ انگلی لگا کر دنیا کو حرکت میں لا سکے۔ اس کے علاوہ اسے خدا کی

مزید کوئی ضرورت نہیں۔

ریاضی دان، سائنس دان اور Jansenist ماہر الٰہیات بلیز پاسکل (Blaise Pascal) کا ایک قول بہت مشہور ہوا: ”دل کی اپنی دلیلیں ہیں جن کے بارے میں منطق کچھ نہیں جانتی۔“

وہ کہہ رہا تھا کہ ڈیکارٹ نے اپنے فلسفے میں نہایت اہم نفسیاتی مسائل کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن یہاں پروفیشنل فلسفیوں، بالخصوص سچائی کے پر عزم فکری نظاموں کے مبلغین کے لیے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ بات بین طور پر درست ہے۔ یہ سوال ہر لحاظ سے بجا ہے کہ فلسفی، منطق، خالص منطق کے پیروکار اسے کس طرح اپنے اندر سمو سکتے ہیں؟ فلسفی لوگ شاعر یا ناول نگار نہیں ہوتے، اور چند نہایت باضمیر اور ممتاز فلسفیوں کے ثبوتیت پسند عقائد شاعری کو لایعنی اور بے عقلی قرار دیتے ہیں۔ جب اہم آسٹریائی ریاضی دان اور فلسفی ایڈمنڈ ہسرل (جس پر ولیم جیمز اور ژاں پال سارتر کے ضمن میں بات کی گئی ہے) نے شعور میں شامل اجزاء کے سوال سے ایک خالصتاً سائنسی انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کیا تو اس کا اپنا بے لچک اور حیرت انگیز حد تک غیر جذباتی طریقۂ کار جلد ہی وجودیت کی ایک بنیاد بن گیا...... فلسفے کی تاریخ میں وجودیت واحد ایسے نظام فکر کا نام ہے جو جذبات کو سب سے زیادہ جگہ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں نے اسے فلسفے کا درجہ دینے سے انکار کر دیا۔ پاسکل نے اس انداز کی پیش بینی کر لی تھی جو ہسرل کے فلسفۂ مظہریت (Phenomenology) نے اختیار کرنا تھا۔

تاہم، وجودیت سے قطع نظر، بیسویں صدی میں صرف ولیم جیمز اور ہیلفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ اور چند انہی جیسے افراد کے فلسفوں نے ہی شاعری میں پیش کیے جانے والے معاملات سے نمٹنے کی سنجیدہ کوشش کی۔

یقیناً منطق کی بھی اپنی دلیلیں ہوتی ہیں، لیکن دنیا کی موجودہ صورتحال میں کیا دل بھی منطق سے اتنا لاعلم ہے جتنی منطق دل سے؟ اگر ہم متوازن مخلوقات ہوتے تو سب ٹھیک ہو سکتا تھا۔ لیکن عمومی طور پر ایسا نہیں ہے اور ہماری سائنسی کاوشیں ہمارے مبہم اور گہرائی تک پھیلے ہوئے مذہبی احساسات کے ساتھ کسی بھی طرح توازن نہیں رکھتیں۔ مذہبی احساسات ہمارے لیے اتنے ہی پرکشش ہیں جتنے وہ خالص منطق کی نظر میں غیر منطقی ہیں۔ بیرونی دنیا کو عموماً غیر منطقی

اصولوں پر گامزن سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مفروضے کے بارے میں کوئی شک پیدا نہیں ہوتا کہ جس کائنات میں ہم زندہ ہیں وہ محض اتفاقاً وجود میں آئی ...... یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ پاسکل اتفاق اور اس کی نوعیت کے متعلق بہت سے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا (وہ نظریہ احتمال یا probability کے بانیوں میں سے ایک تھا)۔ وہ نہ تو بنیاد پرست بنا اور نہ ہی بے وقوفانہ انداز میں داخلی حقیقت سے انکار کیا۔

دل درد کی تمام اقسام کو جانتا ہے، لیکن منطق کو درد کے ساتھ نمٹنے یا اسے بیان کرنے کا طریقہ نہیں معلوم۔ لوگوں نے توقع کی ہے کہ وہ جس خدا کی بھی پرستش کرنے پر آمادہ ہوں گے وہ ''عدل پسند'' ہوگا، لیکن یہ سوال بھی کافی زیادہ گنجلک ہے۔ چنانچہ بلیز پاسکل کی ''سوچیں'' (یا ''افکار) پر بہت غور و خوض کیا گیا۔ ان میں سے متعدد کا تعلق ہم سب کے داخلی تجربے کے ساتھ ہے۔

افلاطون اور ارسطو (جن دونوں نے ہی شاعری کو جگہ دی) سے ہی فلسفے کا عمومی رجحان مذہب کو نظر انداز کرتا رہا ہے۔ نتیجتاً شاعری پر بھی زد پڑی۔ اپنے بعد کے ولیم جیمز کی طرح پاسکل بھی مسئلے کے ساتھ براہ راست نبرد آزمائی کرتا ہے۔ اور جیمز کی طرح وہ بھی جنگ عالم دوم کے بعد کی وجودیت پسند تحریک کا نقیب ہے۔ پاسکل ایک سائنسدان، نہایت کامیاب ریاضی دان، اور ''اتفاق'' کے مفہوم پر تحقیق کرنے والا عظیم ترین شخص بھی تھا۔ اس نے منطق کی بالادستی کو مسترد کیا۔ سورین کیر کیگارڈ جیسے قبل از وجودیت فلسفیوں نے اس کا گہرائی میں مطالعہ کیا تھا، اور تقریباً سبھی فلسفیوں نے اس کا احترام کیا۔

پاسکل 1623ء میں کلیر مونٹ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا باپ Etiema تعلیم کے بارے میں غیر معمولی خیالات رکھتا تھا اور اس نے بیٹے کو خود پڑھایا۔ اس نے پاسکل سے ریاضی کی تمام کتابیں لے لیں، لیکن اس نے دیکھا کہ (تقریباً بارہ سالہ) لڑکا اس میں خود ہی دلچسپی لینے لگا تھا۔ باپ پچھتایا اور اسے یوکلیڈ کی ایک کاپی دی۔ مذہبی تجربے کے باعث عیسائیت کے ساتھ خصوصی لگاؤ پیدا ہونے اور 1654ء سے پہلے پاسکل نے سائنس اور ریاضی کے میدان میں کئی نمایاں کام انجام دے دیے۔ اس نے تب تک کی دوسری کیلکولیٹنگ مشین بنائی۔ اس نے مخروطی

سیکشنز (Conic Sections) پر قابل قدر کام کیا۔ اس کے تجربات بیرومیٹر (ہوا پیما) کی ایجاد پر منتج ہوئے۔ اس نے احتمالیت کی نہایت اہم سائنس کی بنیاد رکھی۔ اس معاملے میں اس نے دل کی دلیلوں کو اپنی توجہ منتشر کرنے کی اجازت نہ دی۔ پاسکل کی ''پہلی تبدیلی مذہب'' 1646ء میں اس وقت ہوئی جب وہ Jansanists سے ملا۔

کارنیلیس اوٹو جانسین (1585ء تا 1638ء) کی ''Augustinus'' کی بنیاد پر علیحدہ مسلک اختیار کرنے والے جانسینیوں کو آج بھی اکثر ''کیلونسٹ کیتھولکس'' کہا جاتا ہے (جو کہ قابل توجیہہ مگر گمراہ کن ہے۔) اس دور کے کیتھولک کلیسیا میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دینے والی جانسینی تحریک 1800ء میں تقریباً مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ جب جانسین ازم ایک مذہبی تحریک کے طور پر اپنے عروج پر تھی تو اس کا مرکز پیرس کے قریب پورٹ رائل کے مقام پر Cistercian راہبات کی خانقاہ (کانوینٹ) تھا۔ 1664ء کے بعد اس برادری کو اذیتوں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاسکل کی ایک بہن جیکولین نے 1652ء میں جانسین ازم قبول کیا۔ نومبر 1654ء میں پاسکل نے اپنی ''حتمی تبدیلی مذہب''، ''اپنے'' وجدان'' کا اعلان کیا جس کی تفصیل وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ آٹھ سال بعد اس کی موت معدے کے السر کے باعث ہوئی۔

جانسین ازم اور کیلون ازم کے درمیان تعلق صرف گمراہ کن ہے کیونکہ اول الذکر انسان کے مردود ہونے پر خصوصی سادیت پسندانہ اصرار نہیں کرتا، جبکہ کیلون کے ہاں یہ چیز واضح ہے۔ جانسین ازم کو آگسٹائن ازم کا احیاء تو کہا جا سکتا ہے۔ یہ یاسیت پسندانہ تھا مگر ظلم پسندی کے بغیر۔ جانسین ازم نے اس بات کو اپنی بنیاد بنایا کہ خدا کی ''خصوصی رحمت'' کے بغیر اس کے احکامات پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ یسوعیوں کے خلاف دشمنی نے تحریک کو متحد ہونے میں مدد دی، اور اسی دشمنی کے پس منظر میں پاسکل کے اپنے اخبار Letteres provinciales (1656ء تا 1657ء) اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ان نظریات پر حملہ کرتا ہے جن کی تعلیم آرتھوڈوکس کیتھولک کلیسیا آج بھی دے رہا ہے: یعنی خدا نے اپنی رحمت کے ذریعہ انسانی تعاون کی پیش بینی کر لی تھی، اور کسی فعل کی گنہگاری کے معاملے میں قانون یہ ہے کہ انسانی آزادی کو تسلیم کیا جائے۔ اپنے ساتھی جانسینیوں کی طرح پاسکل نے بھی کٹر اخلاقی جوش اور ابتدائی کلیسیا کی درشتی کے ساتھ ان

عقائد کی مخالفت کی۔ ان کے خیال میں یہ یسوعی تسہیل پسندی تھی جس نے جانسینیوں کو بہت زیادہ توانائی اور قوت دی۔ پاسکل کی Pense'es ان خیالات کی عکاس ہے۔

وہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی موجودگی کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ چنانچہ انسانی ناخوشگواری وہی ہے جو کوئی جواری کھیل کے نتیجے پر محسوس کرتا ہے۔ ''یہاں منطق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔'' لہذا پاسکل اصرار کرتا ہے کہ رومن کیتھولک ازم کی سچائی کے امکان پر داؤ لگانا چاہیے۔ اگر ہم جیت گئے ہمارے سامنے دائمی مسرت کی زندگی ہوگی۔ اگر ہم ہار گئے تو کوئی ایسی چیز نہیں کھوئیں گے جو آج تک ہمارے علم میں ہے۔ تاہم، اگر ہم نے اس کے برعکس داؤ لگایا تو دائمی عذاب کی زندگی جھیلنا پڑے گی۔

جذباتی لحاظ سے اس دلیل کی طاقت ناقابل انکار ہے۔ لیکن اس کی ایک مہلک کمزوری سارا بھید کھول دیتی ہے: پاسکل بدقسمتی سے ہمیں صرف رومن کیتھولک ازم یا کچھ بھی پیش نہیں کرتا۔ تاہم، وہ یقیناً ہمیں اسلام، بدھ مت، یونانی مذہب اور بے شمار دیگر صداقتوں کی پیشکش بھی کر سکتا تھا۔ درحقیقت داؤ لگانے کا یہ تصور خود پاسکل کا نہیں بلکہ اسلام کا ہے۔

''Pense'es'' بحیثیت مجموعی اس غلط استدلال کے مقابلے میں کہیں اعلیٰ اور برتر ہے۔ لیکن یہ غلط استدلال بھی ایک لحاظ سے اہم ہے: یہ ہمارے مذہبی پن کے لیے ایک صوابدیدی (نہ کہ مشہودہ یا evidential) استدلال پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اور چونکہ عملی لحاظ سے یہ دل کو پاسکل کے خدا کے ساتھ گفتگو کی جانب مائل کر سکتی ہے۔

منطق کے حوالوں سے پاسکل کی یہ مشہور دلیل بے وقعت سہی، لیکن جذباتی پہلوؤں کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔

پاسکل متکبر اور خود پسند تھا، اور وہ نہ صرف بیماری اور تکلیف کا شکار رہا بلکہ مذہبی تشکیک نے بھی اسے عذاب میں مبتلا رکھا۔ اس نے اپنے دور میں جوا بازی کی اور ایک بے مہار زندگی گزاری (ہم یہ نہیں جانتے کہ کتنی ''بے مہار'' لیکن زندگی کا یہ دور دو سال سے زیادہ کا نہیں تھا) اس کی نوٹ بکس (جن میں سے Pense'es کو مرتب کیا گیا) ایک ایسے آدمی کی داخلی حالت بیان کرتی ہے جو زندگی کی تمام صورتوں کے متعلق نطشے یا کیرکیگارڈ جتنا ہی بہتر طور پر جانتا تھا۔ اس

کا فلسفہ نظر ''Pense'es'' کے تیسرے باب میں ملتا ہے:

> احساسات کی بنیاد پر مشاہدہ کرنے والے لوگ استدلال کے عمل کو نہیں سمجھتے، کیونکہ وہ پہلی نظر میں ہی سمجھ لیتے ہیں اور اصولوں کے لیے جستجو کرنے کے عادی نہیں۔ اس کے برعکس استدلال کے عادی حضرات جذباتی معاملات کی بالکل بھی تفہیم نہیں رکھتے۔ وہ اصول تلاش کرتے رہتے ہیں اور ایک نظر دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔

لیکن آگے چل کر وہ بتاتا ہے کہ لوگوں کو محسوس کس طرح کرنا چاہیے۔

> تمام چیزیں لاشئے سے آئیں اور لامحدود کی طرف جا رہی ہیں۔ ان پرشکوہ عوامل کا تعاقب کون کرے گا؟ ان حیرتوں کا خالق انہیں سمجھتا ہے۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ان لامحدودیتوں پر غور و فکر کرنے میں ناکامی کے باعث انسان فطرت کے مطالعے کی جانب بڑھے۔ یہ بات عجیب ہے کہ انہوں نے چیزوں کی ابتداء کو سمجھنے کی کوشش کی، اور نتیجتاً کل کے علم تک پہنچے۔

اس کی تردید مشکل ہے۔ درحقیقت پاسکل کو پڑھتے وقت اکثر ہمارے وہ مذہبی جذبات بیدار ہو جاتے ہیں جنہیں ہم نے دانستہ طور پر چھپایا دبا دیا ہے۔ اچھے مذہبی جذبے کو سمجھنے کے لیے پاسکل کو ایک نہایت ذہین رہنما کے طور پر پڑھنا ہوگا۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوال کرتا ہے کہ ''ہم یہاں کیوں ہیں؟''...... اور یہ کہنا محض ایک جوا کھیلنے کے مترادف نہیں کہ ہر شخص کو (چاہے وہ تسلیم کرے یا نہ) اس سوال کا سامنا ہے۔ اس کے پیراڈاکسز ہمیں انگیخت دلاتے ہیں: ''انسان دریا کے کنارے اگی ہوئی گھاس ہے، وہ فطرتاً سب سے کمزور ہے، لیکن وہ سوچنے والی گھاس ہے۔'' ''انسان نہ فرشتہ اور نہ درندہ ہے، اور بدقسمتی یہ ہے کہ فرشتے کے طور پر عمل کرنے والا ہی درندے والے کام کرتا ہے۔''

47

اخلاقیات

"Ethics "

باروک دی سپنوزا

1677ء

اگر چہ سپنوزا کے کئی جلدوں پر مشتمل خطوط نے دنیا پر کوئی فوری اثر مرتب نہ کیا، لیکن سپنوزا (1632ء تا 1677ء) کو سمجھنے کے لیے "Correspondence" کا مطالعہ لازمی ہے جس کا انگریزی ترجمہ اے وولف نے 1929ء میں کیا۔ مثلاً ہنری اولڈنبرگ کے نام خطوط میں اس کی دی

ہوئی معلومات کے بغیر اس کا فلسفہ ہم پر زیادہ واضح نہ ہو پاتا۔ سپنوزا نے اپنے ساتھی منطق پسند لیبنز کی طرح نجی خطوط میں اپنے شاندار فلسفے کے بنیادی خدوخال بیان نہیں کیے تھے، لیکن یہ خطوط اس کے فلسفے پر قابل قدر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اصول ہیں۔ تاہم، اس کا شاہکار Ellics ہی اصل چیز ہے جس پر اس نے کئی برس کام کیا اور اس کی دیگر تصانیف کی طرح بعداز وفات شائع ہوا۔

سپنوزا نے اپنی سوچ کی خاطر کسر نفسی سے کام کیا: اس کی نجی زندگی کے بارے میں بہت کم تفصیلات میسر ہیں (مثلاً ہم یہ نہیں جانتے کہ اس نے جنس کے معاملے میں کیا کیا)۔ جو کچھ معلوم ہے وہ اس کے حق میں جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ''انسان کے لیے رحمت'' کی زندگی دریافت کرنا چاہتا تھا...... یعنی ایک مسلسل اور تمام ابدیت سے بالاتر مسرت۔ وہ آج فلسفیوں میں سب سے زیادہ محبوب اور محترم سمجھا جاتا ہے۔

سپنوزا (افلاطون، ہیوم اور کانٹ کی طرح) فلسفیوں میں نمایاں نظر آتا ہے: بمشکل ہی کوئی شخص اس رائے سے اختلاف کرے گا کہ وہ تمام تاریخ کے عظیم ترین چھ سات آدمیوں میں شامل ہے۔ حتیٰ کہ اس نے مبہم اصطلاح ''عظیم'' کو بھی ایک قسم کا مفہوم دیا۔

اگر چہ سپنوزا کے میٹا کل فلسفے کی نہایت عجیب وغریب تفسیریں کی گئی ہیں، مگر اس کا فیض دوسروں تک پہنچا۔ تبھی دل اور حقیقی، تجربیت پسند منطقی جان لاک کو بھی کافی مفید پایا گیا۔

باروک دی سپنوزا ہسپانوی النسل پرتگیزی Marranos کا بیٹا تھا (میرانو ان لوگوں کو کہتے ہیں جنہیں جبری عیسائی بنالیا گیا لیکن وہ چوری چھپے یہودی عقیدے پر ہی چلتے رہے)۔ اس کا باپ عدالت احتساب سے بچنے کے لیے اپنے ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ ایمسٹرڈم میں مقیم ہوئے اور وہاں کچھ تحفظ پایا۔ یہیں پر سپنوزا کا باپ ایک کامیاب تاجر بن کر ابھرا۔

باروک نے یہودی سکول میں داخلہ لیا اور وہاں یہودی تصوف اور یہودی وعربی دینیات دونوں کا بھرپور علم حاصل کیا۔ اس کے مرکزی اساتذہ میں سے ایک میرانو Manassah ben Israel تھا۔ اس ممتاز لبرل استاد کو اٹھارہ برس کی عمر میں ربی نامزد کیا گیا تھا اور بعدازاں اس نے یہودیوں کی انگلینڈ واپسی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ابراہام ہیریرا نے سپنوزا کو قبالہ سے متعارف کروایا جس سے وہ بہت متاثر ہوا۔

کیلونسٹ فادرز کو ان کے قابل احترام ہونے کی یقین دہانی کرانے کے خواہشمند یہودی حکام نے جب سپنوزا کو رشوت، وعدوں اور پھر دھمکیوں کے ذریعہ آزاد خیال اور کثرت پرستانہ خیالات ترک کرنے پر مائل کرنے کی کوشش کی تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس نے انکار کیا اور دین بدر ہوا۔ یہ بلاشبہ کسی مفکر کی امتیازی علامت ہے۔

وہ اپنی کوئی تحریر شائع ہونے سے پہلے ہی فلسفیوں اور دانشوروں کے درمیان مشہور ہو گیا، لیکن وہ اپنی زندگی میں ہی ایک "ملحد" کے طور پر اس قدر بدنام ہو گیا تھا کہ اپنی صرف دو تصانیف شائع کر سکا: ڈیکارٹ کے فلسفہ پر ایک کتاب، اور پھر 1670ء میں Tractatus Theologico-Politicus جو اس کے نام کے بغیر اور کسی اور جلد میں منظر عام پر آئی۔ اس پر زبردست لعن طعن ہوئی کیونکہ اس نے آزاد خیالی اور مکمل رواداری کی بات کی تھی۔ اس میں پہلی مرتبہ صحائف کو بطور تاریخی دستاویزات بیان کیا گیا۔ چنانچہ سپنوزا بائبل کے جدید منطقی مطالعہ کا بانی بھی ہے۔ اس نے عیسیٰؑ کو محض عظیم عبرانی پیغمبروں میں سے آخری خیال کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ بائبل کی زبردست اخلاقی قدر و قیمت کی جانب بھی اشارہ کیا۔ اس تصنیف میں بھی وہ تھامس ہوبز سے بہت زیادہ متاثر تھا؛ تاہم، اس کے سماجی رابطے کے نظریہ کو زیادہ آزادانہ اور جمہوری انداز میں واضح کیا۔ یہ کتاب منظر عام پر آنے کے دنوں میں ایک غضبناک ہجوم نے ہالینڈ کے روشن خیال حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس واقعے کی وجہ ان حکمرانوں کی "ملحدیت" پروری بتائی گئی۔ سپنوزا نے اس حماقت اور دیوانگی کے خلاف لکھا۔

سپنوزا نے زندہ رہنے کے لیے روزی روٹی کمانے کی خاطر لینز گرائنڈنگ (یعنی چشموں کے شیشے گرائنڈ کرنے) کا پیشہ اختیار کیا۔ شیشوں کی باریک گرد ہی اس کی تپ دق اور قبل از وقت موت کا سبب بنی۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی تھوڑی بہت مالی امداد لیتا رہا۔ 1673ء میں اس نے ہیڈل برگ میں فلسفہ کی نشست کی پیشکش مسترد کر دی کیونکہ اس کے خیال میں فلسفی کو خود مختار رہنا چاہیے۔ اس نے ملازمت کی پیشکش کرنے والے اسقف کو بتایا کہ وہ "اپنی سوچ کے مطابق" مطالعہ جاری رکھنا چاہتا ہے۔ درحقیقت اس کی ساری زندگی ہم خیال اور مختلف آراء رکھنے والے افراد کے ساتھ بحث مباحثے کے لیے وقف تھی۔ بلاشبہ یہ کسی فلسفی کے لیے آئیڈیل انداز

حیات ہے۔ لیکن اس نے آزاد سوچ کی بھاری قیمت ادا کی۔ اکثریت نے اسے گستاخ کافر اور خطرناک سیکولر خیالات کا حامل خیال کیا۔

تین عظیم منطق پسندوں (ایسے فلسفی جو تجربیت پسندوں کے برعکس یقین رکھتے تھے کہ منطق کی مدد کے بغیر اور حسی تجربے کے ذریعہ سچائی تک پہنچا جا سکتا ہے) میں سے سپنوزا سب سے زیادہ مربوط ہے۔ دیگر دو عظیم منطق پسند لیبنیز اور ڈیکارٹ تھے۔ وہ ڈیکارٹ کے ہاں ذہن اور جسم کی دو الگ حصوں میں تقسیم کو تسلیم نہ کر سکا۔ ذہنی اور طبعی واقعات کے درمیان علتی تعلق کی درست نوعیت کیا تھی، یا کیا ان کے درمیان کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں؟

سپنوزا نے اس تقسیم کو مسترد کر کے اس کی بجائے "جوہری واحدانیت" کا نظریہ پیش کیا...... یہ نظریہ کہ کائنات واحد جوہر یعنی خدا پر مشتمل اور خود انحصار ہے۔ ڈیکارٹ نے زور دیا تھا کہ لاتعداد جواہر موجود ہیں، لیکن سپنوزا نے اصرار کیا کہ ہر "انفرادی" چیز محض حقیقت واحد کا ایک ٹکڑا یا حصہ ہے۔ ہم اس کے بارے میں سوچ سکتے، اس کا ادراک حاصل کر سکتے اور اس کی موجودگی کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ سپنوزا کے خیال میں کسی طبعی چیز کو ذہنی اور ذہنی چیز کو طبعی حوالوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نظر میں سوچ ایک اعلیٰ ترین جوہر ہے کیونکہ یہ چیزوں کی طبعی وسعت "جانتی" ہے، جبکہ طبعی حالت کو سوچ کا علم نہیں ہوتا۔

تجربیت پسندوں کے برخلاف سپنوزا حسی ادراکات کو زیادہ اعلیٰ نہیں سمجھتا تھا۔ پاک صفت جان لاک نے زبور کی تلاوت سنی اور دو رنگی اختیار کرتے ہوئے خدا پر یقین کے لیے منطق پسندانہ توضیحات کو برقرار رکھا، لیکن فلسفے میں ایک تجربیت پسندانہ راہ پر چلتا رہا۔ اس سے پہلے کے سپنوزا نے حسی ادراکات کو "ناکافی" خیال کیا: وہ گڑبڑ کا شکار ہیں کیونکہ ہم خارجی دنیا کو غیر کامل انداز میں دیکھتے ہیں...... یعنی اپنے جسم میں ہونے والے عوامل کے مطابق۔

تاہم، ہر ہستی، ہر محدود شے اپنے اندر کاملیت کی جانب بڑھنے کی ایک خواہش اور تمنا رکھتی ہے۔ (سپنوزا کے خیال میں صرف کائنات ہی لامحدود ہے)۔ اس تمنا یا خواہش کو وہ Conatus کہتا ہے۔ اس کی ایک مفید طبعی مثال موجود ہے: اگر جسم میں زہر داخل ہو تو وہ اسے باہر نکالنے کی اپنے طریقے سے خودرو کوشش کرتا ہے۔ جسموں کو اسی طرح بنایا گیا ہے۔

یہی کچھ روح کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہر فرد کے روحانی پہلو میں برے افعال انجام دینے کے نظریات، خیالات اور حتیٰ کے خواہشات کو مسترد کرنے کی ایک فطری ضرورت موجود ہے۔ ہم نے اپنے اندر خود کو سچے انداز میں سمجھنے کی ایک ضرورت اور حتیٰ کہ استعداد پیدا کی ہے۔

سپینوزا کے لیے بصیرت کا واضح پن اپنی مخصوص امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ اور اس کا تجربہ کرنے والا انسان جان لیتا ہے کہ اس سے پہلے اس کی سوچ اور بصیرت غیر واضح اور دھندلی تھی۔ تب ذہن اپنے جانے مانے نکتۂ نظر کو مسترد کر کے حقیقت کی زیادہ منطقی جستجو اختیار کرتا ہے۔ وہ ''اخلاقیات'' میں لکھتا ہے: ''سچے نظریے کا حامل شخص جان لیتا ہے کہ وہ سچے نظریے کا حامل ہے۔''

تمام صوفیوں میں سب سے زیادہ منطق پسند سپینوزا یقین رکھتا تھا کہ بصیرت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا تعلق ہماری جذباتی زندگی کی پیچیدگیوں سے ہے۔ ہمارے احساسات غیر کامل اور خالصتاً اپنی تمناؤں کا عکس ہیں جو ہمیں الجھن میں مبتلا رکھتے ہیں۔ یہی ہمیں نہایت ناخوش بھی بنا دیتے ہیں۔ ''اپنے جذبات کا شکار شخص خود پر مختار نہیں ہوتا بلکہ اتفاق کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔'' یقیناً وہ سچے اور موزوں جذبات کی طاقت سے انکار نہیں کر رہا، بلکہ محض ہمارے اپنے جذبات کی نوعیت کو مسترد کر رہا ہے جو کہ زیادہ تر منفی یا حیاتی ہوتے ہیں۔ ابتدائی تدارک جذبات کی اصل وجوہ کو دریافت کرنے میں مضمر ہے: مثلاً کیا ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم کسی شخص سے ''محبت کرتے ہیں'' جبکہ درحقیقت ہم محض اس کی حرص کرتے یا اسے اپنے اختیار میں لانے کے خواہشمند ہوتے ہیں؟ اس اور دیگر لحاظ سے بھی سپینوزا کو بجا طور پر جدید نفسیات کا نقیب قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ہمیں قدیم تحریکوں، مثلاً Orphism، کے بارے میں یاد دلاتا ہے جن میں ایک چیز مشترک تھی...... ان کا یقین تھا کہ ریاضی کا استدلال انسان کو خدا کی جانب رفعت دیتا ہے۔ سپینوزا بات کو بہت آگے تک لے جاتا اور کہتا ہے کہ چیزوں کے درمیان اپنا مقام سمجھنے کا مطلب خدا سے محبت کرنا ہے۔

سپینوزا کے روایتی نظریات رکھنے والے معاصرین کی نظر میں اس کا ایک جرم نظریہ وحدت

الوجود تھا (یہ اصطلاح Pantheism 1705ء سے پہلے استعمال نہیں ہوئی تھی۔) ہر چیز کے الوہی ہونے اور خدا اور فطرت میں مشابہت کا نظریہ شاعروں کے لیے ہی منظور کیا گیا، لیکن اب ایک حقیقی فلسفہ رائے دے رہا تھا کہ صرف واحد جوہر موجود ہے۔ نیز اس واحد جوہر یا خدا کی ''سوچ'' میں داخل ہو سکنے والوں کو ہی لافانیت عنایت ہوگی''۔

آج نظریہ وحدت الوجود یا ہمہ اوست زیادہ باعث دلچسپی نہیں۔ یہ ایک حقیقی معاملے کی بجائے محض لفظوں کا کھیل ہے۔ لیکن سپینوزا کا نکتۂ نظر ان لوگوں کو پریشان کرتا ہے جو آگسٹائن اور اس کے پیروکاروں کی ظالمانہ روایت کے تحت سزا اور جزا دینے والے ایک قہار و جبار خدا کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ سپینوزا کا فلسفہ آج تک کے فلسفیوں کے زیر غور آنے والے معاملات پر ایک بحث یا بحث کا آغاز ہے، لیکن اس فلسفے کی سب سے زیادہ اہمیت (افلاطونی فلسفے کی طرح) اس امر میں مضمر ہے کہ اس نے قوانین کی ایک ایسی دنیا پر زور دیا جس میں انسان تکمیل اور اطمینان پا سکیں۔

48

زائر کی جستجو

" Pilgrim's Progress "

جان بُنیان

1678ء تا 1684ء

کیلون ازم کا ورثہ اس قدر نفرت انگیز نہیں تھا، اور نہ ہی ہو سکتا تھا، جتنا کہ اس کا بانی اسے بنانا چاہتا تھا۔ اس کی اپنی کاوش دوسروں سے ذاتی انتقام لینے کے جذبے سے داغ دار تھی۔ تاہم، جنیوا پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد کیلون نے اس قدر برے حالات دیکھے کہ "اسے اپنی

rekhta

نجات کا یقین ہو گیا۔"

دوسروں، مثلاً جان بُنیان پر کیلون ازم نے مختلف انداز میں اثر ڈالا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کیلون کی الٰہیات کو لفظی یا منطقی طور پر لیا جائے تو درست عقیدہ رکھنے کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا...... ہر چیز زمان سے باہر اور پہلے سے طے شدہ ہے؛ راست باز یا بدکار کا مسئلہ قابل بحث نہیں؛ نیک افعال کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ منظم اور با اصول حکومت کی ضرورت کے متعلق کیلون کے دلائل محض ایک جھوٹا نتیجہ ہیں۔ مورخین اور ماہرین الٰہیات نے کیلون کے پر اعتماد حربے کے متعلق زبردست دل جمعی کے ساتھ بات کی ہے۔ لیکن اس کا اثر بہت گہرا ہوا، حالانکہ کیلون ازم کے مرکزی اصول کو (یعنی زیادہ تر انسانی نسل کا مردود ہونا) بڑی احتیاط کے ساتھ نظر انداز کیا گیا۔ کوئی بھی شخص اس قسم کی بنیادوں پر کاروبار نہیں چلا سکتا تھا (یاد رہے کہ کیلون پسندوں کی نظر میں تجارت خصوصی اہمیت کی حامل ہے)...... بہتر ہے کہ اسے بھلا دیا جائے! ہاتھ آیا ہوا ایک ڈالر جھاڑی میں پڑے دس ڈالرز سے بہتر ہے...... بالخصوص جب وہ جھاڑی شعلوں سے لبریز جہنم ہو!

ایذا کا شکار راسخ جان بُنیان ایک کیلونسٹ عہد نامہ لکھنے بیٹھا مگر ایک لوک داستان "زائر کی جستجو" لکھ ڈالی...... یہ بیان قابل فہم مگر تھوڑا سا گمراہ کن بھی ہے۔ کیلون حقیقت میں یہ یقین نہیں رکھتا تھا کہ اس کے سوا زیادہ تر لوگ لعنت زدہ ہیں۔ Pilgrim's Progress اس حوالے سے بے معنی ہو گی۔ وہ 1648ء کے بعد شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہونے پر ہی اس یقین کا قائل ہوا۔ میرے خیال میں ہمیں اس کتاب کو کیلون ازم کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

لیکن کیلون ازم کے مرکزی مسلک نے ایک قطعی مختلف استعارہ مہیا کیا۔ بُنیان کے معاملے میں قابل ذکر بات اس کا اپنی نجات حاصل کرنے کا احساس تھا...... اپنے انداز حیات اور عقیدے کے ذریعے لوتھر کے ہاں یہ احساس متشدد تھا اور سادیت پسند کیلون کے ہاں Pathological یعنی مرضیاتی۔ لہٰذا شاعر کولرج کی بات ٹھیک تھی: بُنیان میں طبعی اور روحانی تجربے سے حاصل کیا ہوا ایک تخیل عقیدے کی تمام صورتوں سے ماورا ہے۔ ناول نگار جارج مور کے خیال میں "زندگی ایک

rekhta

گلاب کا پھول ہے جو عقیدے کی مٹھی میں کھلا جاتا ہے۔'' کوئی راہ دریافت کرنے والے انسان (جیسا کہ بنیان نے اپنی کتاب میں کیا) دیگر راہوں کی موجودگی کا امکان بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جان بنیان بیڈفورڈ کے قریب ایک گاؤں Elstow کے مقام پر 1628ء میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ لندن کے شمال میں کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ اس کا باپ پیوریطانی انداز فکر رکھتا تھا۔ بنیان نے گرامر سکول میں تعلیم حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں (1644ء) اسے بادشاہ چارلس اول کے خلاف خدمات کے لیے جبراً بھرتی کیا گیا۔ فوج سے چھوٹنے کے بعد اس نے شدید غربت کی حالت میں شادی کی۔ پھر (تقریباً 1648ء) میں وہ شدید مذہبی بحران سے گزرا۔ کیلونسٹ پس منظر رکھنے والے بہت سے دیگر افراد کی طرح اسے بھی اپنی نجات پر شک ہونے لگا۔

وہ اپنی پیوریطانی تعلیمات کی وجہ سے قید ہوا اور قید کے دوران ہی اس بحران کا روحانی حال "Grace Abounding to the Chief of Sinners" (1666ء) کی صورت میں لکھا۔ اگرچہ یہ تصنیف اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس کے زیادہ مشہور کام یعنی ''زائر کی جستجو'' جیسی ڈرامائی قوت اور چاشنی نہیں رکھتی۔ 1653ء میں وہ اس بحران سے نکل آیا۔ 1655ء کے بعد اس نے تبلیغ شروع کر دی۔ جب چارلس دوم 1660ء میں تخت نشین ہوا تو جان بنیان کو اس کی تعلیمات کی بنیاد پر قید کرا دیا گیا لیکن آئندہ اس سے باز رہنے کا وعدہ کرنے کی شرط پر رہائی قبول نہ کی۔ یوں اس نے بیڈ فورڈ کی جیل میں آتے جاتے اگلے بارہ سال گزارے (وہ مسلسل بارہ سال قید نہیں رہا تھا)۔ اس کی اپنی ہٹ دھرمی اور ایمانداری ہی رہائی کی راہ میں رکاوٹ تھی۔

1672ء میں جان کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ ''ڈکلیئریشن آف انڈلجنس'' کی شرائط کے تحت تبلیغ کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لندن واپس آنے پر وہ کم از کم 3000 افراد کو اپنی جانب راغب کر سکا۔ 1673ء میں جب ڈکلیئریشن منسوخ ہوا تو بنیان نے مزید چھ ماہ جیل میں گزارے۔ شاید اسی اچانک مایوسی کے احساس کے ساتھ اس نے ''زائر کی جستجو'' کا پہلا حصہ لکھنا شروع کیا جس نے 1679ء میں اپنی حتمی صورت اختیار کی (اشاعت اول میں Mr. Wordly Wiseman موجود نہیں تھا)۔ اندازہ ہے کہ اس نے کتاب کا ایک خاکہ کئی برس پہلے قید

کے دوران تیار کیا ہوگا۔ 1684ء میں جاری ہونے والا دوسرا حصہ عیسائی بیوی کے بارے میں ہے (بنیان نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی تھی)۔ اس حصے کا معیار پہلے جیسا نہیں۔ بعد ازاں بنیان بیڈفورڈ Separatist (علیحدگی پسند) کلیسیا کا پاسٹور بنا اور اپنی تبلیغ کی وجہ سے سارے بیڈفورڈ شائر اور پڑوسی علاقے کیمبرج شائر میں شہرت حاصل کر لی۔

بنیان کی آخری کتاب رومن کیتھولک کلیسیا پر ایک شدید حملہ تھی۔ جیمز دوم نے اسے ''عوامی اعتماد کا عہدہ'' پیش کیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ جیمز دوم انگلینڈ میں پاپائیت بحال کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ کچھ برس مزید زندہ رہتا تو معاشرے میں تبدیلی کا آغاز دیکھ لیتا۔ ولیم آف اورنج خود ایک کیلونسٹ تھا۔ ایک صدی سے بھی کم عرصے میں متعدد سرکردہ کلیسیائی باقی زور دے رہے تھے کہ جہنم میں ابدی اذیت کے تصور کو لغوی مفہوم میں نہیں لینا چاہیے......

''زائر کی جستجو'' ایک تمثیل ہے جس میں ثانوی مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی اصل طاقت استعاروں کے استعمال میں مضمر ہے۔

1623ء میں ماہر تعلیم والہیات جان آموس کومینسکی (1592ء تا 1670ء۔ اس چیک لکھاری کو ہم کومینیئس کے نام سے جانتے ہیں) نے The Labyrinth of the World and the Paradise of the Heart یعنی ''دنیا کی بھول بھلیاں اور دل کی جنت'' لکھی جو 1631ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس یاسیت پسندانہ تمثیل میں ایک ایماندار زائر عارضی دنیا کی سیاحت کرتا ہے۔ (اس کے گائیڈ مکار سیاستدان اور پادری ہیں جو اسے سراب دکھاتے ہیں لیکن زائر انجام کار عیسیٰ مسیح کو اپنے دل میں پاتا ہے۔ یہ تصنیف 1901ء تک انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئی تھی، اور بنیان نے یقیناً اس کے بارے میں نہیں سنا ہوگا۔ یہ ایک انمول شاہکار ہے لیکن ''زائر کی جستجو'' سے اس کی مشابہت بہت کم ہے۔ بنیان کی کتاب عام آدمی کی زبان میں ہے اور وہ صرف تمثیلی حربے استعمال کرتا ہے، جبکہ کومینیئس تمام ادبی ہتھیاروں سے کام لیتا اور اپنے دور کی سائنس اور آرٹ دونوں کو مدلل انداز میں مسترد کرتا ہے۔

''زائر کی جستجو'' ایک تشبیہاتی خواب ہے جس میں ایک عیسائی شہر تباہی سے آسمانی شہر کی جانب

سفر کرتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ادبی رنگ بھی موجود ہے حالانکہ جان بنیان ایسا نہیں چاہتا تھا۔ عام لوگوں پر اس کتاب نے گہرا اثر ڈالا۔ کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> اس دنیا کے ویرانے میں گھومنے پھرنے کے دوران میں ایک جگہ کچھ دیر رکا جہاں ایک کچھار تھی۔ میں ستانے کے لیے اس جگہ لیٹ گیا: آنکھ لگنے پر میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے خواب میں چیتھڑوں میں ملبوس ایک شخص کو ایک مخصوص مقام پر کھڑے دیکھا۔ اس کا چہرہ اپنے گھر کی طرف تھا، ہاتھ میں ایک کتاب اور کمر پر کافی بوجھ تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کتاب کھولی اور پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے وہ رو پڑا اور لرزنے لگا۔ اور مزید برداشت نہ کر سکنے پر وہ ماتمی انداز میں چلایا: ''میں کیا کروں؟

49

فطری فلسفہ کے ریاضیاتی قواعد

" Mathematical Principles of Natural Philosophy "

آئزک نیوٹن

1687ء

عہد استدلال کا بانی آئزک نیوٹن (1642ء تا 1727ء) ریاضی اور طبیعیات کی نسبت الکیمیا، غناسطیت، کہانت، جرمن صوفی جیکب بوہمے کی کتاب اور الہیات میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس پیراڈاکس نے سائنس کے بیشتر مورخین کو بے حد پریشان کیا اور اس کی اس قسم کی تصانیف کو نظر

انداز کرتے رہنے کی وجہ سے یہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔

عیسائی ماہرین طبعیات اور ریاضی دانوں کو بھی کچھ کم مشکل پیش نہ آئی: نیوٹن ایک لادین تھا۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ کلیسیا نے اس وقت غلط راہ اختیار کی جب اس نے یہ عقیدہ مسترد کر دیا کہ خدا نے عیسیٰ مسیح کو دنیا کی رہنمائی کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے بھی تخلیق کیا تھا۔

نیوٹن کا پیراڈاکس اس امر کے باعث اور بھی شدید ہو جاتا کہ اس کی طبعیات کے ذریعہ قائم ہونے والے علم کائنات نے ایک ایسی تعبیر کی حمایت کی جسے خود اس نے بھی مذہبی بنیادوں پر مسترد کر دیا تھا۔ نیوٹن نے اپنی یہاں مذکور کتاب میں ایک کٹر سائنسی تصویر پیش کی اور گلیلیو کی دریافتوں کی بنیاد پر وضاحت کی۔

نیوٹن بھی گلیلیو کی طرح یقین رکھتا تھا کہ ہمارے شمسی نظام کے سیارے سیدھے میں تھے اور پھر خدا نے انہیں مداروں میں متعین کیا۔ خدا نے ''سورج کی قوت کشش'' کو بھی دوگنا کر دیا۔ اس کی تھیوری ایک نہایت غلط نتیجے پر پہنچی۔ نیوٹن نے اپنی ذات کے دو قطعی متضاد، یعنی سائنسی اور ماورائی پہلوؤں میں مصالحت کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔ چنانچہ اس کے کام نے خدا کو کائنات کے مرکز سے نکالنے میں فیصلہ کن مدد دی، حالانکہ وہ خود بھی یقین رکھتا تھا کہ کائنات کا خوبصورت اور قابل تعریف نظام صرف خدا کی کاریگری کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔

نیوٹن 1642ء کی کرسمس کے روز انگلینڈ کے مشرقی ساحل پر لنکن شائر میں وولستھروپ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس نے ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور 1665ء میں طاعون کے باعث یونیورسٹی سے فراغت کے دوران اپنے اساسی سائنسی تصورات تشکیل دیے۔ غالباً زیادہ تر لوگوں کے خیال میں درخت سے سیب گرنے کی کہانی سچی ہے۔ بہرحال اس مشاہدے کے نتیجے میں اس نے سوچا کہ اسی قوت کے اثر سے چاند بھی کرۂ ارض کے گرد بیضوی مدار میں سفر کرتا ہے۔ اس نے خود لکھا کہ ان دنوں میں وہ نوجوان تھا اور ریاضی و فلسفے پر بہت زیادہ توجہ دیتا تھا۔ اس سے قبل اس نے مطالعے کا زیادہ شوق ظاہر نہیں کیا تھا اور حتیٰ کہ یوکلیڈ کو سمجھنے میں بھی کمزور تھا۔ اس کی عمر صرف 23 برس تھی۔

تن تنہا مطالعہ کے دوران نیوٹن نے سفید روشنی کا بھی مطالعہ کیا اور دریافت کیا کہ یہ بنیادی

رنگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کیلکولس تخلیق کی اور لیبنز کے ساتھ تنازع کا شکار ہوا۔ نیوٹن 30 سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی کیمبرج میں ریاضی کا پروفیسر بن گیا۔ بعد ازاں (1696ء) وہ شاہی ٹکسال کا وارڈن اور پھر مالک بنا۔ وہ 1703ء سے اپنی موت تک رائل سوسائٹی کا صدر رہا۔ 1705ء میں اس کو سائنسی کامیابیوں کی بجائے ٹکسال میں خدمات کی بنیاد پر نائٹ کا خطاب دیا گیا۔ اس کے زبردست مداح والٹیئر کے مطابق اسے ٹکسال میں ملازمت صرف اس وجہ سے ملی کیونکہ خزانچی لارڈ ہالیفیکس اس کی بھانجی کا عاشق تھا۔ معاملہ چاہے کچھ بھی رہا ہو لیکن وہ کرنسی کی اصلاح کے عمل کی نگرانی کرتا رہا۔

نیوٹن کی عمومی شہرت کی وجہ قوت کشش ثقل اور حرکت کے قوانین دریافت کرنا ہے۔ اس کے قوانین حرکت یہ ہیں: ہر چیز اس وقت تک ایک سیدھی لائن میں حرکت کرتی رہتی ہے جب تک کہ کوئی قوت اس کی سمت بدل نہ دے؛ کسی جسم کی رفتار اس پر لاگو کی گئی قوت کے تناسب سے ہوتی ہے؛ اور ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ پھر اس نے خدا کو بیچ میں لاتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم خدا کے ذہن کی اندرونی خلاء میں زندہ ہیں۔

لیکن یہ دلیل زیادہ متاثر کن ثابت نہ ہوئی اور نیوٹن کے سائنسی حاصلات میں نظر آنے والے رجحان سے بمشکل ہی میل کھاتی ہے۔ شاعر الیگزینڈر پوپ نے نیوٹن کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھا: ''فطرت اور قوانین فطرت تاریکی میں چھپے ہوئے تھے...... خدا نے کہا، اے نیوٹن وجود میں آ جا! اور سب کچھ روشن ہو گیا۔''

لگتا تھا کہ نیوٹن کے چند مگر نہایت زبردست قوانین کے ذریعہ طبعی دنیا کی وضاحت مکمل اور درست طور پر ہو گئی تھی، لیکن سائنس کے سوا دیگر شعبوں...... منطق، اخلاقیات، سماجی تنظیم...... کو قطعی بے ترتیبی میں چھوڑ دیا گیا۔ لاک، ہیوم اور حتیٰ کہ برکلے نے بھی نیوٹن کا گہرا اثر قبول کیا۔ لیکن شاید برکلے نے ایک حد تک دیکھ لیا تھا کہ نیوٹن کی کائنات بالکل درست نہیں تھی، اور نہ ہی سائنس اس پر ختم ہو جاتی تھی...... یہ تو بس ''مفید'' تھی۔ یقیناً یہ بہت زیادہ مفید تھی اور اب بھی کافی بہتر ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نیوٹن کی حرکیات اور اس کے لکھے ہوئے لاکھوں الفاظ کے درمیان ''بہت کم تعلق'' نظر آتا ہے۔ اشاعت سے محروم یہ الفاظ الکیمیا کے بارے میں تھے۔ وہ یقین

رکھتا تھا کہ ادنیٰ درجے کی دھاتوں کو قیمتی دھاتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ نیوٹن الکیمیا میں کس حد تک سنجیدہ تھا۔ ہمیں بس اتنا معلوم ہے کہ الکیمیا دولت کی جستجو نہیں بلکہ روحانی کاملیت حاصل کرنے کی کوشش تھی۔

شاید نیوٹن نجی سطح پر (اور تکبر کے بغیر) سمجھتا تھا کہ خدا نے اسے انسانیت کو کائنات کی نوعیت سے آگاہ کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ یا شاید اس پر ان قوتوں نے عمل کیا جن سے وہ آگاہ تو تھا لیکن انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ لازماً اپنی قائم کردہ آسمانی میکینکس کو بخوبی سمجھتا تھا۔ درحقیقت مخصوص حوالوں سے اس کی سائنس ثنویت پسندانہ تھی۔

اس نے کیپلر اور گلیلیو کا امتزاج پیدا کر کے آسمان اور زمین پر حاکم قوانین پیش کیے۔ اس نے والٹیئر جیسے لوگوں کی توحید کو ناگزیر بنا دیا۔ تاہم، وہ خود ایک نہایت باطنی تصوف میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ باطنی موضوعات پر نیوٹن کی تحریروں کا عام نہ ہونا، خود نیوٹن کا انہیں شائع کرنے سے خوفزدہ ہونا، ان پر زیادہ توجہ نہ دیا جانا یقیناً اس جیسے نمایاں سائنسدان کے شایانِ شان نہیں۔

نیوٹن ایک نہایت متجسس آدمی تھا۔ وہ پیدائش کے وقت اتنا کمزور تھا کہ اس کے زندہ بچنے کی امید ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے 85 برس عمر پائی۔ وہ ایک منکسر المزاج شخص تھا:

> ''میں نہیں جانتا کہ میں دنیا کو کیسا لگتا ہوں۔ لیکن اپنی نظر میں میں ساحلِ سمندر پر کھیلتا ہوا ایک لڑکا ہوں جو گاہے بگاہے کوئی زیادہ ملائم کنکر یا زیادہ خوبصورت سیپ ڈھونڈ لیتا ہے، جبکہ سچائی کا عظیم سمندر میرے سامنے غیر دریافت شدہ پڑا ہے۔''

''Principia'' کی اشاعت ماہر فلکیات ایڈمنڈ ہیلے (جس نے اپنے نام سے منسوب دمدار تارے کو دریافت کیا) کی مالی امداد اور ترکیب کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ اسے عام قاری کے لیے نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کے برعکس صرف ریاضی جاننے والے لوگ ہی اسے پڑھ سکتے ہیں۔ تمام لوگوں کے لیے اس کے درجن بھر آسان نسخے ("A Ladie's Newton" سمیت) شائع ہوئے لیکن چند ایک ہی کافی ثابت ہو سکے۔

تاہم، نیوٹن کنجوس اور کم ظرف تھا۔ اس پر مالی بدعنوانی کے الزامات بھی لگائے گئے جو غالباً درست نہ تھے۔ اس نے شاعری، آرٹ اور موسیقی کو حقیر جانا۔ کیلکولس کے دریافت کنندہ کے مسئلے میں اس کا رویہ بے ایمانی پر مبنی تھا: اس نے اس مسئلے کے بارے میں رائل سوسائٹی کی رپورٹ چوری چھپے خود ہی تیار کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے یہ دریافت لیبنز سے کچھ دیر پہلے کر لی، لیکن دونوں اپنے اپنے طور پر اس تک پہنچے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تھیوری کو پیش کرنے کے لیے لیبنز کا انداز زیادہ مفید تھا۔ افسوس کہ نیوٹن نے یہ اعلان کروانا چاہا کہ لیبنز نے اس کے خیالات کی سن گن حاصل کر کے ان پر کام شروع کر دیا تھا۔

نیوٹن نے شادی نہ کی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے کبھی جنسی نوعیت کے جذبات محسوس بھی کیے یا نہیں۔ 1693ء کے موسم بہار میں وہ کچھ عرصہ کے لیے مخبوط الحواس ہو گیا (تب اس کی عمر 51 برس تھی) اور تب کے بعد سے اس کا کردار متواتر انحطاط زدہ نظر آتا ہے۔ البتہ اس کی ''Optiks'' (1704ء) ''Principles'' کی نسبت کہیں زیادہ عام فہم ہے۔ اس کے ہر طرف قرمزی رنگ تھا...... صرف اور صرف قرمزی رنگ...... جو غضب اور وحشت کا رنگ ہے۔ تاریخ میں چند ایک افراد ہی اس جتنے اثر انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا جانشین البرٹ آئن سٹائن شاید ہمیں صرف اس لیے سمجھنے میں آسان لگتا ہے کیونکہ اس کا دور ہم سے زیادہ بعید کا نہیں۔ غالباً ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے: نیوٹن کی سائنسی دریافتیں اس کے مذہبی اعتقادات اور خیالات سے مکمل طور پر پاک نہیں تھیں۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں اور اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

50

انسانی تفہیم کے بارے میں مضمون

"Essay Concerning Human Understanding"

جان لاک

1689ء

انگریز جان لاک (1632ء تا 1704ء) عظیم فلسفیوں میں سب سے زیادہ قابل قدر اور غیر ممتاز ہے۔ اس کا اثر بہت زبردست رہا۔ اگر اسے سمجھنے میں اتنی زیادہ غلطی نہ کی گئی ہوتی تو اس کا

کئی حوالوں سے دشمن جارج برکلے اس کے فلسفے کو تباہ کرنے کی مہم میں کہیں زیادہ کامیاب رہتا۔ تکنیکی اعتبار سے لاک فلسفے کا ماہر نہیں تھا، لیکن وہ نہایت سمجھ دار ضرور تھا۔ ڈیوڈ ہیوم زیادہ بڑا فلسفی ہے کیونکہ اس کا طنزیہ انداز اس کی فکر کو ایک ایسی خصوصیت عطا کرتا ہے جو بہت سے شاعرانہ یا صوفیانہ معاملات پر لاگو ہوتی ہے...... اور اس کا فلسفہ ان معاملات کو انسانی معاملات سے الگ کرنے کا مشتاق ہے۔ لاک غیر شاعرانہ یا نثری (Prosaic) ہے۔ لیکن ہیوم نے لاک سے کافی کچھ لیا، اتنا کچھ کہ وہ اس کا ذکر کرنے کی ہمت نہ کر پایا۔

لاک کا ''Essay'' 1689ء میں شائع ہوا۔ اسے 29 پاؤنڈز معاوضہ ملا۔ لیکن یہ 1690ء کی بات ہے۔ 1689ء ''خونریزی سے عاری انقلاب'' کا سال تھا۔ لاک نے اس انقلاب کی وجود پر کئی سال تک کام کیا تھا۔

وہ 20 سے زائد برس تک ''Essay'' کو لکھتا اور اس میں ترمیم کرتا رہا، اور آخر کار جب اسے شائع کیا تو اس کی خامیوں سے بخوبی آگاہ تھا...... مثلاً تکرار اور عدم تسلسل۔ کسی کمتر فلسفی کے لیے یہ چیز تباہ کن ثابت ہوتی۔ اس نے کہا کہ وہ اسے مختصر کرنا چاہتا تھا۔ اس کتاب میں فرانسیسی فلسفی اور ڈیکارٹ کے نقاد پیئرے گاسینڈی (1592ء تا 1655ء) سے کافی کچھ مستعار لیا گیا ہے، لیکن لاک نے اس کا کوئی ذکر نہ کیا۔

سپینوزا یا گلیلیو کے برعکس لاک اکثر خوش قسمت ثابت ہوا۔ اس کی فکر اسی کے دور میں پھلنے پھولنے لگی۔ جب انگلش حکومتیں بنیادی نوعیت کی اصلاحات کے عمل سے گزر رہی تھیں تو وہ اپنے عروج پر تھا: بادشاہوں کے اختیارات منظم انداز میں کم کیے جا رہے تھے، مذہبی سوچ کی آزادی تسلیم کی جانے لگی تھی، اور ہر قسم کی مطلق العنانیت زد پر تھی۔ بالخصوص بیکن اور ہوبز نہایت مختلف انداز میں سائنسی طریقہ کار کی اہمیت منوا چکے تھے۔ لاک کے مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی ترقی کے تصور نے بھی مقبولیت حاصل کی۔

لاک برطانوی تجربیت پسند مکتبۂ فکر کا بانی ہے۔ جب یورپ کی استدلال پسندی نے اصرار کیا کہ صرف عام فہم تجربے کے ذریعے ہی علم حاصل کیا جا سکتا ہے تو برطانوی فلسفے نے اپنی راہ علیحدہ کر لی۔ ہیوم نے اس پر غور و خوض کیا لیکن لاک نے اسے بیکن اور ہوبز کی ایڑیوں پر قائم کر

دیا۔

یہ غیر مبہم پسند آدمی، جو زندگی بھر دمے کا مریض رہا، سمرسیٹ کی کاؤنٹی میں ایک وکیل کے گھر پیدا ہوا جس نے چارلس اول کے خلاف سول جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کی پہلی کتاب اولیور کروم ویل کا ایک گھٹیا شاعری میں قصیدہ تھا۔ وہ بعد میں بھی اسی قسم کی گھٹیا رومانی شاعری کرتا رہا..... لیکن کبھی شادی نہ کی۔ اس نے آکسفورڈ میں داخلہ لیا اور وہاں اس وقت پڑھائے جا رہے متکلمانہ فلسفے سے نفرت کی۔ تاہم، وہ خود کو کبھی بھی نظریۂ ''جوہر'' سے آزاد نہ کر پایا جو قرون وسطیٰ کے فلسفیوں نے ارسطو سے اخذ کیا تھا۔ قرون وسطیٰ کے عظیم فلسفیوں کے ہاں یہ اصطلاح شاید عمیق معنی رکھتی ہو، لیکن یہ معانی صرف ایک وسیع و عریض مطالعہ کے ذریعہ ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔

1665ء میں لاک کو آکسفورڈ میں ''اخلاقی فلسفہ'' کا استاد تعینات کیا گیا۔ اس نے خود کو طب میں اہل ثابت کیا اور زیادہ تجربہ نہ ہونے کے باوجود Shaftesbury کے ارل کا طبیب اور سیکرٹری بننا قبول کر لیا۔ اسی ارل کا پوتا بعد میں ایک انسان دوست اور فلسفی بن کر ابھرا (1671ء تا 1713ء)۔ اس نے لاک پر تنقید لکھی۔

لاک نے ارل کے جگر کا ایک پیچیدہ آپریشن خود تو نہ کیا لیکن اس کی نگرانی ضرور کی (1663ء) اور یوں عمر بھر کے لیے روزی روٹی کا انتظام کر لیا۔ اس نے کچھ عرصہ سفارتکاری اور سیاست بھی کی اور ہالینڈ میں جلاوطنی کے دن گزارے (جیمز دوم کے عہد حکومت میں)۔ جب ولیم آف اورنج نے برطانیہ عظمیٰ کا تاج و تخت سنبھالا تو اسے رہائی ملی۔ نئی حکومت نے اسے چھوٹے موٹے عہدے دیے۔ وہ اپنی ایک سابقہ شادی شدہ محبوبہ کے گھر میں فوت ہوا۔ یہ خاتون، لیڈی ماشم، اس کی سرپرست بنی۔ جب لاک اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا تو محبوبہ اسے زبور پڑھ کر سنا رہی تھی۔

لاک انگلش تجربیت پسندی کا بانی ہونے کے ساتھ ساتھ لبرل جمہوریت کے بانیوں میں سے بھی ایک ہے۔ یقیناً امریکی آئین میں اس کے خیالات کو جگہ دی گئی۔ اس کی سیاسی سوچ دو دیگر کتابوں میں موجود ہے: ''حکومت پر دو مقالے'' اور ''رواداری کے بارے میں مراسلہ''

Enquiry چار کتابوں میں ہے۔ پہلی کتاب میں لاک خلقی (Innate) تصورات کے خلاف۔ افلاطونی اور منطق پسندانہ نظریے پر حملہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی ذہنوں میں فطرت کا پہلے سے مہیا کردہ کچھ بھی نہیں ہے کہ جس پر سچائی کے مسلک قائم کیے جائیں۔ اس نے کہا کہ پیدائش کے وقت ذہن کورے کاغذ جیسا ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اس نظریے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ انسان اپنے اندر کوئی ''علم'' ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ کتاب دوم میں وہ اپنا تجربیت پسندانہ تھیسس پیش کرتا ہے کہ تمام خیالات تجربے کی پیداوار ہیں۔ اس حوالے سے اس کے خیالات اس قدر گنجلک ہیں کہ آج بھی ان کے قطعی مفہوم پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ کتاب سوم میں وہ زبان کی نوعیت بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کانٹ کی پیش بینی کرتے ہوئے نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارا تمام علم لازماً موضوعی ہے: کہ ہم حقیقت کے ساتھ نہیں بلکہ حقیقت کے بارے میں اپنے تصور کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس نے تجویز دی کہ ان معاملات میں خاموشی سے بیٹھ جانا چاہیے جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ کتاب چہارم میں وہ ایک تجربیت پسندانہ بنیاد پر ایک منطقی نتیجہ اخذ کرتا نظر آتا ہے۔

لاک اتنا غیر تندرست یا کاہل یا پھر دونوں تھا کہ صحیح معنوں میں فلسفی نہ بن سکا۔ بلاشبہ انسانی ذہن کے بارے میں اس کی رائے نے جدید نفسیات کے لیے ایک بنیاد مہیا کی، تاہم، اس بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ اصل میں اس کا مطلب کیا ہے۔ کیا ذہن کے بارے میں اس کا تجزیہ محض ایک دلکش فہم عامہ کے سوا کچھ بھی نہیں؟ یا کیا اس میں گہرائی موجود ہے؟ یا کیا فہم عامہ عمیق النظری سے اعلیٰ ہے؟ لاک نے اپنے سے چند سال بعد کے ہیوم کی طرح برطانوی فلسفے کو بہت سی فہم عامہ عنایت کی...... درحقیقت یسعیاہ برلن نے کہا تھا کہ اس نے ایک طرح سے یہ تصور ایجاد کیا، اور اس کا یہ دعویٰ کافی حد تک درست ہے۔

لاک اپنی عقلی تجربیت پسندی اور خدا پر اعتقاد کے درمیان مصالحت نہ کرا سکا، جیسا کہ بعد میں کانٹ کے ساتھ بھی ہوا۔ خدا یا کسی ماورائی ہستی پر ایمان بنیادی طور پر جذباتی ماخذ رکھتا ہے: لیکن لاک جذبے اور عقل کا اتحاد نہ کرا سکا، اور اسی لیے دکھا دیا کہ خدا پر ایمان کی بنیاد منطق اور استدلال میں ہے۔ تاہم، خدا پر ایمان ''منطقی'' نہیں ہو سکتا۔ لیکن لاک سے بہت زیادہ

متاثر برٹرینڈ رسل کے بقول، لاک پیراڈاکسز کے تحت آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے فہم عامہ والے تصور کی تہہ میں ایک نہایت بے قاعدہ مابعد الطبیعیاتی تصور بیٹھا ہوا ہے۔ وہ دو نا قابل مصالحت تصورات رکھنے کے باعث گڑبڑ کا شکار ہے: اول یہ کہ سائنسدانوں کی منطقی دنیا ہی حقیقی ہے، لیکن دوم یہ کہ خدا موجود ہے۔ البتہ سائنسدان یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ خدا موجود ہے۔ چنانچہ مورخین نے کارنیکس اور کپلر جیسے حضرات کی فکری باطنی بنیادوں اور امنگوں کو نظر انداز کر دیا۔

چنانچہ لاک بھی اس ''سائنس پرستی'' یا ''ثبوتیت پسندی'' ''مادیت پسندی'' کا کچھ حد تک ذمہ دار ہے جو آج دنیا کو تیزی سے برباد کر رہی ہے۔ آئرلینڈ میں لاک کے اصولوں کی روشنی میں تعلیم حاصل کرنے والے برکلے کا لاک کے کام کے نتائج سے خوفزدہ ہونا یقیناً بجا تھا۔ ہم ہیوم کو پڑھتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں چاہے اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوں یا اختلاف۔ لاک میں ہمیں بہت کم اقتباسات مسرت بخش محسوس ہوتے ہیں۔

تاہم، لاک نے بہت سا کاٹھ کباڑ صاف کر دیا اور ایک حد تک آزادی کو بھی منوایا۔ اس طرح اس نے Paine اور تھامس جیفرسن جیسے مفکرین کو تحریک دلائی۔ البتہ اسے ایک حقیقی لبرل قرار دینے والوں کو غربت کے تدارک کے لیے اس کی ''خوفناک'' تجاویز پر بھی غور کرنا ہوگا۔ وہ ذاتی سطح پر ہیوم یا سپینوزا کی طرح خراج عقیدت کا حق دار نہیں۔ غالباً وولٹیئر کے اس خراج عقیدت کا مستحق ہے جو اسے بہت احترام دیتا تھا:

> بہت سے فلسفیوں نے روح کی مہم جوئیوں کی کہانی لکھی ہے، لیکن اب ایک ولی ظاہر ہوا ہے جس نے زیادہ معتدل اور منکسر انداز میں اس کی تاریخ لکھی ہے۔ لاک نے انسانوں کے سامنے انسانی منطق اسی طرح پیش کی ہے جیسے کوئی ماہر عضویات انسانی جسم کی کارکردگی بیان کرتا ہے۔ وہ فزکس کی مشعل اٹھائے ہوئے توثیق کرتا ہے، لیکن وہ شک کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔

51

انسانی علم کے اصول

"The Principles of Human Knowledge"

جارج برکلے

1710ء، نظر ثانی 1734ء

جوناتھن سوفٹ اور سیموئل جانسن جیسے ہم عصروں نے جارج برکلے (1685ء تا 1753ء) کی ''موضوعی عینیت پسندی'' (Subjeitive Idealism) کو فہم عامہ کے خلاف ایک کج روگستاخی قرار دیا۔ لیکن اس نے کافی پہلے اپنی نوٹ بک میں ایک اندراج کیا تھا: ''متواتر مابعد الطبیعیات

وغیرہ کو بے دخل کرنا اور انسانوں کو فہم عامہ (عقل سلیم) کی جانب واپس لانا۔" چند ایک لوگ ہی برکلے کے اس نظریہ کو ہضم کرنے کے قابل ہوسکے کہ مادہ "وجود نہیں رکھتا۔"

درحقیقت برکلے کے فلسفہ کو کسی بھی دور کے فیشن کے مطابق نئی صورت دی جا سکتی ہے۔ آسٹریائی ماہر طبیعیات اور فلسفی ارنسٹ ماچ (1838ء تا 1916ء) سے شروع ہونے اور البرٹ آئن سٹائن تک پہنچنے والی جدید سائنس نے خود ثابت کیا کہ برکلے احمق نہیں تھا۔ لیکن اسے احمق سمجھنے والوں نے اس کے اس بیان پر کافی توجہ نہیں دی کہ

> واحد چیز جس کے وجود سے ہم انکار کرتے ہیں...... مادہ یا عارضی نوعیت کا جوہر ہے...... اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ بات چیزوں کی حقیقت سے توجہ ہٹا دیتی ہے تو وہ نافہم ہے...... ہم فطرت میں کسی ایک چیز سے بھی محروم نہیں ہیں۔

لہٰذا برکلے یہ نہیں کہہ رہا کہ ہر چیز ایک سراب ہے، اور ہم حقیقت میں محسوس کرتے، دیکھتے، سنتے، درد سہتے اور خوشی مناتے نہیں ہیں......

حقیقت کے "عام فہم" نکتہ نظر کے بارے میں برکلے کے دلائل خوبصورت ہیں: درحقیقت اس نے یہ تمام دلائل انگریز فرانسسکی فلسفی ولیم آف Ockham (1285ء تا 1349ء) کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں دیے۔

جانسن کی جانب سے برکلے کے "استرداد" کے ساتھ ہمدردی کرتے وقت ہمیں ایک اور غیر فلسفی کے الفاظ بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں: امریکی شاعر والٹ وٹمین نے حقیقت کی نوعیت کے متعلق ہمہ گیر انسانی بے یقینی یوں بیان کی:

> آہ، ظاہری صورتوں کا خوفناک شک
> اس بے یقینی کا شک کہ کہیں ہم سراب تو نہیں دیکھ رہے
> ہوسکتا ہے کہ میں جو چیزیں، جانور، انسان، پہاڑ اور چمکیلے پانی
> رات اور دن کے آسمانوں کے رنگ اور مختلف اشکال دیکھتا ہوں
> شاید یہ محض نظروں کا دھوکا ہو، اور حقیقت ہنوز غیر معلوم ہو۔

برکلے آئرلینڈ کے علاقے Kilkenny میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا آئرلینڈ میں بادشاہ چارلس دوم کی بحالی کے موقع پر گیا تھا۔ اس نے 1700ء میں ٹرینٹی کالج ڈبلن میں داخلہ لیا اور وہاں عموماً لاک کے اصولوں کی روشنی میں تعلیم حاصل کی...... کیونکہ 1688ء کے انقلاب اور اس کے فوراً بعد Enquiry کی اشاعت سے لاک دنیا بھر میں نہایت مشہور ہوگیا تھا...... اور یقیناً وہ شہرت کا دلدادہ تھا۔

1713ء میں جب برکلے پہلی مرتبہ انگلینڈ آیا تو اس کی مرکزی تصانیف شائع ہوچکی تھیں: An Essay Towards a New Theory of Vision (1709)، Principles (1713ء) اور Three Dialogues between Hylas and Philonus جس میں اس نے مادے کے متعلق اپنے نظریات بیان کیے۔ متعدد دیگر فلسفیوں کی طرح اس نے بھی اپنے بنیادی خیالات نوجوانی میں ہی تشکیل دے دیے تھے۔

برکلے نے 1728ء میں شادی کی اور 1734ء میں آئرلینڈ میں Cloyne کا بشپ بنا۔ ان دونوں واقعات کے درمیان چھ برس میں سے اس نے تین امریکہ میں گزارے۔ وہ وزارت کے لیے مختلف نسلوں کے آدمیوں کو تربیت دینے کی غرض سے برمودا میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اس منصوبے کے لیے ہاؤس آف کامنز کی وعدہ کردہ رقم وصول نہیں ہورہی تھی لہٰذا وہ 1732ء میں واپس آگیا۔ تاہم، وہ امریکہ میں (بمقام نیوپورٹ) اپنے لیے تعمیر کردہ نئے گھر کو چھوڑ آیا اور کولمبیا یونیورسٹی کا پہلا پریذیڈنٹ، فلسفی سیموئیل جانسن (انگریز جانسن الگ ہے) اس کے نظریات پر یقین رکھتا تھا۔ برکلے کی بقیہ زندگی میں سے زیادہ تر غریبوں کی مدد کرتے ہوئے گزری۔

برکلے کا فلسفہ خاصا مشہور ہوگیا تھا، لیکن انگلینڈ میں چند ایک افراد نے ہی اس دور میں اسے سنجیدگی سے لیا۔ بنیادی طور پر یہ اس وقت کے غالب سائنسی نکتہ نظر کے خلاف ردعمل تھا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کا نکتہ نظر یہ تھا کہ دنیا ایٹموں پر مشتمل ہے جنہیں خدا نے مشینی انداز میں چلایا۔ مادے کی "بنیادی" خصوصیات اس کا وزن، شکل اور حرکت تھیں۔ یہ مادے میں خلقی طور پر موجود تھیں۔ "ثانوی" خصوصیات یعنی ذائقہ، رنگ وغیرہ کا مادے سے نہیں بلکہ خود ہمارے

ساتھ تعلق ہے۔

فرانسیسی روشن خیالی کے ارکان مثلاً والٹیئر نے لاک سے ان نظریات کو غیر تنقیدی انداز میں اخذ کرلیا۔ جلد ہی ان نظریات کو وسیع مقبولیت حاصل ہوگئی۔ برکلے نے فہم عامہ کی بنیادوں پر ان کے خلاف حملہ کیا، حالانکہ زیادہ تر لوگ انہیں فہم عامہ کے حوالوں سے ہی مانتے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ جدید فزکس کی تھیوریٹیکل نوعیت کی بہت گہرائی میں پیش بندی کرنے والا فلسفی سائنسی انقلاب کے لیے لاک والے جوش و جذبے کا حامل نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ تھیوریز (نیوٹن کی تھیوری سمیت) غیر واقعی ''مفید تھیوریز'' تھیں، اور بہرحال ہوا بھی یہی۔ جدید سائنس متواتر اصرار کررہی ہے کہ وہ چند برسوں میں ''ہر چیز'' کا حل تلاش کرلے گی...... لیکن یہ مفید اور غیر واقعی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

برکلے نے نتیجہ اخذ کیا کہ مادہ وجود نہیں ''رکھ سکتا'' تھا۔ اس یقین کی وجوہ بھی نہایت تجربیت پسندانہ تھیں۔ اس کے دلائل ہیوم کی ہمسری کرنے والی خوبصورت نثر میں ملتے ہیں۔

برکلے نے لاک کی طرح کائنات کو ایک بڑی مشین سمجھنے میں مسرت محسوس نہ کی۔ اس نے اس نظریے سے تنفر کا اظہار کیا کہ...... اور کوئی بھی شاعر اس سے اتفاق کرے گا...... ''تخلیق کی دکھائی دینے والی خوبصورتی'' محض ایک ''بصری دھوکا'' ہوسکتی ہے۔ لاک اپنی پاکیزگی اور خدا پر مبنی نظام اخلاقیات کے باعث اس قسم کی بات لکھنے کے قابل نہیں تھا۔

لاک کو اس مسئلے نے مشکل میں ڈالے رکھا کہ چیزیں حقیقت میں اپنے ظاہری اور قابل ادراک روپ سے بالکل مختلف ہوسکتی ہیں۔ برکلے نے اس مسئلے کا حل پیش کرنے کے لیے چیزوں کے وجود کو ماننے سے ہی انکار کردیا۔ اس نے کہا: ''پہلے ہم نے گرد اڑائی اور پھر شکایت کرنے لگے کہ ہمیں نظر نہیں آرہا۔'' کسی نے بھی اسے غلط ثابت نہیں کیا، لیکن یہ خیال مقبول نہ ہوا۔ شاید اس پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے؟ اس نے محض یہ سوال اٹھایا کہ کیا کائنات اور اس کی تمام چیزیں ایک ذہن کے بغیر موجود ہوسکتی ہیں؟ وہ اس سوال کو منطقی انجام تک پہنچاتا ہے۔

دراصل برکلے کہہ رہا ہے کہ قابل ادراک ہونا ہی ''موجود ہونا'' ہے۔ یقیناً وہ مادے سے

نجات پانے کے ذریعہ تمام قسم کے مسائل سے دامن بچا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ زیادہ لوگ اس کے قائل نہیں ہوسکتے تھے...... بالخصوص ایسے لوگ جو اپنی تمام دولت اور جائیداد کو محض تصورات کا مجموعہ سمجھنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے نزدیک حقیقت کا مفہوم ایک لامحدود اور ابدی خدا کی ہستی ہے جو تصورات کے ذریعہ سے فانی ہستیوں کے ساتھ تعلق بناتا ہے۔ کوئی چیز مثلاً کیک کا ٹکڑا یا کرسی محض تصورات کا ایک مجموعہ ہے۔ لاک کے مادیت پسندانہ اصولوں میں پرورش پانے والے کسی صاحب جائیداد کے لیے یہ نکتہ نظر ہرگز پرکشش نہیں۔ برکلے کے ہمدرد سعیاہ برلن نے لکھا کہ برکلے ان چند فلسفیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ''نشاندہی کی کہ زبان محض بیان کرنے کے علاوہ بھی متعدد مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے'' اور اس کا ''یہ کارنامہ اول درجے کی دانشورانہ خدمت تھا۔''

52

نئی سائنس

"The New Science"

گیامباتستا ویکو

1725ء اور 1730ء (1744ء میں نظر ثانی)

وہ ایک غریب کتب فروش کا بیٹا تھا جس نے اس میں علم کی پیاس پیدا کی۔ گیامباتستا نے اپنی معمول کی علامتیت اور مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ اس کا فلسفے میں دلچسپی لینا ویسی ہی گراوٹ تھی جیسے وہ سات سال کی عمر میں اپنے باپ کی دکان میں سیڑھی سے گرا تھا۔ اگرچہ وہ بہت غیر

معمولی تھا لیکن اپنی موت کے طویل عرصہ بعد مشہور ہوا۔ وہ بہت زیادہ بے باک اور تخیلاتی تھا۔ اس دور کے غیر تنقیدی اور غیر تشکیلی مزاج رکھنے والے نیپلز میں اس کا نہایت "جدید" ذہن یقیناً بہت نرالا معلوم ہوتا ہوگا۔ آج بھی انگریزی زبان میں اس کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے، حالانکہ 1948ء میں اس کے شاہکار "دی نیو سائنس" کا ایک اچھا انگریزی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔

ویکو کو جرمن رومانویت پسندوں نے 1790ء اور 1810ء کے درمیان دریافت یا دوبارہ دریافت کیا۔ پھر 1824ء میں فرانسیسی مورخ Jules Michelet نے "دی نیو سائنس" کا ایک مختصر شدہ ترجمہ شائع کیا۔ تب سے ہی اس کا اثر بڑھنے لگا۔ آج چند ایک لوگ ہی مغربی فکر کی تاریخ پر بات کرتے وقت اسے نظر انداز کریں گے۔

درحقیقت ویکو محض رومانویت پسندوں کے من کو ہی نہیں بھایا...... اگرچہ اس نے اپنا مرکزی تھیسس واضح کرنے کے لیے قدیم روم کی تاریخ کو استعمال کیا لیکن وہ قدیم دور کی شان و شوکت میں کھو جانے کے خلاف خبردار کرنے والا پہلا مفکر تھا۔ اس نے تاریخ کو ایک بالکل نئی نظر سے دیکھا...... یعنی ایک چکردار عمل کی صورت میں۔ وہ وکیل، مورخ اور شاعر تھا۔ اس کے علاوہ وہ پہلا سوشل سائنسدان اور سوشیالوجی کا اصل موجد بھی تھا۔ جیمز جوائس نے اپنے ناول کے چکردار (Spiral) سٹرکچر کی بنیاد ویکو پر رکھی، اور اسے "اسطورہ کا حقیقی دریافت کنندہ" اور "جدید مفہوم میں تاریخ کا نظریہ" پیش کرنے والا اولین شخص قرار دیا گیا۔ اگرچہ اس کو زیادہ ڈیٹا میسر نہیں تھا لیکن وہ دنیا کے چند اولین ماہرین بشریات میں سے ایک تھا۔

گیامباتستا ویکو کی زندگی نیشنا کا کام تھی اور اسے بار بار بدقسمتی سے پالا پڑا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کی خودنوشت سوانح عمری میں ذاتی معلومات بہت کم ہیں (حتیٰ کہ وہ اپنے گھر والوں کا ذکر بھی نہیں کرتا)۔ اس کی بجائے یہ سوانح عمری اس کی عقلی ترقی کا ریکارڈ ہے۔ بہت کچھ ہین السطور کہا گیا ہے۔

ویکو نیپلز میں پیدا ہوا اور باقی ساری زندگی اس شہر کے گرد 60 میل قطر کے اندر اندر ہی گزاری۔ وہ قانون کا ایک ذہین طالب علم تھا اور کوالیفائی کرنے سے پہلے ہی ایک مقدمے میں اپنے باپ کی پیروی کر چکا تھا۔ آخر کار اس کی ذہانت کچھ انعام دلانے کے قابل نظر آئی: اس نے

31 برس کی عمر میں نیپلز یونیورسٹی میں علم بدائع کے پروفیسر کا عہدہ حاصل کرلیا۔ وہ 42 سال تک اس عہدے پر رہنے کے بعد مستعفی ہوا۔ 1723ء میں جب اس نے اسی یونیورسٹی میں سول لاء کی پروفیسر شپ حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ 1699ء میں اس نے ایک غریب اور ان پڑھ عورت سے شادی کی اور چار بچوں کا باپ بنا۔ اگرچہ نیپلز میں اس کی سوچ اور ذہن کو احترام ملا مگر اس کی زندگی بہت خاموشی سے گزری؛ وہ ہمیشہ غربت کے انتہائی کنارے پر رہا اور حتیٰ کہ اسے نجی طور پر ٹیوشن بھی پڑھانا پڑی۔ اس کی واحد تشفی بس یہ تھی کہ ذہنی دباؤ نے اسے اپنا شاہکار مرتب کرنے پر اکسایا اور عدالت احتساب ہنوز موجود ہونے کے باوجود وہ حدود و قیود میں نہ رہ سکا۔ اسے بس اتنی احتیاط کرنی تھی کہ وہ ملحد نہ تصور کر لیا جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ خود کو تمام راسخ العقیدگی سے آزاد سمجھتا تھا۔ میکیاویلی، بیکن اور ہوبز سے متاثر ہو کر لیکن ڈیکارٹ کے برعکس اس کی دلچسپی کا اصل مرکز معاشرہ اور زبان تھی۔ بہر حال وہ مطالعۂ ذات کے ذریعہ انسانیت کے مطالعہ کا بانی تھا۔

ویکو نے ڈیکارٹ کی استدلال پسندی کو چیلنج کیا۔ اس نے علم کی جستجو میں اپنے باہر کی بجائے اندر کی طرف دیکھا۔ اس نے لکھا: ''حقیقی اور بنایا گیا مشابہ ہیں۔'' جی ہاں ریاضی حقیقی یا سچا تھا...... یہاں وہ ڈیکارٹ اور استدلال پسندوں کے ساتھ متفق ہے...... لیکن صرف اس وجہ سے کہ اسے انسانوں نے تخلیق کیا ہے۔ یہ لاشئے میں یا کسی حوالے کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ ڈیکارٹ کے برعکس بحیثیت مجموعی انسانی سرگرمی پر زیادہ اور خالص سائنس پر کم زور دیتا ہے۔

''دی نیو سائنس'' میں ہمیں جدید علم البشر کے متعدد جراثیم ملتے ہیں۔ ویکو اپنے اس نظریے کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ تاریخ کا عمل خراب سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی جانب سیدھی لائن کی صورت میں نہیں بلکہ دائروں کی صورت میں آگے بڑھتا ہے۔ جرمن اوسوالڈ سپنگلر نے بھی اپنی کتاب ''زوال مغرب'' (1918ء تا 1922ء) میں یہی تھیوری متعارف کروائی اور اسی طرح آرنلڈ ٹائن بی نے ''اے سٹڈی آف ہسٹری'' (1934ء تا 1961ء) میں۔ دونوں ایک مختصر عرصے تک بہت پر اثر ثابت ہوئے لیکن اب دونوں کو ہی تقریباً بھلا دیا گیا: سپنگلر اور نہ ہی ٹائن بی کا اثر پائیدار رہا۔ ویکو کی ''نیو سائنس'' بہت پہلے تحریر میں آنے کی وجہ سے مختلف کیٹیگری

میں آتی ہے۔ سپنگلر اور ٹائن بی دونوں نے ہی ویکو کی تھیوری کو بہت سیدھے سادے انداز میں لاگو کر دیا تھا۔ ویکو ان دونوں کو متاثر کرنے کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔

ویکو نے معاشرے کو اس کے ادب، اساطیر، زبان، قانون، آرٹ، حکومت کی اقسام، مذہب اور فلسفے کی پیداوار خیال کیا۔ اسے ''ارتقاء پسند'' کہا گیا ہے۔ یہ خطاب ایک حد تک درست ہونے کے علاوہ گمراہ کن بھی ہے کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ارتقاء کی سمت ہمیشہ آگے اور اوپر کی طرف، زیادہ بہتر صورت کی سمت میں ہوتی ہے۔ ویکو اس بات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے ترتیبی اور حتیٰ کہ فراموشی کی بھی بات کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ معروضی سوچ رکھنے والا مفکر تھا۔ یہ دعویٰ کرنا بھی گمراہ کن ہے کہ چونکہ ویکو نے انسانی معاملات میں ''مشیت الٰہی'' کا عمل دخل دیکھا لہٰذا وہ ایک ''کیتھولک فلسفی'' تھا۔ ویکو اپنی ملازمت کی وجہ سے مجبور تھا کہ ہر چیز کو ایسی اصطلاحات میں ڈھالے جو جاہل پادریوں کا قرانہ معلوم نہ ہو۔ یہ ''سیاسی لحاظ سے'' درست طریقہ کار تھا۔ ویکو کی نوجوانی کے ایام میں عدالت احتساب نے اس کے کچھ دوستوں کو ''اپی قوریت'' کے الزام کے تحت سزا دی تھی۔ وہ عظیم ڈچ ہیوگو گروشیئس (1583ء تا 1645ء) کی تحریروں کا انداز نقل کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ کر سکا کیونکہ گروشیئس ایک ''ملحد'' تھا۔

لیکن ویکو مذہبی تھا۔ حتیٰ کہ اسے ایک طرح کا عیسائی بھی کہا جا سکتا ہے؛ لیکن اسے رومن کیتھولک ازم کے ساتھ حقیقت میں ویسا کوئی لگاؤ نہ تھا جس کا اسے مظاہرہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹلی کے عظیم ترین فلسفی کے طور پر اس کی حیثیت زیادہ قابل اعتراض نہ ٹھہری۔ تاہم، بیسویں صدی میں اٹلی کا عظیم ترین فلسفی بینیڈیٹو کروسے اس کے ساتھ خصوصی لگاؤ رکھتا تھا۔ کروسے نے ویکو کی تمام کاوشوں کی تہہ میں موجود نظریے کو سمجھا: کہ بنی نوع انسان جس چیز کو حقیقی اور مکمل طور پر سمجھ سکتے ہیں وہ ان کی اپنی ہستی نہیں (جیسا کہ ڈیکارٹ کے فلسفے میں) بلکہ وہ چیز ہے ''جو انہوں نے خود تخلیق کی ہے۔'' سائنس میں تجرباتی مشقیں اس لیے غیر قطعی ہیں کیونکہ ہم فطرت کے سپید قوانین کو آزماتے وقت محض فطرت کی نقالی ہی کر سکتے ہیں۔

دراصل لفظ ہم احساسی (Empathy) جدید دور کے آغاز میں اختراع کیا گیا تھا جب جدید فکر میں Verstehen (ادراک) بھی ایک ضروری چیز بن گیا تھا۔ لیکن ویکو کی تصنیف ہم احساسی کی

شدید انسانی ضرورت اور خود شناسی کی ضرورت سے مملو ہے۔ اس نے دلیل دی کہ ہم انسان ہیں اس لیے ہمیں بہترین انداز میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانوں نے کیا تخلیق کیا ہے۔ اس نے پیش بینی کر لی کہ ایک ''کامل سائنس'' کا سراب اس وقت دنیا کو کس خوفناک حد تک اپنی لپیٹ میں لے لے گا جب اسے خدا کی عدم موجودگی کا یقین ہو جائے گا۔ اور یقیناً ثقافتی مفہوم میں خدا کھو گیا تھا۔ اب خدا کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ویکو اتنا روشن خیال تھا کہ وہ ثقافت کے خدا اور سچے خدا کے درمیان فرق دیکھنے کے قابل ہو سکا۔

ویکو پہلا شخص تھا جس نے حقائق کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھا: اس نے دیکھا کہ تاریخ کے ادوار کو معاصرانہ مفہوم میں سمجھنے کی کوشش میں گڑبڑ لازمی ہے۔ اور یقیناً اگر آپ ماضی کو سمجھنے کی کوشش میں ہیں تو تخیلاتی ہم احساسی استعمال کرنا ضروری ہے۔

ویکو یقین رکھتا تھا کہ ''یادداشت کا فن'' (جواب تقریباً معدوم ہو چکا ہے) انسانیت کی تخلیقات کے گمشدہ ماخذوں کی کنجی ہے۔ اس نے زور دیا کہ قدیم لوگ فلسفے نہیں بلکہ شاعری کے مالک ہیں: المختصر، انسانیت کے ہر دور کے اپنے فنون، قوانین اور سیاست تھی۔ تمام انسانی کاوش اور جستجو کی بنیاد زبان کے استعمال میں ہے۔ کسی معاشرے میں زبان کے استعمال کی مدد سے اس کی حالت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اور اس نے زبان کی مختلف اقسام کے درمیان امتیاز قائم کیا: علامتی، استعاراتی، وغیرہ۔

ویکو کی اپنی شاعری بھی دکھاتی ہے کہ وہ ایک شاعر کی حیثیت میں اپنا اظہار نہ کر سکا، لیکن وہ شاعرانہ ذوق رکھتا تھا اور شاعری کا ایک اچھا قاری بھی تھا۔ اسے یقین تھا کہ تمام ادوار کا (الوہی) مقدر اور تمام تاریخی چکر محض نسیان تھا۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لیے ہم ہندومت کی لطافتوں سے رجوع کر سکتے ہیں: ہمیں بدھ مت کے ''شنیہ'' (لاشیئیت) کے مفہوم پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کی تصنیف میں بہت سی ایسی چیزوں کی پیش بینیاں موجود ہیں جنھیں ہم ''جدید'' سمجھتے ہیں: تحلیل نفسی اور فرائیڈ، وجودیت اور سارتر، زبان اور چومسکی، حتیٰ کہ مارکسزم اور مارکس۔ انسانیت کے بارے میں اس کے تصورات کو کہیں زیادہ وسیع مطالعہ درکار ہے۔

53

انسانی فطرت کے بارے میں مقالہ

"Treatise on Human Nature"

ڈیوڈ ہیوم

1739ء تا 1740ء

سکاٹ ڈیوڈ ہیوم (1711ء تا 1776ء) ایڈنبرگ کے ایک چھوٹے سے زمیندار کے گھر پیدا ہوا۔ ڈیوڈ ہیوم کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین فلسفیوں میں ہوتا ہے، اور وہ انگریزی زبان لکھنے والوں میں سے عظیم ترین ہے۔ اہم بات یہ کہ وہ ہرگز ایک پروفیشنل فلسفی نہیں تھا۔ 1745ء میں جب اس نے اپنی پرانی ایڈنبرگ یونیورسٹی میں اخلاقیات (Ethics) کی چیئر کے لیے درخواست دی تو ناکام رہا۔

اس نے بتایا کہ ادبی شہرت اس کی سب سے بڑی امنگ تھی۔ وہ ایک فلسفی اور مورخ ہوتے

کے ساتھ ساتھ ایک معاشرتی آدمی بھی تھا۔ اس میں جذبہ محبت بھی موجود تھا۔ لیکن اس نے کبھی شادی نہ کی۔ ایڈورڈ گبن کی طرح وہ بھی آخری برسوں میں بلاوجہ بہت موٹا ہو گیا۔ اس کے دوست فرانسیسی ناول نگار اور فلسفی ڈینس ویدیرو کے مطابق وہ ایک ''سیر شکم ہیئڈ کئی راہب'' جیسا تھا۔ ایڈنبرگ میں اس کے گھر والی بے نام گلی کا نام اس کی موت کے بعد سینٹ ڈیوڈ سٹریٹ رکھا گیا۔ اگرچہ اسے ایک لامذہب خیال کیا جاتا تھا مگر وہ ایک اچھے آدمی کے طور پر مشہور تھا۔

ہیوم نے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر ایک قانونی کیریئر اپنانے کی خاطر پڑھائی کی مگر جلد ہی یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے اپنے شدید تجسس کو تسکین دینے کی خاطر کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اس شدید جدوجہد کے نتیجہ میں وہ جذباتی بریک ڈاؤن سے دوچار ہو گیا۔

اس تمام مطالعہ میں اس نے ''محض غیر مختتم جھگڑا'' ہی دیکھا۔ اس نے کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرنے کا تہیہ کیا جس کی مدد سے سچائی کا تعین کیا جا سکے۔ اس نے حیرت انگیز حد تک نوعمری میں ہی اپنے مرکزی خیالات کو تشکیل دے لیا تھا۔

وہ فرانس میں لافلیچے کے مقام پر گیا (جہاں ڈیکارٹ نے مطالعہ کیا تھا) اور اپنا شاہکار ''انسانی فطرت کے بارے میں مقالہ'' لکھا۔ یہ دو حصوں میں شائع ہوا: کتاب اول اور کتاب دوم 1739ء میں اور کتاب سوم 1740ء میں۔

بعد میں اس نے شکایت کی کہ ''یہ پریس میں سے مردہ حالت میں پیدا ہوئی۔'' کسی نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس نے لکھا کہ ''نوجوانی کی حرارت اس کی تحریک تھی۔'' اس نے فلسفے میں وہی کچھ ایک دم کرنا چاہا تھا جو نیوٹن نے ''دی پرنسپلز'' میں سائنس کے لیے کیا تھا۔

ہیوم پر مایوسی کے اثرات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس نے اپنا کیس دو مزید نسبتاً مختصر تصنیفات...... (''انسانی تفہیم کے بارے میں غور و فکر'' 1748ء اور ''اخلاقی اصولوں کے بارے میں غور و فکر'' (1751ء)...... میں دوبارہ پیش کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا تجزیہ ان کتب کی بنیاد پر ہی کیا جائے۔ اور حقیقت میں اسے پہلی کتاب کے توسط سے ہی شہرت اور قبولیت ملی۔

تاہم، برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل نے لکھا کہ اس میں وہ ''مقالے'' کے بہترین حصوں کو حذف کر گیا تھا۔ چنانچہ یہاں ہم اس کی بہترین تصنیف پر ہی توجہ مرکوز کریں گے جو اب ایک

بار پھر فلسفیانہ توجہ کا مرکز ہے۔

ہیوم ایک متشکک تو تھا مگر کٹر قسم کا نہیں۔ Pyrhho جیسے کسی کٹر متشکک کے خیال میں کچھ بھی جاننا ممکن نہیں۔ ہیوم نے دیکھا کہ یہ بات ایک قسم کا احمق پن ہے۔ اس نے فلسفہ میں عقل سلیم کی ایک کافی بڑی مقدار داخل کی۔ اس وقت تک کسی اور چیز کا ایسا پائیدار اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی مشہور ہو گیا اور ''ہسٹری آف انگلینڈ'' (1754-59ء) لکھ کر مالی اعتبار سے بھی کامیابی حاصل کی۔ یہ تاریخ بھی شاندار ہے لیکن اس کی پہلی کتاب جیسی زبردست ہرگز نہیں۔ اس نے کچھ عرصہ فرانس میں گزارا (1763ء تا 1766ء) اور ان برسوں کے دوران پیرس کے قہوہ خانوں کا ہردلعزیز شخص بنا رہا۔ اس نے ژاں ژاک روسو کے ساتھ دوستی کی اور اسے اپنے ساتھ لے کر واپس انگلینڈ آیا۔ اگرچہ روسو نے اس کے ساتھ لڑائی کی اور یہ خیال قائم کر لیا کہ ہیوم اس کی ساکھ تباہ کرنے کی کوشش میں تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ہیوم کے خلاف کچھ زیادہ نہ کر سکا۔

اگرچہ ہیوم کا فلسفہ سادگی کی خوبیاں رکھتا ہے، لیکن یہ عمیق ہے اور ابتداء میں اسے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ یہاں ہم اس کی اہم ترین خوبی پر غور کریں گے: تجربیت پسندی کی ترقی میں اس کا اہم کردار۔ سترہویں صدی کے عظیم فلسفی سپینوزا، لیبنز اور ڈیکارٹ سبھی استدلال پسند تھے...... یعنی ان سب نے تھیوری کو اپنی فکر کی بنیاد بنایا تھا۔ یورپی فلسفے کا رجحان ہمیشہ اسی جانب رہا ہے۔ استدلال پسندوں کی نظر میں علم کو صرف اختراجی (Deductive) استدلال کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے؛ نیز علم صرف اور صرف ایک نظام پر مشتمل ہوتا ہے، اور اصولی طور پر تمام چیزوں کو اس نظام کی رو سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

بیکن اور ہوبز کے بعد سے اینگلو سیکسن فلسفہ اس طریقہ کار کی مخالفت کرتا آیا۔ لاک اور حتیٰ کہ عینیت پسند (آئیڈیلسٹ) بشپ برکلے نے بھی تجربیت پسندانہ نکتۂ نظر اپنایا۔ ہیوم نے اسے سب سے زیادہ مکمل طور پر واضح کیا۔ تجربیت پسندی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ پیدائش کے وقت انسانی ذہن میں کوئی ''خلقی تصورات'' موجود ہوتے ہیں۔ صرف عام فہم (کامن سینس) تجربہ ہی ''تصورات'' مہیا کر سکتا ہے۔ چنانچہ افلاطون کے اعیان (تصورات) کو سر دست ہی مسترد کر دیا گیا۔ کوئی ''تصوراتی میز'' موجود نہیں۔ بس حقیقی، مشاہدہ کیے گئے میزوں

کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ افلاطون اور بعدازاں سپائنوزا کی بیان کردہ علم کی قسم علم نہیں ہے۔ حقیقی علم تھوڑا تھوڑا کر کے حاصل ہوتا ہے؛ یہ عمل مرحلہ بہ مرحلہ، اکتا دینے والا، مشکل اور ہمیشہ تجربے پر مبنی ہوتا ہے۔ ہیوم نے لکھا کہ فلسفہ "قدیم دور سے ہم تک منتقل ہوا، یعنی یہ کلیتہً "مفروضے پر مبنی تھا" اس نے محسوس کیا کہ ہر کوئی شخص "انسانی فطرت سے قطع نظر...... صرف اپنے تخیل سے کام لیتا ہے۔" وہ (ذہن میں سائنسی طریقہ کار کے ساتھ) خود انسانی فطرت سے رجوع کرنے کی تجویز دیتا ہے۔

برکلے کی تجربیت پسندی نے اس کو بدیہی طور پر اس نرالے نتیجے پر پہنچایا تھا کہ مادہ ناقابل تشریح ہے اور لہٰذا صرف خدا کے ذہن میں وجود رکھتا ہے۔ چنانچہ ہیوم (غلط طور پر) برکلے کو تجربیت پسندوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس نے مذہبی حلقوں کو مشتعل نہ کرنے کی احتیاط کے ساتھ کہا کہ خدا کی ہستی قابل مظاہرہ نہیں (یقیناً نہیں ہے۔ اور نہ ہی خدا کا نہ ہونا قابل مظاہرہ ہے)۔ اس نے سوچا کہ خدا کا نظریہ "تصورات کے تلازم" کی پیداوار ہے۔ چنانچہ برکلے (یا سپائنوزا یا لیبنز) کے نظام ہائے فکر کے پس پردہ تصورات کی بنیاد محض تخیل پر ہے: وہ حقیقی تجربے پر انحصار نہیں کرتے۔

ہیوم نے ایک ماہر نفسیات کے سے انداز میں اخلاقی احکام (تم قتل نہیں کرو گے، تم زنا نہیں کرو گے، وغیرہ) کی حقیقی نوعیت کا تجزیہ کیا۔ اس نے یہ ثابت کرنے میں مسرت پائی کہ ان کی سچائی کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بااثر انداز میں یقین رکھتا تھا کہ اس قسم کے احکام کا دارومدار پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے احساسات پر ہے، اور ان احساسات کا انحصار خوش گوار یا ناخوش گوار نتائج پر ہے۔ مثلاً ہم نے قتل کرنے سے اس لیے منع کیا کیونکہ قتل ہونا ناخوش گوار امر ہے۔ درحقیقت، انجام کار اس نے ہر چیز کو احساسات یا مسرت اور دکھ میں محدود کر دیا۔ ہیوم یقین رکھتا تھا کہ کوئی شخص محض مختلف ادراکات کا ایک مجموعہ یا بنڈل ہے۔ یہ ادراکات ناقابل فہم تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی جگہ لیتے اور متواتر حرکت کی حالت میں رہتے ہیں۔" اس "بنڈل" تھیوری کی بازگشت بودھی فلسفوں میں نظر آتی ہے، اور ولیم جیمز نے اپنی عہد ساز تصنیف "پرنسپلز آف سائیکالوجی" میں اسے مزید ترقی دی۔

ہیوم کا فلسفہ طویل عرصہ تک نظر انداز ہوتا رہا۔ اس کا کچھ فلسفہ قائل کر لینے والا نہیں اور نام نہاد سائنسی انداز رکھتا ہے۔ وہ اتنا سائنسی نہیں تھا جتنا کہ خود کو تصور کرتا تھا۔

لیکن "مابعد الطبیعیات میں" پرانے انداز کے تحت خیال آرائیاں کرنا ناممکن ثابت ہوا۔ ہیوم کا اثر لینے والا پہلا اہم فلسفی کانٹ تھا: اس نے ہیوم کا مطالعہ کرنے پر کہا تھا کہ وہ اپنی عقائدانہ غفلت سے "بیدار ہو گیا تھا۔" کانٹ کا زیادہ تر فلسفہ ہیوم کے اٹھائے ہوئے مسائل کے جوابات پر مشتمل ہے۔

ہیوم کی تشکیک کو زیادہ تر ایسے لوگوں نے سراہا ہے جو اس کی طرح پروفیشنل فلسفی نہیں تھے۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ اس نے "انسانی فطرت کی سائنس" میں براہ راست طور پر بمشکل ہی کوئی حصہ ڈالا۔ تاہم، اس نے دکھایا کہ انسانی فطرت میں تحقیق کرنا جائز ہے۔ وہ مذہبی تحرک پر کوئی روشنی نہ ڈال سکا کیونکہ وہ اپنی تشکیک پسندی اور ایک انسان کے طور پر اپنی اچھائی کے درمیان کوئی تعلق بنانے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن انسانی فکر کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہے...... نفسیات، بشریات، عمرانیات، تاریخ...... جس پر اس نے زبردست اثر نہ ڈالا ہو۔

54

دی انسائیکلوپیڈیا

"The Encyclopedia"

ڈینس دِیدرو

1751ء تا 1772ء

سترہویں صدی کے اواخر میں جان لاک کے فلسفے کے ساتھ انگلینڈ میں شروع اور فرانس میں اپنے عروج کو پہنچنے والی عقلی تحریک کو عموماً روشن خیالی یا عہد استدلال کہا جاتا ہے۔ اس کے عہد عروج میں والٹیئر، ڈینس دیدرو اور ژاں لے رونڈ ڈی المبرٹ موجود تھے۔ دیدرو اور ژاں

لے رونڈ نے دی انسائیکلو پیڈیا مرتب کی (موخر الذکر ریاضی میں دلچسپی کے باعث اس منصوبے سے علیحدہ ہو گیا) جس کا ٹیکسٹ 17 جلدوں اور تصاویر 11 جلدوں میں ہیں۔ اس نے انسانی علم و فضل کے تمام حاصلات کو ایک ہی جگہ مہیا کر دیا۔

اس میں تمام تھیوریٹیکل علم کے متعلق معلومات کا خلاصہ ایک ہی جگہ پیش کر دیا گیا اور یوں اتفاقاً کیتھولک کلیسا کی حاکمیت چیلنج ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد عملی مشورہ دینا بھی ہے۔ لہٰذا یہ ایک "اپنی مدد آپ" قسم کا ہدایت نامہ بھی ہے۔ یسوعیوں اور دیگر نے اسے سختی سے دبایا لیکن علم کا اپنا وزن اور لوئی XV کی محبوبہ مادام دی پومپاڈور کی تھوڑی بہت حمایت بالآخر غالب آئی۔

چند ایک لوگوں نے ہی "دی انسائیکلو پیڈیا" پڑھی یا دیکھی ہو گی (لیکن اب اسے انٹرنیٹ پر لانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں) اور اٹھارہویں صدی میں بھی اس کی چار ہزار کا پیاں بھی بہت زیادہ قیمت کے باعث محدود رہیں۔ اسے جہالت کے خلاف علم کے حملے کا ایک عظیم اور رجائیت پسندانہ وار خیال کیا گیا۔ اگرچہ "دی انسائیکلو پیڈیا عام جگہوں پر نظر نہیں آتی لیکن اس کا اثر بہت عمیق اور زبردست ہے۔ آپ اس کے بعد میں آنے والے کاموں پر اس کا اثر دیکھ سکتے ہیں...... حال ہی میں اس کے قائم کردہ معیاروں کا انحطاط شروع ہوا ہے (جیسا کہ "تاریخی حقائق" کی ایک حالیہ کتاب میں فرانس پروشیا جنگ کو ہی شامل نہیں کیا گیا)۔ اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے: فلسفہ اور مذہب کے بارے میں مضامین کو اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ سنسر کی پابندیوں سے بچا جا سکے۔

ساری "دی انسائیکلو پیڈیا" میں غالب نکتۂ نظر الٰہیت تھا: کہ خدا نے کائنات تخلیق کی اور اسے متعین اصول دیے، لیکن وہ انسانی ضرورت یا دعا کا کوئی ردعمل نہیں دیتا...... یعنی وہ خالق تو ہے مگر ہادی نہیں۔ الٰہیت (Deism) کا ماخذ شاعر جارج ہربرٹ کے بھائی لارڈ ہربرٹ آف Cherbury کا فلسفہ تھا جو 1583ء میں پیدا اور 1648ء میں فوت ہوا۔

"دی انسائیکلو پیڈیا" اکثر جگہوں پر شدید عیسائیت مخالف بھی ہے۔ "تین کذابوں کے بارے میں مقالہ" (1719ء) نامی کتاب میں درحقیقت مسیح کا موازنہ چنگیز خان سے کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا پادریوں کو چارہ لگا کر پھنسانے والا جذبہ دی انسائکلو پیڈیا میں مفقود نہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے ایڈیٹر کی طرح بنیادی زور خیالات پر نہیں بلکہ ان کے استعمال پر دیتی ہے۔ اسے بجا طور پر ''اشرافیہ اور کلیسیا کے اندر موجود طفیلیوں پر ایک سوچا سمجھا کاری وار'' کہا گیا۔ اس بات میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس نے 1789ء میں فرانس میں بپا ہونے والے انقلاب کی قوتوں کو بہت مضبوط کیا۔

روشن خیالی کے اعلیٰ ترین اور بہترین آئیڈیلز ہیوم کے مندرجہ ذیل اقتباس میں مل سکتے ہیں جس کا ہر ایک لفظ یادوزن ہے:

> انسان کا تخیل فطری طور پر لطیف ہے: یہ ہر دور کی اور غیر معمولی اور کسی اختیار کے بغیر زمان و مکان کے نہایت دور افتادہ حصوں میں بھاگی چلی جاتی چیزوں سے مسرت اٹھاتا ہے تاکہ ان چیزوں سے گریز کر سکے جسے روایت نے بہت شناسا اور جانا پہچانا بنا دیا ہے۔ ایک درست رائے ایک عین برعکس طریق کار پر عمل کرتی اور تمام دور دراز اور اعلیٰ تحقیقات سے گریز کرتے ہوئے خود کو عام زندگی اور ایسے موضوعات تک محدود رکھتی ہے جو روز مرہ کے تجربے میں آتے ہیں، اور یہ زیادہ لطیف موضوعات کو شعرا یا خطیبوں کی تزئین کاری یا پادریوں اور سیاست دانوں کے فنون کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔

لیکن اس عہد کے جذبے، جس کے دوران شاعری اعلیٰ تر حالت کی بجائے نثر کی جانب راغب ہوئی، نے متعدد کہیں زیادہ شدید مفروضات بنائے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اوپر بیان کردہ دو مختلف رجحانات کے درمیان امتیاز کو قبول کر سکنے والا کوئی نہایت ''رومانی'' یا ''ارفع'' تخیلاتی مصنف بھی اتنا قابل قدر نہ ہوتا۔ ہیوم کو یہ معلوم ہونا مشکل تھا کہ اس کی نثر اکثر جلال کے قریب قریب پہنچی...... لیکن کوئی مصنف اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے بارے میں نہیں جانتا، کیونکہ یہ اعلیٰ صلاحیتیں اسی طرح کے دیگر افراد کی صلاحیتوں کے مقابلے میں ''اعلیٰ'' قرار پاتی ہیں۔

عہد روشن خیالی کے مفروضات میں مندرجہ ذیل شامل تھے...... منطق اعلیٰ مرتبت ہے اور یہ نہ صرف پاکیزہ سوچ بلکہ پاکیزہ فعل کی بھی کنجی ہے۔ رواداری یا تحمل بھی ایک نیکی ہے۔ انسان کاملیت حاصل کر سکتا ہے۔ تمام انسان پیدائش کے وقت برابر ہوتے ہیں اور وہ مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ انسان فطری طور پر نیک ہے۔ معجزوں پر یقین رکھنا توہم پرستی ہے، کیونکہ خالق سب سے بڑھ کر ایک منطق ہستی ہے۔ ''میتھیکس'' کی نسبت ذوق زیادہ اہم ہے، چنانچہ درستگی کو تخیل پر سبقت حاصل ہے۔ یقیناً اس کا ردعمل وہ رومانویت تھی جو ایڈمنڈ برک اور دیگر نے پیش کی۔

لیکن خالص منطق اور شیکسپیئر ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسی لیے اٹھارہویں صدی نے اسے ''ٹھیک'' کرنے کی کوشش کی۔

درحقیقت اس روشن خیالی کا کوئی ''ابتدائی سال'' موجود نہیں جس کے آئیڈیلز ''دی انسائکلو پیڈیا'' میں نہایت موزوں طریقے سے رچے ہوئے ہیں۔ والٹیئر اور دیدرو دو ایسی شخصیات ہیں جن کے درمیان روشن خیالی کی تجسیم ہوئی۔ لیکن ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو اپنے اپنے عہد کے پس منظر میں ''روشن خیال'' ثابت ہوئے۔ بدستور نظر انداز کی جاری اطالوی، فرانسیسی خاتون کرسٹین دی پیزان (1364ء تا 1429ء) صرف ایک مثال ہے جس کا وسیع ذہن سترہویں صدی کے عین مطابق لگتا ہے۔ ایک اور شخص اراسمس ہے۔ روشن خیالی کے کچھ ارکان کے خیالات سولہویں صدی کے لوگوں کے بھی تھے۔ کچھ دیگر موجودہ دور کے نام نہاد انسانیت پسندوں اور ''منطق پسندوں'' کے ہیں۔ کٹر مذہبی عقیدے سے نفرت صرف موحدوں (deists) اور ملحدوں کی ہی عملداری نہیں۔ اٹھارہویں صدی میں فرانس کا رومن کیتھولک کلیسیا بھی خود کو تباہ کرنے کے انداز میں اور بالخصوص استبدادی تھا۔

دیدرو والٹیئر کی نسبت زیادہ باثبات اور باضمیر تھا۔ انسائکلو پیڈیا کی ایک اور شخصیت پادری Etienne Bonnot de Condillac (1715ء تا 1780ء) نے لاک کو فرانسیسی میں ترجمہ کیا لیکن وہ لاک کے فلسفے میں کم اور اس کے مابعد الطبعیات مخالف تعصب میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

سترہویں صدی کے منکرین کی جانب سے ڈیکارٹ پر کیے گئے زیادہ تر اعتراضات رومن کیتھولک پادری پیئرے گاسینڈی (1592ء تا 1655ء) کی تصنیف میں ملتے ہیں جو لاک سے

زیادہ با معنی اور ایماندار فلسفی تھا لیکن اسے ابھی تک خاطر میں نہیں لایا گیا۔ درحقیقت روشن خیالی کا واحد غیر متنازعہ عظیم فلسفی جرمن ایمانوئیل کانٹ تھا۔ لیکن دیدرو اور چند دیگر نے فلسفے کے ساتھ ساتھ نفسیات کی بھی پیش بینی کی۔

چنانچہ ''دی انسائکلو پیڈیا'' ہنوز سترہویں صدی کی ایک یادگار ہے۔ آج ہمارے لیے اس کا مواد بمشکل ہی قابل قدر ہے۔ بس اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ لیکن اس دور کے لحاظ سے یہ زبردست کاوش تھی۔

انسائکلو پیڈیا کی اصل تاریخ دلچسپ ہے۔ اس کا تصور بہت قدیم وقتوں میں موجود تھا۔ لیکن اٹھارہویں صدی سے پہلے یہ ممکن نہ ہو سکا جس کی کئی وجوہ ہیں...... مثلاً علم کی دستیابی اور پرنٹنگ کی سہولیات وغیرہ۔ پہلا جدید انسائکلو پیڈیا ایک سکاٹش گلوب ساز افرائیم چیمبرز نے تیار کیا جس کی دو جلدیں تھیں (1728ء)۔ دو فرانسیسی پبلشرز نے اس کا ترجمہ کروانے کی غرض سے دیدرو سے رابطہ کیا۔ لیکن اس نے انہیں دوبارہ سوچنے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا کہ اگر فرانسس بیکن کی ہدایات کے مطابق ایک زیادہ بڑی کتاب مرتب کی جائے تو کیسا رہے گا؟ یوں انسائکلو پیڈیا کا جنم ہوا۔ 1776ء اور 1780ء میں شائع کیے گئے دو اضافی حصوں میں دیدرو کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اس کام میں دیدرو کے بڑے معاون والٹیئر، جو کورٹ اور مارمونٹل بھی تھے۔

لہٰذا روشن خیالی کئی حوالوں سے یقیناً غلط تھی: مثلاً اس نے متکلمانہ فلسفہ کو بھرپور انداز میں نہ سمجھا۔ لیکن اس کی امنگیں اور میراث اور اس میں ملوث مرد اور عورتیں قائم و دائم رہے۔ اس نے جلد ہی خود کو لاک کی اخلاقی مریضانہ صورتحال سے آزاد کرا لیا۔ ''دی انسائکلو پیڈیا'' ایک کہیں اعلیٰ، نہایت جامع اور عمدہ چیز پیش کرتی ہے۔

55

انگریزی زبان کی لُغت

"A Dictionary of English Language"

سیموئیل جانسن

1755ء

بہت کم لوگوں نے (اور وہ بھی میوزیم یا لائبریری میں) ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی مشہور انگریزی زبان کی لغت دیکھی ہوگی جو بائبل کے حجم کی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس کا پورا نام یہ ہے:

rekhta

A dictionary of the English Language in which the Words are deduced from their ORIGINALS and ILLUSTRATED in their DIFFERENT SIGNIFICATIONS by EXAMPLES from the best WRITERS.....

چند سال قبل بھی اس عظیم کام پر تنقید کرنا فیشن کے طور پر رائج تھا۔ اگرچہ گرامر اور روزمرہ پر جانسن کا اثر ایک دور میں بہت بڑھا چڑھا کر بتایا گیا تھا لیکن یہ بات بدستور قطعی درست ہے کہ اس کی لغت کا اثر بعد کی لغت نویسی پر "لاثانی" تھا۔ مختصراً یوں کہہ لیں کہ یہ پہلی عمدہ انگریزی لغت تھی...... اور یہ صرف ایک آدمی نے تالیف کی۔

عظیم امریکی لغت نویس اور ماہر لسانیات Noah ویبسٹر نے کہا کہ اس کے موضوع میں جانسن کی حصہ داری ریاضی میں نیوٹن کی حصہ داری کے برابر ہے۔ یہ کچھ مبالغہ آرائی ہے مگر آپ غور کر سکتے ہیں کہ یہ موازنہ کیوں کیا گیا۔ ایک حد تک جانسن اس تعریف و توصیف کا بجا طور پر مستحق ہے۔ 1884ء سے لے کر 1933ء تک کے 70 برسوں میں مکمل ہونے والی، جمہور مرے کی تالیف کردہ گیارہ جلدوں پر مشتمل "آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" سے پہلے تک جانسن کی لغت انگریزی کی بہترین لغت تھی۔ لیکن آکسفورڈ ڈکشنری کی تالیف کے لیے تمام بہترین دستیاب طریقے استعمال ہوئے: زبان میں موجود تقریباً ہر چیز کو پڑھا گیا، الفاظ کے استعمالات کو ریکارڈ کیا گیا، اس کے بعد ترتیب دیا اور مثالوں سے واضح کیا گیا۔ یہ چیز جانسن کے سکوپ سے باہر تھی۔ اس کے پاس صرف چھ معاون تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے ناممکن ہے۔ یہ کام کمپیوٹر آنے کے بعد ہی ممکن ہوا۔

کسی غیر محقق شخص نے اگر جانسن کی اصل لغت دیکھی بھی ہوگی تو وہ صرف 1860ء تک شائع ہونے والے اس کے کئی ایڈیشنز میں سے ہوگی، یا پھر اس میں سے کیے گئے انتخابات جو 1963ء میں E.L.MacAdam اور جارج Milne نے شائع کیے تھے۔ لیکن آپ اس انتخاب کے دیباچے میں تحریر کردہ ایک بیان پر جھگڑے میں پڑ سکتے ہیں: "اگر شیکسپیئر انگریزی زبان کی کوئی لغت استعمال کرنا چاہتا تو اسے ضرور اپنی لغت مرتب کرنا پڑتی۔" یہ بات کافی حد تک درست ہے، لیکن "مکمل" درست نہیں۔ 1604ء سے لے کر لکھنا ترک کرنے تک شیکسپیئر اولین انگریزی لغت سے

فائدہ اٹھا سکتا تھا...... رابرٹ کاڈرے کی "اے ٹیبل ایلفا بیٹیکل" جس میں 2500 اندراجات ہیں۔

لیکن لغات کی تاریخ کے ڈانڈے بہت پیچھے اور دیگر علاقوں، مثلاً چین، عرب اور یونان تک جاتے ہیں۔ گیارہویں صدی میں ایک چینی - جاپانی لغت موجود تھی۔ جانسن سے قبل انگریزی میں بہترین لغت Nathan Bailey کی Universal Etymological (1721ء) تھی۔ اس نے جانسن کے کام کی بنیاد فراہم کی۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ جانسن نے کیسے کام کیا اور کیا نئے اصول وضع کیے تھے؟ اس نے کیسے سبقت حاصل کی؟

اگرچہ جانسن کو تمام تحریر کردہ انگریزی روزمرہ ریکارڈ کرنے کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا، لیکن اس نے محض الفاظ کی ایک فہرست بنانے سے انکار کر دیا۔ اس نے نتھان بیلے کی لغت کو بہتر بنانے کے لیے اسے ادبی رنگ دینے کا تہیہ کیا۔ سابق فرانسیسی اور اطالوی لغات کے متعین کردہ خطوط پر چلتے ہوئے اس نے کام کا آغاز کرنے کے لیے ایک "سنہری دور" منتخب کیا۔ اس کی نظر میں یہ سنہری دور سولہویں صدی کے نصف آخر سے لے کر 1660ء کی "انگلش ری سٹوریشن" تک کا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے ہوئے "بہترین مصنفین" کی بنیاد پر ایک لغت تیار کرنے جا رہا تھا، چنانچہ اس نے بار بار اپنا ہی طے کردہ اصول توڑا اور جو سرے بھی رجوع کیا۔

اس نے فرانسیسی لغت نویس سے اختلاف کیا جس نے اپنی زبان کو "ٹھیک" کرنے کے لیے ایک باقاعدہ اکیڈمی قائم کی تھی۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ اس قسم کا استحکام ضروری تھا، لیکن وہ اپنے بوڑھے ہم عصر جوناتھن سوئفٹ کے برعکس یہ مقصد کسی حکومتی پالیسی یا ایجنسی کے تحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے استحکام کی حمایت کرنے کے باوجود الفاظ کا مفہوم روزمرہ کی بنیاد پر بتایا اور مثالیں دیں۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی لغت کے نئے ایڈیشنوں میں کافی بہتریاں پیدا کیں، مثلاً وہ بجلی اور اس میدان میں بنجمن فرینکلن کے کام میں دلچسپی لیتا رہا۔ اس نے طب پر کافی توجہ دی اور اس کے توہماتی اور غیر سائنسی پہلو کو نظر انداز کیا۔ یہاں ہم amber (عنبر) کے متعلق اس کی دی ہوئی تفصیل کا ایک حصہ دے رہے ہیں:

A yellow transparent substance of a gummous or bituminous consistence, but a resinous taste, and a smell like oil of turpentine; chiefly found in the Baltick sea, along the coasts of Prussia... Amber, when rubbed, draws or attracts bodies to it; and, by friction, is brought to light pretty copiously in the dark.

اور fairy یعنی پری کے بارے میں:

A kind of fabled being supposed to appear in a diminutive human form, and to dance in the meadows, and reward cleanliness in houses; an elf; a fay.

جانسن بیہودگی کی وضاحت کرنے کی جرأت بھی رکھتا تھا۔ fart کی وضاحت وہ یوں کرتا ہے:

Fart Wing from behind.
Love is *the fart*
Of every heart
It pains a man when 'tis kept close;
And others offend, when 'tis let loose----- Suckling John Suckling, seventeenth-century poet]
to fart. To break wind behind.
As when we a gun discharge,
Although the bore be ne're so large,
Before the flame from muzzle burst,
Just at the breech it flashes first;
So from my lord his passion broke,
He farted first, and then he spoke--- Swift.

جانسن نے اپنے زوردار اثر کے ساتھ عمومی طور پر لغات کو زیادہ ''مستند'' بنایا۔ یعنی ان کو ''معیاری'' یا ''درست'' کی صورت ملی۔ آج بھی بہت سے لوگ آکسفورڈ یا ویبسٹر ڈکشنری کی تعریف کو حرفِ آخر مانتے ہیں۔ تاہم، سائنسی نکتۂ نظر سے لغت کا مقصد صرف تبدیل ہوتی ہوئی زبان کا بالکل درست ریکارڈ ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ جانسن زبان کے تبدیل ہونے کی حقیقت کا ادراک نہیں رکھتا تھا۔ وہ یقیناً اس بارے میں جانتا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ تر

تبدیلیوں کو انحطاط تصور کیا۔ اب اس نکتۂ نظر کو ''اشرافی'' کہا جاتا ہے۔ لیکن کیا اس قسم کے ''اشرافی'' مفروضات زبان کو اپنا کام زیادہ بہتر طور پر کرنے میں مدد نہیں دیتے؟

آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری کے ایک ایڈیشن کے ایڈیٹر نے فیصلہ کیا کہ جو چیز پہلے غلط ہوا کرتی تھی اب استعمال ہوتے ہوتے ٹھیک ہو گئی ہے......یعنی غلط العام۔ کیا یہ شخص ''سیاسی اعتبار سے درستگی'' پر داد حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی زبان سے اس کا امتیاز چھین لینا چاہتا تھا، یا کیا وہ ایک بہادر آدمی تھا؟ کیا کوئی ''درست'' روزمرہ استعمال ہے بھی یا نہیں؟ کوئی ''غلط العام'' چیز کب درست روزمرہ کی صورت اختیار کرتی ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ جانسن کا جواب کیا اور کس حد تک دوٹوک ہوتا۔ کیا ہمیں وقتاً فوقتاً چند ڈاکٹر جانسنوں کی ضرورت ہے جو زبان کا انحطاط روک سکیں؟ کیا یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر جانسن کس حد تک ''غلط'' تھا؟ کیا اس دنیا کے ڈاکٹر جانسن امتیازات کو مندمل کرنے کی جانب تبدیلی کی رفتار سست کر سکتے ہیں؟ کیا ''مستند'' لغات اس خدا جیسی چیز ہیں جس کے متعلق والٹیئر نے کہا: اگر وہ موجود نہیں تھیں تو کیا انہیں ایجاد کر لینا چاہیے تھا؟

ان سوالات پر غور و خوض کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی مزید امتیاز کیا جانا ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ محتاط یا بیہودہ استعمال اور روزمرہ کے درمیان ایک فرق موجود ہے......یعنی عام لوگوں کی سادہ، جاندار، پراثر اور زندہ زبان جو ہمیں شیکسپیئر یا تھامس ہارڈی کے "Far from the Madding Crowd" ناول میں ملتی ہے۔ کیا جانسن اس کی قوائیت کو بھول گیا تھا جو اصول بھی ہے اور پیش بہا بھی؟ کیا ہم جانسن کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بنائیں کہ اس نے اپنی لغت میں ایکسائز (excise) کا مطلب ''اشیاء پر عائد کیا گیا قابل نفرت ٹیکس'' لکھا؟

تاہم، جانسن کا اصل اثر انگریزی زبان کی بجائے لغات پر تھا۔ اس کی لغت نے انیسویں صدی میں مزید بہتر لغات تیار کیے جانے کے عمل کو تحریک دلائی۔

جہاں تک اس کے ''غیر سائنسی پن'' پر کیے گئے اعتراضات کا تعلق ہے تو زیادہ تر ''غلط ثابت ہوئے'' ہیں۔ وہ اپنی تمام خرابیوں کو دور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہم جانسن اور اس کی کوتاہیوں سے محبت کرتے ہیں......اور وہ ہماری سوچ کو بدستور متاثر کر رہا ہے۔

56

کاندید

"Candide"

فرانسوئز- ماری دی وولٹیئر

1759ء

Francois Marie Arouet، المشہور وولٹیئر اصلی معنوں میں فلسفی تو نہیں تھا لیکن اس نے اپنے عہد کے کسی بھی اور مصنف کی نسبت زیادہ موزوں انداز میں "روشن خیالی" کا جوہر پیش کیا۔ لیکن وولٹیئر اپنے دور کے ذہین آدمیوں کے خیالات پر غور و فکر کی بے مثال قابلیت رکھتا تھا، اور وہ غالباً واحد ایسا مصنف ہے جو دنیائے ادب میں اپنے دور کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ یہ چیز اس

کی تاریخی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

اس کا کردار کئی حوالوں سے تضادات کا شکار ہے: حریص مگر فراخدل، انتقام پرور مگر انسانیت پسند، جھگڑالو مگر نہایت ذہین، عوام کی تحقیر کرنے والا مگر عملی طور پر جمہوریت پسند، وغیرہ۔ وہ کبھی بھی متانت یا حقیقی معنوں میں پختہ دانائی کی منزل نہ حاصل کر پایا اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے مذہبی جذبے کی نفسیات کا کچھ اتا پتہ نہ تھا...... لہٰذا وہ جذباتی حوالوں سے کوتاہ رہا۔ ایک سائنس دان کی حیثیت میں وہ پرجوش مگر غیر محتاط اور ایسے ثبوت کو مسترد کر دینے کا رجحان رکھتا تھا جو اس کی اپنی تھیوریز پر پورا نہ اترتا ہو۔ اس کی حاضر دماغی کا کوئی ہمسر تو شاید موجود ہو مگر اس پر کوئی برتری حاصل نہ کر سکا۔ اس جتنی وسیع النوع دلچسپیاں بھی چند ایک لوگوں کی ہی ہوں گی۔

دیدرو اور وولٹیئر دونوں ہی جان لاک کے فلسفہ سے شدید متاثر تھے (البتہ عیسائیت کے متعلق اس کے دلائل سے نہیں) آئزک نیوٹن کی سائنسی دریافتوں نے بھی انہیں کافی متاثر کیا۔ دونوں نے ہی جان لاک کی تحریروں کے تراجم کیے اور وولٹیئر نے نیوٹن کی فکر کو سمجھنے کے لیے ایک عوامی رہنما کتاب لکھی۔

Arouet de Voltaire پیرس کے ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوا (1694ء) اور یسوعی کالج Louis-le-Grand میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا باپ ایک نوٹری تھا اور بعد میں سرکاری افسر بن گیا۔ وولٹیئر کو بچپن میں توجہ ملی۔ وہ شاعری کی جانب رجحان رکھتا تھا۔ تاہم، اس کی شاعری اور ڈرامہ زیادہ قابل تعریف نہیں۔ ہاں اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہلکی پھلکی نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

نوجوانی میں وہ آزاد خیال دانشوروں کے "لبرٹائن" گروپ کے ساتھ منسلک ہوا۔ باپ نے اسے ان سرگرمیوں سے باز رکھنے کے لیے ہالینڈ میں فرانسیسی سفیر کا قاصد بنا کر بھجوا دیا لیکن اسے ایک نازیبا عشقیہ تعلق کی بنیاد پر واپس بھیج دیا گیا۔ جب باپ نے اسے قانون کا پیشہ اپنانے پر مجبور کیا تو وہ نہایت طنزیہ ہجو لکھنے لگا جس کے نتیجے میں اسے ملک سے باہر اور آخر کار باستیلے (Bastille) بھیجنا پڑا۔ وہ گیارہ ماہ تک وہیں رہا۔

rekhta

باستیلے میں قیام کے دوران اس نے ایک ٹریجڈی Oedipe لکھی جو 1618ء میں شائع ہوئی۔ اپنے پلے سے منافع کا ہوشیاری کے ساتھ اندازہ لگانے کے ذریعے وہ 1722ء میں کافی امیر اور مشہور ہو گیا۔ ابھی اس کی عمر 30 برس بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کامیابی کا یہ پہلا دور زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ چیچک نے اس کا چہرہ بدنما کر دیا، وہ ایک بارسوخ شہسوار (Chevalier) کی چالوں کا شکار ہوا اور پھر انگلینڈ جلاوطن کیے جانے سے پہلے مزید دو ہفتے باستیلے میں رہا۔ اس چیز نے وولٹیئر کو بالغ اور پختہ بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شاعر کی حیثیت میں انگلینڈ گیا اور ایک فلسفی کے طور پر وہاں سے واپس آیا۔ اور یقیناً وہ فلسفی یعنی Philosophe تو ضرور تھا...... منطق کی اولیت پر یقین رکھنے والے تمام فرانسیسیوں کو غلط طور پر یہی نام دیا گیا تھا۔

وولٹیئر 1729ء تک انگلینڈ میں ہی رہا۔ جارج اول کے دربار میں اس کا استقبال ہوا اور وزیراعظم رابرٹ Walpole نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے زبان میں مہارت حاصل کی، ادب کا گہرا مطالعہ کیا (بالخصوص شیکسپیئر کا) اور جوناتھن سوئفٹ، جارج برکلے، شاعر الیگزینڈر پوپ اور جان گے، اور ڈرامہ نگار ولیم کونگریو کے ساتھ تعلقات بنائے۔ چونکہ وولٹیئر انگلینڈ کا رہنے والا نہیں تھا، اس لیے وہ نہایت آسانی سے انگلینڈ کی آڑ میں وہ تمام باتیں کر سکتا تھا جو اسے فرانس کے بارے میں ناپسند تھیں۔ بلاشبہ بعد کی زندگی اس نے زیادہ تسکین حاصل کی جب وہ فضول خرچی کے باعث کنگال لوگوں کو رقم ادھار دینے کے ذریعے اپنی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے قابل ہوا۔ اپنے جیسے تخلیقی جوہر سے محروم جارج برنارڈ شا کی طرح وہ ہمیشہ ایک زیرک کاروباری آدمی کی طرح کام کرتا رہا۔

فرانس واپسی کے چند برس بعد اس نے اپنی Lettres Philosophique (1734ء) شائع کی جسے سرعام نذرِ آتش کیا گیا اور پھر اسے اپنی محبوبہ مادام دی کیطلٹ کی دیہی جاگیر میں پناہ لینا پڑی (جہاں پیرس کا عمل دخل نہ تھا)۔ وہ زچگی کے دوران اپنی محبوبہ کی موت سے کچھ روز پہلے 1749ء میں وہاں سے گیا۔ مادام دی کیطلٹ اپنے نئے عاشق کی مہربانی سے حاملہ ہو گئی تھی۔ ان ''فلسفیانہ مراسلوں'' میں Quakers کی مدح میں مضامین شامل تھے جنہوں نے انگلینڈ میں قیام کے دوران وولٹیئر کو اپنی حقیقی مذہبی لگن کے ذریعہ بہت متاثر کیا تھا۔ کچھ مضامین اینگلیکن کلیسا

کے بارے میں ہیں اور کچھ انگریز حکومت کے نظام اور انگریزی ادب کے متعلق۔ یہ کتاب واقعی ''قدیم طرز حکومت'' (ancien regime) کے خلاف ایک زوردار حملہ تھی...... ''قدیم طرز حکومت'' سے مراد فرانس کا قبل از انقلاب نظامِ حکومت ہے۔ 1778ء میں، وولٹیئر کی موت کے گیارہ برس بعد فرانس میں انقلاب کے باعث یہ قدیم طرز حکومت ختم ہو گیا۔ فرانسیسی ادب کے ایک مورخ نے ''فلسفیانہ مراسلوں'' کے بارے میں لکھا کہ ''یہ اس قدیم طرز حکومت پر براہ راست پھینکا گیا پہلا بم تھا۔''

پروشیا کے فریڈرک اعظم کے دربار میں تین سال گزارنے اور کچھ عرصہ سوئٹزرلینڈ میں رہنے کے بعد وولٹیئر Ferney میں قیام پذیر ہو گیا۔ وہ اپنے آخری المیہ کھیل Irene میں شرکت کے لیے 1778ء میں پیرس آیا اور وہاں ایک بے مثال فتح پائی۔ لیکن وہ اتنا بیمار تھا کہ واپس گھر نہ جا سکا اور پیرس میں ہی مر گیا۔ کلیسیا نے اس کی تجہیز و تکفین سے انکار کر دیا لیکن وہ اس صورتحال کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔ لہٰذا خفیہ طور پر دفن کر دیا گیا۔ 1791ء میں اس کی باقیات Pantheon میں منتقل کر دی گئیں۔

وولٹیئر میں کام کرنے کی صلاحیت کاروباری صلاحیت سے ہرگز کم نہ تھی، اور اس کی تحریریں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اس نے نظمیں، مضامین المیہ ڈرامے' کامیڈیز' متعدد حکایات (جیسے کاندید) لکھیں۔ تاریخ اور سائنس کے بارے میں کئی جلدیں اس کے علاوہ ہیں۔ اس کی ایک تصنیف Dictionarie Philosophique Portatif (1764ء) کو مذہبی عقائد پر تنقید کے بعد جنیوا میں نذرِ آتش کیا گیا۔

وولٹیئر کو جاننے والے لوگوں نے کاندید (Candide) ضرور پڑھا ہوگا...... یا اسے پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ کتاب میں پیش کیے گئے بہت سے مصنفوں کی طرح یہی وہ آدمی اور اس کی تمام تحریریں ہیں جو حقیقی معنوں میں اثر انداز ہوئیں۔ ''کاندید'' میں وہ فطرت کے دو متضاد پہلوؤں کو بیان کرنے اور شاید ان میں مصالحت کروانے کے قابل بھی ہو سکا: یعنی ذاتی رجائیت پسندی اور تاریخی قنوطیت پسندی۔ اس کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلاشبہ موخر الذکر میں شدت آتی گئی۔ اس نے اپنے دور کا خلاصہ پیش کیا اور ''کاندید'' نے اس کا۔ اس چھوٹی سی کتاب کو

عموماً ایک ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں والٹیئر ہستی کے بارے میں کسی بھی قسم کی وضاحت کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس انکار سے کچھ نہ کچھ کام لینے کا خواہش مند بھی ہے۔

کاندید جس صنف میں لکھا گیا وہ کافی حد تک خود والٹیئر کی ہی ایجاد ہے: یعنی فلسفیانہ حکایت (Conte)۔ اس کے Contes میں ظرافت مجرد معاملات کی تضحیک کرنے کی شاندار قابلیت کو زیادہ کثیف بناتی ہے۔ مثلاً اس نے مروج عیسائیت کے بارے میں کہا کہ جو لوگ ہمیں مجرد چیزوں پر ایمان لانے کا کہیں گے ان پر نفرت پھیلانے کا الزام آئے گا۔

''کاندید'' دراصل والٹیئر کی روحانی آپ بیتی ہے، اور یہ اس کے پیغام کو پیش کرتی ہے کہ انسان کے لیے اپنے باغ کو سینچنا بہتر ہے: یعنی وہ دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنے کی بجائے اپنی زندگی کے ساتھ جو کرسکتا ہے کرے، یا پھر نہایت رفیع الشان منصوبوں میں مشغول ہو جائے۔ لیکن وہ ''ہمارے'' باغ کا ذکر کرتا اور یوں یہ بات واضح بناتا ہے کہ وہ خود غرضی پر نہیں بلکہ تعاون پر اصرار کر رہا ہے۔

اس تصنیف کا موازنہ ایک بالکل برعکس نوعیت کی تصنیف یعنی جان بنیان کی "Pilgrim's Progress" سے موازنہ کرنا موزوں ہوگا۔ بنیان کا زائر آسمان کی مسرتوں کی خاطر دنیا کو ترک کرنا چاہتا ہے؛ ''کاندید'' زمین پر جنت تک پہنچنے کا خواہش مند ہے۔ ایک موحد ہونے کے باوجود والٹیئر انسان کی کاملیت حاصل کرنے کی صلاحیت پر یقین رکھتا تھا...... لیکن صرف منطق استعمال کرنے کے ذریعہ۔ لہٰذا اس نے لیبنز کے ''تمام ممکنہ دنیاؤں میں سے بہترین'' کے نظریہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ والٹیئر کا کردار پانگلوس کہتا ہے کہ ''سب اچھا ہے۔'' یہ زبردست کہانی والٹیئر کا یہ تھیسس پیش کرتی ہے کہ اگر انسان منطق کا استعمال نہ کرے تو دنیا بالکل انکل پچو، بے ہنگم اور کسی حکمت عملی سے عاری؛ کوئی قابل بھروسہ باطنی راہ عمل موجود نہیں۔ البتہ مرکزی پیغام یہ ہے کہ مابعد الطبیعیاتی خیال آرائی کا مقام عملی کام کے بعد ہونا چاہیے۔ کاندید میں اتنا کچھ موجود ہے کہ وہ ہر قسم کے، مذہبی یا غیر مذہبی قاری کو مطمئن کرسکتا ہے۔

57

عقلِ سلیم

" Common Sense "

ٹامس پین

1776ء

بہت سے قارئین کو موثر ترین کتب کی اس فہرست میں ٹامس پین کی ''عقل سلیم'' (Common Sense) شامل ہونے کی توقع نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ اس کی کتاب ''رائٹس آف مین'' (1791ء) کے متعلق یہاں پڑھنے کی امید میں ہوں گے۔ تاہم، عقل سلیم یا کامن سینس نے بلاشبہ ''امریکی

rekhta

بغاوت'' کو مہمیز دی اور ''دی رائٹس آف مین'' کی نسبت واقعات کے بہاؤ کو زیادہ متاثر کیا۔

تھامس پین 1737ء میں Thetford کے مقام پر نارفوک میں پیدا ہوا۔ وہ ایک کوئیکر (خائفین Quaker-) کا بیٹا تھا۔ تھامس کی ابتدائی زندگی ناکامیوں کا شکار تھی۔ پائیدار Whig رابرٹ والپول بدستور وزیراعظم تھا۔ تھامس نے کچھ عرصہ تک اپنے باپ کے ساتھ کام کیا جو ماہر کورسیٹ ساز (Corsetmaker) تھا۔ لیکن اس کا باپ ایک سخت گیر انسان تھا۔ اس نے بعد میں لکھا:

> اگرچہ میں ان (کوئیکرز) کی انسان دوستی کا احترام کرتا ہوں، مگر اس تصور پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر تخلیق کے وقت کسی کوئیکر سے مشورہ کیا گیا ہوتا تو یہ کس قدر پھیکی اور بدرنگ تخلیق ہوتی۔

اس نے کوئی بھی ملازمت زیادہ دیر تک نہ کی۔ وہ سسیکس میں برائٹن کے قریب Lewes کے مقام پر ایکسائز افسر کے قابل نفرت عہدے پر فائز ہوا اور فرائض انجام نہ دے سکا۔ آخر کار اسے ان لوگوں نے فارغ کر دیا جو واجبات کی وصولی میں اپنے جدید ہم عہدہ افراد کی نسبت زیادہ پرجوش تھے۔ اس فراغت کی وجہ یہ بھی تھی کہ تھامس پین مسلسل اجرتوں میں اضافے کی مہم چلا رہا تھا۔

لیکن لندن میں تھامس پین کی ملاقات اولیور گولڈسمتھ اور امریکی بنجمن فرینکلن جیسے قلم کاروں سے ہوگئی۔ فرینکلن نے اسے اپنے داماد رچرڈ Bache (جو فلاڈلفیا میں تھا) کے نام ایک تعارفی خط دیا اور وہ نومبر 1774ء میں وہاں جا بسا۔ Bache نے اسے ''فلاڈلفیا میگزین'' میں کام دیا۔ تھامس پین نے جلد ہی اس کی سرکولیشن تین گنا کر دی۔

انگلینڈ میں تھامس کی حالت ماہی بے آب جیسی تھی۔ اب 37 سال کی عمر میں اس نے خود کو پرجوش اور اصل دلچسپی میں مصروف پایا۔ فلاڈلفیا میں قیام کے پہلے سال کے دوران اس نے غلامی کے خلاف ایک بے باک مضمون ''امریکہ میں افریقی غلامی'' شائع کیا۔ جلد ہی ہر کوئی اس سے دنیا کے ہر موضوع پر مشورے لے رہا تھا۔ اس کا طرز عمل اس ''بے کیفی'' کے عین الٹ تھا جو اسے اپنے والدین میں ناپسند تھی: واضح، سادہ اور سلیس حقائق پر مبنی جن پر وہ مطلق

بھروسہ کرتا تھا۔

''کامن سینس'' برک کی زیادہ ادبی اور زیادہ پیچیدہ تصنیف سے کہیں آگے تک گئی۔ تھامس برک کی طرح بغاوت کے حقوق کے متعلق پریشان نہ تھا۔ ''کامن سینس'' بے باک انداز میں آزادی کی حمایت سادہ اور ناقابل تردید بنیادوں پر کرتا ہے۔ تقریباً پچاس لاکھ کاپیاں فروخت ہوگئیں اور ''اعلان آزادی'' پر اس کا اثر بھی عہد ساز تھا۔ شروع میں بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ یہ کتاب خود فرینکلن یا جان ایڈمز نے لکھی ہے۔ بہرحال بعد ازاں جان ایڈمز نے کہا تھا کہ ''تھامس کی قلم کے بغیر واشنگٹن کی تلوار کوئی کام نہ دکھا سکتی۔''

چند ایک لوگ ہی ایسے تھے جو تھامس پین جیسی جرأت اور قابلیت کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ محتاط جارج واشنگٹن نے جلد ہی ''کامن سینس'' کی اہمیت کو تسلیم کر لیا۔

''کامن سینس'' واقعات کی روشنی میں درست ثابت ہونے کی تمام خوبیاں رکھتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خوبیاں غیر واضح ہوتی ہیں مگر یہاں تھامس پین یقیناً ناگزیر امر پر زور دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک سیاسی مضمون ''امریکی بحران'' میں امریکیوں کے غالب احساسات کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا: ''یہ ایسا دور ہے جب انسانوں کی روحیں آزمائش سے گزر رہی ہیں۔'' (عین انہی دنوں میں واشنگٹن پسپائی اختیار کر رہا تھا)۔

تھامس نے ''کامن سینس'' میں اپنے عمومی سیاسی خیالات کا اظہار کرنے میں احتیاط سے کام لیا۔ وہ ابتداء ان الفاظ کے ساتھ کرتا ہے:

> ''کچھ قلم کاروں نے معاشرے کو حکومت کے ساتھ اس قدر گڈمڈ کر دیا ہے کہ ان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں رہنے دیا؛ حالانکہ وہ نہ صرف مختلف ہیں، بلکہ ان کا ماخذ بھی مختلف ہے۔ معاشرہ ہماری ضرورتوں اور حکومت ہماری مکاری کی پیداوار ہے۔ معاشرہ ہماری محبت کو متحد کرنے کے ذریعہ ہماری مسرت کو ''مثبت طور پر'' فروغ دیتا ہے اور حکومت یہ کام کرنے کے لیے ''منفی طور پر'' ہماری برائیوں کو پابند محدود کرتی ہے۔ ایک میل جول کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دوسرا امتیازات پیدا کرتا

ہے۔ معاشرہ سرپرستی کرنے والا اور حکومت سزا دینے والی ہے۔

بہ الفاظ دیگر حکومت ایک لازمی برائی ہے۔ لیکن بعد ازاں ''دی رائٹس آف مین'' میں ٹامس پین نے واضح کیا کہ وہ عوام کا اپنی حکومتوں سے پنشن، طبی بہبود اور تعلیم کے حقوق مانگنا ''فطری'' سمجھتا تھا۔

پین اپنے نہایت انقلابی نظریات کے باوجود بہت کم لوگوں کی ناپسندیدگی کا نشانہ بنا۔ اس کی وجہ وہ خصوصیت ہے، جس کی بنیاد پر اس نے اپنی موثر ترین تصنیف کا نام بھی رکھا: عقل سلیم۔ اس کی کہی ہوئی زیادہ تر باتیں حقیقت پسندانہ ہیں۔ برطانیہ کے وزیر اعظم (1784ء تا 1801ء) ولیم Pitt نے کہا تھا کہ ''ٹامس پین نے بالکل درست کہا ہے، لیکن میں کیا کروں؟ موجودہ حالات میں اگر میں ٹامس پین کی آراء کو ہوا دوں تو ہمارے ملک میں ایک خونی انقلاب برپا ہو جائے گا۔''

لیکن اس کے باوجود ٹامس مرنے کے بعد بھی لعن طعن کا نشانہ بنا۔ صدر روز ویلٹ نے اسے ''چھوٹا سا گندا ملحد'' قرار دیا حالانکہ وہ اپنی زندگی کو خدا کی دین سمجھتا تھا۔ وہ محض روچیل، نیویارک میں ایک گھر بنا کر اس میں رہ سکتا اور امیر آدمی بن سکتا تھا۔ لیکن وہ دریائے Schuylkill پر ایک آہنی پل باندھنا چاہتا تھا۔ کسی نے کبھی بھی اس منصوبے کے لیے رقم نہ دی۔ چنانچہ 1787ء میں اس نے واپس یورپ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے پل کے لیے تیار کردہ ڈیزائن دکھانے پیرس گیا، اور پھر اپنی بوڑھی ماں سے ملنے واپس گھر آیا۔ وہ Burke اور فرانسیسی انقلاب کے شوقین افراد کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے قابل تھا۔ اس موقع پر Burke عمدہ انگلش اداروں کے لیے توصیف اور خوف کے درمیان منقسم تھا۔ ٹامس نے اس کی "Reflections" کا مطالعہ کرنے پر لکھا کہ وہ اسے ''انسانیت کا دوست'' خیال کیا کرتا تھا۔ اگرچہ کچھ ہی عرصہ بعد ڈربی شائر میں اس پل کی ایک نقل تعمیر کر لی گئی لیکن ٹامس نے فرانس چلے جانا بہتر خیال کیا۔ لیکن وہاں وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا: وہ لوئی XVI کو بچانے کے الزام میں سزائے موت سے بال بال بچا تھا۔ وہ فرانس میں ناکام تو رہا لیکن 1802ء میں امریکہ واپسی سے قبل بہت سے دیگر افراد کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اگرچہ اس نے امریکہ میں کچھ اہم اور دلچسپ تحریریں لکھیں لیکن وہ اداس تھا۔ تقریباً ہر کسی نے اسے غدار کہا اور جیفرسن کو اسے امریکہ واپسی میں مدد دینے پر تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ اب پرانے انقلابی لوگ رجعت پسند بن چکے تھے۔ اس کے لیے تعزیتی کلمات (1809ء) میں کہا گیا کہ ''وہ کافی عرصے تک زندہ رہا۔ اس نے تھوڑی بہت نیکی کی اور بہت سا نقصان پہنچایا۔'' لیکن اسے آج بھی پڑھا جاتا ہے، اور اگرچہ امریکی اپنی آزادی میں اس کا کوئی کردار تسلیم نہیں کرتے، لیکن اس نے اس عمل کو مہمیز ضرور دی تھی۔

58

دولت اقوام کی نوعیت اور وجوہ پر تحقیق

"An Enquiry Into the Nature and Causes of the Wealth of Nations"

ایڈم سمتھ

1776ء

بلاشبہ سکاٹ ایڈم سمتھ (1723ء تا 1790ء) نے معاشیات کی سائنس کی بنیاد رکھی۔ تاہم، بیسویں کے ایک بہت موثر ماہر معیشت جوزف شوم پیٹر نے ایڈم سمتھ کی شاہکار تصنیف کے

بارے میں لکھا کہ "اس میں ایک بھی ایسا تصور، اصول یا طریقہ کار شامل نہیں جو 1776ء میں نیا ہو۔" یہ بات غالباً ٹھیک ہے لیکن یہ امر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نئے خیالات کے عظیم پرچارک اور وضع کار شاذ ہی کلیتاً اوریجنل ہوتے ہیں، وہ تو بس اپنے دور کے نئے خیالات کو یکجا کر کے مربوط انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ اگر ایڈم سمتھ نہ ہوتا تو آج ہم معاشیات پر اس طرح گفتگو نہ کر تے جیسے کر رہے ہیں۔ بہر حال کیا "معاشیات" کو واقعی ایک سائنس قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب نہیں میں ہے۔ لوگوں نے اس کے بارے میں سائنسی رویہ اپنانے کی کوشش کی، لیکن یہ انسانی طرزِ عمل میں موجود غیر منطقی عناصر کے ساتھ اس قدر قریبی طور پر منسلک ہے کہ سائنسی طریقہ کار کی زد میں نہیں آتی۔ "معاشی قوانین" میں سے کوئی بھی قطعی معنوں میں کارآمد نہیں۔ بہر حال عام لوگوں کی طرح مارکسسٹ بھی معاشیات کی کارکردگی کے حوالے سے اپنے نظریات سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

ایڈم سمتھ Kircaldy کے ایک جج کے گھر پیدا ہوا، گلاسگو اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ گلاسگو یونیورسٹی میں منطق اور اخلاق فلسفہ کا پروفیسر بنا اور 1759ء میں "اخلاقی جذبات کی تھیوری" شائع کی۔ اس کتاب نے ایک امیر اشراف زادے کو ایڈم سمتھ کی سرپرستی کرنے پر مائل کیا۔ لہٰذا اس نے پڑھانے کا کام چھوڑا اور اپنی مشہور ترین تصنیف پر کام میں مصروف ہو گیا۔ طویل محنت سے تیار کی گئی یہ کتاب آج بھی کلاسیکی معاشیات کی بائبل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایڈم سمتھ کے پیش روؤں میں برنارڈ دی مانڈویل (1607ء تا 1733ء)...... جسے وہ "مکار" کہتا ہے...... اور ڈاکٹر سیموئیل جانسن جیسے مفکرین شامل تھے۔ مانڈویل کا تھیسس مختصر تھا: "نجی برائیاں، عوامی فائدے" (Private vices, public benefits)۔ ڈاکٹر جانسن اسے یوں بیان کرتا ہے، "آپ غریبوں کے ساتھ بھلائی کیے بغیر رقم خرچ نہیں کر سکتے...... تعیش بہت سی فلاح پیدا کرتا ہے۔" اپنے مقامی سیٹھ کو یہ بات بتائیں جب وہ خصوصاً اپنی مچھلیوں کے استعمال کے لیے تیسرا سوئمنگ پول تعمیر کر رہا ہو، اس کے رقصِ مسرت میں فلسفیانہ رنگ پیدا ہو جائے گا...... لیکن ماہرین معاشیات کو اس کی فلاح سے دلچسپی نہیں۔ مانڈویل اور جانسن کا کہنا درست تھا۔ صرف یہ بات قابل سوال ہے کہ حکومتوں کو یہ مفروضہ کس حد تک استعمال کرنا چاہیے، یا یہ ہر

ایک کے لیے کس حد تک فائدہ مند ہے؟

ایڈم سمتھ کے متعدد بنیادی خیالات اس کے دوست ڈیوڈ ہیوم سے اخذ کردہ ہیں، بالخصوص اس کا ''ہمدردی'' کا نظریہ۔ بلاشبہ یہ نظریہ سمتھ کے اخلاقی نظام کی بنیادی اینٹ ہے۔ ہیوم کے استاد فرانس ہچیسن (1694ء تا 1746ء) نے بھی سمتھ کو متاثر کیا جو یہ یقین رکھتا تھا کہ سیاسی زندگی کی بنیاد اعلیٰ ترین مسرت کے حصول پر ہونی چاہیے۔

لیکن سمتھ نے رواقیوں (Stoics۔ مثلاً مارکس آریلیس) کے عقائد کا اثر بھی قبول کیا۔ چنانچہ سمتھ کا ''نیک آدمی'' اپنے نیک اور بد دونوں خیالات پر ''کامل اختیار'' رکھتا ہے اور اس کا مقصد ''دوسروں کے لیے خالص اور ہمدردی کے جذبات'' رکھتا ہے۔

چنانچہ ایڈم سمتھ آزادی، اور کچھ موقعوں پر بے لگام حرص کا بھی پرچار کرتا ہے۔ اس پر موخر الذکر الزام بے جا ہے۔ غالباً اس کے خلاف شوم پیٹر کے جذبات قابل توجیہ تھے۔ لیکن شوم پیٹر مارکس کے برخلاف یقین رکھتا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام انجام کار اپنی ناکامیوں نہیں بلکہ کامیابی کی وجہ سے سوشلزم کے لیے حالات ہموار کرے گا۔ 1930ء اور 1940ء کی دہائی میں ترقیوں کو بہ نظر تحسین دیکھنے والا کوئی ایڈم سمتھ جیسا شخص شاید اس بات سے متفق ہو جاتا۔

تاہم، شوم پیٹر کے تحفظات کے باوجود ایڈم سمتھ کی ''انکوائری'' نے معاشیات کی ظاہری شکل تبدیل کر دی: اور اس نے بیشتر ایسے تصورات متعارف کروائے جو آج بھی اس کی تہہ میں موجود ہیں۔ سمتھ نے نہایت باا‌ثر اور استدلالی انداز میں اس نظریے کی حمایت کی کہ خود غرض طرز عمل کے نتائج ایثار پسندانہ (بے غرضانہ) ہوتے ہیں۔ اس نے نرم انداز میں یہی بات کی۔ تاہم، اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ ایک امیر آدمی کا کسی جسم فروش عورت کی خدمات سے حظ اٹھانا ایک سماجی فائدہ رکھتا ہے۔ نرم خو اخلاقیات پسند سمتھ نے اس قسم کے طرز عمل کو نامنظور کیا اور کہا کہ انفرادی ''غیر اخلاقی پن'' معاشرے کو داغ دار کر دیتا ہے۔

Enquiry کو تخلیق دولت کے عمل کے مطالعہ کی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ اس دور کے تمام نہاد تجارت پسند، تاجر اور ریاست کار یقین رکھتے تھے کہ دولت ایک سازگار کاروباری توازن کی پیداوار ہے۔ حامیان قدرت شاہی (Physiocrats) کے فرانسیسی مکتبہ کا کہنا تھا کہ دولت زمین

سے اخذ کی گئی، لہٰذا وہ عدم مداخلت اور تمام رکاوٹیں دور کرنے پر زور دیتے تھے۔

سمتھ کا اثر اس وقت اپنی انتہا کو پہنچا جب اس نے اصرار کیا کہ دولت کا انحصار ''تقسیم محنت'' پر ہے۔ افلاطون کی ریاست میں اس کی وضاحت پہلے سے موجود تھی۔ یہ محض ایک عمل ہے جس کے ذریعہ محنت کو سب سے زیادہ پیداواری سرگرمی میں لگایا جاتا ہے: آپ کرسیاں بناتے ہیں، میں کتابیں تیار کرتا ہے، ہم ضرورت کے مطابق ان کا تبادلہ کر لیتے ہیں، وغیرہ ''انکوائری'' کی حد سے زیادہ رجائیت پسند کتاب چہارم میں سمتھ آزاد منڈی کی خوبیاں اور اچھائیاں پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں آزاد منڈی...... خود غرضی کے باوجود...... سب کے لیے مفید ہے، چنانچہ مصنوعات تیار کرنے والا ایک خود غرض شخص، ہر ممکن حد تک خود غرض بننے کی خاطر ایسے مصنوعات تیار کرتا ہے جنہیں لوگ اپنی مرضی کی قیمت پر خریدنا پسند کرتے ہوں۔ مرکزی خیال ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

ہر شخص اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے متواتر جو فطری کوشش کرتا ہے وہ سیاسی معیشت کے برے اثرات کا تدارک کر دیتی ہے...... اس قسم کی ایک سیاسی معیشت دولت اور خوشحالی کی جانب کسی قوم کے فطری جھکاؤ کو کلیتاً روکنے کے قابل نہیں۔

ایڈم سمتھ کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے خود کسی معاشی پالیسی کی ہدایت کاری نہ کی۔ لیکن اس نے معاشی پالیسی نافذ کرنے کے انداز کو اپنی موت کے تقریباً ایک سو برس بعد تک متاثر کرنا جاری رکھا۔ شاید سرمایہ دارانہ نظام کے لیے اس کی ناپسندیدگی ہی اس کی سب سے زیادہ پرکشش خصوصیت تھی۔

59

سلطنتِ روما کے انحطاط اور زوال کی تاریخ

"The History of the Decline and Fall of the Roman Empire "

ایڈورڈ گبن

1776ء تا 1787ء

''میں ماں کا نظر انداز کیا ہوا، نرس کے ہاتھوں فاقوں کا شکار ایک لاغر بچہ تھا جس کا بہت کم خیال رکھا گیا۔'' یہ جملہ ایڈورڈ گبن نے خود نوشت سوانح میں اپنے بارے میں لکھا تھا جو اس کی

موت کے بعد (1796ء) شائع ہوئی۔ گبن جنوبی لندن میں پٹنی کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ پارلیمنٹ کے ایک امیر کبیر Tory رکن کا کمزور سا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے گوشہ گیری اختیار کر لی اور اسے خالہ کے سپرد کر گیا۔ گبن نے ویسٹ منسٹر سکول اور پھر کچھ دیر مگدلین کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی، کیتھولک ازم اختیار کیا اور یوں ایک کیلونسٹ وزیر کو ''شفاء'' دینے کی خاطر اس کے ہمراہ Laussanne، سوئٹزرلینڈ گیا۔ Ferney کے مقام پر اس کی ملاقات والٹیئر سے ہوئی، وہاں ایک خاتون کی محبت میں مبتلا ہوا، محبت کو ایک فرزندانہ فرض قرار دیا (''ایک عاشق کے طور پر آہیں بھریں لیکن ایک بیٹے کی طرح اطاعت کی'') اور مطالعہ میں مگن ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہنے لگا۔ بہر حال اس نے عہد جوانی کی محبوبہ سے محبت جاری رکھی جس نے مشہور ولیہ مادام دی Stael کو جنم دیا۔

ہیمپ شائر ملیشیا میں کچھ دیر گزارنے کے بعد اس نے وہ تصنیف لکھنا شروع کی جسے آج تک کی سب سے زیادہ شاندار تاریخ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور ادب دونوں کی حیثیت رکھتی ہے: سلطنت روما کے انحطاط اور زوال کے اسباب۔'' یہ پرشکوہ ڈرامائی تصنیف شیکسپیئر کے تحریر کردہ نہایت اوٹ پٹانگ تاریخی سلسلے پر مبنی ڈراموں جیسی ہے، لیکن شیکسپیئر کے برعکس گبن زیادہ تر جگہوں پر تاریخی حوالے سے درست ہے۔ دوستوں نے اس کی توجہ اس ناممکن منصوبے سے ہٹانے کی ہر کوشش کر دیکھی تھی۔

گبن کی پیدائش کے سال، 1737ء، میں معروضی اور تعصب سے پاک تاریخ لکھنے کی کوئی اچھی کوشش موجود نہ تھی، حتیٰ کہ یونانی و رومی مورخین کے دور میں زیادہ بہتر کوششیں کی جا چکی تھیں۔ اصل خرابی کی وجہ (اگر اسے خرابی کہا جا سکتا ہے) عیسائیت نہیں بلکہ عیسائی بنیاد پرستی تھی جس نے ہر قیمت پر کشادہ ذہنی تحقیق کو دبایا۔

گبن وہ پہلا شخص تھا جس نے ایک طویل دور کی پہلی غیر متنازعہ عظیم تاریخ لکھی۔ لیکن اس سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے ایسی کوششیں کی تھیں۔ مثلاً فرانسیسی چارلس ڈی Secondat (1689ء تا 1755ء) کے بغیر ''انحطاط'' لکھی ہی نہ جا سکتی۔ اس کی شاہکار تصنیف ارسطو کی ''سیاست'' کے بعد اس موضوع پر پہلی جامع کتاب تھی۔ اس کے لکھے جانے کے وقت گبن گیارہ

برس کا تھا۔ Secondat نے کھوج لگانے کی کوشش کی تھی کہ انسانی وجود کی حیرت انگیز رنگارنگی کے پیچھے کونسے قابل دریافت اصول کارفرما تھے۔ اس نے ''چیزوں کی فطرت'' دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آب وہوا کے اثرات پر بہت زیادہ زور دیا، اور یہ کام منظم انداز میں کرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔ وہ سوال کرتا ہے کہ کیا انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے پیچھے کوئی عظیم فطری قانون موجود ہے؟ وہ اس کا جواب ہاں میں دیتا اور نتیجہ پیش کرتا ہے کہ اس قانون کو سمجھنے کے ذریعے انسان اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے۔

Secondat کا زیادہ اثر انگلینڈ نے نہیں بلکہ سکاٹ لینڈ نے قبول کیا۔ سکاٹ ڈیوڈ ہیوم کی اپنی شاندار تصنیف ''انگلینڈ کی تاریخ'' Secondat سے فیض یافتہ ہے۔ ایڈم سمتھ کی ''دولت اقوام'' بھی کافی حد تک Secondat کے کام سے متاثر ہے۔

اس سے پہلے تاریخ کی غیر مذہبی تعبیر میکیاویلی اور دیگر نے شروع کی تھی۔ دریں اثناء کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں دھڑوں کے راسخ العقیدہ افراد محض تخیل بازی ہی کرتے آئے تھے۔ اگر وہ ''غلط'' نتائج اخذ نہ کرنے میں احتیاط نہ کرتے تو انہیں بھی کافر قرار دیا جا سکتا تھا۔ خود گبن نے بھی ٹیلین میبلون (1632ء تا 1707ء) اور برنارڈ مونٹ فوکان (1655ء تا 1741ء) کے جمع کردہ حقائق اور دستاویزات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے لوڈوویکو میوریٹوری (1672ء تا 1741ء) سے بھی کافی کچھ لیا۔

والٹیئر اور Secondat میں کافی کچھ مشترک تھا لیکن درحقیقت وہ روشن خیالی کی قوس قزح کی عین مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔

1763ء سے قبل گبن نے متعدد ایسے موضوعات پر غور کیا جو فلسفیانہ تجزیہ کا حوالہ بن سکتے تھے: سر والٹر ریلے کی زندگی، سوئٹزرلینڈ کی تاریخ اور دیگر۔ لیکن اسی سال وہ فوج کی ملازمت سے فارغ ہوا اور واپس اٹلی کی جانب سفر کیا۔ وہاں ''آثار قدیمہ کے درمیان بیٹھے ہوئے...... اس شہر کے انحطاط اور زوال کی کہانی لکھنے کا خیال پہلی مرتبہ ذہن میں آیا۔'' تیرہ سال بعد پہلی جلد منظر عام پر آئی۔ ساتھی مورخین نے اسے بہت سراہا لیکن اسٹیبلشمنٹ کے مذہبی عہدیداروں نے گبن کو جانبداری اور ادبی سرقہ بازی کا ملزم ٹھہرایا۔ چنانچہ اس نے 1779ء میں اپنی Vindication

(برأت) ترتیب دی جو تمام ادب میں شدید ترین دندان شکن جواب تھا۔ اس نے نہایت بے ایمان نقاد Davis کے بارے میں لکھا:

> بدقسمتی سے مسٹر ڈیوس نے پڑھنے سے پہلے ہی لکھ ڈالا۔ اس نے میرے اقتباسات میں ملنے والی اسناد کو ہی استعمال کیا اور بڑی بے باکی کے ساتھ میرے خلاف اپنی شہرت سے کام لیا۔

اس کے بعد وہ ڈیوس اور اپنے دیگر مخالفین کا جواب دیتا ہے۔ اگر وہ اتنا فصیح اللسان نہ ہوتا تو یہ نقاد اسے زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔

گبن 1763ء میں واپس لوسانے آیا اور وہیں اس کو مکمل کیا۔ اگر وہ ایک ملازمت کی پیش کش قبول کر لیتا تو اسے لندن جانا پڑتا۔ لیکن اس نے انسانیت پسندی اور جوہر قابل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: ''ایکسائز کا کمشنر! یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح ہے۔''

گبن میں ''ادبی رنگ'' موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نے اپنے مطالعہ کو بنیاد بنا کر تاریخ لکھی: لیکن اس نے یہ کام کرنے کے لیے حقائق کے اس خزانے سے فائدہ اٹھایا جو نتائج اخذ کرنے سے خوفزدہ تاریخ نگاروں کی محنت کا ثمر تھے۔ اس نے اپنی تصنیف میں مددگار ثابت ہونے والے مصنفوں کا شکریہ ادا کیا۔ ابتدائی چند لائنیں واضح کر دیتی ہیں کہ وہ زوال سے پہلے کے روم کو کیسا تصور کرتا تھا:

> عیسوی عہد کی دوسری صدی میں سلطنت روما نے کرۂ ارض اور تہذیب یافتہ نوع انسانی کا زیادہ تر حصہ حاصل کر لیا۔ قدیم شہرت اور منظم جذبہ اس وسیع و عریض حکومت کی سرحدوں کا محافظ تھا۔ قوانین اور آداب کے مدھم مگر طاقتور اثر نے آہستہ آہستہ صوبوں کے اتحاد کو مضبوط کیا۔ اس کے پرامن باشندوں نے دولت اور تعیش سے حظ اٹھایا اور اس کا غلط استعمال بھی کیا۔ ایک آزاد آئین کے تصور کا احترام کیا جاتا تھا: رومن سینیٹ مطلق حاکمیت کا مالک معلوم ہوتا تھا، اور شہنشاہوں کو حکومت چلانے کے تمام اختیارات دیے گئے تھے۔ تقریباً 80 سال (98 تا 180 عیسوی) کے ایک پرمسرت عہد کے

دوران عوامی امور نیروڈراجن، ہیدریان اور انتونی اول و دوم نے احسن انداز میں چلائے......

اس نے عیسائیت کی جانب اپنے رویے کے باعث اپنے مداح ہم عصروں کو بھی حیرت زدہ کر دیا۔ وولٹیئر کی طرح وہ بھی موحد تھا جسے مذہب کے حقیقی پہلو کی زیادہ فراست نہ تھی۔ لیکن یہ بات قارئین کے مفاد میں گئی۔ اس طرح وہ مذہب کے سیکولر پہلو کو ایک سماجی مظہر کے طور پر دیکھنے کے قابل ہو سکا۔ اس نے بڑے مذاہب کو محض مقامی مسالک کی پیداوار قرار دیا اور کہا کہ ان کی اشاعت روحانی کی بجائے اتفاقی حالات کے باعث ہوئی۔ شاعر ٹامس ہارڈی نے غالباً گبن کے اثر کے تحت ہی اپنے ڈرامے "The Dynasts" میں عیسائیت کو ''ایک چھوٹا سا مقامی مسلک'' قرار دیا۔

''سلطنت روما کا انحطاط اور زوال'' کی بہترین تلخیص کرنے والے Trevor-Roper کو یقین تھا کہ گبن (جو پارلیمنٹ کا رکن بنا) ایک سیاست دان تھا اور منطق نے اسے ایک انقلابی بنا دیا۔ یہ ایک منصفانہ رائے ہے۔ ''انحطاط اور زوال'' عظیم انسانیت پسند تصنیفات میں سے ایک ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں بھی ہیں جو گبن نے نہیں کیں بلکہ ان کی وجہ اس وقت دستیاب سہولتوں کا فقدان تھا۔ ''انحطاط اور زوال'' کی سب سے بڑی خامی مذہبی جذبات کو نظر انداز کر دینا ہے، لیکن وہ ہمیں یہ ضرور بتاتا ہے کہ مذہب کے نام پر کس قسم کی زیادتیاں کی جا سکتی ہیں۔

60

پاکیزہ استدلال کا تنقیدی جائزہ

"Critique of Pure Reason"

ایمانوئیل کانٹ

1781ء (1787ء میں نظرِ ثانی)

کانٹ کے مداح آرتھر شوپنہاور نے کہا تھا ''کسی عظیم ذہن کی تخلیق میں غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر دینا بہت آسان لیکن اس کی قدر و قیمت کے بارے میں وضاحت کرنا بہت مشکل کام ہے'' کچھ کے خیال میں کانٹ جدید ادوار کا عظیم ترین فلسفی ہے...... افلاطون یا ارسطو کا ہم سر...... مگر یہ خیال ایک چھوٹی سی اقلیت کا ہی ہے۔ بہر حال یہ ایک مصنوعی بیان ہے۔

اس کا مقصد لوگوں کو سمجھنے کی بجائے محض انہیں درجہ بند کر دینا ہے۔ قطعی بات یہ ہے: کہ ایک اہم حوالے سے کوئی بھی پڑھا لکھا شخص کانٹ پسند ہے یا پھر نہیں ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک عظیم رتبہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مارٹن ہیوبر کو کانٹ پسند اور برٹرینڈ رسل کو اس کے برعکس قرار دینے کا مطلب کیا ہے؟

کانٹ نے نہ صرف فلسفے بلکہ تکوینیات (Cosmology) اور حتیٰ کہ علم فلکیات میں بھی خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ اس نے انگریز ماہر فلکیات ولیم ہرشل کے مشاہدے سے چند برس پہلے ہی یورینس سیارہ موجود ہونے کی پیش گوئی کر دی تھی۔ کانٹ کی ایک ابتدائی تصنیف ''فطرت کی عمومی تاریخ اور افلاک کا نظریہ'' (1755ء) تعوثی دائرہ عمل کے اندر رہتے ہوئے کاسموس کا ارتقاء بیان کرنے کی اولین حقیقی کوشش تھی۔ کانٹ نے دیکھا کہ کائنات ہنوز زیرِ تعمیر تھی۔

بعد ازاں اس نے اپنی تین "Critiques" کے ذریعہ کہا کہ اس کی کوششیں فلسفہ میں ایک ''کاپرنیکی انقلاب'' کی ہم پلہ تھیں۔ کاپرنیکس خود بھی مشرقی پروشیا میں رہا اور وہاں کام کیا۔ کانٹ کی اصل اہمیت اخلاقیات اور مذہب میں ہے۔ سائنس میں اس کا کام فلسفے کے سامنے ہیچ ہو گیا۔

تاہم، یہاں ہم فلسفہ میں اس کی صرف ایک عظیم ترین حصہ داری پر بحث کریں گے: یعنی اس کا یہ بیان کہ ''ہم کس حد تک جان سکتے ہیں۔'' کانٹ سے پہلے بیشتر فلسفیوں نے تصور کیا تھا کہ دنیا کے بارے میں ہمارا تمام علم لازماً اس میں موجود اشیاء سے مطابقت رکھتا ہے۔ لاک، برکلے، ڈیوڈ ہیوم کے ہاں یہ چیز واضح ہے۔ کانٹ نے اس کو بالکل الٹا کر رکھ دیا۔ پہلے بھی کچھ لوگوں نے ایسا کرنے کا سوچا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی کانٹ جیسا بہادر نہ تھا۔

اس نے لکھا: ''آیئے آزما کر دیکھتے ہیں...... فرض کریں کہ اشیاء ہمارے علم سے مطابقت رکھتی ہیں۔'' لہٰذا اس نے سوچا کہ دنیا حقیقتاً ''بذاتِ خود اشیاء'' سے مل کر بنی ہے، اور ہرگز قابلِ معلوم نہیں ہے۔ (برکلے کی طرح اس کے پاس گہری تشکیک کے لیے فرصت نہ تھی۔) لاک اور حتیٰ کہ ہیوم بھی دنیا کی اصل نوعیت کے متعلق پریشان ہوا تھا، کانٹ نے تمام پریشانی کو ختم کرتے ہوئے لکھا:

> ہماری تمام بصیرت محض چیزوں کے ظاہری پن کی ہی نمائندہ ہے......
> ہمارے ادراک میں آنے والی چیزیں بذاتِ خود وہ نہیں جیسا کہ ہم ان کا ادراک کرتے ہیں...... ظاہری صورتوں کی حیثیت میں وہ بالذات موجود نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان کا وجود صرف ہمارے اندر ہے۔ ہم اب بھی نہیں جانتے کہ...... اشیاء بذاتِ خود کیا ہیں۔

کانٹ نے نامعلوم ''مظہرِ فطرت'' کو ایک علتِ مظہر (Noumenon) یا ''ماورائی معروض'' کہا...... یوں اسے ایک ماورائی عینیت پسند کے طور پر جانا جانے لگا۔ لیکن اسے ایسا فلسفی نہیں کہا جا سکتا جو برکلے کی طرح قائل ہے کہ مادہ وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس نے برکلے پر تنقید کی کہ ''اس نے مادے کو محض ایک التباس'' بنا کر رکھ دیا۔ کانٹ نے ''ماورائی عینیت پسند'' کو ایک ایسے شخص کے طور پر بیان کیا جو ''اشیاء بالذات'' کے علم کا دعویٰ کرے۔

اوپر دیے گئے بیان میں کانٹ کے فلسفے کو بہت سادہ بنا کر پیش کیا گیا۔ برٹرینڈ رسل نے کانٹ کو زبردست اہمیت دی، لیکن اسے اعلیٰ ترین رتبے پر فائز نہ کیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں مظہرِ فطرت (thing-in-itself) ایک بے تکا عنصر ہے، اور دوسری وجہ یہ کہ وہ کانٹ کو بعد کے جرمن فلسفے میں غالب عینیت پسند رجحان کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

رسل کانٹ کے ''صوفیانہ پہلو'' کا ذکر بھی کرتا تھا جو ''اس کی تحریروں میں نظر نہ آنے کے باوجود موجود تھا۔'' سچی بات یہ ہے کہ اپنے سے پہلے کے متعدد فلسفیوں کی طرح کانٹ بھی اپنی عقیدتوں کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ ایک طرف اس نے Critique of Pure Reason جیسی تصنیفات میں دکھایا کہ خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے عام ''ثبوت'' فلسفیانہ لحاظ سے غیر مستند تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ نیکی موجود ہے، اس لیے یقیناً خدا کا وجود بھی ہے۔ یہ ایک منصفانہ دلیل ہے، لیکن یہ حقیقت میں فلسفہ نہیں۔ دینیات پر کانٹ کا اثر بے اندازہ ہے۔

کانٹ پر کوئی نہایت مختصر بحث بھی عملیات (نظریۂ علم) اور اخلاقیات میں اس کی خدمات کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ عملیات کا تعلق Critique سے ہے اور یہ درحقیقت اس کے مرکزی موضوعات میں سے ایک ہے۔ ہیوم نے مابعد الطبعیات کو ماہرین مابعد الطبعیات کے ایک گہرے مطالعہ میں تبدیل کر دیا تھا...... اس نے کہا تھا کہ مابعد الطبعیات کے بارے میں تمام کتابوں کو ''شعلوں کی نذر'' کر دینا چاہیے۔ ان میں ''سراب اور مغالطے کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

کانٹ نے اس سوال کو زیادہ سنجیدگی سے لیا۔ اگرچہ ہیوم نے کانٹ کو اس کی ''عقائدانہ غفلت'' سے بیدار کیا، لیکن کانٹ کا پیش کردہ حل ہیوم سے متاثر نہیں تھا۔ ہیوم ریاضیاتی (Mathematical) یا تجربیت پسندانہ علم پر یقین رکھتا تھا، لیکن کسی اور قسم کے علم پر نہیں۔ چنانچہ اس نے مقدم قضیے (priori proposition) کی اقسام کے درمیان فرق کیا۔ مقدم قضیہ...... جس کی موجودگی سے لاک جیسے فلسفیوں نے انکار کیا...... وہ ہے جسے دنیا میں واقعات کے اصل بہاؤ کا تجربہ کیے بغیر جانا جا سکتا ہے۔ اولی قضیوں، مثلاً ''بچھو ایک چوپایہ ہے'' کو اس نے تجزیاتی (analytical) کہا کیونکہ ان میں نتیجہ موضوع کے اندر ہی موجود ہے۔ زیادہ دلچسپ اور مفید قضیوں کو وہ ترکیبی / مصنوعی (synthetic) کہتا ہے...... مثلاً کانٹ نے اصرار کیا کہ 5 + 7 = 12، اور تمام ریاضیاتی قضیے ترکیبی تھے، اور ''واقعے کی ایک علت ہوتی ہے'' بھی ترکیبی ہے۔ یہ فرق فلسفیوں کے لیے بے حد اہم ہے، چاہے وہ اسے مانیں یا نہ مانیں۔

کانٹ کی اخلاقیات کی بنیاد فرض کے ایک تصور پر ہے: اخلاقی بننے کے لیے ہمیں فرض ادا کرنا لازمی ہے۔ لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ ہمارا فرض کیا ہے؟ کیا کوئی کسوٹی موجود ہے؟ کانٹ نے ایک کسوٹی' ایک آزمائش اختراع کی جسے Categorical imperatives کہتا ہے۔ اس اصول کی ایک عام صورت یہ ہے: ہر فعل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ اگر وہ ہمہ گیر طرز عمل کا قانون بن جائے تو کیسا لگے گا۔ چنانچہ بینک لوٹنا اس کسوٹی کے برخلاف ہے۔ کانٹ کے مطابق ''تنہائی میں سیکس'' بھی اس آزمائش میں پورا نہیں اترتا۔

اس تصور پر بہت زیادہ تنقید ہوئی اور یہ بمشکل ہی کارآمد ہے۔ ایک فلسفی نے ہمیں بتایا کہ اگرچہ کانٹ تکنیکی اعتبار سے اسے ضرور غلط سمجھتا ہوگا کیونکہ یہ کہنا اس کی وضع کردہ آزمائش پر پورا نہیں اترتا کہ ''میں ایسے تمام بچوں کا گلا دبا دوں گا جو رات کو چلا چلا کر میری نیند خراب کرتے ہیں!'' دوسری طرف یہ بیان بھی کسوٹی کے برخلاف ہے کہ ''میں اتوار کی صبحوں کو ٹینس کھیلوں گا کیونکہ ہر کوئی حرج نہ کیا ہوگا!'' کانٹ کے اس معیار پر بہت اختلاف رائے اور دلیل بازی ہوئی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے کا مسئلہ کانٹ کے خیال سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔ شاید اس نے یہاں اپنی لوتھری اخلاقیات (جس میں وہ پروان چڑھا تھا) کو

داخل کر کے سارا کام خراب کر لیا۔

کانٹ خود بھی ایک دلچسپ کردار تھا۔ اسے موسیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہی آرٹ میں کوئی دلچسپی تھی۔ دوسری جانب اسے ادب سے محبت تھی، اور اس نے بالخصوص انگلش شاعر الیگزینڈر پوپ کو پسند کیا۔ وہ Konigsberg میں ایک زین ساز کے گھر پیدا ہوا اور ساری عمر وہیں گزار دی۔ لیکن وہ عزلت نشین نہیں تھا: اسے محفل پسند تھی (لیکن اپنی بات سے اختلاف کیا جانا نہیں) اور اس کے دو انگریز دوست تھے جو کاروبار کی غرض سے اس کے قصبے میں رہتے تھے۔ وہ تقریباً روزانہ ان دوستوں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس نے دینیات، طبیعیات، اور فلسفے کے ساتھ ساتھ ریاضی کا بھی مطالعہ کیا۔ ابتداء میں وہ لیبنز کا پیروکار بن گیا۔ اس نے شادی نہ کی اور یقیناً...... اگر ہم برٹرینڈ رسل کی بات پر یقین کر لیں...... کئی مرتبہ اپنے ہی وضع کردہ اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہوگا (یعنی خود لذتی کی ہوگی) کیونکہ یہ سوچنا مشکل ہے کہ وہ مقامی قحبہ خانوں میں جاتا ہوگا۔ تقریباً 1780ء کے بعد وہ اتنا مشہور ہو چکا تھا اور اس قدر وقت کا پابند تھا کہ لوگ اسے گلیوں میں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کرتے تھے۔ لہٰذا اگر وہ قحبہ خانوں میں جاتا تو یقیناً سب کو معلوم ہو جاتا۔

تاہم، ایک موقع ایسا بھی آیا جب وہ جوش میں آ کر وقت کی پابندی بھول گیا۔ یہ وہ موقع تھا جب وہ روسو کا ناول Emile پڑھ رہا تھا۔ روسو کے پرجوش مطالعہ کی وجہ سے ہی کانٹ امریکی اور فرانسیسی انقلاب کا حامی بنا۔ تاہم، اس کی بنائی ہوئی کسوٹی اسے برسر اقتدار حکومت کے قوانین توڑنے سے منع کرتی تھی۔

کانٹ ایک فلسفی کی نیکیوں اور حدود کی عمدہ مثال مہیا کرتا ہے۔ اسے ایک شاعر ہونا چاہیے تھا (اور غالباً وہ ایسا چاہتا بھی تھا) لیکن اپنی مہیب دانش نے اسے جکڑے رکھا۔ وہ خدا کو مردہ قرار دینے والی جدید الہیاتی تحریک کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ تاہم، دنیا کے بارے میں ہمارے علم پر اس کی عائد کردہ حدود نے کانٹ پسند مارٹن Buber کو جدید دور کی ایک نہایت مفید مذہبی کتاب لکھنے پر اکسایا۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے کانٹ کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ معدودے چند کانٹ پسند ہی کانٹ کے ساتھ متفق ہیں!

61

اعترافات

"Confessions"

ژاں ژاکس روسو

1781ء

جھگڑالو اور انا گیر ژاں ژاکس روسو کے اثرات کی گہرائی کا فیصلہ کرنا ہر کسی کا موضوعی معاملہ ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی میں عموماً ذہنی کجروی کا حامل نظر آتا ہے، اپنی زندگی کے آخری سال میں وہ خلل دماغی کا شکار رہا۔ لیکن اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا اثر بہت وسیع تھا۔

اس کی "Du contrat social" کا ابتدائی جملہ ہزار ہا جگہوں پر دہرایا گیا: ''انسان آزاد پیدا

ہوا لیکن وہ ہر طرف زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔'' مگر اس کی تصنیف میں دلیل دی گئی ہے کہ انسانوں کو'' آزاد ہونے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔'' کوئی بھی اس امر کا تعین نہیں کر پایا کہ روسو کی مراد کس حد تک آزادی سے تھی۔ اس نے یہ پیچیدہ اکس حل نہ کیا۔

اگرچہ روسو نے ''دی انسائکلو پیڈیا'' میں اپنا حصہ ڈالا تھا لیکن وہ آپ کو فلسفیوں کی زیادہ تر ڈکشنریوں میں نہیں ملے گا: اس کی فکر اسے فلسفی قرار دلوانے کے لیے کافی نہیں۔ تاہم، ان تالیفات میں اسے شامل کیے جانے پر تبصرہ نگار اور نہ ہی قارئین کوئی اعتراض کرتے ہیں۔ نہ ہی یہ بات حیران کن یا غلط ہے۔ نیز افلاطون اور ارسطو سے ہوبز اور لاک، اور اس کے بعد مارکس تک سیاسی فلسفہ کی بحثوں میں اس کی "Du contrat social" (1792ء) کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس حوالے سے اکثر اوقات اس کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس کی کتاب ''معاہدہ عمرانی'' (Du contrat social) عقلی دلیل بازی میں بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر کردار رکھتی ہے۔ مگر اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال یہ پہلی ایسی تصنیف تھی جس میں پیش کردہ خیالات جلد ہی سیاسی نظریے میں جانے پہچانے رومانوی اصول بننے والے تھے۔

نہ صرف کانٹ بلکہ ہیگل پر بھی روسو کا اصل کافی زیادہ تھا۔

لیکن وہ ہذیانی تھا...... کسے معلوم کہ کس لیے؟

کیونکہ مہارت وجہ کو بمشکل ہی پاسکتی ہے؛

لیکن یہ شوریدہ سری بیماری تھی یا بدقسمتی

بائرن (جو اس کے لیے ہمدردی رکھتا تھا) نے اپنی ایک نظم میں لکھا۔ اس نے مزید کہا کہ

''خود کو اذیت دینے والے سوفسطائی'' کی زندگی

اپنے ہی ساتھ ایک طویل جنگ تھی

یا پھر ان دوستوں کے ساتھ جنہیں اس نے خود ہی جلاوطن کر دیا تھا......

وہ اس قدر عجیب اور اندھا دھند غضبناکی کس کے خلاف رکھتا تھا

یہاں ''معاہدۂ عمرانی'' یا تعلیمی ناول Emile کو منتخب کرنے کی یقیناً ایک وجہ تھی ہے۔ شاندار ناول "Julie ou La Nouvelle Heliose" بمشکل ہی معیار پر پورا اترتا ہے: اس نے

اپنے عہد میں سنسنی تو پھیلائی تھی مگر اب اسے تاریخ کی بجائے مصنف کو سمجھنے کے لیے اہم سمجھا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ روسو نے اپنی شخصیت اور تحریروں کی صورت میں بطور انسان زیادہ اثرات مرتب کیے، اس لیے ''اعترافات'' کو ترجیح اور فوقیت دینی چاہیے۔ 1768ء کے بعد اپنی سوانح لکھنے والا کوئی بھی شخص اس کے اثرات سے پاک نہ رہ سکا۔ اس سے پہلے کسی نے بھی اپنے متعلق ننگا اور براہ راست سچ لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید روسو کی نیم دیوانگی اس جرأت کا سبب تھی۔ لیکن

کوشش تو اسی کی تھی۔ کیا ''اعترافات'' نے انسان کو بیان کرنے میں کافی آگے تک قدم بڑھایا۔ یہ اولین رومانوی خودنوشت سوانح عمری ہے، البتہ فرائیڈ کو یقین تھا کہ غیر معمولی داخلی بصیرت کا مظاہرہ نطشے نے کیا تھا۔

لیکن کیا روسو نے نطشے کے لیے راہ ہموار کی؟ اگر اس سے پہلے روسو نہ گزر چکا ہوتا تو کیا نطشے یہ لکھ سکتا تھا: ''آپ کی اپنی ذات ہی خود سے مخفی ہوتی ہے۔ ہم خزانوں کی تمام کانوں میں سے سب آخر میں اپنی ذات کی کان کھودتے ہیں۔'' درحقیقت نطشے نے روسو کو نئے سرے سے جیا۔

رومانویت کی ''ایجاد'' میں روسو...... اور گوئٹے...... کا کتنا ہاتھ تھا؟ روسو کی تاریخ پیدائش اور وفات کو دیکھا جائے (1712ء تا 1778ء؛ جبکہ گوئٹے 1749ء تک دنیا میں نہیں آیا تھا) تو وہ قبل از رومانویت عہد کا تھا۔

روسو جنیوا میں ایک فرانسیسی مہاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں اسے جنم دینے کے چند روز بعد ہی مر گئی، اور باپ نے اس کی پرورش کی۔ روسو کی نشوونما کیلونسٹ ماحول میں ہوئی۔ 1728ء میں وہ سفر کرنے اور پڑھنے کی غرض سے جنیوا سے رخصت ہوا۔ وہ متعدد دلچسپ لوگوں سے ملا جو جلد ہی اس کی غیر معمولی صلاحیتوں (مثلاً موسیقی) کے قائل ہو گئے۔

1728ء میں 16 سالہ روسو اپنی سرکردہ سرپرست Vaudios مادام دی وارنز سے ملا (شاید صرف مادرانہ وجوہ کی بناء پر، کیونکہ اس کے پاس روسو کے علاوہ بھی زیادہ مسرت بخش عاشق موجود تھے)۔ یہ بارہ سال بڑی خاتون انجام کار نہ صرف اس کی محبوبہ بن گئی بلکہ اس میں نئے مذہبی نظریات کو بھی بیدار کیا: وہ ایک رومن کیتھولک بن گیا۔ روسو کے ناپختہ ذہن سے جہنم اور گناہ ازلی کے تصورات خارج ہو گئے۔ مطالعہ کے کئی ادوار کے بعد روسو 1731ء سے 1740ء تک مادام دی وارنز کے ساتھ رہا: ان سالوں کے دوران مادام نے روسو کی خود تعلیمی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے بہت کچھ پڑھا اور اپنے سے بے مثال انداز میں لیبنز تا لاک تمام عظیم فلسفیوں کی تفہیم پائی۔

1741ء میں ایک ہوٹل کی ملازمہ لڑکی تھریسے لاویسیور سے ملا اور باقی تمام زندگی اسی کے سنگ گزار دی۔ اس نے تھریسے کے ساتھ 1768ء میں شادی کی۔ ان کے پانچ بچے ہوئے، اور ان سب کے سب کو یتیم خانے بھیج دیا گیا جس پر بعد میں وہ بہت پچھتایا۔ اگرچہ یہ اس دور کا

رواج تھا مگر وہ اس معاملے میں خبطی سا ہو گیا تھا۔

ڈینس دیدرو کے توسط سے روسو کا تعارف انسائکلو پیڈیا ترتیب دینے والوں سے ہوا۔ ''دی انسائکلو پیڈیا'' میں اس کی حصہ داری زیادہ تر موسیقی کے موضوعات پر تھی، البتہ وہ خود سیاسی معیشت کے بارے میں ایک کتاب لکھ چکا تھا۔ عام لوگوں میں اس کی شہرت 1750ء میں ہوئی۔ (اس مرتبہ بھی دیدرو کی حمایت سے) اس نے Diyon یونیورسٹی سے ایک انعام حاصل کیا۔ یہ انعام ایک مقالے پر ملا تھا جس میں اس نے اس تصور کے خلاف بات کی کہ آرٹس اور سائنس انسانی اخلاقی اصولوں کے لیے اچھی تھیں۔ روسو کو بھی اپنے بعد کے شاعر بائرن کی طرح راتوں رات شہرت مل گئی۔ قبل ازیں چند ایک لوگ ہی اسے اس کے مسورکن اوپیرا کی وجہ سے جانتے تھے۔

روسو اب کافی کامیابی حاصل کر لینے اور موضوع بحث بن جانے کے بعد بھی ناخوش تھا۔ اس نے نوجوانی میں خدمت گار کے طور پر کام کیا تھا؛ اب وہ بلند سماجی حیثیت کے لوگوں کے درمیان بے اطمینانی محسوس کرتا تھا، اور ایک ہوٹل کی خادمہ کے ساتھ تعلقات نے اس کی سماجی ترقی کی راہ مسدود کر دی۔ اسے ناپسند کرنے والوں نے اکثر کہا کہ اس کا ذہن ہمیشہ سے ادنیٰ خدمت گاروں والا تھا۔ روسو 1754ء میں واپس جنیوا آیا..... اور اپنے بچپن کا کیلونسٹ عقیدہ بھی اختیار کر لیا۔ لیکن اس کی شخصیت منقسم رہی۔ اس نے اوپیرا اور تھیٹر دونوں لکھے مگر ان پر پابندی لگانے کی حمایت بھی کی۔ روسو نے ہمیشہ ذہانت کا مظاہرہ کیا لیکن اس کی انا پرستی اور تھوڑے بہت غرور نے اسے حس مزاح سے عاری بنا دیا۔ یہی چیز اس کی خلل دماغی میں معاون ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ وہ پوری طرح قائل تھا کہ شفیق اور مہربان دوست ڈیوڈ ہیوم معاندانہ جذبات رکھتا تھا اور اسے تباہ کرنے کے درپے تھا۔

تقریباً 1750ء میں روسو نے مہذب اور وحشی کے نظریہ کی تشہیر شروع کی۔ یہ فکری دھارا Emile اور پھر ''معاہدہ عمرانی'' (1762ء) پر منتج ہوئی۔ Emile میں معصوم بچے کی مثالی تعلیم ناول کی صورت میں بیان کی گئی جس کا مقصد بچے کو معاشرے کی دست برد سے بچانا تھا۔ اس کے خیال میں بچے کی فطری جبلتوں کو سکول میں اخلاقی تربیت کے ذریعہ دبانے کی بجائے اس کی

انفرادیت کو فروغ دینا چاہیے، مذہب غیر رجعت پسندانہ اور دل کی بجائے دماغ پر مبنی ہونا چاہیے، تجربہ کی بنیاد کتابوں کو نہیں بلکہ زندگی کو ہونا چاہیے۔ لہٰذا ایک نہایت اہم حوالے سے تمام لبرل اور جدید تعلیمی نظریات روسو سے ہی اخذ ہوئے۔ Emile میں اس نے تعلیم دینے کے تمام روایتی طریقوں کی مخالفت کی اور کتاب کو حقیقی آزادی پسندوں نے بجا طور پر سراہا۔

''معاہدہ عمرانی'' میں روسو بتاتا ہے کہ صحیح انداز میں تعلیم یافتہ بچے کو کس حالت میں ابھر کر سامنے آنا چاہیے۔ نتیجتاً وہ فصیح البیانی سے کام لیتا ہے اور یہ تصنیف ابہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا گدلاپن کافی بھرپور ہے۔ لوگوں نے اس بارے میں دلائل دیے ہیں آیا یہ آزادی کی مدح سرائی ہے یا مطلق العنانیت کے لیے بلیو پرنٹ: لیکن یہ دونوں ہی ہے۔

روسو اپنے ابتدائی کیلون ازم کے باوجود خطائے ازل پر یقین نہیں رکھتا تھا: اس کے برعکس اس کا اعتقاد تھا کہ انسان فطرتاً اچھا ہے، لیکن اس کی اختیار کردہ سماجی روایات..... بالخصوص جائیداد کی ملکیت کی روایت..... شر کی جانب مائل ہیں۔ روسو نے ہوبز سے کافی کچھ مستعار لیا مگر اس کے باوجود وہ انسان کو برے کی بجائے اچھا خیال کرتا ہے۔

روسو انارکسٹ نہیں۔ اس کے خیال میں انسانیت کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ''عمومی ارادے'' کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اپنی مکمل انفرادیت کو محسوس کریں۔ وہ اس اجتماعی جذبے کو فلاح عامہ کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس تسلیم، اس معاہدہ عمرانی کے ذریعہ ہی فرد کو اپنی بھرپور ترین آزادی ملتی ہے۔ عزم عام کے خلاف شخص دراصل اپنے خلاف ہوتا ہے۔ یوں اس کا معاہدہ عمرانی جمہوریت یا مطلق العنانیت کی حمایت میں لیا جا سکتا ہے۔ نازیوں اور کمیونسٹوں کی فصیح البیانی سے واقف لوگوں نے روسو کو مسترد کیا۔ یہ امر کافی واضح ہے کہ وہ خود مطلق العنانیت کا حامی نہیں، لیکن استبدادیت پر غالب آنے کے لیے اس کا اختراع کردہ آلہ (جسے وہ لیجسلیٹر کہتا ہے) بھی ایک ہلکی قسم کا ڈکٹیٹر ہی تھا۔ دوسری طرف لیجسلیٹر کا نیم دیوتائی کردار ہٹلر اور سٹالن کے ساتھ کافی کچھ مشترک رکھتا ہے۔

''اعترافات'' روسو کا نہایت مثالی کام ہے۔ وہ اس کا آغاز یوں کرتا ہے:

''میں نے ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں، جس

کی کوئی نقل نہیں کی جاسکے گی۔ میرا مقصد اپنے ساتھی فانی انسانوں کے سامنے ایک انسان کو فطرت کی تمام تر سالمیت کے ساتھ پیش کرنا ہے، اور وہ انسان میں خود ہوں۔

صرف میں۔ میں اپنے دل سے واقف ہوں، اور میں نے انسانیت کا مطالعہ کیا، میں ان لوگوں میں سے کسی جیسا نہیں جن سے میری شناسائی ہے، شاید پوری ہستی میں کوئی بھی میرے جیسا نہیں۔ میں کم از کم اپنے اچھوتے پن (Originality) کا دعویدار تو ہوں۔ اور یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی تعین کیا جا سکے گا کہ فطرت نے وہ سانچا توڑ کر دانشمندی کا مظاہرہ کیا یا نہیں جس میں مجھے بنایا تھا۔

''اعترافات'' میں وہ جا بجا زبردست نخوت کا اظہار کرتا ہے۔ شاید یہ نخوت ناگزیر تھی: ورنہ وہ اپنے بارے میں اس قدر دلچسپی کیسے رکھتا؟ آیا اس نے ایک تشکیکی عہد میں عیسائیت کی بنیادی سچائیوں کو تحفظ دے کر اس کی خدمت کی یا پھر گناہ ازل سے انکار کر کے اس کی جڑیں کھوکھلی کیں...... دونوں ہی خیالات پیش کیے گئے اور دونوں اپنا اپنا جواز رکھتے ہیں۔ کم از کم اس نے تجزیہ ذات کے عمل کی بنیاد تو رکھ دی تھی۔ وہ اتنا انا پرست نہیں کہ ''اعترافات'' کا قاری کچھ تلاش نہ کر سکے۔

62

فرانس میں انقلاب پر سوچ بچار

" Reflections on the Revolution in France "

ایڈمنڈ برک

1790ء

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کا ایک عظیم صاحب طرز نثر نگار ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) ایک زبردست خطیب تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ Whigs چارلس جیمز فاکس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا جس نے صرف اور صرف اپنے جوش خطابت کی بنیاد پر سیاسی طاقت حاصل کی۔

برک کی کچھ تقاریر آج بھی پڑھی اور زیر غور لائی جاتی ہیں۔ وہ فصیح اللسان تھا لیکن الفاظ کی ادائیگی میں زیادہ باصلاحیت نہ تھا۔ بہر حال اس کے نظریات کو مقبولیت ملنے لگی اور انجام کار وہ کنزرویٹزم (رجعت پسندی) کے موثر ترین ترجمانوں میں سے ایک بن گیا۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ برطانیہ عظمیٰ میں Whigs وہ تھے جو سترہویں صدی کے آخری برسوں سے عوامی حقوق پر اصرار کر رہے تھے۔ امریکہ میں آزادی کے متوالوں کی طرح انگلش Whigs نے اپنے نکتہ نظر کی بنیاد جان لاک کی آئینی تحریروں کو بنایا، البتہ وہ ان کی تشریح کچھ مختلف انداز میں کرتے تھے۔ انگلش Whigs تفرقہ بازی کا شکار ہونے کے باوجود 1718ء سے 1761ء تک مسلسل اقتدار میں آتے جاتے رہے۔ پھر 1830ء تک وہ حکومت سے باہر رہے۔ انجام کار انیسویں صدی کے دوران وہ لبرلز کی صورت اختیار کر گئے۔ ریاستہائے متحدہ میں Whig اصطلاح کی تاریخ بالکل مختلف تھی اور 1854ء میں ان لوگوں نے ری پبلکن پارٹی بنائی جو خود کو Whigs خیال کرتے تھے۔

یہ خیال کافی حد تک بجا ہے کہ برک خطیب سے زیادہ عظیم مصنف تھا۔ آج ہم جس سیاسی مفکر ایڈمنڈ برک کو جانتے ہیں وہ ظاہراً کچھ اور اصلاً کچھ اور تھا۔ جان کیلون یا اس کے سکاٹش پیروکار جان ناکس جیسے پیوریٹانیوں نے عموماً جنسی مسرت اور نفسانیت کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ معتقد عموماً پوری تن دہی کے ساتھ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ یقیناً اسے انقلابی سیاست کی صورت میں نہیں تصور کیا جاتا۔ تاہم، اگر برک کی عقیدتوں کی وضاحت اس کی جنسیت میں ملے تو انہیں صرف اسی وجہ سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ سیاست کو شائستگی یا اصول کی طرح جنس کے حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ برک کے معاملے میں بنیادی قسم کی رجعت پسندی کی راہ جنسی جذبات کے خوف اور پر جوش دلچسپی سے ہو کر گزرتی تھی۔

برک ایک پروٹسٹنٹ وکیل کا بیٹا تھا۔ وہ ڈبلن، آئرلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی۔ اس کی ماں رومن کیتھولک تھی، اور برک نے ہمیشہ کیتھولکس کی جانب رجحان ظاہر کیا۔ اس نے قانون پڑھا اور پھر لندن چلا گیا، لیکن جلد ہی وہ سیاسی صحافت میں زبردست دلچسپی لینے لگا۔ اس نے 1756ء میں "A Vindication of Natural Society" لکھ کر خود کو ایک مصنف منوالیا۔ اس کا

ایک سیاسی کیریئر تھا لیکن وہ کبھی بھی اعلیٰ عہدوں تک نہ پہنچا۔ اس نے 1759ء میں سیاست شروع کی اور آئرلینڈ میں ملازمت کرنے لگا۔ 1765ء میں وہ Rockingham Whigs نامی فرقے میں شامل ہوا اور پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ 1770ء میں اس نے "Thoughts on the Cause of the Present Discontent" شائع کی جس میں سیاسی جماعتوں کی قدر و قیمت کے بارے میں دلائل دیے۔ پارلیمنٹ میں اس کی تقریروں میں امریکی آبادکاروں کے حقوق کے لیے ہمدردی جھلکتی تھی۔ بعد ازاں وہ عارضی طور پر Fox کا حلیف بن گیا تاکہ "لارڈ نارتھ" کی انتظامیہ کی مخالفت کر سکے جو امریکی کالونیوں کے حق میں تھی۔

لیکن اس کے خیالات کے لیے زیادہ نرم گوشہ رکھنے والا لارڈ راکنگ ہیم 1782ء میں برسراقتدار آیا تو برک کو کابینہ سے نکال دیا گیا۔ اسے افواج کو تنخواہیں دینے کا مایوس کن عہدہ ملا۔ تاہم، حکومت میں رہنے کے دوران اس کے Acts سب سے زیادہ اہم تھے۔ اول، اس نے اپنے محکمے میں فراڈ بازی روکنے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس مقصد کے تحت اس نے اپنے نجی اکاؤنٹس کو محکمانہ اکاؤنٹس سے الگ کر دیا۔ دوم اس نے "سول لسٹ ایکٹ" کے ذریعے بیک وقت شاہی اثر و رسوخ اور شاہی بجٹ میں اسراف کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی بنیاد دراصل برک کے اس غلط اصرار پر تھی کہ جارج سوم نے اپنی سیاسی مشین کی حمایت میں بہت سی رقم ضائع کر دی تھی۔

درحقیقت برک ایک پیچیدہ کردار تھا۔ وہ انسانیت پسندانہ فہم عامہ اور دشنام طرازی کا مزاج بھی رکھتا تھا۔ 1783ء میں اس نے ایک "انڈیا بل" تیار کیا جس کی گورنر جنرل آف انڈیا نے پرزور مخالفت کی۔ یہ نیک ارادوں پر مبنی ایک بہادرانہ بل تھا، لیکن اس میں یہ ناقابل عمل اقدام کرنے کی تجویز دی گئی تھی کہ انگلینڈ کے بیوروکریٹس کو ہندوستان کا کنٹرول دے دیا جائے (جو چاہے کرپٹ سہی مگر اس ملک کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے)۔

برک نے اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ برس تک انتظار کیا۔ تب اس نے ڈرامہ نویس شیریڈان اور چارلس جیمز فاکس کے ساتھ مل کر گورنر جنرل آف انڈیا وارن ہیسٹنگز کے خلاف مواخذہ کی کارروائی شروع کر دی۔ اس طویل مقدمے (1787ء تا 1794ء) نے ہیسٹنگز کی شہرت

تباہ کر دی مگر انجام کار وہ بے خطا قرار پایا۔ تاہم، اس وقت تک لندن کا اعلیٰ طبقہ اپنے طریقہ عدالت سے تنگ آ چکا تھا۔

یقیناً برک کا سب سے اہم کام (جس نے براہ راست اثرات تو نہ مرتب کیے) ایک ابتدائی تصنیف "A Philosophical Enquiry Into the Origins of Our Idea of Sublime and Beautiful" تھی جو 1757ء میں شائع ہوئی۔ یہ نہ صرف جلد ہی منظر عام پر آنے والی رومانوی تحریک کی بلکہ فرائیڈ کی بھی نقیب تھی۔ اسی کتاب میں برک کا اصلاحی جذبہ اور اصلاح کے نتائج کا خوف دونوں موجود ہیں۔ حال ہی میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے حقیقی موضوع پر ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے: یعنی مردانہ شہوانیت کی نوعیت۔ مسرت بخش چیزوں کے بارے میں سوچنے پر ہمارے ذہن میں دیگر چیزوں کے علاوہ جنسی مسرت کا خیال بھی آتا ہے۔ لیکن برک نے اسے ایک طرح کا ''انتشار'' قرار دیا۔ اس نے نوجوانی کے زمانے میں ہی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ''ہمارے جذبات کے ایسے سوتے ہیں جن کے بارے میں ہم قطعاً کچھ نہیں جانتے۔''

1789ء میں انقلاب فرانس بپا ہونے پر برک کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ نجانے انگلینڈ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں۔ اس نے فاکس اور دیگر دوستوں سے تعلق توڑ لیا اور جلد ہی "Reflections" لکھ ڈالی۔

اصل میں وہ یہ کتاب فرانس میں ایک نوجوان دوست کے نام خط کی صورت میں لکھنا چاہتا تھا، لیکن انگلینڈ کے آئندہ حالات کے بارے میں خوف اس پر غالب آ گیا اور یہ تصنیف ایک مقالے کی صورت اختیار کر گئی۔ اس نے ''مردانہ، اخلاقی، منظم'' آزادی کی حمایت کی۔ اس نے زور دیا کہ 1688ء کا انگلش انقلاب ماضی سے مربوط تھا، بلکہ وہ پرانے وقتوں کی آئینی سیاست کی جانب مراجعت کا عمل تھا (اس بات کو بھی جھٹلانا مشکل ہے)۔ دوسری طرف انقلاب فرانس میں لوگوں نے اپنے ماضی سے ناطہ توڑ لیا تھا: معاشرے کو ممکن بنانے کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ برک نے درست طور پر پیشگوئی کی کہ واحد ممکنہ نتیجہ فوجی آمریت کی صورت میں ہی برآمد ہوگا۔

اس نے اپنی پیشگوئی کی صلاحیتوں کے برخلاف ایک اور دلیل بھی پیش کی۔ ایک ایسی دلیل

جس نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ دلیل یہ ہے کہ معاشرہ ''نامیاتی'' (Organic) ہے اور آئینی بادشاہت اس لحاظ سے ''فطرت'' کے مطابق چلتی ہے کہ یہ دانا تو ہے مگر ''غور و تفکر کے بغیر''۔ شاید وہ اس صوفیانہ نتیجے پر اس احساس کی وجہ سے پہنچا تھا جس کا اظہار "Enquiry" میں ملتا ہے: ''بے یقینی کی صورت اس قدر خوفناک ہے کہ ہم اکثر اس سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' یہ کتاب کئی حوالوں سے خراب انداز میں ترتیب دی ہوئی اور کم قدر ہے، لیکن اور کچھ حوالوں ...... مثلاً فرانسیسی باغی ہجوم کی تفصیل ...... سے اس کی زبردست اہمیت فنی ہے۔ تاہم، برک یہ وضاحت نہیں کرتا کہ شدید مخالفت کی صورتحال میں لازمی اصلاحات کیسے کی جائیں۔ اس نے انقلابات کے خطرات کے بارے میں زبردست وار نگز دیں اور درست طور پر پرامن انقلابات کو ترجیح دی۔

لیکن اپنے ہم عصر پیروکاروں میں بھی برک اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ اگر پرامن ذرائع موجود نہ ہوں تو کیا کرنا چاہیے۔

63

حقوقِ نسواں کی حمایت

"*Vindication of Rights of Women*"

میری وولسٹون کرافٹ

1972ء

نسوانی ذہن کو وسعت دے کر اسے مستحکم کر دیں اور اندھی اطاعت کا خاتمہ ہو جائے گا؛ لیکن اقتدار ہمیشہ اندھی اطاعت کا خواہش مند ہوتا ہے اس لیے جابر حاکم اور شہوت پرست لوگ عورتوں کو بجا طور پر تاریکی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جابر

حاکموں کو صرف غلاموں اور شہوت پرستوں کو صرف ایک کھلونے کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ "حقوقِ نسواں کی حمایت" میں سے لیا گیا ایک اقتباس ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس قسم کی بات اتنے دوٹوک اور بے باک انداز میں کہی گئی۔ میری وولسٹون کرافٹ کے متعدد پیش رو تھے لیکن اپنے خیالات کو بلند بانگ انداز میں پیش کرنے کی جرأت سب سے پہلے اسی نے کی۔ وہ گردوپیش کے حالات کی وجہ سے ایسا کرنے کے قابل ہو گئی۔ آبنائے (Channel) کے اس پار مجوزہ عمل انقلاب ابھی تک اپنی شدید خونریزی کی وجہ سے ہمہ گیر طور پر غیر مقبول نہیں ہوا تھا۔ 1791ء میں اس کے دوست ٹامس پین نے "Reflection on the Revelution in France" شائع کی تھی۔ یہ کتاب ٹامس پین کی "حقوقِ مرداں" تھی۔ میری 1790ء میں ہی اپنی "حقوقِ مرداں کی حمایت" لکھ چکی تھی...... جس پر ولیم گوڈون بہت چیں بہ جبیں ہوا۔ اب اس نے عورتوں کی جانب سے ایڈمنڈ برک کو جواب دینے کی خواہش کی۔ اس کی کتاب عام فہم اور ناقابل تردید ہونے کے باعث بہت اثر انگیز ثابت ہوئی لیکن یہ مردانہ خواہشات اور توقعات کے برعکس تھی۔

میری نے ولیم گوڈون سے شادی کی اور ایک بیٹی میری شیلی کو جنم دینے کے بعد فوت ہو گئی۔ ولیم گوڈون نے اپنا زیادہ تر وقت اس کی یادوں اور اس کی تحریروں کو چھپوانے میں صرف کیا (بمع اپنے نام لکھے ہوئے محبت بھرے خطوط کے)۔ لیکن کئی برسوں تک میری کو ایک "جسم فروش عورت" کے طور پر جانا جاتا رہا اور اس کے خیالات کو اس قسم کے الفاظ کے ساتھ رد کیا جاتا رہا: "شہوت انگیز"، "تحقیر آمیز"، "بے حیا"، "ذکر پرستی کی حامی۔" اس سے اتفاق کرنے والے بھی کچھ وقت کے لیے اس سے دور رہنے پر مجبور ہو گئے لیکن اس کی شہرت کے داغ آہستہ آہستہ دھل گئے اور "حقوقِ نسواں کی حمایت" میں پیش کردہ متعدد دلائل کو فتح حاصل ہوئی۔ مخصوص مردوں کی جانب سے اس کتاب کے خلاف بیہودہ اور توہین آمیز طرزِ عمل کی کہانی یقیناً افسوس ناک ہے۔ کچھ مرد وولسٹون کرافٹ کے مرکزی نکتۂ نظر کو اب بھی قبول نہیں کرتے...... لیکن وہ کم از کم اسے تسلیم کرنے کا دکھاوا تو کرتے ہی ہیں۔

میری بذات خود ایک روایتی نہیں بلکہ باغی، جسمانی طور پر پرجوش اور حتیٰ کہ حاسد عورت بھی تھی۔ اس نے ولیم گوڈون سے ملاقات ہونے تک ایک سخت زندگی گزاری۔ پھر زچگی کے دوران لگنے والی ایک بیماری نے ان کے ساتھ کو منقطع کر دیا۔ وہ شادی کے رواج پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن ناجائز پن کے غیر منصفانہ کلنک سے آگاہ ہونے کے باعث انہوں نے اپنی بچی کی خاطر شادی کر لی تھی۔

میری وولسٹون کرافٹ

1859ء میں لندن میں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے چھ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھی۔ اس کے جولاہے باپ نے کاشتکاری شروع کر دی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ ایک آتش مزاج شخص تھا جس نے انجام کار شراب میں پناہ لی۔

میری وولسٹون کرافٹ مردانہ لباس میں

میری نے اپنی زندگی کے دوران تقریباً وہ بھی کام کیے جو عورتوں کے لیے دستیاب تھے: گورنس (اسے فارغ کر دیا گیا کیونکہ بچے اپنی ماں سے زیادہ اسے چاہنے لگے تھے)، آیا، استانی، سوشل تبصرہ نگار، ناول نگار۔ اس کی پہلی تصنیف ''بیٹیوں کی تعلیم کے بارے میں غور و فکر'' (1787ء) میں عملی (Pragmatic) بنیادوں پر عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی گئی تھی۔ یہ کتاب ''حقوق نسواں کی حمایت'' کی بنیاد تھی۔ اس نے اپنا پہلا ناول ''Mary: A Fiction'' ایک دوست کی موت سے متاثر ہو کر لکھا (1788ء)۔

گورنس کی ملازمت سے محروم ہونے کے بعد میری واپس لندن آئی اور اپنی کتابوں کے

ناشر جوزف جانسن سے ملی۔ اس ناشر کے گھر میں ہی اس کی ملاقات اہم انقلابیوں سے ہوئی: گوڈون، ٹامس پین، مصور ہنری فوسیلی (جس کی محبت میں وہ کچھ عرصہ مبتلا رہی) اور ولیم بلیک۔ ہمیشہ غیر محتاط اور پرجوش میری وولسٹون کی ملاقات لندن میں ایک ''کیپٹن'' گلبرٹ ایملے سے ہوئی (1793ء) اور اس کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ پیرس میں ''مسز ایملے'' بن کر رہی اور ایک بیٹی فینی کی ماں بنی (1794ء)۔ پھر اچانک وہ اسے چھوڑ گیا۔ میری نے دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ پھر 1795ء میں اس کی ملاقات ولیم گوڈون سے ہوگئی اور یوں اس کی بقیہ مختصر زندگی کچھ قابل برداشت بن گئی۔

گوڈون نے اپنی بیوی کی صداقت شناسی کی قدر کی۔ وہ اس کی تحریریں پڑھنے سے قبل خود بھی اس کی قابلیت سے ناواقف تھا۔ میری حادثاً مشہور نہیں ہوئی، اور اس کی سوچ محض خراب حالات زندگی کی ہی پیداوار نہیں۔ اس نے ایملے کے نام خط لکھا۔ وہ شخص جس نے آخر کار اس سے دغا کی لیکن جس کے ساتھ وہ ایک اور عورت کو حصہ دار بنانے پر بھی تیار تھی:

> 100 میں سے 99 مردوں کے معاملے میں کسی عورت کو ایک چٹ پٹی چیز بنانے کے لیے بہت تھوڑی سی دغابازی ہی کافی ہے۔ اور ہمدردی کے اس عارضی ابال کے سوا چند ایک (عورتیں) ہی اپنے دل میں جذبہ شوق پالنے کے ذریعہ مسرت تلاش کرتی ہیں۔

جدید نسوانیت پسندوں نے ''حقوق نسواں کی حمایت'' کو ''زن بیزار'' قرار دیا۔ انہوں نے نکتہ پیش کیا کہ میری میں زیادہ عورت پن نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی دعویٰ کرتی ہوئی ملتی ہیں کہ غیر معمولی خوبیوں کی مالک عورتیں دراصل زنانہ جسم میں مقید مرد تھیں۔ (لیکن میری کا خیال تھا کہ نیوٹن اتفاقاً انسانی خول میں قید ہو گیا تھا) اور یہ بات بھی درست ہے کہ میری کی سوچ ایک لحاظ سے گڑبڑ کا شکار تھی۔ اس کی وجہ عورتوں کے ساتھ معاشرے کے سلوک سے اس کی نفرت تھی۔ دراصل ''وکٹورین'' قرار دی جانے والی اقدار اس کے دور میں رائج ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف عورتوں کو ''پاکیزگی'' کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا جبکہ دوسری طرف وہ جاگیر، مرد کی جائیداد کی حیثیت رکھتی تھیں۔

تاہم، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''حقوق نسواں کی حمایت'' جانبدارانہ تھی۔ اس کے خلاف

rekhta

طویل عرصہ تک احتجاج ہوا اور بالآخر اس کی قدر و قیمت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس کتاب نے دنیا بھر میں آئندہ نسوانیت پسندوں کو متاثر کیا۔ گوڈون کی محنت ضائع نہ گئی۔ کتاب میں کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ عورتوں کو مردوں کی طرف سے اپنے اوپر عائد کی گئی نفسیاتی درجہ بندیوں کے خلاف جدوجہد کے علاوہ کیا کرنا چاہیے۔ اس کا عورت کو ایک جائیداد قرار دینا مارکس کی پیش بینی کرتا ہے اور یہ بات آج بھی معقول ہے: اگر عورت کو معلوم ہو کہ وہ مرد کی قانونی جائیداد ہے تو وہ لاشعوری طور پر بھی خود کو ایسا سمجھنے لگے گی۔ شاید اسی لیے میری وولسٹون کرافٹ نے کہا تھا کہ عورتوں کو ''سوچنے کی تربیت'' دینی چاہیے۔

اس نے اپنی زیادہ تر ہم عصر خواتین کو عشوہ گر، چونچلے باز اور مکار قرار دیا۔ متعدد جدید نسوانیت پسندوں کا اس بات پر ناراض ہونا بجا تھا لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اس دور کی عورتیں مردوں کی حاکمیت کے نتیجہ میں واقعی ایسی بن گئی ہوں۔ کچھ جدید نسوانیت پسند خواتین اس قسم کی خود تنقیدی کو پسند نہیں کرتیں اور اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ وہ ''حقوق نسواں کی حمایت'' کو اس کے درست سیاق و سباق میں رکھ کر سمجھنے کے قابل نہیں۔ البتہ یہ کتاب جنس اور جنسی امتیازات کے متعلق میری وولسٹون کرافٹ کی سوچ کو مکمل طور پر پیش نہیں کرتی۔ اگر وہ کچھ عرصے بعد پیدا ہوئی ہوتی (جب خواتین نے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی) تو وہ اس بحث میں زیادہ بہتر انداز میں حصہ لے پاتی۔

64

سیاسی عدل کے بارے میں تحقیق

"An Enquiry Concerning Political Justice"

ولیم گوڈون

1793ء

کسی قانون کا احترام کرنے والے آدمی کا معاشرے کے ایک بڑے حصے اور بالخصوص ''اسٹیبلشمنٹ'' کو حیران کر کے رکھ دینا ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔

ولیم گوڈون نے اپنی کتاب ''سیاسی عدل'' کے ذریعہ یہی کام کیا۔ وہ سیاسی نظریہ ساز، ناول

نگار، ڈرامہ نویس اور مورخ تھا۔ اس نے نوجوانوں کی تربیت کے لیے بھی کتب لکھیں اور شائع کیں۔ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں اس پر متواتر یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ بے حدود جنسی نشاط انگیزی، اسقاط حمل، الحاد پرستی، بغاوت، سول نافرمانی اور بچہ کشی کی حمایت کرتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کے خاتمے کی بات پہلی مرتبہ اسی نے کی تھی۔

''سیاسی عدل کے بارے میں تحقیق'' نے بلاشبہ براہ راست طور پر زبردست اثرات مرتب کیے: انقلاب فرانس کے باعث پرجوش نسل پر، گوڈون کے داماد شاعر پی بی شیلے پر، نوجوان ورڈزورتھ پر، کولرج پر، مالتھس پر، میری وولسٹون کرافٹ کے بطن سے جنم لینے والی اپنی بیٹی میری شیلے پر، اگر تمام نہیں تو بیشتر سوشلسٹوں پر، انارکسٹوں پر اور ان حکام پر جنہیں اس نے چیلنج کیا۔ گوڈون کا ناول ''Caleb William'' اس کی تصنیف ''سیاسی عدل کے بارے میں تحقیق'' کو سمجھنے کے لیے ایک اہم کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔

گوڈون میں بھی خامیاں تھیں، لیکن چند ایک لوگ ہی اس کی ذاتی شائستگی یا دانشورانہ صلاحیتوں پر سوال اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ اگر وہ زانی یا قاتل بنا ہوتا تو اس کا مقصد محض قانون دشمنوں کو عفریت ثابت کرنا ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اس کی جنسی اشتہاء اور اس سلسلے میں اس کی دردناک ایمانداری کا مضحکہ اڑایا گیا۔ گوڈون کی شخصیت میں بہت کچھ قابل محبت ہے۔ اس نے حقیقتاً تمام بنیادی برائیوں (طمع، ناانصافی، جہالت، اندھی قوم پرستی) سے نفرت کی لیکن وہ خود کو ان سے پاک نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بدقسمت بھی تھا: اس کی بااعتماد پہلی بیوی میری وولسٹون کرافٹ زچگی کے دوران مر گئی۔ بعد میں جب اس پر مشکل وقت آئے تو پی بی شیلے اس کے نظریات کا وارث بن کر آیا اور اس کی بیٹی میری، دیگر بیٹیوں اور سوتیلی بیٹیوں کو بھگا کر لے گیا۔ بحیثیت مجموعی گوڈون نے شیلے کے ساتھ مخلص اور ایماندارانہ برتاؤ کیا۔ کبھی کبھی گوڈون کی اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی عادت بہت دلچسپ لگتی ہے۔ وہ بدستور اپنے اصولوں پر ڈٹا رہا۔ وہ دیگر لوگوں (شیلے سمیت) سے ایک ایک پائی وصول کرتا لیکن ضرورت مند دوستوں اور ساتھی انقلابیوں کو رقم دینے میں اس نے کبھی دریغ نہ کیا۔

ناول ''Caleb Williams'' میں اس جذباتی قیمت کی ایک نہایت خیالی کہانی بتائی گئی ہے جو

آزادی، سب کے لیے انصاف، ایک پرامن زندگی، سکون اور سچائی سے محبت کے لیے ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ بھوت نما اور غیر فطری ہستی یعنی ریاست کس طرح فرد کی زندگی میں مداخلت کرتی اور پھر انجام کار اسے برباد کر دیتی ہے۔ یہ بیسویں صدی کے عظیم مصنف فرانز کافکا کی پیش بینی کرتی معلوم ہوتی ہے۔

کافکا کی تحریریں اعصابی خلل کا تاثر رکھتی ہے جبکہ ''Caleb William'' کچھ بے لچک اور بے لوچ سا ہے۔ کافکا کی طرح گوڈون یہ لکھنے کے قابل نہیں تھا (''ڈائریز'' میں): ''بدستور رقص کرتے رہو، مجھے اس سے کیا؟'' لیکن وہ کافکا کے احساس میں شریک تھا۔ تاہم ''Caleb'' کا موضوع حکومت کی بدکرداریاں تھا۔ بچپن میں اپنے اوپر زبردستی تھوپ دیے گئے کیلون ازم کو مکمل طور پر مسترد کر دینے والے گوڈون کے لیے استبدادی ریاست ازلی گناہ بن گئی۔ اس نے فرد پر اس گناہ کے مابعد الطبعیاتی اثرات کا تجزیہ کیا۔ قاری اس ناول کی طرف متواتر متوجہ ہوتے رہے۔

''سیاسی عدل'' اسی ذہنی عمل کی پیداوار ہے۔ شاید ہمیں اس ذہنی حالت پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ گوڈون 1756ء میں Wisbech (کیمبرج شائر) کے مقام پر ایک کیلونسٹ وزیر کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اس نے کیلونسٹ اداروں میں ہی تعلیم پائی۔ پھر وہ خود بھی وزیر بنا مگر اپنے ہم مسلک افراد کے ساتھ جھگڑا کر کے کیلون ازم سے نفرت کرنے لگا۔ لیکن کیلون ازم کی سکھائی ہوئی درشتی کافی حد تک اس میں بدستور موجود رہی۔

اس نے لاطینی، یونانی اور انگریزی زبان میں بہت کچھ پڑھا اور لندن کے ایک صحافی کی حیثیت میں اپنے عہد کے نہایت عالم فاضل افراد میں شمار ہونے لگا۔ وہ تامس پین سے ملا اور اس کا دوست بن گیا۔ اس دوستی نے حکومت سے اس کی نفرت کو مزید بڑھاوا دیا۔ وہ تامس پین کے خلاف دائر کردہ مقدمۂ بغاوت کی کارروائی میں شامل ہوا اور اٹارنی جنرل کا یہ مشہور جملہ سنا کہ برطانیہ عظمیٰ کے ''شاندار اور بے مثال آئین کو جولیس سیزر نے بھی تسلیم کیا تھا۔'' اس نے دفاعی اقدام کے طور پر ''سیاسی عدل'' دانستہ اور نہایت جرأت کے ساتھ شائع کی۔ وزیراعظم ولیم Pitt اصغر کے خیال میں یہ کتاب اپنی بہت زیادہ قیمت کے باعث زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

گوڈون نے ''سیاسی عدل'' لوگوں کے لیے پیش کی تا کہ وہ خود غور وخوض کر سکیں۔ اصل میں گوڈون فلسفیانہ بنیادوں پر یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ آخر حکومت بنائی ہی کیوں جائے۔ اس نے کچھ معاملات کے بارے میں اپنی سوچ تبدیل کی اور بعد کے دو ایڈیشنوں میں ان تبدیلیوں کو کتاب میں لاگو بھی کیا۔ یہ ایڈیشن 1796ء اور 1798ء میں شائع ہوئے تھے لیکن اس کا انارکزم جوں کا توں رہا۔ وہ 1836ء میں اپنی طویل زندگی کے اختتام پر بھی اس پر پوری طرح قائم تھا۔

گوڈون کی نثر سلیس اور انداز دھیما ہے۔ وہ اپنے ایک سوانح نگار کے بقول ''سچائی کا پرسکون دوست ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مخالفین نے بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ کتاب لکھنے کے ساتھ ساتھ اسے ٹائپ کرواتا گیا اور ٹائپنگ کی تیز رفتاری نے اسے نقصان پہنچایا۔ لیکن گوڈون کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ آرام سے بیٹھ سکتا۔ غالباً اسی دباؤ نے اسے جلدی جلدی کام نمٹانے پر مجبور کیا۔

اس کا مرکزی استدلال یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان فطری طور پر برابر ہیں' اور چونکہ حکومت حاکموں اور ان کی رعایا کو کرپٹ کر دیتی اور ان میں نابرابری پیدا کرتی ہے' اس لیے معاشرے کو غیر سیاسی بنا کر ہی فطری عدل کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ گوڈون رقم طراز ہے:

> انسان فطرت کی پیداوار اور قوانین فطرت کا مطیع ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی مسرت کے لیے (جو اسے زمین پر نہیں مل پاتی) ماورائی ہستیوں سے امید لگانے کی بجائے فطرت کا مطالعہ کرے، اس کے قوانین جانے اور ان کی اطاعت کرے۔ خدا ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ مذہب انسان کے قدیم خوفوں کی پیداوار ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے انسانوں کے ذہنوں کو غلام بنانے کے لیے مذہب کا استعمال کیا۔

لیکن گوڈون کوئی ملحد نہیں تھا: اس نے لکھا کہ حیات بعد از موت جیسے نظریات اس کے ذہن میں موجود نہیں، جبکہ مطلق مادیت پرستی کو بھی مسترد کیا اور ''ہر جگہ موجود ازلی سچائی'' کے افلاطونی تصور کو مانا۔ اس پس منظر میں نابرابری یا غلامی کے لیے کوئی عذر نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان استدلال استعمال کرنے کے ذریعہ یقیناً کاملیت حاصل کر سکتا ہے۔ ''برائی محض ایسی غلطی یا خطا ہے جو رواج پا جائے۔''

65

آبادی کے اصول پر مضمون

''*An Essay on the Principle of Population*''

تھامس رابرٹ مالتھس

1798ء (نظر ثانی 1803ء)

تھامس رابرٹ مالتھس (1766ء تا 1834ء) ایک دل گیر مذہبی آدمی تھا جس نے اصرار کیا کہ صرف جنسی (اخلاقی) ضابطہ بندی ہی دنیا کو فاقہ کشی اور اس کے تمام خوفناک نتائج سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ ایک بات بہت سوں کو حیرت زدہ کر دے گی' اور بلاشبہ ان لوگوں کو جو فرزندانہ سعادت

rekhta

پر یقین رکھتے ہیں۔ باعث حیرت بات یہ ہے کہ اس کا باپ ایک کھاتا پیتا جنٹلمین اور ''روشن خیالی'' کا مفکر Marquis de Condorcet (1743ء تا 1794ء) تھا۔ اس نے ایک کتاب ''انسانی ذہن کے ارتقاء کا تاریخی پس منظر'' لکھی جو اس کی موت کے ایک سال بعد انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ کونڈورسیٹ نے فرانس کی جیل میں قید کے دوران خودکشی کر لی تھی اور تھامس مالتھس نے ''نظریۂ آبادی'' میں اسے خاص طور پر ہدف بنایا۔

مالتھس کے باپ نے ہی اپنے دو دوستوں ڈیوڈ ہیوم اور رُوسو کو ملوایا تھا۔ وہ ولیم گوڈون کی تصنیف ''سیاسی عدل'' کا بھی قائل ہوا۔ چنانچہ محترم مالتھس کی مشہور ترین تصنیف کی ابتدا کو اس کے باپ کی اخلاقی آزادی پر پچھتاوے کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ ''مالتھس ازم'' کو عموماً مالتھس کی ایک غلط تعبیر قرار دیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں مالتھس ازم مالتھس کا ہی ہے۔

مارکوس دی کونڈورسیٹ

ابتدا میں مالتھس نے طے شدہ حقائق کی بجائے رجحانات کے بارے میں لکھا۔ اس کی مشہور دلیل بدستور بدقسمت لوگوں کی بہبود و فلاح کے خلاف جاتی ہے۔ لیکن اس بات کا دارومدار اس امر پر ہے کہ آپ اس کے ''مضمون'' کا کون سا ایڈیشن پڑھ رہے ہیں۔ 1817ء تک یہ پانچ جلدوں پر پھیل گیا تھا۔ قسمت اور خود مالتھس نے بھی مالتھس ازم کو دائیں بازو کی فکر کے لیے ایک آلۂ کار بنا دیا۔ اور دھیمے مزاج کے مالک چارلس ڈارون نے ''مضمون'' کو پڑھا تو اس نے فطری انتخاب کے نظریے پر سوچنا شروع کیا۔

مالتھس کسی بھی لحاظ سے ایک عظیم مفکر نہیں تھا۔ اس کا بنیادی خیال اچھوتا نہیں۔ اصل میں اس نے یہ خیال اپنے باپ سے مستعار لیا۔

مالتھس لندن کے جنوب میں ڈورکنگ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے باپ

کے منتخب کردہ متعدد اتالیقوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد وہ Jesus کالج کیمبرج میں داخل ہو گیا۔ اس نے گریجوایشن کی، فیلوشپ کے لیے منتخب ہوا، 1798ء میں پادری بنا اور 1804ء میں شادی کی۔ تب تک اس نے اپنے بنیادی نظریات تشکیل دے لیے تھے، بلکہ ان پر تھوڑی بہت نظرِ ثانی بھی کر چکا تھا۔

مضمون کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی ملاقات گوڈون سے ہوئی اور وہ اس وقت تک گوڈون سے متاثر رہا جب تک کہ اس نے 1820ء میں اس کا جواب نہ شائع کر دیا۔ تاہم، دشمنی کی ابتدا گوڈون نہیں بلکہ مالتھس کی جانب سے ہوئی تھی۔ اس نے آئندہ کچھ برس کے دوران یورپ بھر میں سفر کیے۔ 1803ء کے دوسرے ایڈیشن میں بہت سا مواد اس دوران کیے ہوئے مشاہدات پر مبنی ہے۔

1805ء میں مالتھس ہیلی بری (Hailey Bury) کے نئے تربیتی کالج (جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ملازمین کو تیار کیا جاتا تھا) میں سیاسی معیشت کا پروفیسر بنا۔ وہ اس قسم کے عہدے پر تعینات ہونے والا پہلا انگریز تھا۔ وہ ہارٹ اٹیک کے نتیجہ میں اپنی اچانک موت تک وہیں رہا۔

''اصول آبادی پر مضمون'' کا بنیادی جوہر یہ ہے: آبادی geometric انداز میں بڑھتی ہے اور ذرائع روزگار arithmetical صورت میں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آبادی پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو یہ 25 برس میں دوگنی ہو جاتی ہے۔ صرف جنگ، قحط اور وبائیں ہی اس تباہی کا تدارک کرتی ہیں۔ (جیومیٹرک انداز کا مطلب 1، 2، 4، 8، 16، 32 ...... ہے اور ریاضیاتی انداز 1، 2، 3، 4، 6، 8، 10 ...... ہے) چنانچہ ایسے حالات یقیناً پیش آئیں گے جب مفید جنگوں، خشک سالیوں اور وباؤں کی عدم موجودگی میں فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑے گا اور یوں کھاتے پیتے طبقے کے خلاف مختلف صورتوں میں تشدد ہوگا۔

امیر طبقات نے 1803ء کے دوسرے ایڈیشن کی بجائے پہلے ایڈیشن کو زیادہ پسند کیا تھا۔ وہ اس خیال کا حامل لگتا ہے کہ غربت کا علاج خود غریبوں کے ہاتھ میں ہے۔ مالتھس کے اس دوٹوک بیان کی وجہ سے معاشیات ایک ''افسردہ سائنس'' بن گئی کہ ''انسان کی بقاء کے لیے خوراک لازمی ہے، جبکہ...... جنسوں کے درمیان لگاؤ اور محبت لازمی ہے اور یہ کم و بیش موجودہ صورت میں ہی

رہے گی۔" مستقبل کی تاریخ دکھائے گی کہ انسان کے لیے کاملیت حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ مالتھس نے اصرار کیا کہ تاریخ اپنے اندوہناک چکروں میں ہی پھنسی رہے گی۔

مالتھس اور نہ ہی گوڈون نے برتھ کنٹرول پر زیادہ زور دیا۔ مالتھس کی نظر میں یہ "برائی" تھی اور اپنی بیوی میری وولسٹون کرافٹ کے ساتھ ناکام "فطری" طریقے اختیار کرنے والا گوڈون کنڈوم کو پسند نہیں کرتا۔ (غالباً وہ اس لحاظ سے پوپس کا ہم خیال تھا) درحقیقت برتھ کنٹرول ہی مالتھسکی پیشگوئیوں میں مداخلت کرنے والا ایک اہم عنصر تھا۔ یہ اس دور کی شمالی امریکہ کی کالونست آبادی کے معاملے میں تو موزوں تھا لیکن مقامی ہندیوں کے لیے نہیں۔ مالتھس تکنیکی ترقی کی قدر و اہمیت بھی صحیح طرح نہ سمجھ پایا اور اس کے پیش کردہ ماڈلز پسماندہ معاشروں کے لیے بمشکل ہی موزوں تھے۔ بہرحال ایک حد تک ان میں کافی جان تھی۔

مالتھس کا طوطی ہر طرف بولنے لگا۔ وہ آبادی کے مسئلے پر مستند ترین مفکر خیال کیا جانے لگا۔ یوں اس نے سمندر پار آبادکاری کی پالیسی کے فروغ کی راہ روکی۔ 1817ء میں اپنی کتاب کے پانچویں ایڈیشن میں وہ دلیل دے رہا تھا کہ بے روزگاری اور غربت کی وجہ "صرف" فاضل آبادی ہے، کہ غریبوں کی بہبود کے لیے رقم میں کمی کی جائے اور ناجائز اولاد پیدا کرنے کے خلاف سزائیں مزید سخت کی جائیں۔ نتیجتاً گوڈون اور مالتھس میں ٹھن گئی اور تو تو میں میں تک نوبت آ گئی۔ گوڈون کی تنقید نظرانداز ہو گئی اور مالتھس نے کامیابی حاصل کی۔

Jeremy Bentham نے کنڈومیٹ کا برتھ کنٹرول کا نظریہ اپنایا لیکن مالتھس نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ شہوانی اخراج کو کمزوری کا باعث خیال کرتا تھا اور اس نے لکھا کہ اس قسم کی برائیاں "محنت کشی کا رجحان ختم" کرتی ہیں۔ وہ اپنے زمانے کا فاتح تھا۔ ایک جدید مورخ کے بقول اس کے مکتبۂ فکر کا سب سے بڑا کام یہ تھا: "سماجی پالیسی کا خاصہ یہ ہے کہ کوئی سماجی پالیسی نہیں ہونی چاہیے۔" انیسویں صدی کے اوائل میں کچھ سیاست دانوں نے مالتھس ازم کو استعمال کر کے اجرتوں کو کم سے کم سطح پر رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آبادی میں اضافہ بہرحال انہیں دوبارہ کم کر دے گا۔ لیکن انیسویں صدی میں آبادی بڑھنے کی وجہ شرح پیدائش میں اضافہ نہیں بلکہ شرح اموات میں کمی تھی۔

مالتھس پسندوں اور خود مالتھس کی زبردست غلطی ایک مخصوص عرصہ پر ایک بے لچک معاشی "قانون" لاگو کرنا تھی۔ درحقیقت تکنیکی ترقی ایک ہی جتنے قطعہ اراضی پر پہلے سے زیادہ افراد کو ذرائع زندگی حاصل کرنے کا اہل بناتی ہے۔ لیکن تباہی کی پیش گوئیاں کرنے والے حضرات کہہ سکتے ہیں کہ مالتھس کی پیش گوئیوں کی یہ ظاہری ناکامی مستقبل پر لاگو کرنا موزوں نہیں...... مثلاً پسماندہ ممالک ترقی یافتہ ممالک سے ادویات درآمد کر کے اپنی شرح اموات میں کمی تو کر لیتے ہیں لیکن ان کی شرح پیدائش اسی رفتار سے بڑھتی رہتی ہے...... لیکن کیا ایسا ہی ہے؟ آج کل کے دور میں بیشتر کیسز میں ایسا نہیں ہے۔ لیکن ہمیں بدستور مسئلہ درپیش ہے۔ موجودہ دور کے چین نے جزوی طور پر مالتھسی پالیسی اختیار کی ہے' لیکن مسئلے کو ایک مختلف انداز میں حل کرنے کی ضرورت ہو گی۔ خراب سلوک اور فلاحی کاموں میں کمی کے لیے مالتھسی نظریے کا استعمال اب متروک ہوتا نظر آتا ہے۔

66

رُوح کی مظہریات

"Phenomenology of Spirit"

جارج وِلہلم فریڈرک ہیگل

1807ء

rekhta

جارج ایلیٹ کے ''مڈل مارچ'' میں ایک ناقابل فراموش کردار ایڈورڈ کیسوبون کا ہے جو ''The Key to All Mythologies'' نامی ایک کتاب لکھ رہا ہے بلکہ لکھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن یہ کتاب محض ایک تصور ہے: یہ نہ صرف کبھی بھی ختم نہیں ہو پاتی، بلکہ اس کا تو آغاز تک نہ ہو سکا۔ کیا ناقابل بیان پر وشیائی جی ڈبلیو ایف ہیگل بھی اتنا ہی ناتواں تھا، جس کی تمام علم کی کنجی بھی

بھی منظر عام پر نہ آ سکی! لیکن ہر دس ہزار کیسوبون جیسے لوگوں میں ایک ہیگل ضرور ہوتا ہے جو واقعی تمام علم کی کنجی لکھ ڈالتا ہے۔ چنانچہ ہیگل کی ''روح کی مظہریات'' ہمارے پاس موجود ہے۔ ہیگل بصیرتوں سے عاری نہیں اور بلاشبہ اس میں عمق بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی تصنیف ایک لحاظ سے اس ''کالی دیوار'' جیسی ہے جو ویتنام جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں تعمیر کی گئی تھی۔ ہم اس پر ماتم کناں ہیں لیکن اس کا احترام کرنا لازمی ہے؛ تاہم، ہیگل کی تصنیف اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اسے عزت واحترام دینا لازمی نہیں۔ ہیگل کے مجموعۂ تصانیف کے 1832ء تا 1840ء میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں نے اسے زبردست شہرت دلائی۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی متحدہ جرمن دنیا پر غالب آنے کی کوشش میں مصروف نہیں تھے تو وہ ہیگل سے یہ کام لے رہے تھے۔

rekhta

بلاشبہ ہیگل اس بدنامی کا بجا طور پر مستحق ہے جو اسے متعدد غیر راسخ العقیدہ لوگوں کے ہاں حاصل ہوئی: ایک مصنف کی حیثیت سے وہ بھی کانٹ کی طرح محض غریب نہیں؛ وہ دوسروں کی تحقیر کرنے اور خود کو بہت بڑی چیز سمجھنے والا آدمی تھا۔ وہ اپنی بات کے مفہوم کو چھپائے رکھتا اور پھر آخر میں ایک مبہم نتیجہ ''حرف آخر'' کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانی تاریخ کا اصل مقصد ہیگل کے نظامِ فکر کو سمجھنا اور پھر ہمیشہ کے لیے رحمت یافتہ بن جانا ہے۔

آرتھر شوپنہاور نے ہیگل کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہوئے اسے ایک ڈھونگیا اور نیم حکیم قرار دیا۔ بہت سوں نے اس رائے کی حمایت کی۔ شوپنہاور اپنی شاہکار کتاب کے حواشی میں ہیگل پر بار بار حملے کرتا ہے۔ ان حملوں کی وجہ محض شوپنہاور کا ہیگل سے جلنا ہی نہیں تھا۔ وہ اس بات پر غصے میں تھا کہ ہیگل نے بے ایمان انداز میں کانٹ کو بائی پاس کر دیا تھا۔ ہیگل کا قوم پرستانہ فلسفہ بھی اسے غصہ دلاتا تھا۔

تاہم، تاریخِ عالم کی ترقی کی منازل کا کھوج لگانے کے عمل میں ہیگل کچھ نہایت دلچسپ صداقتوں اور نیم صداقتوں کی طرف بھٹک نکلا۔

ہیگل 1770ء میں Stuttgart کے مقام پر ایک ادنیٰ سرکاری افسر کے ہاں پیدا ہوا۔ Tubingen کی یونیورسٹی سے وہ ایک لوتھری پادری بن کر نکلا۔ کاغذوں کے مطابق تو وہ ساری عمر لوتھری مذہب کا ہی پیروکار رہا تھا لیکن اس کا نظامِ فکر اس کی نفی کرتا ہے۔ البتہ اس نے فلسفہ کی راہ

اختیار کر لی۔ یونیورسٹی میں رہنے کے دوران اس نے رومانی فلسفی فریڈرک شیلنگ (1775ء تا 1854ء) اور شاعر فریڈرک ہولڈرلن سے دوستی کی۔ 1793ء میں گریجوایشن کرنے پر اس کے سرٹیفکیٹ میں اعلیٰ اخلاقی رویے کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ فلسفہ میں اس کے ناکافی علم کی نشاندہی بھی تھی۔ ہیگل نے اس فیصلے کا انتقام لینے کے لیے خود کو اپنے دور کا مشہور ترین فلسفی ثابت کر دکھایا...... ایسا فلسفی جس نے فلسفہ کو نئے سرے سے ایجاد کیا تھا۔ یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ شروع میں اس کا دوست شیلنگ زیادہ مشہور تھا لیکن اس نے اپنی زندگی کے آخری 40 برس گوشہ نشینی میں گزارے۔

ہیگل کی زندگی میں کوئی بڑے واقعات رونما ہوئے۔ 1801ء میں اس نے Jena یونیورسٹی میں ایک عہدہ حاصل کر لیا اور یہیں "روح کی مظہریات" لکھی۔ ہیگل نے روح کے لیے Geist کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب ذہن اور روح دونوں ہے (غالباً یہ عربی کے نفس یا ذات کا مترادف ہے۔ مترجم) آج تک اس بارے میں اختلاف رائے موجود ہے کہ ہیگل کی اصل مراد ذہن سے تھی یا روح سے۔ Battle of Jena (1806ء) کی شام کو "مظہریات" کے پروف اس کی میز پر پڑے تھے۔ اس جنگ میں نپولین کی فتح کے باعث یونیورسٹی بند ہو گئی اور اسے نیورمبرگ جانا پڑا۔ وہ کچھ عرصہ تک لڑکوں کے نیورمبرگ جمنازیم کا ہیڈ ماسٹر رہا۔ خیال ہے کہ وہاں وہ اپنے گائے جیسے شاگردوں کو اپنا اوٹ پٹانگ فلسفہ پڑھاتا رہا۔

ہیگل 1818ء سے لے کر 1831ء میں ہیضہ کی وباء پھیلنے پر اپنی موت تک برلن یونیورسٹی میں رہا (شوپنہاور اس بیماری سے بچ نکلا تھا)۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی چار بنیادی کتب شائع کیں: "مظہریات"، "منطق" (1812ء تا 1815ء) "انسائیکلوپیڈیا" (1817ء) اور "راستی کا فلسفہ" (1821ء)۔ اس کے مسودات اور لیکچر کے نوٹس میں موجود مواد فکری مسائل سے بھرپور ہے۔ اس کے نقاد ہمیشہ باہم برسرپیکار رہے۔ اس کی تمام تحریریں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں جن کے زیادہ تر حصے نے کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑا...... بالخصوص روح/ذہن کے معاملے میں۔ برلن میں قیام کے دوران ہیگل کی شہرت بام عروج پر تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو سب سے بلند درجے پر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تکبر اور غرور کچھ حد تک اس کے فلسفے کا بھی حصہ ہے۔ اس نے 1816ء میں شادی کی اور دو

بچوں کا باپ بنا۔ اس کا ایک بیٹا کارل مورخ بنا۔

یہاں ہم ہیگل کے نام نہاد مکمل اور کامل نظام فکر کا ایک مختصر خاکہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ کانٹ نے شئے بالذات کے علم کے امکان کو مسترد کیا تھا۔ تمام مظاہر کی وضاحت کرنے کا خواہشمند ہیگل اسی تک محدود نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ عارضی طور پر برکلے پسند تجربیت پسند بن گیا۔ اس نے دلیل دی کہ کسی شئے کے وجود کا دعویٰ صرف اور صرف شعور کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کے خیال میں یہ دلیل ایک تکنیکی لحاظ سے ناقص ہے (یہ موضوع ہماری اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے)۔ لیکن اس دلیل کے بغیر ہیگل کے نظام فکر کی عمارت تعمیر نہ ہو سکتی کیونکہ اس کا فلسفہ ناقابل معلوم کا ہی بیان ہے۔ اسے غیر دلچسپ قرار دینا حماقت کے ساتھ ساتھ بے ایمانی بھی ہوگا۔ بہرحال ہم بجا طور پر شوپنہاور کے ساتھ ہمدردی رکھ سکتے ہیں:

......اس کا سارا فلسفہ مابعد الطبیعیاتی توضیح کی ایک مہیب صورت ہے۔ (یعنی خدا کے موجود ہونے کا ثبوت)

ہیگل میں اس قسم کی تنقید کا جواب دینے کی اہلیت نہیں تھی۔ اس کا کوئی بھی لفظ خندہ زن نہیں اور افسوس کہ اس کے فلسفے کی تشریح کرنے والے لوگ بھی خندہ سے محروم رہے۔ بلاشبہ اس پر سب سے زیادہ اثر گوئٹے کا ہوا۔ شوپنہاور کی طرح ہیگل نے بھی رنگوں سے متعلق گوئٹے کے نظریے کو نیوٹن کے نظریے پر ترجیح دی۔ جب گوئٹے کے جوہر قابل نے جرمن ادب کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا تھا تو اس عہد کے متعدد جرمن مفکرین کی طرح اس کی اپنی تخلیقی امنگیں بھی غیر تخلیقی راہوں پر چل نکلیں۔ لیکن ہم سب قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کہ اس نے گوئٹے کے شہوت انگیز اور مزاحیہ Roman Elegies (1795ء) سے کیا کام لیا تھا۔ بلاشبہ اس نے بعد میں اپنی متوقع بیوی میری وان ٹکر کو یہ پڑھ کر نہیں سنایا تھا: وہ اسے بری طرح مارا پیٹا کرتا تھا تا کہ "معنی" (آئیڈیا) کی طرح اس کی شہوانیت بھی خود آگاہ ہو جائے۔ (یقیناً اس کے ایسا کرنے کی کوئی شہادت موجود نہیں، البتہ یہ ایک مفید قیاس آرائی ہے)۔ لیکن یہ ہرزہ سرائی عموماً ہیگل کے ساتھی پروفیسروں کو عوام کے سامنے مسائل سے دوچار کر دیتی تھی۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتے تھے۔

ہیگل کے فلسفے کا مفروضہ یہ ہے کہ ذہن (یا روح یا خدا؟) کا خود سے آگاہ ہونا ہی تاریخ ہے۔ کائنات ایک مطلق خیال کے انکشاف کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مطلق خیال کیسے کام کرتا ہے؟

ہیگل نے روایتی منطق سے گریز کرتے ہوئے اس کی جگہ جدلیات کی منطق سے کام لیا۔ یونانی زبان میں "Dialectic" کا مطلب "دلیل" یا وعظ ہے اور سقراط، افلاطون، ارسطو اور رواقی فلسفیوں نے اسے سچائی کی تشریح کے لیے سوال جواب کا طریق کار خیال کیا۔ کچھ جگہوں پر اس کا استعمال "منطق" کے ایک مبہم ہم معنی لفظ کے طور پر بھی ہوا لیکن کانٹ نے اسے "سراب کی منطق" قرار دیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مصنوعی استدلال کا ایک عمل ہے جو ناقابل معلوم کو سمجھنے کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ہیگل نے بعد از کانٹ تحریروں کی مدد سے جدلیات کو مطلق آلۂ کار کے درجے پر پہنچا دیا۔ خود تاریخ بھی اس کے تابع ہے۔ ذہن یا مطلق خیال تھیسس' اینٹی تھیسس اور سنتھیسس (دعویٰ، رد دعویٰ، ترکیب) کے عمل کے ذریعہ اپنے آپ سے مکمل طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ لیکن ہیگل تک آتے آتے ہر ترکیب ایک نئے تھیسس یا دعویٰ کی صورت اختیار کرتی گئی۔ ہیگل اپنی فکر کو حتمی ترکیب(synthesis) قرار دیتا ہے۔ "ہستی" (being) تھیسس ہے جس کی ضد بلاشبہ "لاشے" (nothing) ہے۔ لہٰذا ترکیب "ہونا" (becoming) ہے۔ قدیم مشرق میں صرف ایک یعنی حکمران ہی "آزاد" تھا؛ یونان اور روم میں چند لوگ "آزاد" تھے؛ ہیگل کے پروشیا میں سب لوگ "آزاد" تھے (بہرحال یہ آزادی پولیس والے کو پریشان کرنے یا شرانگیز مواد چھاپنے کے لیے ہرگز نہیں تھی)۔ ہیگل کی "آزادی" عام آدمی کی آزادی نہیں ہے۔

افسوس کہ اس مقام پر آ کر ابہام کی دھند دوبارہ چھانے لگتی ہے۔ ہیگل کی جدلیات کو محض تھیسس' اینٹی تھیسس اور سنتھیسس کے تین مراحل میں ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن Fitche اور شیلنگ نے ایسا ہی کیا۔

ہیگل بھی اپنے بیسویں صدی کے جانشین مارٹن ہیڈگر کی طرح ہمیشہ ان نہایت دلچسپ سوالات کے گرد ہی گھومتا رہا: ذہن میں خیالات کیسے پیدا ہوتے ہیں، سوچنے کا عمل کیسے کام کرتا ہے" آقا" خود کو اپنے "غلام" میں کیسے شناخت کرتا ہے اور انجام کار دونوں اپنے کردار کیسے

ادل بدل لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیگل کی کچھ بصیرتیں نہایت عمیق ہیں لیکن اس کا یہ نظریہ بدسرشت ہے کہ منطق کے ساتھ اتحاد کی جانب ذہن کی ترقی کی حقیقت ریاست کی صورت میں مجسم ہے۔ نہ ہی اس کا یہ خیال درست ہے کہ سکندر، جولیس سیزر (یا ہٹلر؟) جیسے "ہیروز" ظالمانہ اور پروشیائی نظریۂ اخلاق سے مبرا ہیں۔

شاید اس کے برعکس ہین (آئیڈیا) زیادہ باطنی قسم کی تاریخ میں خود سے آگاہ ہوتا ہے: یعنی فکر اور کم عوامی لوگوں کی جدوجہد کی تاریخ۔ ہیگل پسند اکثر کہتے ہیں کہ ہیگل کی فکر کو سٹالن یا ہٹلر جیسے افراد کی سوچ کے ساتھ جوڑنا "ناانصافی" ہے کیونکہ وہ بھی ضرور ان کی حکومت سے تنفر کا اظہار ہی کرتا۔ بلاشبہ ہیگل فلسفے کا پروفیسر تھا جس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنا عظیم الشان فلسفیانہ نظام تشکیل دیتے وقت عام لوگوں کی تکالیف پر بھی توجہ دیتا۔ وہ تو بس فلسفہ کا ایک پروفیسر تھا اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ مسئلۂ شر کے حوالے سے غیر پروفیسر سپینوزا کا پیش کردہ حل کچھ لحاظ سے محض زیادہ عمیق ہی نہیں بلکہ زیادہ انسانیت پسندانہ بھی ہے (بشرطیکہ انسانیت کی کوئی اہمیت ہو)۔ سپینوزا کی نظر میں شر کی اہمیت زیادہ تھی۔ یہ اس کی نثر میں اپنی تاب دکھلاتا ہے۔ تاہم، اس کا خدا بھی ہیگل کے "ہین" سے کچھ کم "ہیبت ناک" نہیں۔

کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو الٹا کر رکھ دیا (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے)۔ مارکس نے بس ہیگل کے ذہن یا روح کو "مادے" کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ یہ سادہ سی تبدیلی ممکن ہونے کا مطلب ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور غلط تھا۔ جدلیاتی مادیت کے علاوہ اور بھی کئی حوالوں سے ہیگل نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ فلسفے پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ شروع میں برٹرینڈ رسل بھی ایک ہیگلی مفکر تھا۔ نام نہاد پرانے ہیگلی پروٹسٹنٹ ازم پر زور دینے کے لیے ہیگل کو استعمال کرتے تھے۔ نوجوان یا بائیں بازو کے ہیگلیوں (جن میں مارکس بھی شامل تھا) نے اس کے فلسفے کی مدد سے دنیا کو بدلنے کی کوشش کی۔

جرمنی سے باہر ہیگل کی مطلق عینیت پسندی برطانوی فلسفیوں اے سی بریڈلے اور جے ایم ای مک ٹیگارٹ اور امریکہ میں جوشیا رائس کا نقطۂ آغاز بنی۔

67

دنیا بطور عزم اور خیال

"The World as Will and Idea"

آرتھر شوپنہاور

1819ء

آرتھر شوپنہاور (1788ء تا 1860ء) کو انگلینڈ میں پیدا ہونا تھا لیکن اس کی ماں کے ارادے ناکام ہوئے اور اسے پورٹ آف Danzig میں پیدا ہونا پڑا۔ اس کے باپ ہائنرخ کو بنکنگ اور ٹریڈنگ کے سلسلے میں وہاں جانا پڑا تھا۔ شوپنہاور کی ماں ایک ناول نگار اور مصنفہ تھی؛ 1806ء کے

بعد وہ ایک سیلون چلانے لگی جہاں گوئٹے بھی کئی بار گیا۔ 1831-32ء میں جب اس کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا تو وہ 24 جلدوں پر محیط تھا؛ وہ ایک اچھی مصنفہ نہیں تھی مگر زیادہ بری بھی نہیں تھی۔ وہ سفر کرنا چاہتی تھی اور یوں اس کے بیٹے کی ولادت گھر میں ہی ہوئی۔ لگتا ہے کہ شوپنہاور کو پیدائش کے دن سے ہی اپنی ماں پر غصہ تھا۔ وہ 1814ء سے لے کر 1838ء میں اپنی وفات تک کبھی اس سے نہ ملا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور آپس میں اس قدر حسد کا شکار تھے کہ اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ شوپنہاور کی ایک چھوٹی بہن 1796ء میں پیدا ہوئی۔

1793ء میں Danzig کی بندرگاہ کا پروشیاؤں کے ساتھ الحاق ہو گیا اور ہائنرخ کو ہیمبرگ منتقل ہونا پڑا۔ وہ 1805ء میں خودکشی کرنے تک وہیں رہا۔ اس کا خیال تھا کہ آرتھر بھی تجارت کا پیشہ اختیار کرے گا۔ اسے اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر آئی تھی، لہٰذا اس نے اپنے بیٹے کو بخوشی سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ آرتھر دو سال پیرس میں رہا اور چند ماہ لندن کے قریب ومبلڈن میں بھی گزارے۔ شوپنہاور کی تندخوئی (بالخصوص ہیگل کے خلاف) کی بڑی وجہ اس پروشیائی قوم پرستی اور توسیع پسندی سے نفرت تھی جو دو عالمی جنگوں کا باعث بنی۔ وہ خود اس برائی سے کلیتاً پاک تھا۔

شوپنہاور نے اپنے باپ کی موت کے بعد ایک تاجر کے پاس اپرنٹس کی نوکری بڑی ایمانداری کے ساتھ جاری رکھی؛ لیکن 1807ء میں اپنی ماں کے کہنے پر وہ گوٹنجن یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے طب کا مطالعہ کیا مگر پھر فلسفہ کا مضمون اختیار کر لیا۔ اسے برلن میں "The Fourfold Root of the Principle of Sufficent Reason"(1813ء) پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ماں نے یہ کہہ کر اسے ستایا کہ یہ مقالہ ماہرین نباتات کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کی شاہکار تصنیف "The World as Will and Idea" کا پہلا ورژن 1818ء میں شائع ہوا۔ اس وقت کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا اور نہ ہی اس کے 1844ء کے ایڈیشن پر خاص توجہ دی گئی۔ لیکن شوپنہاور کو برلن میں ایک اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی۔ اس نے 1820ء میں ہیگل کے مقابلے پر لیکچر دینے کی راہ منتخب کر کے اسے چیلنج کیا اور بے توقیر ہوا؛ فرانسیسی ناول نگار ستاں دال کی طرح وہ بھی اپنے عہد میں نظر انداز کیا جاتا رہا۔ وہ منتظر تھا کہ دنیا کب اس پر توجہ دے گی۔

آخر اس کی زندگی کے آخری عشرے میں یہ موقع بھی آ گیا۔ ہیگل کے لیے مہلک ثابت ہونے والی ہیضہ کی وبا (1831ء) کے بعد شوپنہاور Frankfurt am-main میں سکونت پذیر ہوا اور بقیہ ساری زندگی وہیں گزاری۔ اپنے محبوب کانٹ کی طرح اس کی زندگی بھی بڑی منظم اور باترتیب تھی۔ وہ روزانہ لندن ٹائمز پڑھتا اور چہل قدمی کرتا تھا۔

شوپنہاور نے زندگی کے کافی ابتدائی دور میں ہی اپنا فلسفہ تشکیل دے لیا تھا۔ اس کی شاہکار تصنیف کا 1844ء والا ایڈیشن محض ایک توسیع ہے۔ اسے دونوں ایڈیشنوں سے کوئی ادبی مقبولیت نہ ملی لیکن 1851ء میں جب اس کے کہاوتی قسم کی مجموعہ ہائے مضامین "Comments and Omission" کی دو جلدیں شائع ہوئیں تو اس نے اچانک خود کو مشہور و معروف پایا۔ جلد ہی "The World as Will and Idea" کے تراجم کی جانب توجہ دی جانے لگی اور وہ اپنی زندگی کے آخری عشرے میں مشہور ہو گیا۔ البتہ اس کی شہرت فلسفیانہ میدان میں پُراثر ہیگل جیسی نہ تھی۔

کسی بھی شائستہ قنوطیت پسند کی طرح اس نے بھی ایک مزے کی زندگی گزاری، اچھا کھایا پیا، دوسروں کو خوش رکھا اور جنسی اشتہا کی تسکین کی...... اور یقیناً وہ بے قدری کی پریشانیوں اور احساسات کا بھی شکار تھا۔ اپنی پیاری ماں کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے میں ناکامی اس کے لیے شدید صدمہ بن گئی۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے کتوں کے سوا کسی سے بھی ٹوٹ کر محبت نہ کر سکا۔

شوپنہاور کا فلسفیانہ قضیہ کانٹ سے مستعار لیا ہوا ہے: کہ مظاہر کی قابلِ معلوم دنیا اور ناقابلِ ادراک دنیا کے درمیان ایک فرق موجود ہے۔

شوپنہاور مظہرِ فطرت (thing-in-itself) کو ارادے (will) کے ساتھ شناخت کرتا ہے لیکن اس کے ہاں یہ لفظ خصوصی معنوں میں استعمال ہوا ہے (جیسا کہ ہم آگے غور کریں گے)۔

اس کے دوسرے قضیے کی بنیاد ظلم کے لیے اس کی نفرت اور خوف میں ہے۔ وہ اخلاقیات کے موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتا ہے کہ ''انسان کی پہلی اور اولین خوبی ایک مہیب انا پرستی ہے جو انصاف کی حدود کو پھلانگنے کے لیے تیار اور مشتاق ہے۔'' اس کی ''بدترین خاصیت'' دوسروں کی تکالیف سے مزا لینا ہے۔ شوپنہاور نے اسے رشک و حسد کی مزید مسخ شدہ صورت خیال کیا۔ وہ اپنے اندر اور دوسروں میں اس پر غور و فکر کرنے کی زحمت نہ کر سکا۔

شوپنہاور کا ناقابلِ ادراک کی جانب بڑھنے کا انداز زندہ جسم کی جانب بڑھنے جیسا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ ہم مظہرِ فطرت میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہم جسموں کا تجربہ محض ایک مظہری انداز میں کرتے ہیں، لیکن یہ مظہرِ فطرت کے طور پر بھی ہمارے تجربے میں آتے ہیں۔ یعنی ہم اپنے افعال کا تجربہ دو طریقوں سے کر سکتے ہیں: داخلی اور خارجی لحاظ سے۔ آپ مجھے روٹی کھاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ میں بھوکا ہوں: اور میں خود کو بھی یہ کام کرتے دیکھ سکتا ہوں؛ لیکن میں اصل میں صرف روٹی کھانے سے ہی آگاہ ہو سکتا ہوں۔ لہٰذا میں ''اپنے ارادے'' کا ایک خصوصی علم رکھتا ہوں۔ چنانچہ شوپنہاور کی نظر میں ''ارادہ'' زندہ رہنے کا عزم اور تحریک ہے۔ اس کے آغاز میں ہی اس کا اختتام ہے، کیونکہ یہ محض تکلیف سے چھٹکارا پانے کی ہی خواہش کرتا ہے۔

گوئٹے نے شوپنہاور کو ہندوستانی فلسفے اور پھر رومانوی نقاد ایف ڈبلیو Schlegel سے بھی متعارف کروایا۔ اس نے اپنشدوں کا ایک ناکافی مگر مددگار ترجمہ بھی پڑھا۔ ہندومت اور بدھ مت نے شوپنہاور کے فلسفے کو کافی متاثر کیا کیونکہ وہ انفرادی ارادے کو ساری کائنات کے ارادے کا ایک جزو سمجھتا تھا۔ بدھ کی طرح وہ کہتا ہے کہ ہم خود کو ایک سچی معدومیت (نروان نما) کے سپرد کر دیتے ہیں۔

چنانچہ بدھ کی طرح وہ بھی ایک ''ملحد'' تھا، مزید کچھ بھی نہیں۔ وہ ہسپانوی ڈرامہ نویس کالدیرون کے ایک قول کی توثیق کرتا ہے: ''انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے جنم لیا۔''

بودھیوں کی طرح شوپنہاور کی دنیا بھی اندھی اور غیر استدلالی ہے۔ آرٹ اور موسیقی راحت دیتے ہیں، لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ تیاگ واحد راہ ہے۔

نفسیات کے نقیب شوپنہاور نے اپنے سے پہلے کے کسی بھی فلسفی کی نسبت سیکس پر زیادہ توجہ دی۔ وہ بڑے دلچسپ انداز میں ''محبت'' کو شہوت پر ترجیح دینے سے انکار کرتا ہے۔ اس کے

خیال میں محبت خود کو ساوی اور ماورائی انداز میں پیش کرتی ہے" لیکن اس کی جڑیں صرف جنسی جذبے میں ہیں۔" اس نے یہ بیان کرتے ہوئے ایک عمیق نکتہ پیش کیا کہ کس طرح جنسی خواہش، ایک موضوعی ضرورت ماہرانہ انداز میں معروضی تعریف وتحسین کا کردار اختیار کر کے ہمارے شعور کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ بات ہمیں Pareto کی یاد دلاتی ہے جس کا اثر بھی بہت گہرا ثابت ہوا لیکن صاف گو شوپنہاور اس امکان سے صرف نظر کر گیا کہ جنسی سرگرمی محض شہوت سے ماخوذ ہونے کے باوجود ایک اور عنصر کی حامل ہو سکتی تھی: زندگی کی ایک منفرد بڑھوتری۔

دراصل شوپنہاور کائنات کے ناقابل ادراک کے اندر راہ ملتے ساتھ ہی ایک قطعی مختلف سمت اختیار کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے محبوب کتے عورتیں نہیں تھے۔ لگتا ہے کہ جیسے وہ جان بوجھ کر ایک اداسی بھری راہ اختیار کر رہا تھا اور الوہی احمق کے لیے جستجو کو بھی نظرانداز کر گیا۔ اس کا مخاطب پروفیشنل فلسفیوں کی بجائے عام اہل قلم تھے۔ مگر چند ایک کی ہی نظر میں اس کا یہ نکتہ جاندار ہے کہ جسم ہی ناقابل ادراک کی جانب جانے کا راستہ ہے۔ اُس نے اس بات سے انکار کیا کہ خودکشی تیاگ حاصل کرنے کا ایک کارآمد راستہ تھی کیونکہ یہ بھی تو ارادے کی ہی توثیق تھی۔ تاہم، وہ بودھیوں کے نظریہ تناسخ ارواح کا حامی نظر نہیں آتا۔ آپ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس نے خودکشی کی افادیت کو اس لیے مسترد کیا کیونکہ ایک قنوطیت پسند کے طور پر اس کا کیریئر بہت مسرت بخش ثابت ہوا تھا۔

1848ء کے ناکام یورپی انقلابات نے کافی مایوسی پھیلائی اور قنوطیت پسندی کو مقبول اور فیشن ایبل بھی بنا دیا۔ قارئین کے فوراً شوپنہاور کی جانب راغب ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ شوپنہاور دوسروں کے لیے ہمدردی کے جذبات سے عاری تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔

68

ثبوتیت پسند فلسفہ

"Course in the Positivist Philosophy"

آگسٹ کونتے

(1830ء تا 1842ء)

آئسی ڈور آگسٹ میری فرانسوئز ژاویئر کونتے یا مختصراً آگسٹ کونتے نے بہت عمیق اثر ڈالا لیکن وہ ذاتی حیثیت میں زیادہ قابل قدر نہیں ہے۔ البتہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اسے اپنے ملک میں بے انتہا سنجیدگی سے لیا گیا۔ کارل مارکس، جان سٹوارٹ مل، جارج ایلیٹ، اس کی پارٹنر جارج ہنری لیوس، ٹامس ہارڈی اور متعدد دیگر فرانسیسی، انگریز اور امریکی مفکرین و مصنفین

نے اسے اہمیت دی۔ بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جو عیسائیت پر اپنا ایمان کھو چکے تھے لیکن اس کے حقیقی فائدوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

ایک سیکولر کلیسیا تشکیل دینے کے لیے Comtean کوشش کے نصیب میں ناکامی لکھے ہونے کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ ایک ملحدانہ یا کم از کم غناسطی نکتۂ نظر بمشکل ہی فرد میں منطقی مذہبی نکتۂ نظر کو بڑھاوا دے سکتا ہے۔ انسانیت کی تقدیس پر ایمان ہی انسانیت سے ماورا کسی چیز کی جگہ نہیں لے سکتا۔ لیکن درخائم کے کام کی بنیاد پر متعدد لوگوں نے انسانیت کے "اجتماعی شعور" میں خدا کا ایک کارآمد متبادل ڈھونڈنے کی سعی کی۔ یہ ایک لازمی تجربہ تھا۔ درخائم "مقدس" کے اصل ماخذ دریافت کرنا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مذہب کی ایک صورت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

تاہم، ہر لحاظ سے ایک کمتر آدمی کومتے ایک زبردست تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور سٹوارٹ مِل کی طرح درخائم نے بھی اسے سنجیدگی سے لیا۔ کومتے کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والی خاتون Harriet Martineau (1802ء تا 1876ء) ایک ناول نگار تھی۔

کومتے کے دونوں جانشین...... کومتے کلاڈ ہنری ڈی روورائے سینٹ سیمون (1760ء تا 1825ء) اور ایمیلی ڈرخائم (1885ء تا 1917ء)...... اصلاً زیادہ اہم اور اچھوتے تھے۔ خود کومتے میں بمشکل ہی کوئی اچھوتا پن تھا۔ البتہ اس نے بائیالوجی کی طرز پر لفظ "سوشیالوجی" اختراع کیا اور اسے بجا طور پر تجربیت پسند اور ثبوتیت پسندانہ سوشیالوجی کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے لفظ "مثبت" اصل میں "سائنسی" کا ہم معنی تھا اور عموماً ہم اسی کے توسط سے ویکو، مونٹیسکیو اور سینٹ سیمون کے زیادہ گراں قدر خیالات تک رسائی پاتے ہیں۔ شاید صرف سوشیالوجسٹ ہی سوشیالوجی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں؛ انہوں نے کومتے کو اتنے بلند عہدے پر فائز کر دیا کہ وہ اس کا حقدار نہیں اور اب بھی بہت سے سوشیالوجسٹ رکھتے ہیں کہ معاشرہ ایک خالصتاً سائنسی خوردبین کے نیچے آ سکتا ہے۔

یہ امر معلومات افزا ہے کہ منطقی انداز فکر رکھنے والے کومتے نے نہایت دردناک زندگی گزاری۔ اپنے ہی مفادات کے ایک جاہلانہ دشمن کی حیثیت سے وہ ہمیشہ خود ہی اپنی تکالیف کا

باعث بنا۔ وہ اعصابی مرض کی حد تک انا پرست، جذباتی اور دوسروں کے احساسات سے لاپروا تھا۔ اس خاصیت نے اسے عارضی طور پر بااثر بنایا۔ اس کے جزرس ذہن نے متقدمین کے زیادہ ثمر آور نظریات کو مرتب کیا اور بہت سوں کے خیال میں اس نے ان نظریات کو ایک منطقی مفہوم عطا کر دیا تھا۔ امریکہ، برطانیہ عظمیٰ اور دیگر جگہوں پر سیکولر مذاہب اسی کے بتائے ہوئے خطوط پر استوار ہوئے۔

کومتے 1798ء میں مونٹ پلیئر کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا آغاز نہایت تباہ کن انداز میں ہوا۔ اس کا باپ ایک سینئر محصل (ٹیکس کلکٹر) تھا۔ وہ پیرس سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک طلباء بغاوت کی قیادت کرنے پر بال بال بچا۔ جلد ہی وہ ایک سیکرٹری بنا اور سینٹ سیمون کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ رجعت پسندانہ علوم اور ترقی پسندانہ اعتقادات کے حامل یوٹوپیائی سوشلسٹ سینٹ سیمون نے ہی اُن میں سے زیادہ تر خیالات تشکیل دیے جن کی بعد ازاں کومتے نے وضاحت و صراحت کی۔ سیمون نے امریکی انقلاب میں حصہ لیا اور انقلاب فرانس میں خطرات کا شکار ہوا۔ اس نے معاشرتی ارتقاء کے تین مراحل پیش کیے: "دینیاتی" (مصنوعی)، "مابعد الطبیعیاتی" (مجرد) اور "ثبوتیت پسندانہ" (سائنسی اور درست)۔ اس نے اپنی فکر کی بنیاد قرونِ وسطیٰ کی جاگیرداری میں سے جدید صنعتی معاشرے کے ظہور کی مثال کو بنایا۔ وہ یہ یقین نہیں رکھتا تھا کہ روایتی عیسائیت اچھائی سے عاری تھی، بلکہ اس کو یقین تھا کہ ایک عیسائی معاشرہ اپنے اندر ہی اپنے انحطاط کے بیج لیے ہوئے ہے۔ یہ معاشی میدان میں بالادستوں کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ مارکس نے اس کا اثر لیا۔ لیکن دنیاوی کے ساتھ ساتھ ایک روحانی طرز عمل پر یقین کے متعلق سینٹ سیمون کی تحریر ظاہر کرتی ہے، کہ وہ اپنے شاگرد کی طرح سیدھی سادی سوچ کا مالک نہ تھا۔ کومتے ایک مشترکہ تصنیف کی اشاعت کے معاملے میں اس کے ساتھ جھگڑ پڑا تھا (1824ء)۔

سینٹ سیمون اور چند دیگر مفکرین سے اخذ کردہ دینیاتی ...... مابعد الطبیعیاتی ...... ثبوتیت پسند چکر کومتے کے ہاں اس طرح پیش کیا گیا: دینیاتی مرحلے میں انسان چیزوں کی وضاحت کے لیے مافوق الفطرت وسیلوں پر انحصار کرتا ہے، مابعد الطبیعیاتی مرحلے پر وہ مجرد لیکن ناکافی طور پر

ادراک کردہ وجود کو مانتا ہے۔ صرف ثبوتیت پسندانہ مرحلے پر ہی وہ انجام کار دنیا پر قادر خالصتاً سائنسی قوانین کو سمجھ پاتا ہے۔ یوں مابعد الطبیعیاتی یا مافوق الفطرت وجود کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈرخائم نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان وجود کو رد ی کرآیا ہے، لیکن ان کے ممکنہ مفہوم کے بارے میں اس کی تحقیق زیادہ عمیق تھی۔ البتہ کومتے کو یقین تھا کہ انسان سائنسی جذبے کے تحت خود ہی دنیا کو کنٹرول کر سکتا تھا، مگر یہ راستہ سیدھا یوٹوپیا کی جانب لے جاتا ہے۔ کومتے کی عظیم تصنیف میں پیش کردہ یہ سکیم اس قدر سادہ کہ اس نے وکٹورین رجائیت پسندی اور سائنسی طریقہ کار کی محیط کل طاقتوں پر اعتماد کو زبردست تقویت دی۔ انجام کار مارکسی فکری ڈگر نے غلبہ پایا لیکن کچھ وقت تک کومتے ہی فاتح رہا۔ شاید اس کی بڑی وجہ اس کا دنیا کے انداز کارکردگی کی حقیقتوں سے ناواقف ہونا تھی۔ سائنس انسانی تضاد، قحط اور طاعون کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی' اور مخصوص تحقیقات میں سائنسی طریقہ کار لازمی ہونے کے باوجود یہ دنیا کو کنٹرول یا اس کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں۔

کومتے کی سوچ (جو سینٹ سیمون سے ہی اخذ کی گئی) میں اگلے مرحلے نے ڈرخائم کو بالخصوص متاثر کیا۔ کومتے ایک ثبوتیت پسندانہ یعنی غیر مذہبی کلیسا قائم کرنے تھا۔ ڈارون پسند انگریز ٹی ایچ ہکسلے نے درست طور پر اسے "عیسائیت سے عاری کیتھولک ازم" کہا۔ کومتے کے Positivist Calendar (1849ء) میں عظیم سیکولر اولیاء کی فہرست دی گئی ہے: فریڈرک اعظم، ایڈم سمتھ، وغیرہ۔ یہ انسانیت کے مذہب کے فائدے میں تھا' جس میں خدا کی بجائے انسانیت کی عبادت کی جاتی تھی اور جس میں محبت اور جذبۂ ایثار انسانوں کو تحریک دلاتا تھا۔ کومتے خود ان دونوں چیزوں سے محروم تھا۔ بیوی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ اپنے فرانسیسی شاگرد ایمیلی Littre اور جان سٹوارٹ مل کے ساتھ لڑا۔ بہرحال سٹوارٹ مل مالی لحاظ سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر آخر کار کومتے کی حرص کے آگے حوصلہ ہار گیا۔

کومتے بہت محتاط اور جز رس تھا۔ وہ ہر چیز کو اس قدر کامل طور پر سمجھتا تھا کہ شاید حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پُر اعتماد بھی تھا۔ لہٰذا اس نے ہر اس چیز کو حماقت قرار دیا جو سائنسی نہیں کہلا سکتی تھی۔

69

جنگ کے بارے میں

"On War"

کارل میری واں کلاسوِز

1832ء

کارل واں کلاسوِز (1780ء تا 1831ء) کوئی فلسفی نہیں تھا، البتہ ارنسٹ اور ٹریور نے اپنی "انسائیکلوپیڈیا آف ملٹری ہسٹری" میں اسے "عظیم ترین عسکری فلسفی" قرار دیا۔ غالباً ان کا مقصد "فلسفہ" کا مفہوم بدلنا نہیں، لیکن بیادانستہ طور پر عسکری مفکرین کی جذباتی فلاکت اور غیر انسانی

پن کو ضرور ننگا کر دکھاتا ہے۔ دکھ کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پروشیائی نے بھی کئی حقیقی فلسفیوں جتنے ہی گہرے اثرات مرتب کیے۔ نیز اس نے ہزاروں دیگر افراد کو بھی فلسفے یا کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی ضرورت سے محروم کر دیا۔

فوج میں کلاسوز کا کیریئر ممتاز تو تھا لیکن غیر معمولی نہیں۔ اس کی ذہنیت قائدانہ نہیں بلکہ خدمت گارانہ تھی۔ فوجی حکمت عملی کے حوالے سے بات کرنے پر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ہر ملٹری کالج میں اس کا نام جانا پہچانا ہے۔ اسی کا ایک بار یک بین پروشیائی قاری ہیلمتھ کارل برنہارڈ مولتکے (1800ء تا 1891ء) اصل مجرم ہے...... بشرطیکہ ہم الزام عائد کرنا ضروری سمجھتے ہوں۔ آخر الزام کیوں دیا جائے؟ جنگ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ عسکری حلقوں سے باہر کلاسوز کا ذکر اس تعریف کے حوالے سے ہوتا ہے جو اس نے جنگ کا مفہوم اور مقصد بتانے کے لیے کی: ''جنگ محض ریاستی پالیسی کو جاری رکھنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔'' اس تعریف پر زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا۔ بالخصوص جنگوں کی تباہ کاریوں سے ناآشنا پروفیسرز فوراً ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ اس کا فلسفۂ نظر محض ''موجودہ حالات سے اخذ کردہ منطقی نتیجہ'' ہے۔ لیکن اس بارے میں شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ کلاسوز ایک رزم خواہ کی حیثیت سے بجا طور پر مشہور ہے...... چاہے وہ خود ایک اچھا جنگجو بننے کی صلاحیتیں نہیں رکھتا تھا۔ اس کی پروشیائی فطرت دور امن کے تساہل اور غیر حب الوطن حالات کے حق میں نہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ ''جنگ ہمارے دشمنوں کو ہماری خواہش کی تکمیل پر مجبور کرنے کے لیے ایک متشدد فعل تھی۔'' بیسویں صدی میں یہ بات کافی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

اس نے یہ بھی لکھا: ''فلسفۂ جنگ میں اعتدال کا اصول متعارف کروانا بے کار اور فضول ہو گا۔'' ''آئیے ان جرنیلوں کی بات نہ کریں جنہوں نے خونریزی کے بغیر فتوحات حاصل کیں۔'' ''جنگ کا موازنہ آرٹ کے ساتھ کرنے کی بجائے ہمیں چاہیے کہ اس کا موازنہ تجارت کے ساتھ کریں' جو مفادات اور سرگرمیوں کا ایک ٹکراؤ ہی ہے؛ جنگ کافی حد تک سیاست جیسی اور سیاست ایک بڑے پیمانے کے کاروبار جیسی ہے۔'' یہ بات بمشکل ہی حیرت انگیز ہے، امریکی بزنس مین کے کچھ دھڑے کلاسوز کی قسم اٹھائے ہوئے ہیں۔ "Crisis Manager" نامی ایک

انٹرنیٹ میگزین میں "Green Bay Packers" کے مشہور کوچ ونس لومبارڈی کو فٹبال کا کلاسوز قرار دیا گیا۔ مضمون کے آخر میں خلاصہ پیش کیا گیا کہ ''فٹ بال = جنگ = سیاست = کاروبار۔''

کلاسوز کے واحد مدمقابل چینی جنرل اور عسکری مصنف سن تزو (تقریباً 500 ق م) اور سوئٹزر لینڈ کا انتونی ہنری جومنی ہیں۔ سن تزو کا اثر چین سے باہر نہ ہونے کے برابر تھا' لیکن حال ہی میں Crisis Manager نے ''آرٹ آف وار'' کو غیر معمولی قرار دیا۔ کرائسس مینیجر کے منتظمین کو اس سے نئے خیالات ملے: ''مفتوح عوام کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرو اور وہ تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور جنگ چھیڑنے کے لیے آپ کو عوامی عزم کی ضرورت ہوتی ہے'' (یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے طریقے موجود ہیں۔ سن تزو یقین رکھتا تھا کہ لوگوں کے ساتھ بہرحال فیضانہ برتاؤ ہونا چاہیے اور اس نے حال ہی میں کرائسس مینیجر کو قائل کیا ہے کہ یہ فیاضانہ برتاؤ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن سن تزو تو محض ایک ''اخلاقی اصول'' پیش کر رہا تھا۔ جدید عسکری منصوبہ ساز ہمیشہ کلاسوز سے ابتدا کرتے ہیں۔ ہنری جومنی کو اس جیسی اہمیت حاصل نہیں۔

کلاسوز کے دفاع میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ذہین تجربیت پسند تھا اور اسے کسی بھی اعتبار سے عسکریت پسند نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مقصد جنگ کو رفیع الشان بنانا نہیں بلکہ اسے درست سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھنا تھا۔ تاہم، یہ حد سے زیادہ فیاضی ہے۔ ''جنگ کے بارے میں'' سے اخذ کردہ جملوں کی روشنی میں وہ میکیاویلی جیسا لگتا ہے۔ لیکن یہ کتاب (جس پر مصنف کو نظر ثانی کا موقع نہ ملا) نہایت گنجلک اور بے ربط انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کی دیگر تحریریں جنگی مہمات کی تواریخ ہیں۔ ان تمام تحریروں کا مجموعہ 1832ء تا 1837ء کے دوران ''باقیات'' کے نام سے سامنے آیا اور دنیا کو پہلی بار ''آن وار'' کا علم ہوا۔ کلاسوز ایک اچھا قلم کار نہیں تھا۔ تاہم، شاید وہ چنگیز خان (اس وقت تک کا عظیم ترین جرنیل) کے ان الفاظ سے اتفاق نہ کرتا: ''عظیم ترین خوشی دشمنوں کو شکست دینا، ان کا تعاقب کرنا، ان کی دولت لوٹنا، ان سے محبت کرنے والوں کو روتے دیکھنا اور ان کی بیویوں اور بیٹیوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونا ہے۔''

کلاسوز Magdeburg کے قریب Burg کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس نے نوجوانی سے لے کر آخر تک ساری زندگی سپاہی کے طور پر بسر کی۔ اس نے بارہ برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اپنا اندراج کروایا اور ایک سال کے اندر اندر فرانسیسیوں کے ساتھ پہلی لڑائی کا تجربہ حاصل کر لیا۔ 1801ء میں اسے نئی تشکیل دی گئی ملٹری اکیڈمی برلن میں داخلہ ملا جہاں اس نے فریڈرک اعظم اور میکیاویلی کے ساتھ ساتھ پروشیا اور دیگر عظیم اقوام عالم کا مطالعہ کیا۔

گریجوایشن کرنے کے بعد کلاسوز فوج میں واپس آیا اور فرانسیسیوں کا قیدی بنا۔ 1812ء میں اس نے اپنے کئی دیگر افسر ساتھیوں کی طرح سابق دشمن فرانس کے ساتھ جبری پروشیائی اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور روس کے خلاف نپولین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ کلاسوز جا کر روسی فوج میں شامل ہو گیا اور دو برس تک مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ اس نے روس کے ساتھ اتحاد اور پروشیائی فوج کی تنظیم نو کر کے نپولین کے خلاف خدمات انجام دیں اور 1818ء میں برلن وار کالج کا سربراہ مقرر ہوا۔ وہ دس برس سے زائد عرصہ تک پروشیائی فوج کو منظم کرنے میں مصروف رہا اور اس دوران اپنے عسکری فلسفہ کو مرتب کیا جو بعد ازاں ''آن وار'' کی صورت اختیار کر گیا۔

کلاسوز صاحب طرز مصنف نہ ہونے کے باوجود اپنے موضوع یعنی جنگ پر بات کرتے ہوئے سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کی ہٹلرازم پر منتج ہونے والی تھیوری کا ایک مرکزی وصف ''عسکری جینئس'' کا تصور ہے: ''جینئس کا عمل بہترین ہے، اور تھیوری تو محض یہ دکھاتی ہے کہ وہ کام کیوں اور کیسے کرنا چاہیے۔'' بہادر، نڈر، قوت برداشت کے مالک فوجی جینئس کی سب سے بڑی خوبی ''انسانی فطرت کی تفہیم'' ہے۔ یعنی اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر کوئی عزت، شہرت اور ترقی کا متمنی ہوتا ہے۔

وہ عسکری ماہرین اور ان کے کاروباری پیروکاروں کے چہرے پر مسرت بکھیرنے کے لیے دوٹوک انداز میں کہتا ہے: ''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ بظاہر غیر پیچیدہ معلوم ہونے والی جنگ صرف وہی لوگ لڑ سکتے ہیں جو غیر معمولی ذہانت کے مالک ہوں۔'' اس قسم کے کاروباری افراد کی نظر میں ''غیر معمولی ذہانت کا مالک ہونا ایک بہت بڑا امتیاز ہے۔ کلاسوز کے فوجی

جینئس کی مزید خوبیاں یہ ہیں: ماہر، انتشار اور بے ترتیبی میں سے راہ نکالنے والا، سچائیوں کو فوراً پہچان لینے والا اور مستثنیات سے باخبر۔ آپ سوچیں گے کہ کلاسوز کسی فوجی جینئس کو جانتا اور بخوبی سمجھتا تھا...... جی ہاں ایسا ہی تھا اور یہ فوجی جینئس اس کا دشمن نپولین تھا...... ''جنگ کے بارے میں'' محض بونا پارٹ ازم کے مشاہدات پر مبنی ہے۔

Dupuys اپنی ''انسائیکلو پیڈیا آف ملٹری ہسٹری'' میں نکتہ پیش کرتا ہے کہ کلاسوز کے نظریات نے ہر ایک فوج کو شدید متاثر کیا اور اس پر تنقید کرنے والے اب بھی اس کے متعدد مشاہدات کو دہراتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی ''تھیوریز'' میں مروڑ توڑ کر پیش کیے جانے کی خاصیت کافی زیادہ ہے کیونکہ انہیں ''اخلاقیات'' کی حدود سے باہر رہ کر تصور کیا گیا تھا۔ اس کا مقالہ کسی کیبن کو کھولنے کے لیے اس پر درج ہدایات کی طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اس کی تجزیاتی صلاحیت بہت کمتر ہے۔ مثلاً وہ ہمیں تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کرتا کہ فوجی جینئس کیسے متشکل ہوتا ہے۔

''جنگ کے بارے میں'' خوشگوار آئیڈیلزم سے عاری بھی نہیں۔ مصنف کے خیال میں فوجی جینئس کو سیاست اور پالیسی سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے، ورنہ وہ اپنی شروع کی ہوئی جنگ جیت نہیں پائے گا۔ (اس نظریے پر بات نہیں کی گئی کہ جنگ غلط چیز ہے اس لیے جنگ چھیڑنی چاہیے) وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ جنگ کا کنٹرول سویلین ہاتھوں میں ہو۔

کلاسوز یہ نہ دیکھ پایا یا دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا کہ بونا پارٹ ازم ہٹلرازم پر منتج ہوتا ہے...... یا شاید اس کی قوت متخیلہ اس قدر محدود تھی کہ وہ اسے کوئی ایشو ہی نہیں سمجھتا تھا۔ لگتا تھا کہ پہلی عالمی جنگ ختم ہونے کے بعد اس کے نظریات لایعنی ہو گئے تھے، لیکن ہٹلر کی Blitzkrieg پالیسی بنیادی طور پر کلاسوز سے ہی اخذ کردہ ہے۔ ہنری کسنجر کا تعلق neo-Clausewitzian نامی مکتبہ فکر سے ہے۔ تاہم اب یہ کہا جاتا ہے کہ کلاسوز نے Lyndon بی جانسن کو بتایا کہ وہ جنگ ویتنام کیوں ہارا: لڑائی میں دشمن کو تھکا دینے کا مطلب ہے کہ جنگ کی طوالت کو استعمال کرتے ہوئے دشمن کی جسمانی اور اخلاقی مدافعت کو درجہ بدرجہ کھوکھلا کرنا۔ یہی سبق مارکیٹنگ پر بھی لاگو ہوتا ہے: یعنی ایک پختہ یا انحطاط پذیر مارکیٹ کے لیے طویل مہم چلانا۔

70

اور / یا

"Either/Or"

سورین کیرکیگارڈ

1843ء

ایک شدید اور مطلق موضوعیت اور نہ ہی ایک مصنوعی معروضیت حقیقی معنوں میں معروضیت ہے۔ ڈینش ماہر دینیات، طنز نگار اور فلسفی سورین کیرکیگارڈ (ہیگل کا شدید دشمن) انیسویں صدی کے ان تقریباً نصف درجن مفکرین میں سے ایک ہے جنہوں نے بیسویں صدی کی فکر پر

فیصلہ کن اثر ڈالا۔

نطشے کی طرح وہ بھی ایک افسردہ، نیوراتی اور خوفناک حد تک وہمی انسان تھا...... لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زبردست دانائی والے مقولے تراشنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اسے حد سے زیادہ افسردہ کہا گیا۔ کچھ ایک نے کہا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔ کچھ لوگ اس کے وا شگاف پیغام کو نطشے کے بلند بانگ پیغام پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس کی سوچ (جو غیر سیاسی ہے) کی حقیقی سمت ناقابل تقلید حد تک سخت نہیں۔ وہ پاگل پن کی حد کے بہت قریب نہیں تھا (بہرحال نطشے تو پاگل ہی ہو گیا تھا)! اس میں زیادہ نخوت نہیں تھی اور نہ ہی وہ کوئی بہت بڑا عالم فاضل تھا۔

سورین کیرکیگارڈ 1813ء میں بمقام کوپن ہیگن پیدا ہوا۔ اس کے ماں باپ متوسط طبقے سے تھے۔ اس کی ماں Ane اپنے شوہر کی پہلی شادی کے دوران گھریلو ملازمہ تھی اور مائیکل سے شادی کرنے سے قبل ہی حاملہ ہو چکی تھی۔ مائیکل اون کے کاروبار میں خوش قسمت نکلا اور اسے اتنا فائدہ ہوا کہ 40 برس کی عمر میں ریٹائر ہو گیا (سورین کی پیدائش کے وقت اس کی عمر 56 برس تھی)۔ لیکن اپنی مفلوک الحال جوانی کے دنوں میں ایک مرتبہ اس نے خدا کو کوسا تھا۔ اب اسے نفسیاتی دورے پڑنے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ ان دوروں کی وجہ خدا کے خلاف برے کلمات بولنا تھا۔

مائیکل نے اپنے بیٹے کی شخصیت پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ وہ اپنی نجات دلانے والی صلاحیتوں کی بجائے متواتر مسیح کی تکالیف پر غور و فکر کرتا رہا۔ سورین نے کہا کہ "انسانی اعتبار سے بات کی جائے تو میری پرورش پاگل پن میں ہوئی تھی۔" وہ بھی اپنے باپ کی طرح سودائی ہونے کے باوجود نہایت بردبار، بذلہ سنج اور لطافت کا مالک تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے باپ کی ذہنی الجھن کی قیمت ادا کی مگر اسے دانش کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

1830ء میں سورین یونیورسٹی میں داخل ہوا اور ایک عشرہ تک وہیں رہا۔ اس نے الٰہیات اور فلسفے کا مطالعہ کیا، کچھ عرصہ شراب نوشی اور فسق و فجور میں گزارا، مقروض ہوا اور 1834ء میں باقاعدگی سے اپنا مشہور و معروف "روزنامچہ" لکھنے لگا۔ 1835ء میں اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے خود کو جاننا چاہیے اور اس کے بعد ہی وہ زندگی کے ساتھ کچھ کر سکے گا۔ اس نے روایتی مفہوم میں اپنی زندگی کے ساتھ "کچھ" "بھی نہ" کیا۔ "اس کے پاس وافر ذرائع تھے جو 1855ء میں

اس کی وفات کے دن ہی اختتام پذیر ہو گئے۔

اس نے خود کو سمجھنے والی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی Regine سے منگنی کی لیکن اس بنیاد پر یہ رشتہ توڑ دیا کہ وہ ایک ''تماش بین'' تھا۔ اس نے خوفناک طنز (جو اس کا نشان امتیاز بن گیا) کے ساتھ کہا: ''بہر حال تقریباً دس برس میں، جب میں اپنے جنگلی بیج بو چکا ہوں تو مجھے دوبارہ جوان کرنے والی ایک نوجوان خاتون حاصل ہونی چاہیے۔'' اس قسم کا آدمی بہت زیادہ کچھ جانتا تھا اور وہ اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ ''انسانیت کی تنگی رگ تھا۔'' Regine کے ساتھ تعلق ٹوٹنے کے موقع تک وہ ایک عمیق مذہبی تجربہ حاصل کر چکا تھا (19 مئی 1838ء) جسے محض صوفیانہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے: صبح ساڑھے دس بجے۔

کیرکیگارڈ نے یہ اصرار کر کے ''قابل احترام'' الٰہیات کو الٹا کر رکھ دیا کہ موضوعیت واحد سچائی ہے جسے جاننا چاہیے۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس کی اپنی ذات بھی مختلف اور حتیٰ کہ متحارب ذاتوں (Selves) پر مشتمل ہے۔ چنانچہ وہ متعدد فرضی نام استعمال کرتا ہے جن میں سے کوئی بھی دوسرے کے ساتھ ''میل'' نہیں کھاتا۔ وہ ہمیشہ ایک متحد کرنے والے ''میں'' کی جستجو میں رہا۔

کیرکیگارڈ کوپن ہیگن میں لوتھری کلیسیا کے شدید سرگرم دشمن کے طور پر کافی معروف تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یورپ میں 1848ء کے انقلابات کے نتیجے میں ڈنمارک میں قائم ہونے والا نام نہاد عوامی کلیسیا اور عوامی بادشاہت محض دکھاوے تھے۔ اس نے عیسائیت کی جڑیں ''لغویت'' میں دیکھیں۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ عیسائی جانتا ہے کہ کوئی منطقی غور وفکر اس کے ایمان کی حمایت نہیں کر سکتا تھا: اسی حوالے سے یہ ''لغو'' ہے۔

بہت سوں نے سوال کیا کہ اس قسم کے نظام فکر میں مثبت چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب ہے: صبح کی طرح محبت میں گزاری ہوئی زندگی۔

وٹگنسٹین نے کیرکیگارڈ کو ''گزشتہ (انیسویں) صدی کا سب سے زیادہ عمیق النظر مفکر قرار دیا تھا لیکن اس منفرد مصنف کے ہاں مثبت مواد کے لیے اس کی تصنیفات کا جائزہ لینا پڑے گا: انسانوں کی داخلی نفسیات میں کیرکیگارڈ کی مہارت کا اندازہ کرنے کے ذریعہ ہی آپ اس کی کہی ہوئی باتوں کی اہمیت جان سکتے ہیں۔ فطری طور پر اس کی ''لغویت'' کو ملحدین (مثلاً

سارتر) اور مذہبی (مثلاً ہیوبر) دونوں قسم کے لوگوں نے استعمال کیا۔ کیرکیگارڈ کے پاس عیسائیت پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا اور اس نے دیگر مذاہب کی بجائے پاسکل کا مطالعہ کیا۔ اس کا سارا کام سرکاری عیسائیت کے دائرۂ کار میں ہے۔ اس نے ایک پادری بننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس نے بے ایمان کلیسیا کی مخالفت کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔ لیکن بلاشبہ اس نے کلیسیا کے کچھ لوگوں کا احترام کیا اور کلیسیا میں بھی اس کا احترام کرنے والے کئی لوگ موجود تھے۔

کیرکیگارڈ نے متعدد کتب تصنیف کیں، جو سب ہی مختلف نکتہ ہائے نظر بیان کرتی ہیں: "Purity of Heart Is to Will One Thing" (1847ء) میں نیکی برائے نیکی نہ کہ کسی برائے جزا کے مسئلے پر بات کی گئی ہے۔ یہ غالباً اس موضوع پر آج تک کی سب سے بہتر اور حقیقت پسندانہ بحث ہے۔

"Either\Or: A Fragment of Life" (1843ء) کیرکیگارڈ کی پہلی قابل ذکر کتاب تھی۔ یہاں اسے شامل کرنے کی وجہ اس کا دیگر تمام کتابوں سے زیادہ مسحور کن ہونا ہے۔ کیرکیگارڈ اس قدر مسحور کن کیوں ہے؟ کیونکہ وہ داخلی زندگی، شعور کے دھارے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے، کیونکہ اس نے داخلیت پر زور دیا۔ اگر کیرکیگارڈ نیوراتی ہے تو وہ انتہائی ذہین بھی ہے۔ وہ اتنا زیادہ کچھ جانتا ہے کہ ایک اخلاقیت پسند ملحد یا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

"Either\Or" کی پہلی جلد لذتیاتی زندگی (یا بقول کیرکیگارڈ ''ملحدانہ زندگی'') کے بارے میں ہے۔ اس میں موسیقی، مشہور ''بدقماش کی ڈائری'' اور دیگر کئی موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ کیرکیگارڈ کی اپنی ہی تصویر کشی ہے۔ یہ اس قسم کے لوگوں کی طرز زندگی کے متعلق غیر معمولی معلومات فراہم کرتی ہے۔

دوسری جلد ایک متبادل یعنی فطری زندگی پیش کرتی ہے۔ خود کیرکیگارڈ نے اپنے روزنامچوں میں لکھا کہ اس نے شادی کو ایک ''یا'' (Or) کی صورت میں دکھایا لیکن ''یہ میری زندگی کی ''یا'' نہیں تھی۔'' Either\Or نے ایک انتہائی تھیسس قائم کیا جس پر کیرکیگارڈ نے اپنی بقیہ تصانیف میں تحقیق کرنا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ Regine کے ساتھ اس کا رویہ نفرت انگیز تھا (اس کا دفاع کرنا اس کی

ساری تصنیف کی روح کے منافی ہوتا)۔ ایک لحاظ سے اس کی "Concept of Dread" (1844ء) اس کے خبطی احساس جرم کا نتیجہ تھی جو اس نے Regine کے ساتھ اپنے رویے پر محسوس کیا۔ یہاں وہ دنیا کو ایک نظریے سے متعارف کرواتا ہے جو دوسری عالمی جنگ کے بعد اور سارتر کے منظر عام پر آنے پر "angst" (احساسِ خوف) کے طور پر مشہور و مقبول ہوا۔

کیر کیگارڈ نے کافی درست انداز میں ''احساس خوف'' کو ہر روشن فکر آدمی کے ساتھ منسوب کیا۔ کم از کم مذہب کی ہمہ گیر طمانیت بخش حیثیت کے خاتمے کے بعد ہستی کو لامحدود اور خوفناک امکانات کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ اس نے ''روزنامچوں'' (مئی 1843ء) میں Regine کو مسترد کرنے کے حوالے سے اس مسئلے پر بحث کی:

> اگر مجھے اپنے بارے میں وضاحت کرنا پڑتی تو اسے نہایت خوفناک چیزوں سے متعارف کروا دیتا..... اپنے باپ کے ساتھ میرا تعلق، اس کا سودائی پن، اندرون میں چھائی ہوئی ابدی تاریکی، میری ہرزہ گردی، عیش و نشاط جو شاید خدا کی نظر میں خوفناک نہیں (کیونکہ خوف نے ہی مجھے زیادتی کی جانب مائل کیا)۔

کیر کیگارڈ کے ہاں خوف، تسکین کی ضرورت، اس معصومیت کی جانب مراجعت کی ضرورت کی وضاحت کرتا ہے جو ہر انسان آدم کے انداز میں ہی کھوتا ہے۔ Either/Or میں ڈان یوآن کی نیم اسطوریائی شخصیت کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کا خوف ہی اس کی جنسی توانائی ہے۔

بیسویں صدی پر کیر کیگارڈ کے اثرات کے پیش نظر اسے ایمان کے ہمہ گیر زیاں کے نتائج کا گواہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں۔ کیونکہ اسے عقیدے کے خاتمے کی وجوہ کا گواہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف وہ انفرادیت پسندانہ پروٹسٹنٹ ازم کا جوہر پیش کرتا لیکن اس کے کلیسیا پر ایمان کو چیلنج بھی کرتا ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی خدمت یہ دکھانا تھی کہ ہیگلیت میں فرد کے لیے ایک گہری نفرت موجود ہے۔

71

کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو

"Manifesto of Communist Party"

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس

1848ء

کچھ لوگ ضرور سوال کریں گے کہ کارل مارکس کی شاہکار تصنیف ''داس کیپٹل'' کی بجائے ''کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو'' عظیم کتب کی اس فہرست میں کیوں شامل کیا گیا ہے۔ کیا یہ دھوکا بازی ہے؟ لیکن ''داس کیپٹل'' کا انتخاب کرنا بھی ایک لحاظ سے دھوکا بازی ہوتی؟ کیا ''کارل مارکس: زندگی اور حالات'' (1939ء) کے مشہور مصنف سر یسعیاہ برلن نے 1997ء میں

اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل برطانوی ریڈیو پر انٹرویو دیتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خود بھی داس کیپٹل کی پہلی جلد سے آگے نہیں جا سکا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ہیگل کی طرح مارکس کو بھی پڑھنا آسان نہیں۔ چنانچہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں نے محض داس کیپٹل کے اقتباسات پر مبنی ایڈیشن ہی پڑھے ہوں گے۔ درحقیقت مارکس کی تصنیفات کے وسیع حصوں کا شدید ناقابل خواندگی ہونا ایک نہایت سنگین مسئلہ اٹھاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کی بین الجھنیں (کوئی بھی اسے فلسفی نہیں کہتا) انہی حصوں میں زیر غور لائی گئی ہوں۔ اب نہایت بھونڈے انداز میں مقبول مارک ہیڈ گر بھی اپنی تحریر کے ناقابل خواندگی ہونے کی وجہ سے بدنام ہے' لیکن وہ آخری دم تک ایک پرجوش نازی، ایک سامی مخالف، موقع پرست اور فراڈ تھا۔ جبکہ مارکس ہرگز فراڈ نہیں اور وہ اپنے نام پر کی گئی زیادتیوں کی بنیاد پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس کے تصور میں انسانیت کا مستقبل بہت خوبصورت تھا۔ یقیناً اسے اس وجہ سے الزام دیا جا سکتا ہے۔ مارکس الجھن میں مبتلا تھا: اور اس میں ایک زبردست صلاحیت تھی: انسانی بنیادوں پر فرد کی ذہنی حالتوں کا تجزیہ۔

مارکس نے اپنے تاریخی مادیت کے نظریہ (جسے اس کی موت کے بعد روسی مارکسسٹ جارجی پلیخا نوف نے ''جدلیاتی مادیت'' کا نام دیا) کو پوری طرح اور مکمل انداز میں پیش کرنے سے قبل ہی ''مینی فیسٹو'' لکھا تھا۔ اس کا انداز تحریر نہایت واضح اور عام فہم تھا۔ نیز The Economical and Philosophical Manusripts of 1944" (جو 1930ء سے پہلے دستیاب نہیں تھے) میں وہ اپنے بنیادی نظریات تشکیل دے چکا تھا۔

یہ وہ نظریات تھے جن کے ذریعہ اس نے تاریخ کو متاثر کیا۔ مگر یورپ میں 1848ء کے انقلابات میں مینی فیسٹو کا ہرگز کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ان انقلابات کی اپنی راہ تھی اور انہوں نے مارکس کو متاثر کیا۔ مینی فیسٹو کو بالکل درست طور پر ''کارل مارکس کے انقلابی نظریات کا اصلی اور غیر ترمیم شدہ خلاصہ'' قرار دیا گیا۔ اس میں مارکس کی توقعات اور نظریات جستہ اور خود رو انداز میں اکٹھے نظر آتے ہیں۔

کارل ہنرخ مارکس ٹرائر میں Rhenish کے مقام پر پیدا ہوا (1818ء)۔ اس کا باپ ایک

کامیاب یہودی تاجر تھا جس نے 1817ء میں عیسائیت قبول کر لی۔ مارکس کی پرورش پروٹسٹنٹ کے طور پر ہوئی مگر وہ جلد ہی اپنے مذہبی عقائد سے آزاد ہو گیا۔ اس نے بون اور برلن کی یونیورسٹیوں میں قانون کا مطالعہ کیا لیکن بعد میں تاریخ اور فلسفہ کو اپنا لیا۔ اس نے 1843ء میں شادی کی اور اگلے ہی برس فرانس گیا۔ 1848ء میں اس نے لندن میں رہائش اختیار کر لی۔ کئی سال شدید غربت میں گزارے (ایک موقع پر تو اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ صرف امریکی جریدہ ہی رہ گیا جو اسے 4 ڈالر فی مضمون ادا کرتا تھا)۔ 1864ء کے بعد اینگلس اس کی غربت میں کچھ کمی کرنے کے قابل ہو سکا۔ 1883ء میں مارکس کی وفات ہو گئی

کمیونسٹ مینی فیسٹو کا ٹائٹل

اگرچہ اینگلس مارکس کا وفادار اور مخلص ساتھی اور ایڈیٹر تھا لیکن اس نے تحریروں میں اپنی طرف سے بہت کم حصہ ڈالا۔ 'مینی فیسٹو' بھی ان جوابات پر مبنی تھا جو مارکس نے اینگلس کے سوالات کے دیے۔

مارکسزم کا جوہر یہ مشہور بیان ہے: ''فلسفیوں نے دنیا کی تعبیر مختلف طریقوں سے کی ہے لیکن اصل مسئلہ اسے تبدیل کرنے کا ہے۔'' لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں موجود مارکس کی قبر پر لگے کتبے پر بھی اس کا یہی قول کندہ ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ مارکس کے لیے فلسفے کے تمام مسائل سماجی دنیا کی ترتیب کے حوالے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جب اس سماجی تنظیم کا طریقہ کار تبدیل ہو جائے تو فلسفیانہ مسائل باقی نہ رہیں گے۔ عیسائیوں کی جنت یہاں زمین پر ٹھوس حقیقت بن جائے گی جس کے نتیجے میں فلسفیانہ خیال آرائی لغو اور غیر ضروری ہو جائے گی۔ یہ جنت کمیونزم ہے اور کمیونزم بہر صورت ناگزیر ہے۔ تاہم اس کے ناگزیر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی جانب بڑھنے میں عجلت کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ مینی فیسٹو کے اختتامی کلمات میں کہا گیا ہے:

''اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانا کمیونسٹ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

وہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ موجودہ

سماجی نظام کا تختہ بزور الٹ دیا جائے۔ حکمران طبقے کیمونسٹ انقلاب کے خوف سے کانپ رہے ہوں تو کانپیں۔ مزدوروں کو اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے اور جیتنے کو ساری دنیا پڑی ہے۔"

"دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ۔"

ہیگل نے تاریخ کو ایک روح تصور کیا تھا جو جدلیاتی عمل کے ذریعہ خود سے آگاہ ہوتی ہے۔ تاریخ کو آگے بڑھانے والی توانائی کا ماخذ خدا تھا۔ "پرانے ہیگلیت پسند" رجعت پرست تھے جو پروشیائی ریاست کے معترف تھے اور جنہوں نے ہیگل کے نظام فکر میں مبہم عیسائی عناصر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ نسبتاً زیادہ جاندار "نوجوان ہیگلیت پسند" لبرل اور بائیں بازو کے تھے۔ انہوں نے پروشیائی ریاست کو تاریخی عمل میں ایک خطرناک لمحہ قرار دیا اور یوں "عظیم عمل" کو "حقیقی دنیا" میں کھینچ لانے کی خواہش کی۔ ہیگل کے شاگرد لڈوگ فوئرباخ نے "Thoughts Regarding Death and Immotality" (1830ء) اور بالخصوص "The Essence of Christianity" میں خدا کے وجود سے قطعی انکار نہیں کیا تھا، لیکن اس نے عیسائی خدا کے تصور کے خلاف دلائل دیے۔ فوئرباخ نے کہا کہ وہ خدا انسان کے اپنے جوہر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ اگلا مرحلہ خدا سے انسان کی محبت کو انسان سے انسان کی محبت کے ساتھ تبدیل کرنا ہونا چاہیے۔

ہیگل کا فلسفہ الٹا کر رکھ دیا گیا۔ مارکس اسے ایک طرف رکھنے کے قائل تھا۔ جیسا کہ مارکس نے خود لکھا تھا:

"ہستی کا تعین شعور نہیں کرتا، بلکہ ہستی ہی شعور کا تعین کرتی ہے۔"

مارکسی تھیوری میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں، یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ معاشرہ ہی فرد کا تعین کرتا ہے۔ تاہم، مارکس کی کئی نہایت پائیدار اور خوبصورت بصیرتیں محض انفرادی تجربے کے طور پر ہی بیان کی جا سکتی ہیں اور وہ خود یقیناً ایک دردمند انسان تھا۔ اسے سب سے پہلے انصاف کی ایک خواہش نے تحریک دلائی۔ تاہم، اس نے پرزور اصرار کیا کہ اس کا نظریہ انسانی نشوونما کی ایک سائنس سے کم ہرگز نہیں۔ وہ ایک ایسے انسانیت پسند اور تخلیقی انسان کی عمدہ مثال ہے جو

ایک پُر جوش ثبوتیت پسند سائنس دان بن گیا۔

مارکسسٹ لینن ازم پہلا سیکولر مذہب بنا۔ اس کی سوویت صورت اور روسی سلطنت بیسویں صدی کے اختتام پر انجام کو پہنچی۔ لیکن مارکسسٹ نظریے میں ابھی بہت جان باقی ہے۔

مارکس کی نظر میں اصل میدان جنگ معاشی ہے۔ جب یہ جنگ جیت لی جائے گی تو ہر کوئی آزاد ہو گا۔ معاشرہ طبقاتی امتیازات سے آزاد ہو جائے گا۔ اس نے نشاندہی کی کہ موجودہ صورت حال میں کسی انسان کی محنت ایک قدر زائد پیدا کرتی ہے۔ ایسی قدر جو اس کی ضروریات کی تسکین کے لیے درکار قدر کے علاوہ ہوتی ہے۔ یہ قدر زائد پیداوار کے بورژوا مالکان کیلیے سرمایہ بن گئی۔ مارکس خود یہ یقین نہیں رکھتا تھا کہ اچھے مزدور ذاتی طور پر عیار بورژوا مالکان سے برتر تھے (وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا)۔ اس نے پیش گوئی کی تھی کہ زائد کے جمع ہوتے جانے اور مارکیٹوں کے لیے مقابلہ بازی بڑھتے جانے سے سرمایہ داری نظام کا زوال ہو گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ 1917ء کے روس میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں وہاں کوئی سرمایہ دارانہ ترقی موجود نہ تھی۔

اس پیشگوئی میں ایک حوالہ پرولتاریہ کی بدتر ہوتی ہوئی حالت کا بھی تھا۔ درحقیقت جن ممالک میں سرمایہ دارانہ ترقی ہوئی وہاں طبقاتی امتیاز کچھ مدھم پڑ گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پرولتاریہ کی حالت میں بھی کافی بہتری آئی ہے۔ البتہ یہ حقائق سرمایہ دارانہ معاشرے کو ایک قابل قبول نظام نہیں بناتے۔ یقیناً انسان "برابر پیدا" نہیں ہوتے لیکن ہر فرد کی زندگی ایک جیسی اہمیت رکھتی ہے۔

مارکس کا یہ کلیہ بدستور قائل لینے والا ہے کہ سرمایہ داری نظام انسانوں کے لحاظ سے غیر فطری ہے۔ اگرچہ اس کے دلائل اکثر ناقص ثابت ہوئے' لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کا انسان کے فطرت اور اپنے آپ سے بیگانہ ہونے کا بیان کارآمد ہے۔ اس نے بیگانگی کا تصور ہیگل اور فوئرباخ سے لے کر اسے آگے بڑھایا۔ مارکس کے مطابق مزدور اپنے کام سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعہ سے معاشرے میں حصہ نہیں ڈال سکتا۔ نتیجتاً وہ خود سے بھی

بیگانہ ہو جاتا ہے۔

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ذاتی حیثیت میں مارکس ''عام'' لگنے کے باوجود ہر کسی کی طرح ''منفرد'' ہے۔ ذیل میں ہم اس کے کچھ ''اعترافات'' دے رہے ہیں جو اس نے ایک پارلر گیم میں ازراہِ تفنن کیے تھے' لیکن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی پسندیدہ عمومی اچھائی ''سادگی'' تھی؛ اور مردوں میں سادگی ان کی طاقت لیکن عورت کے لیے کمزوری تھی۔ اس کے پسندیدہ مصنفوں میں شیکسپیئر، گوئٹے اور دیدرو شامل تھے۔ اس کے پسندیدہ ہیرو کپلر اور رومن باغی سپارٹیکس تھے۔ اسے کھانے میں مچھلی پسند تھی۔ وہ سب سے زیادہ نفرت خدمت گاری سے کرتا تھا۔ سرخ رنگ اس کا پسندیدہ تھا۔

72

سِول نافرمانی

"Civil Disobedience"

ہنری ڈیوڈ تھورو

1849ء

یہ تعین کرنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ آیا Walden نے زیادہ اثر ڈالا تھا یا مضمون ''سول نافرمانی'' نے۔ ''سول نافرمانی'' کو تکنیکی اعتبار سے ایک کتاب نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ متعدد کتب کی صورت میں بارہا شائع ہوئی۔ لہٰذا یہاں ہم نے اسے ''کتاب'' کی حیثیت ہی دی ہے۔ تھورو ہرگز ایک باقاعدہ فلسفی نہیں تھا لیکن ''سول نافرمانی'' غیر منصفانہ قانون کے خلاف بدستور

ایک ضمیر کی آواز ہے۔ مہاتما گاندھی نے اسے بطور مثالی نمونہ اپنایا۔ خود تھورو بھی ہندو ادب کے مطالعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ گاندھی نے اسے اپنا ''استاذ'' قرار دیا۔ گاندھی نے ہی دنیا کو دکھایا تھا کہ سول نافرمانی کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ برطانیہ نے تھورو کی آواز پر کان دھرنے میں کافی دیر لگائی۔

تھورو جیسے شرمیلے اور حساس انسان کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ وہ لوگوں کو لیکچر دینا پسند کرتا تھا مگر کبھی نخوت کے ساتھ خود کو دوسروں پر فوقیت نہ دی۔ وہ منکسر قسم کا ایک حقیقی مہم جو تھا۔ اس نے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ کس قسم کی زندگی اس کے اپنے اور دوسروں کے لیے بھی بہترین تھی ورنہ وہ کچھ بھی نہ لکھتا۔

تھورو 1817ء میں کونکورڈ، میساچوسٹس میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ فرانسیسی الاصل تھا۔ تھورو کا باپ ایک سٹور کیپر تھا جس نے بہت مشکل وقت دیکھا لیکن پھر عمدہ لکھائی والی قلمیں بنانے لگا۔ ہنری ڈیوڈ نے اپنی ماں کی کوششوں کے نتیجے میں ہارورڈ سے کلاسکس اور لینگویجز میں گریجوایشن کی۔ یونیورسٹی میں اس نے بہت کچھ پڑھا اور پانچ ہزار صفحات پر مشتمل نوٹس تیار کیے۔ شرمیلے اور مس فٹ تھورو نے اپنے بھائی تام کے ساتھ مل کر ایک سکول کھولا لیکن وہ نظم و ضبط کی پابندی کروانے میں ناکام رہے اور سکول بند کرنا پڑا۔ استعفیٰ دینے سے پہلے تھورو کا آخری اقدام چھ لڑکوں کو پیٹنا تھا۔ تب وہ دریا کے راستے سیر کرنے کے لیے کونکورڈ اور میری میک (Merrimack) گئے۔ اس سیر کے دوران لکھی ہوئی ڈائریز نے ہنری تھورو کی پہلی کتاب کی صورت اختیار کی: "A Week on the Concord and Merrimack Rivers" (1849ء)۔ تام 1842ء میں ٹیٹنس کی وجہ سے مر گیا۔ ہنری پر بھی اس بیماری کا شدید حملہ ہوا اور وہ تاحیات صحت یاب نہ ہو سکا۔

کافی عرصہ تک وہ ولی رالف والڈو ایمرسن کے گھر میں رہتا رہا اور اس کی بیوی کے ساتھ بڑے شرمیلے مگر کامیاب انداز میں اپنے تعلقات کو ''ماورائیت'' عطا کی۔ 1845ء میں جب ایمرسن نے والڈن پونڈ کے کنارے ایک جنگل خریدا تو اس نے تھورو کو وہاں اپنے لیے ایک کیبن بنانے کی پیشکش کی (جس پر اس کے 28.13 ڈالر خرچ ہوئے)۔ دو سال، دو ماہ اور دو دن تک (1845ء تا 1847ء) تھورو نے اپنی احتیاجات کو گھٹا کر امارت کی جانب بڑھنے کی راہ اختیار کی۔

میں جنگلوں میں اس لیے گیا کیونکہ میں اپنی مرضی سے جینا اور زندگی کے صرف لازمی حقائق کا ہی سامنا کرنا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا میں وہ نہیں سیکھ سکتا تھا جو یہ سکھاتی تھی...... میں زندگی سے باہر نہیں جینا چاہتا تھا: زندگی اس قدر عزیز ہے: نہ ہی مجھے تارک الدنیا ہونے کی خواہش تھی۔

تھورو کی یہ خواہش برقرار رہی' اور اس نے اس کی پیروی کرتے ہوئے ایک مثال قائم کی۔ شہری زندگی کی طمع اور ''روشن خیال انا پرستی'' کے قائل لوگ اس مثال کو نظر انداز کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے تھورو سے واسطہ نہ پڑنا ہی بہتر ہے۔

''والڈن'' (1854ء) کو مکمل ہونے میں تقریباً دس برس لگے۔ یہ اس دور میں امریکہ میں شائع ہونے والی سب سے زیادہ اچھوتی (اور بجنل) اور ''امریکی'' کتاب تھی۔

اپنا پول ٹیکس ادا کرنے سے انکار کے بعد (1847ء میں) تھورو کی زندگی میں نشیب و فراز کم ہو گئے۔ ایمرسن کے ساتھ اس کے تعلقات میں بھی کچھ سردی آ گئی۔ اب اس کا خاندان خوش حال ہو رہا تھا کیونکہ اس نے گریفائیٹ بنانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ گھومتا، سرویئر کے طور پر کام کرتا اور جب بھی موقع ملتا لوگوں کو لیکچر دیتا۔ بہرحال اس نے ذاتی طور پر ہمیشہ ایمانداری کو ملحوظ خاطر رکھا۔

ایک شام کو وہ والڈن پونڈ کے کنارے واقع جنگل میں اپنے جھونپڑے سے نکلا ہی تھا کہ اسے اپنا پول ٹیکس ادا کرنے کا کہا گیا۔ اس نے اس بنیاد پر ادائیگی سے انکار کر دیا کہ یہ ایک بلا جواز جنگ (میکسیکی جنگ) پر خرچ ہوگا۔ تھورو کی ایک آنٹی نے اس کے نام پر فوراً ٹیکس جمع کروا دیا لیکن حکام نے اسے اگلے روز ہی رہا کیا۔ جیل میں گزاری ہوئی یہ رات اس کی زندگی

میں بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ اس نے اپنے مزاج کے عین مطابق، اصولوں کی خاطر شہید ہونے کی راہ منتخب کی۔

لیکن ''سول نافرمانی'' ایک مختلف معاملہ ہے۔ یہ نہ صرف خوش بیان اور دل موہ لینے والی بلکہ منطقی اور اثر انگیز بھی ہے۔ اگر چہ تھورو اپنی اس تحریر کے آئینے میں ایک انارکسٹ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ انارکزم کے ناکام ہونے کا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ حکومتوں کے غائب ہو جانے کی خواہش کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عموماً دائیں بازو کے انارکسٹوں یا آزادی پسندوں (مثلاً Haye) کی تحریروں میں ہمیں اس قسم کے گرمجوش جذبات ہرگز نہیں ملتے۔ ان کی نظر میں ''آزادی'' ملکیت کے ''حقوق'' کا معاملہ ہے۔

تھورو ماورائیت پسندانہ تحریک سے منسلک ہوتے ہوئے بھی بے تعلق تھا۔ ماورائیت پسندی نے اسے نکھارا لیکن وہ اس کی پیداوار نہیں تھا۔ نیو انگلینڈ کی ماورائیت پسندی کو ''فلسفیانہ سوچ کی ایک نہایت رقیق قسم'' کہا جاتا ہے۔ یہ اینٹی کمیونسٹ، رومانک اور باطنی تھی اور اس نے بنیادی طور پر افلاطون، پلوٹینس، بوہمے، انگریز شاعر سیموئیل ٹیلر کالرج کے اعتقادات اور ہندوستانی فکر پر تکیہ کیا۔

73

انواع کا ماخذ

"The Origin of Speries by Means of Natural Selection"

چارلس ڈارون

1859ء

اب عام لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں کہ چارلس ڈارون (1805ء تا 1882ء) سے پہلے کی صدی میں بھی ارتقاء کے حوالے سے غور و فکر وسیع پیمانے پر موجود تھا اور اس رجحان کو ''روشن خیالی نے جنم دیا۔'' اگر چہ یہ بات قطعی معنوں میں درست نہیں مگر اٹھارہویں صدی سے پہلے کی بیشتر

ثقافتوں میں بیشتر لوگ ماخذوں کے بارے میں ''معجزاتی'' حوالے سے سوچتے تھے۔ لیکن خود ڈارون نے بھی قبل از سقراط فلسفی امپی ڈوکلیز کا حوالہ دیا۔ چینیوں کے ہاں بھی نسلی تقلیب کا ایک نظریہ موجود تھا۔

البتہ یہ ڈارون ہی تھا جس نے نہایت تفصیلی نظریہ تشکیل دیا اور نظریہ تقلیب (The theory of transformation) میں خاطر خواہ حصہ ڈالا۔

پہلے طب اور پھر کلیسیا کی جانب رجحان رکھنے والا ڈارون بنیادی طور پر ایک فطرت پسند (Naturist) تھا۔ وہ کئی حوالوں سے اپنے عظیم پیشرو گلبرٹ وائٹ (1720ء تا 1793ء) سے مشابہہ تھا۔ وائٹ کی طرح ڈارون نے بھی فطرت کو ''نہایت بھرپور'' تصور کیا اور تجسس و جوش و خروش کے ساتھ اس کا کھوج لگانے کی خواہش کی۔

لیکن وہ فطرت کی توضیح و تعبیر کرنے کا ایک ایماندارانہ، غیر متعصبانہ اور دینیات سے پاک جذبہ بھی رکھتا تھا۔ وہ انگلینڈ اور ویلز کی سرحد کے قریب شروپشائر میں شریوبری کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ طبیب اور سائنس دان ایراسمس ڈارون کا پوتا تھا۔ 1828ء میں جب چارلس ڈارون کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا تو جلد ہی علم نباتات اور علم حیوانات میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے 1831ء میں گریجوایشن کی اور اسی سال کے آخر میں H.M.S. Beagle بحری جہاز پر سائنسی دریافت کے سفر کے لیے (بطور فطرت پسند) سوار ہو گیا۔

وہ پانچ سال بعد واپس آیا تو اس کا ذہن Tenerife، کیپ وردے جزائر، برازیل اور دیگر مقامات پر دیکھی ہوئی چیزوں سے لبریز تھا۔ اس مہم کے دوران اسے کوئی مرض بھی لاحق ہو گیا تھا جو تادم آخر ساتھ رہا (یہ نہیں معلوم کہ وہ مرض کیا تھا)۔ وہ تھک جانے پر ویکل چیئر میں پناہ لیتا۔ اس نے 1839ء میں اپنے پہلے سائنسی سفر کا حال بھی شائع کیا۔

بہت سے مقامات پر اپنے کیے ہوئے مشاہدات کے ساتھ ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کرنا شروع کیا (حالانکہ وہ اپنی فکر تیج سے پریشان تھا) کہ انواع کا جد امجد غالباً مشترک ہے۔ اس کی پرورش اس غالب مگر نہایت ناقابل قائل تصور کے تحت ہوئی تھی کہ خدا نے تمام انواع کو الگ الگ تخلیق کیا تھا۔ لیکن اس کے مشاہدہ کے شوق، فطرت سے شدید محبت اور اس کا کھوج لگانے کا تجسس اسے

اس شک کی جانب مائل کرنے لگا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ اگرچہ وہ خود ایک راسخ العقیدہ عیسائی نہیں تھا مگر وہ اپنے خیالات کے باعث بیوی کو پہنچنے والی تکلیف کے حوالے سے شدید دکھی ہوا۔ بیوی ایما اور دوستوں نے اس کے نظریہ کو عیسائیت کے لیے ایک چیلنج خیال کیا۔ بلاشبہ یہ عیسائیت یا کسی بھی مذہب کے لیے ہرگز چیلنج نہ تھا؛ لیکن اس نے تخلیق کے بارے میں بائبلی بیان کی تصحیح ضرور کی۔ اس نظریے نے انسان کے ایک خصوصی مخلوق ہونے کے تصور کو تباہ کر دیا۔ ظاہری بات ہے کہ اپنا عیسائی عقیدہ برقرار رکھنے کے خواہش مند حضرات کو کچھ مفروضات پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ حتیٰ کہ ''فطری انتخاب'' کو ایک ''خدائی قانون'' کے طور پر دیکھ سکنے والے زیادہ عقل مند لوگ بھی اپنے عقیدے کو بچانے کی خاطر زیادہ آگے نہ بڑھے۔

ڈارون سے پہلے فرانسیسی ماہر نباتات ژاں باپٹسٹ دی لیمارک (1744ء تا 1829ء) نے انواع میں تنوعات پر زور دیا تھا اور اپنی کتب میں انسانی ارتقاء کی بابت بات کی تھی۔ اب اصطلاح لیمارکین ازم عموماً باعثِ فضیحت ہے' لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اول، اس لیے کہ اکتسابی خصوصیات کی وراثت بدستور ایک امکان ہی ہے۔

چارلس ڈارن' عہد جوانی میں

دوم اس لیے کہ لیمارک بہرحال ایک پہل کار تھا اور اس کا نظریہ ہرگز مضحکہ خیز نہ تھا۔ سوم اس لیے کہ اصطلاح لیمارکین ازم کو عموماً ڈارون ازم کے متضاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، مگر ڈارون بذات خود لیمارکین تھا۔ ڈارون نے 1844ء میں اپنے ایک دوست Hooker کے نام خط میں لکھا: ''میرے اخذ کردہ نتائج لیمارک کے حاصل کردہ نتائج سے زیادہ مختلف نہیں۔'' لیکن ڈارون نے متوقع ماؤں کو مشورہ دیا کہ وہ زچگی سے پہلے ''مردانہ'' مہارتیں حاصل کر لیں!

تاہم، ڈارون کی عظیم بصیرت کو لیمارک کی بجائے مالتھس کی تحریر (Essay) پڑھ کر تحریک ملی: کہ فطری انتخاب (یعنی موزوں ترین کا انتخاب) تولید کے عمل میں کام دکھاتا ہے۔ اس نے دلیل دی کہ تمام انواع اس سے کہیں زیادہ تولید کرتی ہیں جو ان کی بقاء کے لیے ضروری ہوتی ہے، چنانچہ سازگار تنوعات ہی۔ اتفاق کے تحت منتخب ہوتی ہیں۔ اس نے مالتھس سے جہد للبقاء

(Struggle for existence) کا اصول اخذ کیا۔ بد قسمتی سے اس نے اپنے نظریہ فطری انتخاب کے مترادف کے طور پر ہربرٹ سپنسر کا ''موزوں ترین کی بقاء'' کا تصور بھی مستعار لے لیا۔

ڈاروِن کے ہاں ''موزوں'' کا مطلب ہے ''مخصوص ماحول میں زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے لیے بہترین صلاحیتوں کا مالک۔'' لیکن سپنسر کے مفہوم میں اس کا مطلب ''کامل ترین'' تھا۔ جلد ہی اس سے ''طاقتور ترین'' مراد لیا جانے لگا۔ ڈاروِن نے لکھا کہ اس نے ''جہد للبقاء کی اصطلاح کو ایک وسیع اور استعاراتی مفہوم میں استعمال کیا تھا'' لیکن زیادہ تر قارئین نے اس کی تشریح ''لڑائی'' کے طور پر کی اور اس کا اطلاق انواع کے ساتھ ساتھ معاشرے پر بھی کیا۔ اگرچہ آج ''سماجی ڈاروِن ازم'' کو مکمل طور پر رد کیا جا چکا ہے (کیونکہ یہ اخلاقیاتی اور حیاتیاتی شعبوں کو گڈ مڈ کر دیتا ہے) لیکن اس کا اثر بدستور قائم ہے۔ تاہم، سپنسر کی ''اولین سرچشمے'' کے ضمن میں اس مغالطے پر زیادہ تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ خود ڈاروِن کو بمشکل ہی اس کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

1840ء کی ساری اور 1850ء کی زیادہ تر دہائی کے دوران ڈاروِن انواع کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس کا کبھی بھی مکمل ہو پانا خلاف قیاس تھا کیونکہ وہ اپنے ذہن میں موجود نتائج کے متعلق تمام شکوک اور انکساری کا حامل تھا۔ لیکن اسے ایک شدید دھچکا لگا۔ اور اسے اپنے حواس بحال کرنے میں کافی دیر لگی۔ فطرت پسند الفریڈ رسل والیس (1823ء تا 1913ء) نے بھی آبادی کے بارے میں مالتھس کا سنگدلانہ نظریہ پڑھا تھا۔ 18 جون 1858ء کو ڈاروِن کو اس کی جانب سے ایک خط ملا۔ ڈاروِن نے ایک دوست کو بتایا: ''......اگر والیس نے میرا خاکہ 1842ء میں لکھا ہوتا تو تب بھی وہ کوئی زیادہ بہتر تجریہ پیش نہ کر سکتا۔ حتیٰ کہ اس کی اصطلاحات میرے ابواب کے عنوانات ہیں۔'' دونوں نے یکم جولائی 1858ء کو Linnean سوسائٹی کے سامنے ایک مشترکہ پیپر پیش کیا اور اگلے ہی برس ڈاروِن کی ''انواع کا ماخذ'' منظرِ عام پر آئی۔ یوں ''تقدیم کا مسئلہ'' حل ہو گیا۔

آج کل آرتھوڈوکسی کو neo-Darwinism کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ڈاروِن کے بعد سے جینیٹکس کے میدان میں ہونے والی ترقیوں کو بھی شمار کرتی ہے۔ زندگی کو ایک ''خود غرض'' DNA کی ذیلی

پیداوار (بائی پروڈکٹ) سمجھنے کا نظریہ ہمیں کسی بھی منزل پر نہیں پہنچاتا۔ نہ ہی اس کی کوئی فلسفیانہ بنیاد ہے۔ کرۂ ارض پر حیات کو اندھے اتفاق کی ایک بے احساس پیداوار سمجھنے کے نظریے کے لیے ہمیں نام نہاد سائنسدانوں کی بجائے تخیلاتی مصنفین کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔

''انواع کا ماخذ'' میں ڈاروِن کی اپنی حصہ داری فطری انتخاب کا تصور تھی (حالانکہ والیس نے اس کی پیش بینی کر لی تھی)۔ توریث (heredity) میں اس کا عمل دخل اب موضوعِ بحث ہے لیکن اس قسم کی کسی چیز کی موجودگی کے بارے میں سوال اب موجود نہیں۔ اب صرف اسے درست انداز میں بیان کرنے کا مسئلہ باقی ہے۔

اس امر کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو پایا کہ ارتقاء کی تاریخ میں ڈاروِن کی حصہ داری کس حد تک مرکزی ہے۔ اگر ڈاروِن نے 'انواع کا ماخذ'' نہ لکھی ہوتی تو وہ بھی محض والیس کے برابر ہوتا۔ اس کتاب کے قارئین دو دہائیوں کے اندر اندر اس کے مرکزی تھیسس کے قائل ہو گئے۔ اسی پڑھے جانے کے قابل کتاب نے ایک انقلاب برپا کیا۔ بعد ازاں ڈاروِن نے ''توریثِ آدم'' اور ''انسان اور جانوروں میں جذبات کا اظہار'' (1871ء اور 1872ء) لکھ کر مزید وضاحت کی۔ وہ اپنی ممتاز حیثیت کا حق دار ہے: ''انواع کا ماخذ'' مشکلات کو تسلیم کرتی اور ان کے ساتھ موزوں انداز میں نمٹتی ہے۔ اس نے ہمت، انکساری اور عزم صمیم کے ساتھ ایک رحمان و رحیم گھڑی ساز خدا کے پرانے تصور کی مخالفت کی۔ اس میں خدا کو مسترد کرنے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں۔ مگر اس کے باوجود اس نے خدا کے ناقص نظریہ کو شدید نقصان پہنچایا۔

74

آزادی کے بارے میں

"On Liberty"

جان سٹوارٹ مِل

1859ء

جان سٹوارٹ مل افادیت پسندی (Utilitarianism) نامی اخلاقی نظام کے بارے میں لکھتا ہے:

> افادیت یا عظیم تر مسرت کو اخلاقیات کی بنیاد کے طور پر قبول کرنے والے مسلک کے مطابق مسرت کو فروغ دینے والے افعال ٹھیک جبکہ مسرت کو کم کرنے والے افعال غلط ہیں۔ مسرت سے مراد ہے تلذذ اور دکھ کا نہ ہونا، ناخوشی کا مطلب دکھ ہے۔

چنانچہ نتائجیت پسندی (Consequentialism) نامی فلسفے کی بہترین معلوم صورت وہ ہے جس میں کسی فعل کو صرف اس کے نتائج کے حوالے سے جانچا جاتا ہے۔ مثلاً سزائے موت کے معاملے میں ہم یہ نہیں جانچتے کہ آیا کسی مجرم کو مارنا خلقی طور پر درست ہے یا غلط، بلکہ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ معاشرتی لحاظ سے یہ مفید اور درست ہے یا نہیں۔

انیسویں صدی میں افادیت پسندی کے تصور کا بڑا چرچا تھا۔ اس کا آغاز جیریمی بینتھم (1748ء تا 1832ء) کے فلسفہ سے ہوا جسے جان سٹوارٹ مل نے ترامیم کرکے آگے بڑھایا۔ یہ آج بھی اپنی مختلف صورتوں میں مقبول ہے۔ یقیناً اس کی بنیادیں ماضی کے متعدد فلسفوں میں ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد سے جمہوری سیاسی عمل کی تہہ میں افادیت پسندی یا اسی جیسی کوئی چیز کارفرما ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں برسرِ جنگ حکومتوں کو افادیت پسندانہ نکتۂ نظر کی حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ سوویتوں کا ہے۔ جان سٹوارٹ مل کا پمفلٹ ''افادیت پسندی'' (1861ء) پہلی بار ایک میگزین میں شائع ہوا۔ یہ زیادہ جانبدارانہ ہونے کے باعث زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا اور مل کے نقادوں کو اس میں کافی کچھ مل گیا۔ تاہم باقاعدہ فلسفہ کی تاریخ میں سٹوارٹ مل کی ''نظامِ منطق'' (1843ء) سب سے زیادہ بااثر نظر آتی ہے۔ اس کی بہترین فکر اسی میں جلوہ گر ہوئی۔ اس کی بہترین کتاب غالباً ''خود نوشت سوانح عمری'' ہے۔

جان سٹوارٹ مل ایک سکاٹش فلسفی، ماہر معیشت اور صحافی جیمز مل (1733ء تا 1836ء) کا بیٹا تھا جس کے بینتھم کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ جیریمی بینتھم نے ہی ''عظیم تر مسرت'' کا اصول وضع کیا اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ اسی اصول کی بنیاد پر حکومت کی جا سکتی ہے۔

جیمز مل نے اپنے بیٹے کی پرورش اس طرح کی کہ جیسے وہ اسے کوئی جینیئس بنانا چاہتا ہو اور غالباً سٹوارٹ مل واقعی جینیئس ثابت ہونے کے لحاظ سے بے مثال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اسے

تین، بارہ اور تیرہ برس کی عمر میں بالترتیب یونانی زبان، منطق اور معاشیات سیکھنے پر مجبور کیا گیا۔ ایک دن منظور شدہ شیڈول کے مطابق ''تفریحی'' چہل قدمی کے دوران باپ نے اس سے پے در پے سوالات کیے۔ نتیجتاً 21 برس کی عمر میں اس کا جذباتی بریک ڈاؤن ہو گیا اور صرف شاعری کچھ عرصہ تک اس کا دل بہلا سکی۔ بالخصوص ورڈز ورتھ کی شاعری نے اس بحرانی دور میں اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ ایک نمایاں اور روشن خیال ادبی نقاد بن سکتا تھا لیکن فرض آڑے آیا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اس نے اپنا زیادہ تر وقت اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بجائے افادیت پسندی کو فروغ دینے میں لگایا۔ وہ بینتھم ازم میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا رجحان ہمیشہ عدل، انصاف اور آزادی اور اس نظریے کے فروغ کی جانب تھا کہ فرد کو ہمیشہ دوسروں کی لاگو کردہ اخلاقی استبدادیت سے آزاد ہونا چاہیے۔ تاہم، اپنے دلائل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے کچھ مسائل کو دور کرنے کے لیے اس نے ایسے دلائل بھی دیے جو اس کے شایان شان نہیں۔

بہرحال "On Liberty" لبرل سیاسی پوزیشن کا ایک کلاسیک بیان ہے۔ سٹوارٹ مل نے بینتھم کے نظریہ مسرت کو کمزور کیا۔ اس کی زبردست تنقید کا نشانہ بننے والی دلیل یوں ہے: اگر کسی چیز کی خواہش کی جائے اور کوئی خود غرض شخص اس کا متمنی نہ ہو تو یقیناً اسے ایک موزوں حاصل خیال کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ عمل کا حاصل ہو تو وہ متعلقہ شخص کے لیے اچھا ہے۔ اس کے بعد مل دلیل دیتا ہے کہ مسرت بھی اسی قسم کا ایک موزوں حاصل یا مقصد ہے کیونکہ ہر کوئی اسی کا خواہشمند ہے۔

On Liberty میں مل نے جو بات سب سے بڑھ کر چاہی وہ یہ تھی کہ لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے دینا چاہیے اور حدود کا صرف ایک مجموعہ لاگو ہونا چاہیے: یعنی دوسروں کو زک نہ پہنچے۔ لیکن منطق کے موضوع پر اس کی تحریر پڑھنے پر اس کے دلائل حیرت انگیز طور پر ناکام ہوتے نظر آتے ہیں۔ ہر کوئی اتفاق کرتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ اس کا اپنا ''مسرت'' کا نظریہ ہے۔ چاہے وہ دکھ اور یاس ہی چاہتا ہو۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن اس کی دلیل کی بنیاد یہ نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ ''ہر شخص کی مسرت اس کی اپنی ذات کے لیے اچھی ہے۔'' لہٰذا ہر کسی کی مسرت بھی ہر کسی کے لیے لازماً اچھی ہوگی۔ یہ ایک واضح منطقی مغالطہ ہے۔

جس چیز کو ہم شائستگی (decency) کہتے ہیں وہ بقول پاسکل دل کا استدلال ہے۔ کیا اس قسم کے معاملات کو بھی صرف منطق کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے؟

ہم سٹوارٹ مل اور بینتھم جیسوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ''شائستہ حضرات'' (decent chaps) تھے...... ری ایکشن اور ظلم کے دشمن ...... اور وہ واقعی تھے بھی...... لیکن ہم صرف عمومی جذباتی سمت جانتے ہیں جو ان کے دلائل اختیار کرتے ہیں۔ کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ حسن کو محض حسن کے ایک تجزیہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس عمل میں وہ تباہ بھی نہ ہو؟

مل خود بھی سمجھتا تھا کہ آزاد روی کی جانب اس کے رجحانات بعد میں شاعر سیموئل ٹیلر کالرج کے رجعت پسندانہ خیالات کے مطالعہ کے ذریعہ درست ہوئے (جزوی طور پر) اور اس پر عورت Harriet ٹیلر کے اثرات کی بے کم و کاست نوعیت کا تعین کرنا مشکل ہے جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی بنی اور جس کے ساتھ اس کا پہلے سے ہی ایک قریبی تعلق قائم تھا۔ حقوق نسواں کے بارے میں اس کی تصنیف نے عام حقوق کی تحصیل میں مثالی مدد کی۔ (لبرل حوالے سے) جنسی اخلاقیات کے امور میں اس نے بلاشبہ گہرا اثر مرتب کیا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے دور میں اس موضوع پر کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا: ''ایک غیر تسکین یافتہ سقراط ایک تسکین یافتہ سور سے بہتر ہے۔'' یہ بات قابل فہم ہے مگر اس میں کوئی منطق موجود نہیں۔

تاہم، مل اور دیگر افادیت پسندوں نے مؤثر طور پر حکومتوں کو جنیوا کے کیلون کی پیروی سے باز رکھا جس نے خارجی کے ساتھ ساتھ داخلی تطابق (Conformity) یا تعمیل پر بھی زور دیا۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ہیگلیت پسندوں نے افادیت پسندی پر شدید اعتراض کیا کیونکہ یہ بہت زیادہ انفرادیت پسندانہ ہے۔ چنانچہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ افادیت پسندی فلسفہ کے مفہوم چاہے کتنی ہی کمزور ہے مگر اس نے بہت سے انسانوں کی مدد کی۔

75

اولین سرچشمے

" First Principles "

ہربرٹ سپنسر

1862ء

روسی افسانہ نگار انتونی چیخوف نے اپنے مشہور افسانے "The Duel" میں ایک کردار سے کہلوایا: ''ابتدا میں ہم نے بوسے لیے، پرسکون شامیں گزاریں، قسمیں اٹھائیں اور سپنسر کا مطالعہ کیا۔'' یہ 1891ء کی بات ہے۔ اس سے برطانوی ''ارتقاء کے فلسفی'' ہربرٹ سپنسر (1820ء تا 1903ء) کے زبردست اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ سپنسر اپنے ملک کے ساتھ ساتھ سارے یورپ میں

بھی اثر رکھتا تھا۔ امریکہ میں تو اس کا اثر سب سے زیادہ پڑا۔ یکدم شہرت اور اثر انگیزی کی ہی طرح اس کا زوال بھی تیزی سے ہوا یا کیا یہ محض ظاہری زوال ہے؟ آج کوئی مشکل ہی اسے پڑھتا ہے، زیر بحث لائے جانے کا معاملہ تو بعد کا ہے۔ لیکن کیا ہم اس کے ''بابائے سوشیالوجی'' کے رتبے سے انکار کر سکتے ہیں؟ کیا اس کے نظریات بے جان ہو چکے ہیں۔

ہربرٹ سپنسر ڈربی کے Midlands ٹاؤن میں غیر مقلد والدین کے گھر پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک سکول ماسٹر تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ بار بار منقطع ہوتا رہا۔ اسے ''کتابی علم'' سے نفرت تھی۔ 1840ء کی دہائی میں وہ لندن میں ایک ریڈیکل صحافی تھا اور "Economist" کے لیے کام کرتا تھا۔ 1857ء میں اس نے ایک وسیع فلسفیانہ نظام پیش کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا مقصد ارتقاء کے حوالے سے ہر چیز کا احاطہ کرنا تھا۔

"First Principles" اس فلسفے پر اولین بیان ہے اور اس کے بعد حیاتیات، تعلیم، تاریخ، سوشیالوجی، نفسیات وغیرہ کی وضاحت کے لیے مزید جلدیں منظر عام پر آئیں۔ ان تمام تصنیفات کو ملا کر سپنسر کو ''سینتھٹک فلسفہ کا نظام'' کہا گیا۔ امریکہ اور دیگر جگہوں پر اسے ممتاز دانش کا حامل شخص قرار دیا گیا۔ لیکن کیا واقعی ایسا تھا؟

سپنسر کی اصل اہمیت یہ حقیقت ہے کہ اس نے ہر ممکن حد تک دیگر مصنفین کی کتابوں کو نظر انداز کیا۔ وہ انہیں دردِ سر کا باعث کہتا تھا۔ ایک اور پیراڈاکس یہ کہ وہ زندگی کا کوئی زیادہ تجربہ نہیں رکھتا تھا، چنانچہ اسے اپنا تمام علم صرف اور صرف کتابوں سے حاصل ہو سکتا تھا جو اسے پسند نہ تھیں۔ وہ اپنی تحریر میں کوئی حوالہ نہیں دیتا اور نہ ہی کسی ذاتی تجربے پر انحصار کرتا ہے۔ اس نے ایک دوست کے نام خط میں لکھا: ''میں نے چیزوں کو صرف اور صرف اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ دوسروں کی۔''

تاہم، عروج کے دور میں اس کا اثر بے پناہ تھا۔ وہ بالخصوص مزدور طبقے کے قارئین کو پسند آیا جو علم کے متمنی تھے۔ وہ تعلیم کے میدان میں انقلاب کا محرک بنا۔ وہ خود مختار، اپنے بارے میں پُراعتماد اور ہر قسم کے جبر و استبداد سے نفرت کرنے والا تھا۔ 1860ء اور 1870ء کی دہائیوں کے دوران وہ انیسویں صدی کی تمام خوبیوں کی تجسیم نظر آتا ہے۔ سائنسدان ٹی ایچ ہکسلے نے لکھا کہ

1859ء اور ''انواع کا ماخذ'' سے پہلے ''جس واحد شخص کے علم اور استعداد نے میرے اندر جذبۂ احترام کو تحریک دی وہ ہربرٹ سپنسر ہی تھا......'' البتہ بعد میں ہکسلے نے سپنسر کا مضحکہ اڑایا اور اس پر تنقید بھی کی۔

ڈارون کی ''انواع کا ماخذ'' شائع ہونے سے قبل ہی سپنسر ارتقاء کے موضوع پر دو کتب لکھ چکا تھا: "The Development Hypothesis" (1852ء) اور "Progress: Its Law and Cause" (1857ء)۔ تاہم، ڈارون نے اس سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بھی اس کا ''موزوں ترین کی بقاء'' کا نظریہ مستعار لے لیا۔

ارتقاء میں ڈارون کی دلچسپی محتاط اور سائنسی نوعیت کی تھی۔ سپنسر ضرورت سے زیادہ بے باک اور سائنسی طریقہ سے بے تعلق تھا۔ بہت شروع میں ہی خصوصی تخلیق کا مفروضہ (کہ خدا نے ہر ایک نوع کو الگ الگ بنایا) مسترد کر دینے کے بعد سپنسر نے نہایت پر اعتماد انداز میں ہر چیز...... ستارے، کائنات، تہذیبیں، افراد، ممالک، تصورات، حکومتی نظام...... کو ''اوپر کی جانب'' ناگزیر ترقی کے عمل کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر چیز مسلسل بہتری کی جانب مائل تھی۔ یہ وکٹورین عہد کی حد سے زیادہ رجائیت پسندی کی مثال تھی' اور اسی حد سے زیادہ رجائیت پسندی نے دنیا کو پہلی عالمی جنگ سے دوچار کرنے میں کردار ادا کیا۔

یہ سوشل ڈارون ازم کا مسلک یا مغالطہ ہے۔ انواع کی سست رو ترقی اخلاقیات سے مکمل طور پر جدا ہونے پر ''بہتری'' بن جاتی ہے...... نہ صرف انواع بلکہ ہر چیز کی بہتری۔

بلاشبہ سپنسر کے لیے اصل محرک ڈارون نہیں بلکہ اپنے عہد کے (یا قبل کے) جرمن ماہرین حیاتیات تھے جنہوں نے نشان دہی کی کہ پیچیدہ نامیاتی اجسام میں زیادہ سپیشلائزیشن اور فعالیت تھی۔ تاہم، پیچیدگی میں اضافہ کو غلط طور پر ''اعلیٰ تر'' قرار دیا گیا۔

ان حالات میں بہترین دانش مندی یہی ہے کہ ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ ''فطری'' انداز میں ''ترقی'' کرے۔ آزاد مقابلہ بہترین صورت ہے۔ وہ حالات ''نہایت فطری'' ہیں جن میں حکومت کوئی مداخلت یا منصوبہ بندی نہ کرے کیونکہ معاشرے کو بھی ہو بہو فطرت جیسا تصور کیا گیا۔ ''موزوں ترین'' خود ہی ''فطری انداز میں'' سب پر امتیاز پا لے

گا...... اور موزوں ترین سے مراد ہے ''تمام حالات میں بہترین۔'' یہاں قابلیت سے زیادہ زور طاقت یا قوت پر ہے۔

یہ منطق تقریباً ناقابل تردید ہے۔ چنانچہ یہ ایک قسم کا مذہب بن گئی۔ سپنسر کی نظر میں ارتقاء ایک متحد کرنے والا تصور تھا۔ اس کے فلسفہ کے مطابق تمام سائنس صرف یہی ثابت کر سکتی ہے کہ کچھ بھی قابل معلوم نہیں۔ اس نے سائنس کو غلط مفہوم میں لیا۔ چنانچہ اس کے نظام فکر میں ''ناقابل معلوم'' ایک ''ناقابل ادراک قوت'' بن جاتا ہے۔

سپنسر کا عمومی انداز فکر درحقیقت (جی ای مور کے بقول) ''فطرت پسندانہ مغالطے'' کی اولین مثال ہے۔ یہ نہایت مشہور مغالطہ ''کیا ہونا چاہیے'' کے متعلق اخذ کردہ نتائج پر مشتمل ہے۔ سپنسر نے نتیجہ اخذ کیا کہ کسی مخصوص ماحول میں موزوں ترین حیاتیاتی لحاظ سے اپنی بقاء کو ممکن بناتا ہے' لہٰذا معاشرتی لحاظ سے طاقتور ترین اور اخلاقی اعتبار سے نہایت سنگدل کو ہی باقی رہنا ''چاہیے۔'' یوں مسولینی، ہٹلر اور تھیوڈور روزویلٹ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

لیکن انسان اپنے ماحول کو خود بناتے ہیں۔ سائنس تو بس فطرت کے اصل وقوعوں کو بیان کرنے کی ہی کوشش کرتی ہے؛ ''اچھے'' یا ''برے'' کے ساتھ اس کا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ آپ کچی آبادیوں میں رہتے، انھیں دیکھتے اور شاید انہیں تبدیل کرنے کی خواہش بھی کرتے ہیں۔ سپنسر نے فطرت کی کارکردگیوں کو مشینی انداز میں غلط جامہ پہنایا اور پھر انھیں ہر چیز کی کارکردگی پر لاگو کر دیا۔ درحقیقت اس نے نظریۂ ارتقاء کو اٹھارہویں صدی کے نظریات کے ایک مجموعے پر لاگو کیا۔ وہ جتنا آگے دیکھتا ہے اتنا ہی پیچھے بھی۔ اس کی وفات کے ایک سال بعد امریکی تجربیت پسند فلسفی جان ڈیوی نے نشاندہی کی کہ سپنسر محض ایک عبوری شخصیت تھا۔

سماجی ڈارون ازم نے کیا نقصان پہنچایا؟ اس کے ایک نقصان کی بدترین مثال ہمیں ہٹلر کی ''میں کیمپف'' میں ملتی ہے:

> اگر ہم نے قانون فطرت (طاقتور ترین کی مرضی لاگو کرنے کے قانون) کا احترام نہ کیا تو ایک دن آئے گا جب وحشی جانور دوبارہ ہمیں چیر پھاڑ دیں گے۔ پھر کیڑے مکوڑے ان وحشی جانوروں کو کھائیں اور آخر کار جراثیموں کے سوا

کچھ بھی باقی نہ رہے گا...... برتر لوگ جدوجہد اور کوشش کے ذریعہ خود کو نیا کرتے رہتے ہیں۔ قانون انتخاب موزوں ترین کو ہی قائم رکھتا ہے۔ عیسائیت فطری قانون کے خلاف ایک بغاوت' فطرت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔

ہٹلر ایک پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا' لیکن افسوس کہ وہ طاقتور تھا۔ اگر اس کا ''موزوں ترین کی بقاء'' کا تصور درست ہوتا تو یقیناً تمام نفیس تتلیاں اور پھول اور دیگر ''کمزور'' مخلوقات اور پودے اور ڈاروز اور پنسرز جلد ہی ''جدوجہد'' کی راہ پر چلتے ہوئے ''مغلوب'' ہو گئے ہوتے۔

لیکن پنسر سے زیادہ تھیوڈور روز ویلٹ پنسر پسند (Spenceran) تھا۔ حقیقی فلسفے کے لحاظ سے پنسر تو ایک احمق تھا جو اپنے ہی ''فلسفے'' کے نتائج کو ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ آج ہماری نظر میں محترم برطانوی فلسفیوں میں سے کسی نے بھی اُسے سنجیدگی سے نہ لیا۔

76

پودوں کی پیوندکاری

"Experiments with Plant Hybrids"

گریگور مینڈل

1866ء

"The Proceedings of the Brno Society for the Study of Natural Science" کبھی بھی ایک بین الاقوامی طور پر مشہور جریدہ نہیں رہا (البتہ یہ ''کتاب'' کہلانے کا مستحق ہے) اور اس کے 1866ء کے نمبر میں کسی غیر مشہور راہب کے دو لیکچروں پر مبنی ایک مضمون اگرچہ چارلس ڈارون کو بھیجا گیا مگر کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔

rekhta

1868ء میں، اپنے مضمون کی اشاعت کے دو برس بعد گریگور جان مینڈل اپنی Brno خانقاہ کا ایبٹ بن گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی مصروفیات کے باعث پودوں کی افزائش کے بارے میں تحقیق بالکل ترک کر دی۔ اس کا مقالہ 1900ء سے پہلے دوبارہ دریافت نہ ہوا (یعنی اشاعت کے 34 برس بعد)۔ اگرچہ جینیٹکس کی جدید سائنس خوفناک حد تک پیچیدہ ہے لیکن مینڈل کی تحقیقات بحیثیت مجموعی اس قدر شاندار ہیں کہ اسے اس شعبے کا بانی قرار دیا گیا۔ میتھمیٹکل دلائل پر مبنی اس مقالے کی دریافت نو کے بعد ہی مزید تحقیق ممکن ہوئی اور جینیٹکس کی شاخ وجود میں آئی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ڈارون نے قرار دیا تھا کہ ”توریث کے زیادہ تر قوانین غیر معلوم ہیں۔“ چنانچہ وہ خصوصیات کے ”امتزاج“ اور حاصل کردہ خصوصیات کی توریث دونوں پر یقین رکھتا تھا۔ لوگ، بالخصوص کسان، صدیوں سے جانتے تھے کہ اولادیں اپنے والدین کی خصوصیات ظاہر کرنے پر مائل ہوتی تھیں۔ 1875ء میں چارلس ڈارون کے کزن فرانسس گالٹن نے مشابہ اور غیر مشابہ جڑواں بچوں کے بارے میں عہد ساز تحقیقات شائع کیں لیکن وہ مینڈل کے کام سے آگاہ نہ تھا، لہٰذا توریث کے عمل کی کوئی تسلی بخش وضاحت بھی نہ پیش کر سکا۔

9 سال قبل اس نے آڑوؤں پر تجربے کے ذریعہ دریافت کیا کہ دو بلند قامت پودوں کی اولاد بلند قامت ہوتی ہے اور دو پست قامت پودوں کی اولاد بھی پست قامت ہوتی۔ تاہم، جب اس نے بلند اور پست پودوں کو ملا کر افزائش کی تو ان سے دو بلند قامت اولادیں حاصل ہوئیں لیکن بعد کی پیداواروں میں پست قامت پودے حاصل ہونے لگے۔ لہٰذا اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ پست قامتی کی خصوصیات نے دوسری یا تیسری نسل میں بلند قامتی کی خصوصیات پر غلبہ پا لیا۔

اس نے دو قوانین وضع کیے: انفصال وافتراق کا قانون (Law of Segregation) کہتا ہے کہ کسی بھی خصوصیت کے لیے دو عوامل ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں؛ صنف بندی کا قانون (Law of Assortment) کہتا ہے کہ کسی بھی خصوصیت کے لیے مادری اور پدری عوامل اس طرح مرتب ہوتے ہیں کہ ہر ایک ”جرثومہ خلیہ“ دونوں والدین سے عوامل کا ایک ایک مجموعہ لیتا ہے (مؤخر الذکر قانون صرف مخصوص حالات میں ہی درست ہے)۔

قطعی طور پر معلوم نہیں ہے کہ مینڈل اپنے کام کی اطلاقی اہمیت سے کس حد تک آگاہ تھا اور

آج اس حوالے سے کافی تنازعہ پایا جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک ماہر حیاتیات نے تو اسے ایک فراڈ بھی قرار دے دیا کہ اس کے حاصل کردہ نتائج باغات میں کیے گئے تجربات کا حاصل نہیں تھے بلکہ صرف نوٹ بکس کی پیداوار تھے۔ تاہم، بہت کم لوگوں نے اس بات پر توجہ دی۔ ایسا قرین قیاس نہیں۔ شاید اس بیان کی وجہ حسد ہو کہ ایک غیر سائنسی راہب اپنی کیاری کی مدد سے وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا جو اس عہد کا کوئی جدید سائنسدان اپنی مہنگے آلات والی لیبارٹری میں حاصل کرنے کے قابل تھا۔ جب مینڈل کا کام دوبارہ منظر عام پر آیا تو امریکہ اور انگلینڈ میں سائنس دانوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔

لیکن جدید مینڈل ازم کا ماخذ امریکہ کے تھامس ہنٹ مارگن (1866ء تا 1945ء) کا کام ہے۔ اسی نے سب سے پہلے مینڈل کے ”عوامل“ کو کروموسومز کے ساتھ شناخت کیا۔ ان کروموسومز کی لمبائی نیوکلیئک ایسڈ کی دو اقسام ...... ڈی این اے اور آر این اے ...... کی صورتوں پر مشتمل تھی۔ ان کی تقسیم اور افزائش کے عمل کا مطالعہ کیا جا چکا تھا اور جوہانس لفظ ”gene“ بھی استعمال کر چکا تھا لیکن یہ مارگن ہی تھا جس نے کروموسومز اور جینز کے درمیان تعلق کی وضاحت کی اور بتایا کہ جین اصل میں کروموسوم کا ہی ایک حصہ ہے۔ مگر اس سارے تحقیقاتی عمل کا آغاز مینڈل نے ہی کیا۔

مینڈل کے کام کی دریافت نو (1900ء میں) کے وقت مارگن اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ ماحولیاتی عوامل کی نسبت اندرونی عوامل ایمبریوز کی نشوونما کے تعین میں زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس نے 1915ء میں "The Mechanism of Mendeliam Heredity" لکھ کر مینڈل کے کام کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اس کام کے اہم نتائج 1930ء کی دہائی میں سامنے آئے جب روسی ماہر جینیات تھیوڈوسیس دوبژنسکی (1900ء تا 1975ء) نے اپنی "Genetics and the Origin of Species" (1937ء) میں ڈارون ازم اور جینیٹکس کا ملاپ کروا دیا۔

جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے، ڈارون کے پاس توریث کی کوئی مربوط تھیوری نہیں تھی۔ لیکن مارگن اور اس کی ٹیم کے کام نے یہ کمی پوری کر دی۔ انہیں یقین تھا (اور سائنسی برادری نے ان سے اتفاق کیا) کہ جینیک تبدیلی خود رو انداز میں ہوئی اور اس نے نئے خواص کو جنم دیا۔

77

جنگ اور امن

"War and Peace"

لیو ٹالسٹائی

1868ء تا 1869ء

اثرات کے لحاظ سے لیو ٹالسٹائی ایک دیو تھا۔ دنیا بھر سے مصلحین اس سے مشورہ کرنے آئے۔ گاندھی، لڈوگ وٹگنسٹین صرف اسی کا اثر تھا۔ ٹالسٹائی کو بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ ہر سال ”جنگ اور امن“ پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ”آننا کارینینا“ کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ ان دونوں ناولوں پر کئی مرتبہ فلمیں بھی بنائی گئیں (یہ ناول اردو میں

ترجمہ ہو چکے ہیں)۔

ٹالسٹائی کے خیالات کافی مشہور بھی ہیں۔ اس کی اچھی اور بری سوانحات نے لوگوں میں پذیرائی حاصل کی۔ تاہم، ایک پیراڈاکس یہ ہے کہ اس کا زبردست احترام کیے جانے کے باوجود لوگوں کی اکثریت کے لیے اس کے خیالات مردود ہیں۔ کسی عام تھنکر کے سامنے ٹالسٹائی کی ہدایات کی فہرست پیش کریں اور وہ آپ کو سائبیریا بھجوانے سے پہلے کوڑے بھی لگوانا چاہے گا۔ تمام ادوار کا حیرت انگیز حد تک کامیاب آدمی ٹالسٹائی ناکامی سے بھی دوچار ہوا۔

ٹالسٹائی 1828ء میں ماسکو سے کوئی 130 میل دور واقع دیہی جاگیر میں ایک اشرافیہ گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن باعث مسرت تھا لیکن 9 سال کی عمر میں ماں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ 1844ء وہ کازان کی یونیورسٹی میں داخل ہوا مگر ڈگری نہ حاصل کر سکا۔ 1847ء میں وہ ایک آتشکی (جماعی) بیماری کی وجہ سے زیر علاج رہا اور اس کی بقیہ زندگی مسلسل شہوت پرستی کے باعث اذیت کا شکار رہی۔ اس کے ناولوں کے وسیع کینوسوں کی طرح ہی اس کی جنسی زندگی کا کینوس بھی بہت وسیع تھا (جنگ اور امن میں 580 کردار ہیں)۔

اس پر پہلا حقیقی فیصلہ کن اثر ژاں ژاک روسو کا تھا جس نے اسے روسی غلاموں کی قسمت بہتر بنانے کی کوشش کرنے پر مائل کیا اور وہ نئے لبرل پسند تعلیمی طریقوں میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ افلاطون کی طرح اس نے دنیا کو بدلنے کی کنجی تعلیم کو قرار دیا اور بعد کی زندگی میں اپنی زمینوں پر بہت سے سکول کھولے جن میں بچوں کو بے انتہا آزادیاں دی گئیں جن کا روس میں تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ جوابازی میں بہت زیادہ مقروض ہونے کے بعد اس نے 1851ء میں فوج میں شمولیت اختیار کی اور کاکیشیا کے علاوہ دیگر جگہوں پر بھی خدمات انجام دیں۔ اس کی کہانیوں ”بچپن“ (1852-1857ء) اور "Tales from Sebastopol" (1855ء) نے اسے ادبی شہرت اور مقبولیت دلائی۔

ٹالسٹائی کی ایمانداری پر سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ 1855ء میں فوج چھوڑنے کے بعد اس نے یورپ بھر میں سفر کر کے معاشرے اور اس کی اصلاح کے بارے میں کافی کچھ سیکھا۔ 1862ء میں Sonia Behrs سے شادی کرنے پر (وہ اس کے تیرہ بچوں کی ماں بنی) دونوں میاں بیوی

rekhta

شروع میں تو ایک دوسرے میں پوری طرح کھو گئے لیکن بعد میں یہ شاندار تعلق شکستگی کا شکار ہوا۔ یقیناً اس کے لیے سونیا کو ہی موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ ہم بس محفوظ انداز میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ...... ٹالسٹائی چیزوں کو درست اور غلط کے میکینکل طریقوں سے دیکھنے کے خلاف تھا۔ جبکہ بیوی کے نظریات زیادہ روایتی قسم کے تھے۔ لیکن اس میں بیوی کا کیا ''قصور''؟ وہ اس کے تیرہ بچوں کی ماں بننے کے ساتھ ساتھ اس کی سیکرٹری کے طور پر بھی کام کرتی رہی۔ اس نے اپنے شوہر کی ادبی سرگرمیوں کو سماجی و سیاسی سرگرمیوں پر ترجیح دے کر درست کیا۔ ٹالسٹائی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث روس کے جابر حکمرانوں کی نظر میں کھٹک رہا تھا۔

جب ٹالسٹائی نے ''آنا کارینینا'' مکمل کر لی (1875ء تا 1877ء) تو سونیا کے ساتھ اس کے معاملات بہت بگڑ گئے۔ اس کی ذات کے ناصحانہ اور اخلاقی پہلو نے غلبہ پایا۔ اس نے اپنے تمام سابقہ کاموں (بشمول ''جنگ اور امن'') کو مسترد کر دیا اور اس سب کی وضاحت کے لیے "Conversion" (1879ء) لکھا۔ اس پر پابندی لگنے کے باوجود لوگوں نے اسے پڑھا۔ البتہ وہ بدستور فکشن اور ڈرامے لکھتا رہا۔ اس کی طویل کہانی ''ایوان ایلائچ کی موت'' (1884ء تا 1886ء) قابلِ قدر اور اس کی دیگر تحریروں کی طرح اخلاقی مواعظ سے پاک ہے۔

لیکن شخصی حیثیت میں وہ نظریہ پرست بنتا گیا۔ اس نے اپنے زرعی غلاموں کو آزاد کیا یا آزاد کرنے کی کوشش کی جو اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس نے اپنی جائیداد بھی بانٹ دی (جس پر بیوی بہت سیخ پا ہوئی)۔ اس موقع پر وہ آرتھر شوپنہاور کے زیرِ اثر تھا۔ اس نے چیزوں کو حد سے زیادہ سیدھے انداز میں دیکھا، البتہ اس کے تخلیقی ضمیر نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔ 1883ء میں اس کی ملاقات ایک شاگرد ولادیمیر چیرتخوف سے ہوئی جو ٹالسٹائی کی تخلیقی قوتوں سے زیادہ ناصحانہ پہلو میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس بات نے ٹالسٹائی کی بیوی کو بہت دکھی کیا جو 1910ء میں چیرتخوف کے ساتھ بھاگ گئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد ایک ریلوے سٹیشن پر مر گئی۔ ٹالسٹائی نے اپنے آخری ناول "Resurrection" (1899ء) میں ایک معتوب عیسائی کمیونسٹ کسان برادری Doukhobors کا کیس پیش کیا جس نے اس کے چند نصائح سے متاثر ہو کر 1895ء میں ہتھیار دفن کر کے لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ ٹالسٹائی نے ان میں سے بہت سوں کو

کینیڈا ہجرت کرنے میں مدد کی۔

ٹالسٹائی نے عیسائیت کی ایک ایسی صورت کا پرچار کیا جو ہر قسم کے ''توہم پرستانہ'' عناصر سے پاک تھی۔ آخر کار روسی آرتھوڈوکس کلیسیا نے اسے دین بدر کر دیا (1901ء) کیونکہ وہ اس پر بہت زیادہ تنقید کرنے لگا تھا۔ اس کی پرچار کردہ عیسائیت کے پانچ مرکزی خیالات تھے: انسانوں کو اپنا غصہ دبانا چاہیے؛ شادی کے علاوہ کوئی جنسی تعلق نہیں ہونا چاہیے؛ قسمیں نہیں اٹھانی چاہئیں؛ برائی کی مدافعت نہیں کرنی چاہیے (یعنی اگر آپ کی بیوی یا بیٹی پر کوئی زانی آپ کے سامنے حملہ کر دے یا اس کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو تو کوئی دفاعی اقدام نہیں کرنا چاہیے)؛ اور دشمنوں سے محبت کرنی چاہیے۔ ٹالسٹائی کو یقین تھا کہ ان چیزوں پر عمل کرنے سے فرد کی محبت جلد ہی اس کی بدی کی صلاحیت پر غلبہ پا لے گی۔ شاید اس کا کہنا درست ہو مگر وہ عملی نہیں تھا۔

تو کیا ہمیں اس حوالے سے لیو ٹالسٹائی کا احترام کرنا چاہیے کہ اس نے ان چند نصائح پر اپنی زندگی میں ہی عمل کرنے کی زبردست کوششیں کیں؟ یا کیا اسے ایک نقصان دہ آئیڈیلسٹ شخص کے طور پر لعنت ملامت کی جانی چاہیے کہ جس نے اپنے طرزِ عمل کے باعث مصیبتیں کھڑی کیں؟ یا اسے دیکھنے کا کوئی اور حوالہ موجود ہے؟

یہ بات واضح ہے کہ سچ کے قریب پہنچنے کے لیے ہمیں تیسرے سوال پر ہی غور کرنا پڑے گا۔ ٹالسٹائی کی اپنی زندگی میں سچائی اور انصاف کے لیے جستجو قائل کر لینے والی اور ایک خصوصی قسم کی تحریک انگیز شان کی حامل ہے۔ 1888ء میں وہ بالآخر واقعتاً گوشت، تمباکو، الکحل اور شکار سے اجتناب کے قابل ہو گیا۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے انسانی فطرت کو تسلی بخش انداز میں سامنے نہ رکھا۔ وہ اپنے محبوب کسانوں کے لیے طبقۂ اشراف کی حقارت کو ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ یہ یقین کرنے پر مائل تھا کہ وہ خود اپنے اندر موجود اخلاقیات پسند جیسا تھا۔ تخلیقاتی کام (مثلاً ''دی ڈیتھ آف آئیوان الائچ'') میں ہی وہ اپنی ذات کے تضادات کو حل کرنے کے قریب قریب پہنچ پایا۔ ''آرٹ کیا ہے؟'' میں وہ متاثر کن نظر آتا ہے۔ وہ شیکسپیئر، بیتھوون اور دانتے کو برا بھلا کہتا ہے لیکن اس کے دلائل قائل کر لینے والے نہیں۔ اس کا اپنا پیش کردہ آرٹ دنیا کی ایک حقیقت

پسندانہ تصویر نگاری ہے۔

اور یہی اس کی حقیقی کامیابی ہے۔ غالباً ''جنگ اور امن'' کی نسبت ''آنا کارینینا'' زیادہ عظیم ناول ہے لیکن اوّل الذکر کا اپنی وسعت میں کوئی ثانی نہیں۔ پہلے یا بعد میں کبھی بھی الفاظ میں جنگ کی اس سے زیادہ متاثر کن تصویر نگاری نہیں کی گئی۔ نپولین کی فتح روس کا اس قدر واضح بیان آپ کو اور بھلا کہاں ملے گا؟ جی ہاں، کچھ حقائق غلط بلکہ دانستہ طور پر تبدیل کیے گئے ہیں؛ لیکن اس جنگ کے بارے میں ہم عصر لوگوں کی تفہیم بھی تو ''غلط'' تھی۔ اگر ''جنگ اور امن'' دنیا کا عظیم ترین ناول کہلانے کا مستحق نہیں تو بلاشبہ وہ اس حوالے سے زیرِ غور لائے جانے کے قابل ضرور ہے۔

بلاشبہ ''جنگ اور امن'' سب لوگوں کے لیے سب کچھ رکھتا ہے۔ ناول نگار ہنری جیمز نے اسے کسی پلاٹ یا سمت سے عاری "loose baggy monster" قرار دیا، پھر بھی وہ اس کا مداح تھا۔ اس ناول کی اپنی کمزوریاں ہیں لیکن وہ کمزوریاں خود زندگی کی تمام تر شدت رکھتی ہیں۔ مرکزی کمزوری بلاشبہ ٹالسٹائی کا اپنا تاریخی نکتۂ نظر پیش کرنے کا انداز ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے لیکن ہم خود کو آزاد مرضی کا مالک تصور کیے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ ان قوانین تاریخ کو بیان نہیں کر پاتا جن کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے۔

''جنگ اور امن'' کو کامل کامیابی حاصل نہ ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔ لیکن اسے ناکام کس نے قرار دیا ہے؟ اس میں ایک فوجی حملے کے خوف میں مبتلا قوم کی انسانیت پسندانہ تصویر کشی، تشدد اور جنگ کے زیرِ اثر آئے ہوئے انسانوں کے متعلق بیان نے وہ کچھ کر دکھایا جو اخلاقیات پسندانہ پند و نصائح کے ذریعہ کبھی بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

78

بجلی اور مقناطیسیت پر مقالہ

"Treatise on Electricity and Magnetism"

جیمز کلرک میکس ویل

1873ء

زیریں سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والا جیمز کلرک میکس ویل (1831ء تا 1879ء) اپنی زندگی میں "Maxwell's equations" کی شہرت نہ دیکھ سکا۔ ہم عصر سائنسدان اس کے اخذ کردہ نتائج میں دلچسپی رکھتے تھے اور ان کا بڑے شوق سے مطالعہ بھی کیا۔ لیکن وہ ان پر یقین نہیں رکھتے تھے' حالانکہ میکس ویل نے ان کے مخصوص ماڈل بھی پیش کر دیے تھے۔ میکس ویل کی قبل از موت کے

بعد ہی اس کی تحقیقات کو قبولیت حاصل ہو سکی۔

ورکرز کے ایک قلیل سے گروپ کے سوا ہر کسی نے اس مقالے کو نظر انداز کر دیا۔ انجام کار 1884ء میں اولیور ہیوی سائیڈ (1850ء تا 1925ء جس کے نام پر فضائی لہر کا نام رکھا گیا) نے اس کی مساواتوں کو بیان کیا۔ 1879ء میں جرمن سائنس دان ہائنرخ واں ہیلم ہولٹز (1821ء تا 1894ء) نے ان کی تجرباتی تصدیق کے لیے ایک انعام مقرر کیا۔ 1888ء میں میکس ویل کی وفات کے تقریباً دس برس بعد) ایچ آر ہرٹز (1875ء تا 1894ء) نے اس کی Wave تھیوری کی تصدیق کر دی۔ دو سال بعد یہ وسیع پیمانے پر تسلیم کی جا چکی تھی۔ آج اکثر کہا جاتا ہے کہ "ہم میکس ویل کی مساواتیں اس طرح لکھتے ہیں کہ جیسے وہ پتھر پر کھود کر ہم تک پہنچائی گئی ہوں۔" ان کی تعداد چار ہے۔ پرانے سائنس دان نئی باتوں پر عموماً کان نہیں دھرتے اور انہیں قبول کرنے میں ایک نئی نسل کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

میکس ویل کا بچپن تجسس سے لبریز تھا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتا رہتا تھا۔ اس کی نثر بہت خراب تھی لیکن وہ اپنا مدعا بیان کرنے میں کامیاب رہا۔ آج ماہرین طبعیات جیمز میکس ویل کو انیسویں صدی کے مؤثر ترین سائنسدانوں میں شمار کرتے ہیں۔ عموماً اسے نیوٹن اور آئن سٹائن کے ساتھ بھی شمار کیا جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے میکس ویل کی 100ویں سالگرہ کی تقریب میں اس کے کام کو نیوٹن کے بعد سے فزکس کے میدان میں مفید ترین کام قرار دیا۔

میکس ویل نے برقناطیسیت اور بصریات کو مدغم کر دیا۔ اسی سے برقناطیسی تابکاری کا تصور پیدا ہوا۔ میکس ویل کی فیلڈ equations کی بنیاد پر آئن سٹائن نے کمیت اور توانائی کی مساوات بنائی۔ میکس ویل کا heat radiation کا نظریہ ہی وہ اصل محرک تھا جس نے 1900ء میں میکس پلانک کو اپنی کوانٹم تھیوری تشکیل دینے پر مائل کیا۔

ماں کی موت کے بعد ایڈنبرگ اکیڈمی میں میکس ویل اپنے معلموں کے غلط سلوک کا نشانہ بنا جو اسے "Dafty" (باؤلا) کہتے تھے۔ لیکن اس نے خود کو قائم رکھا اور پندرہ سال کی عمر میں غیر معمولی ذہانت کا مالک مشہور ہو گیا۔ بعد کی زندگی میں لوگوں نے اس کی وجدانی طاقتوں کو بنظر

احترام دیکھا اور وہ یقین رکھتے تھے کہ میکس ویل کسی بھی معاملے میں "غلط نہیں سوچ سکتا۔" درحقیقت اس کی سوچ کبھی بھی غلط سمت میں نہ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے تجسس نے شہرت کی خواہش پر فوقیت حاصل کر لی۔

میکس ویل نے 1874ء میں Trinity کالج کیمبرج سے فزکس میں گریجوایشن کی اور سترہ برس بعد پہلے کیونڈش پروفیسر کی حیثیت سے وہاں واپس آیا۔ سائنس میں اس کی پہلی قابل ذکر حصہ داری یہ رائے تھی کہ سیارہ زحل کے دائرے (Rings) ٹھوس ذرات پر مشتمل تھے۔

ملے 20 سال کی عمر میں

ہمارے دور میں وائیجر خلائی جہاز نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس کے بعد میکس ویل نے تھرموڈائنامکس کے قوانین کو بہتر بنایا اور ثابت کیا کہ انہیں شماریاتی حوالوں سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ یوں اس نے ایٹامک تھیوری کی ترقی میں حصہ ڈالا۔ اس نے رنگ نظر آنے کے بارے میں بھی قابل ذکر کام کیا اور اتفاقاً یہ دکھایا کہ رنگوں کی تمیز نہ کر سکنے والے (کلر بلائنڈ) لوگوں میں ایک receptor کا فقدان ہوتا ہے جو رنگوں کو محسوس کرتا ہے۔ لیکن بلاشبہ اس کی سب سے بڑی کامیابی ریاضی کے ذریعہ برقی اور مقناطیسی اثرات کو متحد کرنا تھی۔

نیوٹن اپنے جادوئی نظریہ کشش ثقل پر اس قدر حیرت زدہ تھا کہ بمشکل ہی اس پر یقین کر پایا کہ مادہ ایک فاصلے سے مادے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن مشاہدات نے اسے درست ثابت کر دیا اور یوں یہ اصول برقیات اور مقناطیسیت دونوں تک پہنچا۔ برقیاتی اور مقناطیسی اجسام ایک دوسرے کے حوالے سے ایک ہی انداز میں عمل کرتے تھے (اور وہ کشش ثقل کے زیر اثر ایک دوسرے کو دفع بھی کرتے ہیں)۔ لیکن چند ایک افراد کو ہی ان دونوں کے درمیان کسی بھی تعلق پر یقین تھا حتیٰ کہ 1820ء میں ہانس کرسٹیان اورسٹیڈ (1771ء تا 1851ء) نے اتفاقیہ طور پر اس کی تصدیق کر دی۔

تب مائیکل فیراڈے (1791ء تا 1867ء) نے نیویارک کے ایک سکول ماسٹر جوزف ہنری کے ساتھ مل کر یہ دریافت کیا کہ اگر آپ ایک برقی رو اور مقناطیس کے درمیان فاصلہ تبدیل کر دیں تو کرنٹ کا بہاؤ پیدا کر سکتے ہیں (cause a current to flow)۔ یوں بجلی کی موٹر اور جنریٹر کے لیے اصول ایجاد ہوا۔ آخر کار فیراڈے نے خود سے پوچھا کہ اگر برقی رو لے کر جانے والی ایک تار مقناطیسی میدان (فیلڈ) پیدا کرتی ہے تو کیا ایک مقناطیسی فیلڈ کو تار میں کرنٹ نہیں لے جانا چاہیے؟ میکس ویل نے فیراڈے کے کام پر ہی انحصار کیا لیکن فیراڈے میکس ویل کی طرح ریاضی میں مہارت نہیں رکھتا تھا اور وہ بس اتنا ہی کہہ سکا کہ مقناطیس اور برقی رو ''قوت کے فیلڈز'' بناتے ہیں۔ مقناطیس کے کنارے پر لوہے کے ٹکڑے رکھ کر ہم ان فیلڈز کو ''دیکھ'' سکتے ہیں۔

ہنوز کوئی بھی برقی رو (الیکٹرسٹی) کی تفہیم نہیں رکھتا: کوئی بھی ہمیں یہ نہیں بتا سکتا کہ مقناطیس ایک کشش (اور دفع کرنے) کی قوت کیوں رکھتا ہے۔ لیکن ناقابل فہم کو ریاضی میں ''بیان'' کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میکس ویل نے خود کو درپیش تضادات سے مسحور ہو کر اس نئی معلومات کو ایک ریاضیاتی صورت میں بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ فیراڈے اور تمام دیگر لوگ یقین رکھتے تھے کہ برقیاتی اور مقناطیسی اجسام کے قوت کے میدان ایک لامحدود رفتار پر سفر کرتے تھے۔ فیراڈے نے ثابت کیا کہ برقناطیسی لہریں ایک متواتر رفتار پر سفر کرتی ہیں: یعنی روشنی کی رفتار پر۔ اس نے دکھایا کہ روشنی بھی ایک برقناطیسی لہر تھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد ہرٹز نے خالصتاً برقیاتی ذرائع سے لہروں کا سراغ لگایا اور آئن سٹائن سے لے کر پلانک تک تمام دلائل کے دوران میکس ویل کی مساواتیں کارآمد رہیں، انجام کار نیوٹن کے قوانین میں ترمیم کی گئی۔ ہر قسم کی تاب کاری...... ایکس ریز، ریڈیو لہریں وغیرہ...... کے اثرات کی وضاحت بھی میکس ویل کا کارنامہ ہے حالانکہ اس کے دور میں ان کی دریافت بھی نہیں ہوئی تھی۔

وان ہیلم ہولٹز نے لکھا: ''میکس ویل کی تھیوری کیا ہے؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی مختصر اور دوٹوک جواب نہیں ہے۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ میکس ویل کی تھیوری اس کا مساواتوں (Equations) کا نظام ہے۔''

79

زرتشت نے کہا

"Thus Spoke Zarathustra"

فریڈرک نطشے

1833ء تا 1885ء

فریڈرک نطشے جدید دور کے موثر ترین مفکرین میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس کو انیسویں صدی کے آخری برسوں تک مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس کے اثرات تبھی مرتب ہونا شروع ہوئے جب ڈینش نقاد جارجز برانڈیس نے اپنے لیکچرز کے ذریعہ (1888ء میں) اس کی تحریروں کو مقبول بنانا شروع کیا جبکہ اس دور میں نطشے ناقابل علاج دیوانگی اور ارد گرد سے بے خبری کی حالت میں

تھا۔اس نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال اسی حالت میں گزارے۔اسے ہرگز نہیں معلوم تھا کہ وہ مشہور ہو گیا ہے۔عموماً اس کی مقبول ترین کتاب ''زرتشت نے کہا'' کو ہی اس کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔نطشے نے اس کتاب کے پہلے تین حصے اپنے ذاتی خرچ پر شائع کیے اور چوتھے حصے کی باری آنے تک اس قدر مایوس ہو چکا تھا کہ محض چند ایک نقول تیار کروانے پر ہی قناعت کی۔

''اپنے آپ پر غلبہ پانا'' نطشے کی فکر کا جوہر تھا۔آسٹریائی مصنف سٹیفان زویگ نے نطشے کی دیوانگی کے آخری برسوں کے بارے میں لکھا:

''ضعیف البصر آدمی احتیاط کے ساتھ میز پر بیٹھتا ہے: حساس معدے والا آدمی محتاط انداز میں مینو کی آئٹمز پر غور کرتا ہے: کہیں چائے زیادہ تیز تو نہیں، کھانے میں زیادہ مرچیں تو نہیں کیونکہ خوراک میں ذرا سی بے احتیاطی اس کے حساس نظام انہضام میں گڑبڑ پیدا کر دیتی ہے اور ذرا سا انحراف اس کے اعصاب کو ہفتوں تک مسائل زدہ بنائے رکھتا ہے۔نہ وائن کا گلاس، نہ بیئر کا گلاس، نہ الکحل، نہ کافی، نہ کھانے کے بعد سگریٹ...... اسے ہیجان دلانے، تر و تازہ کرنے یا راحت دلانے کے لیے کوئی بھی چیز میسر نہیں۔بس تھوڑا سا کھانا اور عموماً ایک پڑوسی کے ساتھ مدھم آواز میں تھوڑی بہت شائستہ باتیں...... اور پھر واپس اپنے چھوٹے اور تنگ سے کمرے میں...... صرف کتابیں اور مسودے اور ایک ٹرے میں بے شمار بوتلیں...... سر درد، معدے کی اینٹھن ...... قے وغیرہ کو روکنے کی ادویات ...... زہروں اور ادویات کا ایک خوفناک بارود خانہ جو اس راحت سے عاری عجیب و غریب کمرے کی خالی خاموشی میں اس کا واحد مددگار ہے ...... وہ گھنٹوں بیٹھا لکھتا رہتا ہے ...... آخرکار اس کی آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔

البتہ نطشے بہت سے لوگوں کے لیے بہت کچھ ہے: ایڈولف ہٹلر کے پاس اس کا ایک مجسمہ تھا اور 1943ء میں اس نے عارضی طور پر معزول مسولینی کی ڈھارس بندھانے کے لیے اسے نطشے کی تحریروں کا ایک مجموعہ تحفے میں دیا۔خود کو ایک ناکام ناول نگار سمجھنے والے مسولینی نے انہیں

پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔البتہ کچھ زیادہ ذمہ دار مفکرین نے نطشے کو امن کا بادشاہ بھی قرار دے دیا۔فرائیڈ کو یقین تھا کہ وہ دیگر تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ آگہی ذات کا مالک تھا۔

''نازیوں کا اسے غلط طور پر استعمال کرنا...... مسلماً اس کی اپنی غلطی تھی۔اسے اپنے فلسفے میں موجود کمزوری کو دور کرنے کے لیے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔'' یہ تنقید تیں پینتیس برس پہلے کی گئی۔لیکن آج نطشے کو فاشزم کو فروغ دینے والا نہیں خیال کیا جاتا۔درحقیقت نطشے کی نازی ازم کی حامی بہن الزبتھ نے اپنے ہی جیسے دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر اس کے پیغام کو مسخ کیا اور حتیٰ کہ رد و بدل کرنے کے علاوہ مخصوص اقتباسات ہی لیے۔

نطشے کی غلطیوں کو سمجھے بغیر اس کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ حقیقت میں تشدد کا حمایتی نہ ہونے کے باوجود اس نے اکثر یہی تاثر دیا۔

نطشے 1844ء میں پروشیا کے علاقے سیکسونی میں بمقام روکین پیدا ہوا۔اس کا باپ ایک لوتھری پادری تھا جو چار برس بعد پاگل ہو کر مر گیا۔اس نے Bonn اور لیپزگ میں تعلیم پائی اور محض 24 سال کی عمر میں بیسل یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ میں کلاسکس کا پروفیسر تعینات ہوا۔یہ اس کی فاتحانہ کامیابی کا مختصر زمانہ تھا۔اگرچہ اسے ابھی تک لیپزگ سے ڈاکٹریٹ نہیں ملی تھی لیکن یونیورسٹی نے جلد ہی ڈگری فراہم کر دی۔تقریباً اسی دور میں وہ فلسفے کا شوقین بنا اور شوپنہاور سے محبت کرنے لگا۔شوپنہاور کا یاسیت پسندانہ اثر اس پر کارگر ثابت ہوا۔

قبل ازیں نطشے نے فوج میں بھی خدمات انجام دی تھیں (1867ء) لیکن گھوڑے سے گرنے کے بعد وہاں سے فارغ کر دیا گیا۔1870ء میں اس نے فرانکو پروشیائی جنگ میں خود کو ایک طبی اردلی کے طور پر پیش کیا مگر جلد ہی پیچش کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔

1879ء میں اسے اپنی صحت کی خرابی کے باعث بیسل میں عہدے سے استعفیٰ دے کر پنشن لینا پڑی۔تب تک وہ "The Birth of Tragedy" کے علاوہ کئی کتب چھپوا چکا تھا۔اس نے اپنے پاگل کا آخری عشرہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں گزارا۔باپ کی طرح وہ بھی اچانک پاگل ہو گیا تھا۔

نطشے کی سوچ ''زرتشت نے کہا'' میں نمایاں ہے (اس کتاب کا زرتشتی مذہب سے ہرگز

کوئی تعلق نہیں)۔ اس کتاب کا خلاصہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ ''زرتشت نے کہا'' کو عظیم ترین کتابوں میں شمار کرنا چاہیے۔ اس میں نطشے کی عورت کے موضوع پر بات کرنے کی کوششیں اس کی عمومی سوچ کے مقابلے میں نہایت پست درجے کی ہیں۔ متن میں کہیں کہیں ہسٹیریا اور خبط کی صورت حال نظر آتی ہے۔ کچھ لطیفے بے تک یا مبہم ہیں۔ لیکن یہ وہ قیمت ہے جو نطشے نے ایک شاندار اندازِ سخن کے لیے ادا کی۔ وہ خوبصورت انداز میں ابتدا کرتا ہے: ''جب زرتشت تیس برس کا ہوا تو اس نے اپنا گھر اور گھر کی جھیل کو خیر باد کہا اور پہاڑوں میں چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی روح اور تنہائی کا لطف اٹھایا اور دس برس کے دوران اکتایا نہیں۔ لیکن آخر کار اس کے دل نے ایک کروٹ لی، ایک روز وہ صبح سویرے اٹھا، سورج کے سامنے کھڑا ہوا اور اس سے یوں خطاب کیا......'' یہ کتاب تصورات اور خیالات کی ایک امیر کان ہے۔ ان میں سے تین تصورات قابلِ ذکر ہیں: خدا کی موت، سپرمین (یا ''اوورمین'') اور ابدی ظہورِ نو۔

نطشے کی جانب سے خدا کی موت کا اعلان سب سے زیادہ متاثر کن تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس تصور کی بھی متعدد تفاسیر پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس کا لب لباب یہ تھا کہ ایک ٹریجڈی اور زندگی کی لایعنیت کے احساس نے انسانیت کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ عیسائی سوچ (جس سے وہ خصوصی نفرت کرتا تھا) حقیقت سے لاتعلق ہو گئی تھی اور انسانوں کو غیر حقیقی خدا میں پناہ لینے کی تعلیم دے رہی تھی۔ ایک ایسا خدا جسے نطشے نے مردہ قرار دیا۔ پرانے عیسائی خدا کی موت کی یہ تشخیص ثقافتی نوعیت کی تھی: اس میں اس حوالے سے کوئی منطق نہ تھی کہ ایک زندہ خدا موجود ہے۔ نطشے کی تفسیر مذہبی اور ملحدانہ دونوں مفہوم میں ہو سکتی ہے۔

اس کا حل ایک ایسا آدمی پیدا کرنا ہے جو خود سوچ کر اپنے لیے عمل کر سکے: سپرمین۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے: 'تم کہتے ہو کہ تمہارا زرتشت پر ایمان ہے؟ لیکن اس کی کیا اہمیت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ مجھے چھوڑ کر خود کو تلاش کرو: اور جب تک تم مجھ سے انکار نہ کرو گے میں واپس نہیں آؤں گا۔''

درحقیقت نطشے اپنے دور کے جرمنوں اور بالخصوص ان جرمنوں کا مخالف تھا جو نازی بنے اور جنہوں نے ایک نیم پڑھے لکھے اور نفسیاتی مسائل کے شکار رہنما کو تسلیم کر لیا۔ نطشے اس قدر

تعصب کی حد تک سامیت کا حامی تھا کہ کچھ موقعوں پر وہ ایک سامی مخالف تکنے لگتا ہے۔ اگر اس کا ذہن بحال رہتا اور صحت اجازت دیتی تو وہ ضرور اپنی کتاب پر نظرِ ثانی کر کے کافی واضح کر دیتا کہ اس کا سپرمین ایک درندہ نہیں بلکہ اپنی کوتاہیوں پر اور اپنے عہد کی شکستہ اقدار پر قابو پا سکنے والا ایک انسان تھا۔ قابو پانے کی اس استعداد نے اسے ''ابدی ظہورِ نو پر یقین تک پہنچایا۔ یہاں اہم نکتہ یہ ہے کہ سپرمین کس انداز میں اس کی ذمہ داری اٹھا سکتا تھا:

> اگر کسی دن یا رات کو بالکل تنہائی میں ایک شیطان آپ کے پاس آئے اور کہے: ''تم جس انداز میں یہ زندگی گزار رہے ہو، تمہیں یہی زندگی ایک مرتبہ پھر اور متعدد مرتبہ اسی طرح گزارنا پڑے گی اور اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہوگا، بلکہ سب کچھ اسی طرح بار بار پیش آئے گا......'' تو کیا تم زمین پر لیٹ کر دانت پیسنے اور اس شیطان کو کوسنے نہیں لگو گے؟

80

خوابوں کی تفسیر

"The Interpretations of Dreams"

سِگمنڈ فرائیڈ

1900ء

سگمنڈ فرائیڈ (1856ء تا 1939ء) کا ذکر کیے بغیر بیسویں صدی کے بارے میں کوئی بھی بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ سن 2000ء میں وہ اسی طرح بیسویں صدی کی مرکزی شخصیت ہوگا جیسے 1700ء میں لاک یا نیوٹن، 1800ء میں والٹیئر یا ہیگل یا 1900ء میں شوپنہاور کو مرکزی حیثیت

حاصل تھی۔

اکثر زور دیا جاتا ہے کہ فرائیڈ نے لاشعوری ذہن کو "دریافت" کیا۔ تاہم، لاشعور کا تصور بہت ابتدا کا ہے۔ مثلاً ہومر کے ہاں ہم ایسے آدمی دیکھتے ہیں جنہیں دیوتاؤں نے بھیجا تاکہ وہ بے خبر سوئے ہوئے لوگوں کے ذہنوں میں خیالات جاگزیں کریں۔ سوفوکلیز کے Ajax یا شیکسپیئر کا ہیملٹ بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ تمام دور کے اور تمام جگہوں کے لوگوں نے جب کسی شخص کو "جذبات سے مغلوب" قرار دیا تو اس سے اُن کی مراد کیا تھی؟ لاشعوری ذہن کا تصور متعدد فلسفیوں (بالخصوص کانٹ) کے کام میں بھی عیاں ہے۔ کانٹ کے خیال میں ہم دنیا کا خاکہ اپنے لاشعور میں ہی بناتے ہیں۔ اس تصور نے شوپنہاور کے شاگرد ایڈورڈ واں ہارٹ مین کی تصنیف "The Philosophy of Unconscious" (1886ء) میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ ہیگل اور شوپنہاور کے فلسفوں کا امتزاج پیش کرنے کی کوشش تھی۔ فرائیڈین ازم کی بنیادوں میں ایک اینٹ اس نے بھی لگائی۔ لیکن فرائیڈ نے لاشعوری ذہن کو ایک مربوط اور سائنسی حیثیت میں پیش کیا۔ اس کے کام کو سراہا اور مسترد بھی کیا گیا۔

اصل معاملہ ذہن کے مخفی حصے یعنی لاشعور کا نہیں، بلکہ اس کی موزوں تعریف کا ہے۔ فرائیڈ کے قائم کردہ اصول، تحلیل نفسیات کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ فرائیڈ کے حوالے سے یہ دلچسپ تو ہے مگر اس کی حقیقی اہمیت اتنی زیادہ نہیں۔ فرائیڈ کی پیدائش فرائی برگ موراویا کے ایک یہودی گھرانے میں ہوئی، لیکن اس نے چار سال کی عمر کے بعد سے ویانا میں پرورش پائی۔ وہ 1938ء تک اسی شہر میں رہنے کے بعد لندن میں پناہ گزیں ہوا اور اگلے برس وہیں فوت ہو گیا۔ فرائیڈ ایک ذہین طالب علم تھا۔ اس نے 1881ء میں ویانا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری (نیورالوجی میں) حاصل کی۔ وہ پیرس کے Salpetriere ہسپتال میں جین مارٹن کی زیرِ نگرانی پڑھنے کے لیے 1885ء میں وہاں گیا۔ جین مارٹن ایک فزیشن اور ماہر ہپناٹزم تھا اور مخصوص مرض میں مبتلا افراد (سب کی سب عورتیں نہیں) کا انچارج تھا۔ بعد میں اس مرض کو "ہسٹیریا" قرار دیا گیا۔ یونانی زبان میں اس لفظ کا مطلب کوکھ ہے۔ کافی عرصہ تک یہ مرض صرف عورتوں سے ہی منسوب کیا جاتا تھا۔ اس مرض میں مبتلا افراد مفلوج ہو جاتے جس کی وجہ کوئی اعصابی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

''ہسٹیریا'' نے ہی فرائیڈ کو نفسیاتی علاج میں دلچسپی لینے پر مائل کیا۔ جین مارٹن کے پاس آنے سے پہلے اس کی دلچسپی کا مرکز حیاتیات میں تھا۔ اس نے کچھ برس تک پروفیسر ارنسٹ برو کے کی لیبارٹری میں کام کیا تھا۔

پیرس سے واپس آنے کے بعد فرائیڈ نے ویانا جنرل ہسپتال میں جنرل فزیشن کے طور پر کام کیا۔ وہ یونیورسٹی میں ایک عہدہ چاہتا تھا لیکن یہودیوں کو اس کی اجازت نہ تھی۔ افسوس کے آج کی طرح اس دور میں بھی آسٹریا سامیت مخالفت کا گڑھ تھا۔ فرائیڈ نے 1886ء میں شادی کی (اور 6 بچوں کا باپ بنا) اور اسی برس اعصابی مسائل کا سپیشلسٹ مشہور ہو گیا۔ وہ اسی گھر میں رہا حتیٰ کہ نازیوں نے اُسے ویانا سے نکال دیا۔ فرائیڈ نے تحلیلِ نفسیاتی تحریک کی بنیاد رکھی اور اس کی قیادت کی۔ اس میں رشک و حسد جیسی برائیاں موجود تھیں، لیکن ابھی تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ اس نے واقعی کوئی مکاری کی تھی۔ وہ زندگی بھر ایک شائستہ اور معتدل لبرل رہا۔

اعصابی علالت کے لیے علاج کے طور پر فرائیڈ کی اپنی ایجاد یعنی تحلیلِ نفسیات یہاں بمشکل ہی زیرِ بحث ہے۔ البتہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی تشکیل کی مرکزی وجہ خود فرائیڈ کا جینیئس تھا۔

لاشعور کو تحت الشعور سے واضح طور پر تمیز کرنا لازمی ہے۔ لاشعور ذہن کا ایک ایسا حصہ ہے جو آگہی سے مخفی ہو۔ جبکہ تحت الشعور کو سابقہ شعور کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ یعنی وہ حصہ جس کے اندر ایسی یادیں ہوتی ہیں جو اصل میں شعور کا حصہ تو نہیں لیکن اس کے لیے فوری طور پر قابلِ رسائی ہیں۔ سابقہ شعور یا Preconsciousness کے مشمولات اکثر بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔

فرائیڈین تھیوری کی بنیاد متعدد جبلتی تحریکات پر ہے جن سب کا مقصد بقا کو یقینی بنانا (لیکن بعد میں ایک موت کی خواہش کا اضافہ بھی ہو گیا جو فرائیڈ پر براہِ راست شوپنہاور کا اثر ہے) اور حصولِ مسرت یا تسکین ہے۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ اعلیٰ ترین مسرت جنسِ مخالف کے ساتھ جنسی مجامعت ہے۔ اس کے پاس اس خیال کی حمایت میں خاصی شہادت موجود تھی، مگر اسی بنیاد پر اس کے اوّلین رقیب بننے والے کارل گستاو ینگ نے ماورائے شادی سرگرمیوں میں بھی اس کا کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔

انسان بلوغت (اور فرائیڈ کو یقین نہیں تھا کہ یہ منزل کبھی آتی ہے) کی جانب جاتے ہوئے مندرجہ ذیل مراحل سے گزرتا ہے: دہنی (Oral)، مقعدی (Anal)، جنسی عضویاتی اور بلوغی۔ قوت محرکہ لبیڈو یا شاید ایک جاندار تصور ہے؛ یہ لبیڈو انسانی ہستی کے ''قدیم'' ترین جز Id کی جدوجہد ہے (Id ایک کوڑے دان ہے جس میں صرف قاتلانہ، مباشرتِ محرمانہ اور خود غرضانہ تحریکیں ہی ہوتی ہیں)۔ ایک قسم کا تہذیبی عمل ان تحریکات کا تدارک کرتا ہے۔ چنانچہ پولیس، سرکاری حکام، اساتذہ مل کر فوق الانا یا ''ضمیر'' تشکیل دینے میں مدد کرتے ہیں (یاد رہے کہ فرائیڈین ازم کوئی خدا کا ودیعت کردہ ضمیر موجود نہیں کیونکہ خدا ایک سراب ہے)۔ یہ فوق الانا عموماً فرد کو مائل کرتی ہے کہ وہ معاشرتی لحاظ سے قابلِ قبول ذرائع سے اپنی خوفناک تشفیاں حاصل کرے۔

ہمارے اندر Id اور فوق الانا کے درمیان ایک غیر راحت بخش سمجھوتے کو فرائیڈ انا یا ego کا نام دیتا ہے۔ فرائیڈین ازم میں بہت سی ایسی رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا جو ''نارمل'' عمل میں پیش آتی ہیں: یہ رکاوٹیں صدمات یا دکھوں پر مشتمل ہیں جو مسائل حل کرنے میں تمام قسم کی ناکامیوں کا نتیجہ ہیں۔ شدید ترین صدمہ کی وجہ جنسی توجہ کو ماں سے ہٹا کر کسی اور ''معاشرتی لحاظ سے قابلِ قبول'' ''معروض'' کی جانب لگانا ہے۔ فرائیڈ یقین نہیں رکھتا تھا کہ المشہور ایڈی پس کمپلیکس بیشتر صورتوں میں حل ہو گیا تھا (ایڈی پس نے انجانے میں اپنے باپ کو قتل کر کے ماں سے شادی کر لی تھی)۔ عورتوں میں یہ عمل تھوڑا سا مختلف ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرائیڈ نے اس حوالے سے اطمینان بخش انداز میں بات کی۔ اس نے پوچھا: ''عورت کیا چاہتی ہے؟'' اس کی بیوی نے کہا تھا کہ اس قسم کے معاملات کو ''نرسری سے باہر'' رکھنا چاہیے۔

ذہن کے بارے میں فرائیڈین بیان کی مرکزی خصوصیت اس کا نہایت مشینکانہ نظر ہے۔ ابتدا میں جب وہ صرف ہسٹیریا میں ہی دلچسپی رکھتا تھا تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے توانائی کو ایک محلول کی صورت میں حرکت کرتے ہوئے تصور کیا جسے ''ڈسچارج'' کیا جا سکتا تھا۔ تاہم، 1900ء میں جب ''خوابوں کی تعبیر'' منظرِ عام پر آئی تو اس نے زیادہ رقیق اور کم تخلیلی مقاصد کے لیے ایک مفید استعارے کا کام دیا۔ اسی کتاب نے فرائیڈ کو جرمنی اور آسٹریا کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی قابلِ ذکر بنایا لیکن اسی دور میں فرائیڈ اپنے خیالات کا سائنسی بنیادوں پر دفاع کرنے کے

لیے نہایت بے قرار ہو گیا۔ بعد میں اس نے اپنے خیالات کے خلاف دشمنی رکھنے والوں کے جذبات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ لیکن اہل آسٹریا و جرمن کی سامیت مخالفت کی بنا پر مخالفت کو نظر انداز کر دیا گیا۔

تاہم، فرائیڈ کا نظریۂ ذہن اس قدر پُر اثر ثابت ہونے کی وجہ اس کی سائنسی درستی نہیں۔ اگرچہ فرائیڈ روایتی سائنسی طریقہ کار کی زد پہ با آسانی آ سکتا ہے لیکن اس نے ہمارے خود کو دیکھنے کے انداز کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی فرائیڈ کا نظریۂ ذہن 1950ء سے بعد کے دیگر فکری نظاموں کی بہ نسبت کہیں زیادہ اثر انگیز ہے۔ خود تحلیلی نفسیات کا مقدر زیادہ مشکوک ہے؛ لیکن اس حوالے سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ خود فرائیڈ کی رائے تھی کہ ذہنی حالتوں کی جسمانی وجوہ انجام کار دریافت ہوں گی۔

rekhta

81

نتائجیت پسندی

"Pragmatism"

ولیم جیمز

1908ء

''دی پرنسپلز آف سائیکالوجی'' (1890ء) غالباً ولیم جیمز کی عظیم ترین کتاب ہے اور یہ کہنا بجا ہے کہ اس میں کم از کم مستقبل کی تمام کتب کے جراثیم موجود تھے ...... "The Will to Believe" (1897ء)، "The Varieties of Religious Experience" (1902ء) اور "The Meaning of Truth" (1909ء)۔ لیکن اس کی اصل شہرت فلسفۂ نتائجیت کی وجہ سے ہے حالانکہ وہ اس کا بانی نہیں۔

rekhta

ولیم جیمز کی پیدائش نیویارک کے ایک نہایت روشن خیال گھرانے میں ہوئی جس کا سربراہ ہنری جیمز سینئر ایک Swedenborgian ماہر الٰہیات تھا۔ سینئر جیمز ایک زبردست آدمی تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کو یورپ میں لیے لیے پھرا تا کہ انہیں بہترین آرٹسٹک، انسانیت پسندانہ اور لبرل روایات کی تعلیم دے سکے۔ ولیم کا ایک سال چھوٹا بھائی ہنری ایک مشہور ناول نگار تھا، جبکہ وہ خود ایک نفسیاتی معالج اور فلسفی تھا۔

1863ء میں جب ولیم نے ہارورڈ میڈیکل سکول میں داخلہ لیا تو اس سے پہلے ہی مصوری کی تعلیم حاصل کر چکا تھا لیکن اپنی بنیادی صلاحیتوں پر اعتبار نہ ہونے کے باعث اسے ترک کر دیا۔ اس طرح اسے تخلیقی صلاحیت کی ایک انمول بصیرت ضرور حاصل ہوگئی۔ 6 سال بعد اس نے ایک فزیشن کی حیثیت میں گریجوایشن کی۔ تاہم، اس نے کبھی بھی ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس نہ کی؛ 1872ء میں وہ ہارورڈ میں فزیالوجی کا انسٹرکٹر بنا۔ وہ 32 سال تک وہیں رہا۔

اگرچہ ولیم جیمز نے شادی کی، ایک خاندان کو پالا اور بہت سی کتب تصنیف کیں لیکن وہ خبطی قسم کا آدمی تھا جو زندگی بھر ڈپریشن اور حد درجہ جذباتیت کا شکار رہا۔ اس کا بھائی ہنری زیادہ تیوراتی (Neurotic) تھا۔

یہ دعویٰ کسی بھی طرح غیر معمولی نہیں کہ سپینوزا کے بعد ولیم تمام فلسفیوں میں سب سے زیادہ چاہا گیا شخص تھا۔ حالانکہ وہ خود کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عادی تھا۔ یہ ایک بدقسمتی تھی کیونکہ اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی جیسے لوگ کچھ معقولیت کے ساتھ خود کو نتائجیت پسندی کے پیروکار بیان کرنے کے قابل تھے لیکن وہ ایسے نہیں تھے۔ یہ ولیم ہی تھا جس نے ایچ جی ویلز کے نام ایک خط میں "کامیابی کی عظیم کتیا دیوی" کا جملہ استعمال کیا۔ لیکن وہ خود بھی اس دیوی کے سحر سے مکمل طور پر آزاد نہ تھا۔ تاہم، اس کی نیک فطرت لامحدود تھی اور اس کی ہر تحریر پڑھنے کی قابل ہے۔

ایک ماہر نفسیات کی حیثیت میں جیمز کی کامیابی کثیر الجہتی ہے۔ "Principles" میں وہ اپنی فکری بنیادیں قائم کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شعور کو مشاہدۂ باطن کے ذریعہ جانا جا سکتا ہے۔ اس نے "شعوری دھارے" (Stream of Consciousness) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے میں فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں نے بھی حصہ ڈالا۔ دونوں نے ملاقات کی اور ایک دوسرے کے

معترف ہوئے لیکن ان کے کام آزادانہ تھے۔

جیمز کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہنے کو موجود ہوتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے بیشتر اہم خیالات کے پس پردہ موجود ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی نتائجیت پسندی پر ہی بات کریں گے جو اس نے 1898ء میں پوری طرح تشکیل دی، جب اس کی عمر 56 سال تھی۔

آئن سٹائن اپنی "نظریہ اضافت" کی اشاعت سے پہلے

جیمز کی پیدائش کے زمانے میں امریکی فلسفہ امریکی لوگوں کے عملی تجربے سے بالکل لاتعلق ہو گیا تھا۔ جب جیمز نے 1884ء میں اپنے باپ کی "ادبی باقیات" ایڈٹ کی تو وہ باطنیت کو عملیت کے ساتھ ملائے جا سکنے کے انداز سے بلاشبہ متاثر ہوا۔ خود ہنری سینئر بھی اکیڈمک امریکی فلسفے کا مخالف تھا۔ ولیم کو محسوس ہونے لگا کہ اس کے معاصرین کی عینیت پسندی بنجر اور بے کار تھی۔ شوپنہاور کی طرح وہ بھی (بطور فلسفی) تجربے میں ارادے کی اہمیت پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ لوگ جب یہ سوچتے ہیں کہ وہ سوچ رہے ہیں تو وہ محض اپنے "تعصبات کی ترتیب نو" کر رہے ہوتے ہیں۔ یوں اس نے ایک قابل استعمال اور مفید سچائی کی تعریف کرنا چاہی۔

نتائجیت پسندی کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے: "سچائی کی حتمی کسوٹی اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا طرز عمل ہے۔" بالفاظ دیگر انسانی تجربے سے لاتعلق کوئی سچائی موجود نہیں۔ ہر چیز کو اس کے پیدا کردہ نتائج کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمیں خود سے پوچھنا چاہیے کہ: "میرا یہ یا وہ عقیدہ یا تصور حقیقی دنیا میں کس طرح کام کرتا ہے؟"

جیمز نے اپنی نتائجیت پسندی ایک ایسے شخص سے اخذ کی جو کوئی عظیم ذہن نہیں تھا: یعنی امریکی چارلس سینڈرز (1839ء تا 1914ء) سے جس کی سوچ بیسویں صدی کے فکری دھاروں کی نقیب ہے۔ سینڈرز ایک مشکل آدمی تھا لیکن وہ جیمز سے اس قدر پریشان ہوا کہ اپنی Pragmatism کو

جیمز کی Pragmatism سے تمیز کرنے کے لیے Pragmaticism کا نام دیا۔ اس نے بالکل سچ کہا کہ جیمز نے اس کا نظریہ معانی...... ''کسی چیز کے بارے میں ہمارا تصور اس کے باعمل اثرات کے بارے میں ہمارا تصور ہے۔'' لے کر اسے نظریہ سچائی کی صورت دے دی۔ تاہم، اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ خود بہت مجرد جبکہ جیمز کافی ٹھوس اور جاندار تھا۔

سینڈرز کافی عرصہ تک واضح انداز میں کچھ نہ لکھ سکا۔ چنانچہ جیمز کو یہ الزام نہیں دینا چاہیے کہ اس نے سینڈرز کے خیالات کو مستعار لے لیا تھا۔ وٹگنسٹین یا نطشے کی طرح اس نے بھی فلسفے کو انسانی زندگی کے ساتھ جوڑنا چاہا۔ دوسری طرف نتائجیت پسندی پر یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ دانستہ طور پر سچائی کو محدود کرتی ہے۔ تاہم، جیمز اس کے جواب میں یہ دلیل دے سکتا تھا کہ اس نے سچائی کو محدود کرنے کے ذریعہ بہت سے غیر فلسفیانہ لوگوں کو رجائیت اور زیادہ بہتر زندگیاں گزارنے کی قابلیت دی۔

جیمز نے اس بات سے انکار کیا کہ مطلق سچائی قابل معلوم ہے۔ تاہم، وہ تشکیکیت پسندی کے بھی خلاف ہے کیونکہ یہ تردید سے عبارت ہے۔ وہ جدید لاوجودیوں (Nihilists) اور خود ساختہ ''مابعد جدیدیت پسندوں'' کے خلاف بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایسے بربری ہیں جن کی سب سے بڑی خواہش انسانی امید کا خاتمہ کرنا اور یوں اپنی مایوسی میں غرق ہو جانا ہے۔

چنانچہ اس نے اصرار کیا کہ مطلق سچائی صرف اور صرف موضوعی حوالوں سے ہی قابل معلوم ہے، لہٰذا ''ہماری غیر فکری فطرت ہمارے ایقان کو متاثر کرتی ہے۔'' اس لیے ہمیں ''عالم شہود سے پرے'' جانا چاہیے اور ہم جاتے بھی ہیں۔

اگر ہم نتائجیت پسندی سے ایک اخلاقی قسم کی رہنمائی نہ لے سکیں تو ہم یہ اندازہ کیسے کریں گے کہ اس نظام میں کیا ''درست'' ہے؟ اور قطعی انداز میں بات کی جائے تو ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ صرف اور صرف موضوعیت سے عبارت ہے۔ جیمز نے جواب دیا: ''لیکن تجربہ محض ایک معروض نہیں: یہ مسائل حل کرنے کے ٹھوس تجربات کے درمیان تعلق کا مجموعہ ہے' اور یہ بھی نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔'' اسے ہی وہ ایک تکثیریت پسند کائنات کا نام دیتا اور ساتھ ہی زور دیتا ہے کہ ہمیں کھلے ذہنوں کے ساتھ مسلسل یہ جاننے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ ایک اخلاقیاتی لحاظ سے کیا کارآمد ہے۔

82

اضافیت

"Relativity"

البرٹ آئن سٹائن

1916ء

اگر ہم آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کو سمجھنے کا محض دکھاوا کر سکتے ہیں تو ہمارے پاس کم از کم یہ بہانہ ہے: اسے سمجھنا اس قدر مشکل ہے کہ عام طبیعات دانوں کے ہاں اس کی مدافعت ختم ہونے میں کئی سال لگے۔ ''اضافیت'' اس کتاب کا عنوان ہے جو خود آئن سٹائن نے اپنی دونوں تھیوریز عام لوگوں پر واضح کرنے کے لیے لکھی۔ خصوصی نظریہ اضافیت (1905ء) اور پھر عمومی

نظریہ اضافیت۔ اس کتاب کے 16 ایڈیشن شائع ہوئے اور اب بھی اس موضوع پر اسے بلا مقابلہ بہترین تحریر مانا جاتا ہے لیکن بلاشبہ یہ کافی ٹیکنیکل ہے: اسے ہم "سادہ" نہیں کہہ سکتے جیسا کہ آئن سٹائن نے کہا تھا۔

طبیعیات کے کلاسیکی قوانین 1687ء میں نیوٹن نے اپنی کتاب "Principles" میں پیش کیے تھے۔ ان قوانین میں فرض کیا گیا تھا کہ اگر بیرونی عوامل اثر انداز نہ ہوں تو کوئی چیز سیدھی لائن میں متواتر رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہے گی۔ تیز سپیس، ٹائم اور حجم کو مطلق خصوصیات تصور کیا گیا۔ بہت دور کے فاصلے پر رکھی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی اشیاء بھی ایک دوسری پر قوت کشش ثقل ڈالتی ہیں۔ ان کی باہمی قوت کو ناپنے کی مساوات کے لیے ان کے حجم (یا کمیت) کو کشش ثقل کے مستقلہ (Constant) سے ضرب دینے کی ضرورت ہے۔ پھر اس مستقلہ G کو فاصلے کے مربع پر تقسیم کرنا پڑتا ہے۔

کافی عرصہ تک نیوٹن کے قوانین کو چیلنج کرنے کی کوئی وجہ نظر آئی۔ آخر کار تھرموڈائنامکس کے حوالے سے رُدلف کلاسیس (1822ء تا 1888ء) نے کارلوٹ اور دیگر کے کام کی پیروی کرتے ہوئے entropy کی اصطلاح ایجاد کی اور تھرموڈائنامکس کے دو قوانین بنائے۔ دوسرے قانون کے مطابق حقیقی دنیا میں بدنظمی (entropy) میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر کیتلیاں خود بخود نہیں کھولنے لگتیں۔

ایک مختلف سطح پر، مقناطیسیت اور بجلی کے میدان میں فیراڈے، میکس ویل، ہرٹز اور دیگر کی نئی دریافتوں نے دیگر بنیادی نوعیت کی مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں۔

ان نئی مشکلات کے پیش نظر وکٹورین لوگوں نے ایک چیز کے وجود کا تصور قائم کیا جسے انہوں نے ایتھر (اثیر) کا نام دیا۔ ان کے خیال میں ایتھر ایک قسم کا مصنوعی وسیلہ تھا جس میں روشنی کی لہریں، مقناطیسی اور دیگر لہریں اپنے کام انجام دے سکتی تھیں۔ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ جب برٹرینڈ رسل اور الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ جیسے ریاضی دان اور فلسفی اپنے ابتدائی کام کر رہے تھے (تقریباً 1900ء میں) تو یہ مشکلات بدستور قائم تھیں...... کہ ان حضرات کے پاس "ایتھر" کا تصور کرنے کے سوا اور کوئی راہ تھی۔ 1930ء کی دہائی میں بھی یہ اصطلاح استعمال ہو رہی تھی، حالانکہ

اس وقت تک اس کا کوئی مفہوم نہیں رہ گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف فلسفی ولیم کلفورڈ ہی نے نظریہ اضافیت پر غور وفکر کیا تھا۔

بیسویں صدی کا پہلا عشرہ گزرنے کے بعد چیزیں زیادہ متنازعہ اور گڈمڈ ہوتی گئیں اور "امریکی سوسائٹی برائے سائنسی ترقی" کے صدر نے آئن سٹائن کی سپیشل تھیوری اور فرانسیسی ریاضی دان ہنری Poincare و دیگر کے کام سے آگاہی رکھتے ہوئے سائنس دانوں کے احساسات کو بڑے جامع الفاظ میں پیش کیا: "مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ اب دنیا میں کوئی ایسا آدمی موجود ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ وقت کے بارے میں تصور کر سکتا ہے جو ولاسٹی کا ایک فنکشن ہے یا اسے یہ یقین ہو کہ اس کا "آج" ایک اور آدمی کا مستقبل اور ایک تیسرے آدمی کا ماضی بھی ہے۔"

1945ء تک سائنس دان اٹامک گھڑیوں کی مدد سے ایک عمارت کی بالائی چھت اور نچلی منزل پر رکھی گھڑیوں کے درمیان خفیف سا فرق ناپنے کے قابل تھے۔ 1905ء میں آئن سٹائن نے بھی "متحرک اجسام کی برقی حرکیات" میں لکھا تھا کہ خط استواء پر رکھا ہوا کلاک قطبین پر رکھے ہوئے کلاک کے مقابلہ میں تھوڑا سا سست ہوگا۔ اب یہ معاملہ قابل پیمائش ہے کہ آپ کے گھر کی بالائی منزل پر رکھی گھڑیاں نچلی منزل میں موجود گھڑیوں کی نسبت تیز چلتی ہیں۔

آئن سٹائن Ulm، جرمنی کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا (1879ء)۔ اس کا باپ ایک کامیاب کاروباری آدمی تھا؛ اور کسی دور میں ماں پیانو بجایا کرتی تھی۔ اس نے 1894ء میں سوئس قومیت اختیار کی اور 1940ء میں امریکی بن گیا۔ نازیوں نے اس کی ہاتھ لگنے والی کتابوں کو برلن میں نذر آتش کر دیا (1933ء)۔

آئن سٹائن نے عظیم دریافتیں عہد جوانی میں کیں جب وہ اپنے ساتھی سائنس دانوں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا۔ 1905ء میں جب "خصوصی نظریہ" (سپیشل تھیوری) پر مبنی مضمون شائع ہوا تو اسے Berne، سوئٹزرلینڈ میں پیٹنٹس کے ایگزامینر کی نوکری ملی۔ وہ طبیعیات دان کے طور پر ملازمت ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ محض تیسرے درجے کا ایک سوئس سول سرونٹ تھا۔ لیکن وہ 16 سال کی عمر میں ہی جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ چونکہ وہ میونخ جمنازیم میں پڑھنے کے دوران ایک زیادہ ذہین طالب علم ثابت نہ ہوا تھا اور چونکہ وہ بہت آہستہ آہستہ بولتا تھا،

اس لیے اس کے جینیئس کو عام حوالوں سے جانچنا بہت مشکل ہے۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی دلچسپی کلاسیکل میوزک تھا' اور 1930ء کی دہائی میں اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر بیلجیئم کے بادشاہ اور ملکہ کے سامنے فن کا مظاہرہ کیا۔

آئن سٹائن سے تحریک یافتہ سائنسی انقلاب بھی کاپرنیکس، کیپلر، گلیلیو اور نیوٹن کے لائے ہوئے انقلابات جیسا ہی قطعی تھا۔

چونکہ آئن سٹائن کے نظریے کا نام ''اضافیت'' (Relativity) تھا لہٰذا اس نے مؤرخین اور مصنفین کو ہر ممکن پہلو سے متاثر کیا۔ بے شمار کتب اس امر کی غماز ہیں۔

یہاں میں آئن سٹائن کی سپیشل اور جنرل تھیوری کا مکمل تکنیکی جائزہ پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ ہم صرف اضافیت کے پیدا کردہ فرق کی بابت ہی مختصراً بات کریں گے۔ کمیت اور توانائی کے بارے میں آئن سٹائن کی مساوات ($e=mc^2$) کی اہمیت بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ ابھی تک پوری طرح یہ معلوم نہیں کہ ہم پر اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ نہ ہی شاید یہ نکتہ پیش کرنا ضروری ہے کہ تمام اشیا روشنی کو خم دار بناتی ہیں۔

ارسطو اور اس کے بعد کے کئی سائنسدانوں کے خیال میں کرہ ارض ایک خصوصی مقام اور کائنات کا مرکز تھا۔ اس کے برعکس آئن سٹائن نے دلیل دی کہ کائنات میں کوئی بھی مقام خصوصی نہیں۔ ہر مشاہدہ کرنے والے کے لیے قوانین طبعیات ایک ہی ہوں گے (چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہو)۔ حرکت ہمیشہ اضافیاتی (Relative) ہوتی ہے: ایک مخصوص رفتار کسی پیمائش کرنے والے کے لیے اس کے مقام کے لحاظ سے ہی بامعنی ہوگی۔ آئن سٹائن نے دریافت کیا کہ نیوٹن کے قوانین مخصوص رفتاروں کے لیے ہی کارآمد تھے، لیکن جب رفتار بہت زیادہ ہو (مثلاً روشنی کی رفتار) تو پیمانے سست جاتے اور گھڑیاں سست رفتار پر چلنے لگتی ہیں۔ آئن سٹائن نے نیوٹن کے پرانے مطلق ڈھانچے کو ایک اور حقیقی مستقلے یعنی روشنی کی رفتار کے ساتھ تبدیل کر دیا۔

1905ء میں آئن سٹائن بس یہیں تک پہنچا تھا اور اسے مسائل درپیش تھے۔ تب تک قوت کشش ثقل کو فوری طور پر عمل کرنے والی قوت خیال کیا جاتا تھا۔ آئن سٹائن کے پیش کردہ حل بتاتے ہیں کہ نظریۂ اضافیت اصل میں نظریۂ کشش ثقل کیسے ہے؟ وہ فوری طور پر کیسے عمل کر سکتی ہے؟ یوں کہہ لیں کہ آئن سٹائن نے سپیس۔ ٹائم کو سپیس اور ٹائم کے دو الگ الگ نظریات بنا دیا۔

بہت سے لوگ سٹیفن ہاکنگ کو آئن سٹائن کا جانشین سمجھتے ہیں لیکن وہ وضاحتِ بیان کے معاملے میں آئن سٹائن والی خصوصیات کا حامل نہیں۔ ''وقت کی مختصر تاریخ'' فی الحال زیادہ بامعنی نہیں، جبکہ ''اضافیت'' نے واضح اور قطعی اثرات چھوڑے۔

83

ذہن اور معاشرہ

"The Mind and Society"

وِلفرڈو پیریٹو

1916ء

سوشیالوجی کا آرٹ یا سائنس، یا آرٹ/سائنس آگسٹ کومتے سے شروع ہوا جو اس کو ضرورت سے زیادہ جاندار علم خیال کرتا تھا۔ کومتے کے اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی فرانکو اٹالین ولفرڈو پیریٹو کا اثر زیادہ فیصلہ کن اور زیادہ عمیق تھا۔ دراصل پیریٹو بیسویں صدی میں میکیاولی کا وارث تھا اور میکیاولی کی طرح اس کی شہرت بھی داغ دار ہوئی۔ یہاں یہ بتانا بھی

ناگزیر ہے کہ وہ ایک اور زبردست اطالوی مفکر اور سیاست دان گیتانو موسکا (1858ء تا 1941ء) کا بھی رہین منت تھا۔ اگرچہ سوشیالوجسٹ حضرات پیریٹو کے قطعی فاشسٹ روابط کو زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن وہ اسے نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں۔ وہ جدید سوشیالوجی کے تین بانی ارکان میں سے ایک ہے۔ دیگر دو جرمن میکس ویبر اور فرانسیسی ایمائل ڈرخائم تھے۔ پیریٹو سب سے زیادہ دوٹوک ہے۔ اس کی تصانیف میں جذباتیت کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ نہ ہی وہ محض ایک سوشیالوجسٹ کی حیثیت میں اہم اور متاثر کن تھا۔

پیریٹو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا جینوآ سے تعلق رکھنے والا باپ جلاوطن ہوا تھا اور ماں فرانسیسی تھی۔ خاندان جب وطن واپس آیا تو پیریٹو کی عمر دس برس تھی اور اس نے اپنی ابتدائی تعلیم تورین میں حاصل کی۔ وہ ریلویز میں بطور انجینئر بھرتی ہوا اور پھر ایک لوہے کی کان میں مینیجر کے فرائض انجام دیے۔ 1893ء میں وہ لوسانے یونیورسٹی میں سیاسی معیشت کا پروفیسر تعینات ہوا۔ 1898ء تک وہ فرانس اور اٹلی کا نہایت بارسوخ ماہر معیشت بن چکا تھا (اس نے دونوں زبانوں میں روانی سے لکھا) اس کا نظریہ تھا کہ کوئی معیشت تبھی اپنی اعلیٰ کارکردگی کی آخری حد کو پہنچتی ہے جب ایک فرد کے رتبے کو کسی دوسرے کے رتبے کو متاثر کیے بغیر بہتر بنانا ناممکن ہوتا ہے اور ایسا صرف تبھی واقع ہوتا ہے جب 80 فیصد لوگ بُرے حالات کا شکار ہوں۔ یہ نظریہ جتنا متاثر کن تھا اتنا ہی غیر مقبول بھی۔ اس کی بُری شہرت کی وجہ کافی حد تک نقادوں کا اسے بطور مفکر تسلیم نہ کرنا تھی۔ اس نے کچھ تجویز کرنے کی بجائے محض صورت حال ہی بیان کی۔ مارکس کے خلاف اس کی ابتدائی پیشگوئی (کہ کسی بھی مارکسسٹ سسٹم میں پرانے مکار اشراف کی جگہ نئے مکار اشراف لے لیں گے) 1917ء کے بعد کے سالوں میں درست ثابت ہوئی۔

پیریٹو نے معاشرے میں فطرت اور جنسیت کی فعالیت کے متعلق سوچ میں خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ اس نے "La Mythe Verluiste et la litterature immorale" (1911ء) میں "ناشائستہ" ادب کے متعلق حکومتوں اور ان کے مشیروں کی منافقت کے تباہ کن اثرات کا تجزیہ کیا۔ یہ کتاب کوئی اثرات مرتب نہ کر سکی بلکہ ایک لحاظ سے بالکل نظر انداز کر دی گئی۔ 1888ء کے بعد پیریٹو گوشہ گیر ہو گیا۔ اسے ورثے میں اتنی دولت ملی تھی کہ بآسانی سوئٹزرلینڈ میں Celigny

rekhta

کے مقام پر رہنے لگا اور تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گیا۔ 1922ء میں مسولینی کی مدح سرائی کے ساتھ وہ دوبارہ منظر عام پر آیا۔ لیکن اس نے ایک مضمون میں مسولینی کے ''کارناموں'' کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کی آزادی پر بھی اصرار کیا۔ اسے سینیٹر بنا دیا گیا۔

یہ بلاشبہ اپنے ملک میں طویل عرصہ تک نظر انداز کیے گئے آدمی کا خود پسندانہ رجحان تھا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پیریٹو نے اپنے ماضی سے بالکل لاتعلقی اختیار کر لی جب وہ پناہ گزینوں کا مددگار اور سرگرم لبرل ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس سب کی بناء پر اسے ''فاشزم کا مارکس'' قرار دیا جانا ایک زیادہ سنگین اور گمراہ کن غلطی تھی۔ اگست 1923ء میں اپنی وفات سے قبل ہی پیریٹو اپنے فعل کی دانائی پر شک کرنے لگا تھا۔ بہر حال اس وقت تک مسولینی بھی باقاعدہ ڈکٹیٹر نہیں بنا تھا اور اسے جارج برنارڈ شا اور ونسٹن چرچل وغیرہ کے علاوہ دیگر کی حمایت بھی حاصل تھی۔

پیریٹو نے 1889ء میں ایلیساندرا باکونن سے شادی کی تھی۔ ایک روز جب وہ پیرس سے واپس آیا تو بیوی بہت سی دولت لے کر خانساماں کے ساتھ رفو چکر ہو چکی تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہ شرابوں کا رسیا اور تمام جذباتی اظہار سے تہی ہو گیا۔ بلاشبہ وہ بہت آگے تک گیا، لیکن اس کا دماغ بدستور غیر معمولی انداز میں کام کرتا رہا۔ اس نے لکھا: ''میرے جذبات نے مجھے آزادی کی حمایت کرنے پر ابھارا، چنانچہ میں نے بڑی تکلیف سہہ کر ان جذبات کی مدافعت کی۔''

پیریٹو نے سوئٹزرلینڈ کے کیلنی میں ایک خوبصورت گھر تعمیر کیا۔ رومن کیتھولک قوانین نے اسے ایلیساندرا کو طلاق دینے سے باز رکھا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ ایک فرانسیسی لڑکی Jean Regis کو پانے میں کامیاب ہو گیا جو اس کے ساتھ رہتی اور دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ موت سے چند ہی ماہ قبل اس نے شادی کر لی۔ صرف وہی لڑکی پیریٹو کے ''انسانی'' پہلو سے واقف تھی۔

بیسویں صدی میں انسانی رویے کے بارے میں ایک نفسیاتی تجزیے کی رو سے پیریٹو اپنی "Mind and Society" میں بڑی درشتی کے ساتھ دکھاتا ہے کہ معاشرے، اپنے لوگوں کی طرح، منطقی انداز میں عمل نہیں کرتے۔ وہ فرائیڈین اصطلاحات استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس نے فرائیڈ کا بغور مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ فرائیڈ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

فرائیڈ کا اثر ہونے یا نہ ہونے کے سوال میں پڑے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ذہن اور معاشرہ'' فرائیڈین رنگ میں رنگی ہوئی سوشیالوجی تھی۔ وہ انسانوں کے غیر منطقی افعال کا مطالعہ کرتا اور کہتا ہے کہ وہ سماجی نظام کی بنیاد مہیا کرتے ہیں۔

اس کے بعد پیریٹو نے ''تلچھٹوں'' (Residues) کا تصور تعارف کروایا۔ یہ انسانوں کی مخصوص ''جبلتوں کی پیداوار'' ہیں (یعنی جذبات)۔ چینی پسند کرنا ایک تلچھٹ نہیں ہو گا لیکن ''چینی پر یقین'' ایک تلچھٹ ہو گا۔ جذبات مستحکم ہیں لیکن تلچھٹیں نہیں: وہ تغیر پذیر ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ ایک کو تعصبات یا خبط کہہ سکتے ہیں۔

یہ ایک لطیف اور عمیق تجزیہ تھا، اور یہ بدستور متعدد سماجی لغویات کی وضاحت کا ایک زبردست انداز ہے۔ مثلاً کچھ کو یقین ہے کہ شیکسپیئر کی تصانیف اس کی اپنی نہیں تھیں۔ یہ خبط متعدد جبلتوں یا Paretian جذبات کے ایک امتزاج کی پیداوار ہے: خلل دماغی شک، ادعا پسندی اور خود پسندی وغیرہ۔ ''شیطانی بچوں'' یا ''ایلینز کے حملے'' (جن کی کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں) پیریٹو کے بیان کردہ طریقہ کار کی مدد سے بہترین انداز میں واضح کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم تمام بنیادی جبلتوں یا جذبات کی تفہیم رکھنے کا تصنع نہیں کر سکتے۔

پیریٹو کو ایک ''ثبوتیت پسند'' (Positivist) اور سائنسیت (Scientism) کا پیروکار کہا گیا ہے۔ یہ نہایت گمراہ کن اور ناقابل فہم ہے۔ اس کا کام بالخصوص ایسے لوگوں کو سرد مہر لگتا ہے جو واقعی دنیا کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ ''آپ پرالی کے تنکوں سے ریشم کا پرس نہیں بنا سکتے'' اور میکیاویلی کی طرح پیریٹو بھی تنکوں کی فطرت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ''ذہن اور معاشرہ'' کے آغاز میں ہی پیریٹو سوشیالوجی کی تعریف کرنا ناممکن بناتا ہے، جس سے اس کا ثبوتیت پسند نہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو ناراض کر کے خوش ہوتا ہے، شاید اس لیے کہ اس کی بیوی خانساماں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لیکن اس کی تحریر ذاتی نفرت اور غصے سے مبرا ہے۔

84

نفسیاتی اقسام

"Psychological Types"

کارل گُستاوینگ

1921ء

نفسیات اور انسانی ذہن کی کارکردگی کے انداز کے متعلق ہماری تفہیم میں سوئس کارل گستاوینگ (1875ء تا 1961ء) کا درجہ صرف سگمنڈ فرائیڈ کے بعد آتا ہے۔ اس نے فرائیڈ سے ہی اپنے زیادہ تر بنیادی تصورات مستعار لیے۔ البتہ یہ دونوں حضرات کوالیفائیڈ ماہرین نفسیات نہیں تھے اور کچھ ماہرین نفسیات اس بات پر بہت خار کھاتے ہیں۔

ینگ کا نکتۂ نظر بہ حیثیت مجموعی بہت متاثر کن ثابت ہوا اور یہ کافی حد تک ''نفسیاتی اقسام'' میں مجسم ہے۔ لیکن اگر فرائیڈ متنازعہ ہے تو ینگ اس سے دوگنا متنازعہ ہے۔ آج جہاں تک ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے، فرائیڈ کے برعکس ینگ نے ایک ایسا کام کیا جو اور کسی فزیشن نے نہیں کیا: وہ اپنی مریض خواتین کے ساتھ سویا اور ایسا کئی بار ہوا۔ تاہم، اس نے اصطلاح ''کمپلیکس'' (مثلاً ایڈی پس کمپلیکس) وضع کی اور الفاظ پر مشتمل ٹیسٹ کے ذریعہ مریض کی داخلی پریشانیوں کا کھوج لگانے کا طریقہ اپنایا۔

ینگ کیسٹن Thurgau کے علاقہ Keswil میں ایک پروٹسٹنٹ پاستور کے ہاں پیدا ہوا۔ 1905ء میں وہ زیورچ یونیورسٹی میں نفسیاتی معالجے کے موضوع پر لیکچر دے رہا تھا۔ اس سے قبل وہ دماغی امراض کے ہسپتال میں عملی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ 1907ء اور 1913ء کے درمیانی برسوں میں اس نے فرائیڈ کی معاونت کی جو اس کا بڑا مداح تھا۔ لیکن 1913ء میں وہ فرائیڈ سے الگ ہو گیا۔ وہ ایک معاون خدمت گار بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ فرائیڈ جنسیت پر ضرورت سے زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ بعدازاں نازی جرمنی سے شائع ہونے والی تحریروں میں اس نے فرائیڈ کو اس کے یہودی پن کی بنیاد پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ ینگ کی سامیت مخالفت اب کافی حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ البتہ اس کے حامی کہتے ہیں کہ اسے غلط سمجھا گیا ہے۔ بہر حال اس حوالے سے دو نکتہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں کہ وہ سامیوں کا مخالف تھا (اس نے ایک نازی جریدے میں لکھا کہ یہودی عورتوں جیسے ہیں) یا یہ کہ وہ محض ایک موقع پرست تھا۔ انجام کار فرائیڈ نے جنسیت کے بارے میں اپنے نظریہ میں ترمیم کی اور اسے بہت حد تک ینگ کے نظریے جیسا بنا دیا۔ لیکن یہ دونوں حضرات مذہب کے متعلق اپنے رویے میں مختلف تھے۔ فلسفی لڈوگ فائرباخ کی طرح فرائیڈ مذہب کو ایک سراب جبکہ ینگ ایک حقیقت سمجھتا تھا۔

ینگ کو فرائیڈ کی نسبت اصل پاگل پن (Psychosis) کا زیادہ تجربہ تھا اور وہ اس میں زیادہ دلچسپی بھی رکھتا تھا۔ اس کی پہلی قابل ذکر کتاب (1908ء) شیزوفرینیا کے بارے میں تھی۔ تاہم، وہ اس بیماری کے علاج کے حوالے سے کوئی کام نہ کر سکا۔ آج یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقیقی پاگل پن صرف تجزیہ کار کے ساتھ باتیں کر کے دور نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم، ینگ نے شیزوفرینیائی پاگل پن کے ماخذوں کے متعلق اپنے خیالات بعدازاں ''تجزیاتی نفسیات'' (فرائیڈ کی تحلیلی نفسیات سے ممیز کرنے کے لیے) کی صورت میں پیش کیے۔ یوں انسانی سائیکی کے ایک نظریہ کی حیثیت میں یہ متاثر کن تھا۔ پاگل پن کے بارے میں ینگ کا نظریہ تھا کہ مریض کے واہمے درحقیقت وضاحتی آلات ہیں جن میں مریض کی صورت حال کو بامعنی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر آگے بڑھتے ہوئے ینگ نے اجتماعی لاشعور کا نظریہ پیش کیا۔ ذہن کی ایک زیادہ گہری تہہ جو محض شخصی/ذاتی تہہ کے نیچے ہوتی ہے۔

ہم ینگ اور فرائیڈ کے درمیان تضادات کی ایک بدنام ترین مثال پر بات کریں گے: بلاشبہ فرائیڈ نے مردوں میں نام نہاد ایڈی پس کمپلیکس کو ''ایجاد'' اور واضح کیا تھا...... باپ کو قتل کر کے ماں کے ساتھ جنسی فعل کرنے کی خواہش کے طور پر۔ اس کے برعکس ینگ نے زور دیا کہ مرد اور عورت دونوں میں ہی ماں پر حق ملکیت جتانے کی زبردست ضرورت موجود ہوتی ہے، کیونکہ وہ معلوم ہستیوں میں سب سے زیادہ خیال رکھنے والی اور راحت بخش ہے۔

ینگ کی بہترین اور اہم ترین کتاب "Psychological Types" (نفسیاتی اقسام) ہے جو 1921ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی بنیاد بننے والا کام 1913ء میں فرائیڈ سے علیحدگی کے فوراً بعد شروع ہوا۔ اس میں بہت کم کچھ اور بے تکا ہے۔ لیکن فرائیڈ کی طرح ینگ بھی نہایت قائل کر لینے والے انداز میں ایک عہد کے خیالات کو ایک ہی جگہ پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اس کتاب میں ینگ نے "extroverts" اور "introverts" کے درمیان امتیاز پیش کیا یعنی بروں بیں اور دروں بیں۔ یہ بلاشبہ نفسیات میں اس کی سب سے بڑی حصہ داری ہے۔

بروں بیں وہ شخص ہے جس کی زیادہ تر دلچسپی بیرونی دنیا میں ہوتی ہے، جبکہ دروں بیں اپنے ذہن کی دنیا پر ہی توجہ دیتا ہے۔ ینگ نے اس کی بنیاد پر طرز عمل کی چار اقسام بیان کیں: سوچنا، محسوس کرنا، حساسیت اور وجدان یا بصیرت...... متضادات کے دو جوڑے۔ فطری طور پر انسان توازن حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن وہ یک رُخے بھی تھے: یہی ان کے نیوروسس کی وجہ ہے۔ ینگ نے اپنے مریضوں کو "individuation" نامی عمل کے ذریعہ توازن حاصل کرنے کی کوشش کرنے پر زور دیا: اس عمل کے دوران انہیں نہ صرف اپنے خوابوں بلکہ جاگتی حالت کے

تخیلات سے بھی کام لینا تھا۔ مریضوں کو (اور ینگ ساری نوع انسانی کو اپنا مریض سمجھنے لگا تھا) اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال، اور بالخصوص اپنے داخلی تجربات لکھنے یا پینٹ کرنے پر زور دیا گیا۔ اس نے جانا کہ لوگ مختلف ہوتے ہوئے بھی حیرت انگیز حد تک ایک جیسے تجربات پیش کرنے پر مائل تھے۔

ینگ نے مذہبی مواد پر بھی کافی غور و خوض کیا' البتہ محققانہ انداز میں نہیں: غناسطیت، الکیمیا، اور آئی چنگ جیسی مشرقی کتب۔

فرائیڈ زیادہ مشینی انداز کی وضاحتیں دینے پر مائل تھا جبکہ ینگ ایک زیادہ مذہبی انداز رکھتا تھا جس میں انسان کائنات میں ایک مقام کا حامل ہے۔ لیکن وہ فرائیڈ کی نسبت کم منظم اور کم مؤثر مصنف تھا۔ نیز اس کے سسٹم (نظام فکر) کو فرائیڈ کے سسٹم کی ہی ایک رومانوی تفسیر خیال کیا گیا ہے۔

ینگ سے متاثر ہونے والی شخصیات مختلف قسم کی ہیں: ناول و ڈرامہ نگار جے بی پریسٹلے، نقاد اور شاعر ہربرٹ ریڈ، ناول نگار پی ایچ نیوبائی اور طبعیات دان وولف گینگ پاؤلی۔ تاہم، بیسویں صدی کے اواخر میں ایک ایماندار اور مکمل صحیح الدماغ شخص کے طور پر اس کی شہرت تیزی سے زوال پذیر ہونے لگی۔

البتہ اس کی تعریف نہ کر سکنے والے لوگوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس نے ''الحاد پرست شہوتیت پسندوں کے برعکس، کہا تھا کہ مذہبی احساسات انسانوں میں فطری طور پر موجود ہیں اور انہیں محض توہمات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس حوالے سے وہ جرمن لوتھری مفکر روڈلف اوٹو (1869ء تا 1937ء) کا رہین منت تھا۔ ''نوع انسانی کی مذہبی لیگ'' قائم کرنے اور ہندومت و زین بدھ مت میں قابل قدر کام انجام دینے والا اوٹو اصرار کرتا ہے کہ مافوق الفطرت تجربہ ''تخلیقیت کا احساس'' (feeling of createdness) تھا جس نے جلال اور تحیر دونوں کو تحریک دلائی: خالق کو نہ صرف ''بالکل اجنبی'' بلکہ پرمسرت رفعت میں سرایت پذیر بھی محسوس کیا گیا۔ مارٹن بوبر کے ساتھ مشابہتیں واضح ہیں جس کی زیادہ معقول توضیحات نے انجام کار مزید قارئین کو متوجہ کیا۔

85

میں اور تم

"I and Thou"

مارٹن بیوبر

1923ء

مارٹن بیوبر (Buber) نے ہیسیڈک یہودی کہانیوں کو نئے سرے سے بیان کر کے فوری اثرات مرتب کیے۔ یہ کہانیاں اس کی ساری زندگی کے دوران شائع ہوتی رہیں اور پھر 1962ء میں ان کا مجموعہ "Tales of the Hasidism" (1962ء) شائع ہوا۔ Hasidism (ہاسدیت) اٹھارہویں صدی کی یورپی یہودی تحریک تھی (بیوبر کو 1904ء میں اس کا پتہ چلا) جس نے مقابلہ

اور خود بیوبر سے بھی براہ راست فیض حاصل کیا؛ حالانکہ بیوبر دیگر روایات کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے اپنے عقائد نے انجام کاران کہانیوں سے بھی کہیں زیادہ گہرا اثر ڈالا۔ یہ عقائد اس کی صوفیانہ تصنیف، اس کے شاہکار "I and Thou" میں پیش کیے گئے ہیں۔

بیوبر 1878ء میں ویانا میں پیدا ہوا۔ اپنے دادا سولومن بیوبر (جو ایک ممتاز عبرانی محقق تھا) کے پاس گالیشیا (پولینڈ) میں پرورش پائی کیونکہ والدین کا ازدواجی تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ پڑھا، ناول نگار پاؤلا ونکلر سے شادی کی (1902ء) اور ایک پرجوش صیہونیت پسند بن گیا۔ تاہم، اس کی صیہونیت ابتدا سے ہی ثقافتی تھی نہ کہ سیاسی۔ حتیٰ کہ اس نے صیہونی تحریک کی قیادت تھیوڈور ہرزل کے پاس جانے کی بھی مخالفت کی۔ صیہونیت کا جوہر یہ ہے کہ یہودی ایک گروہ یا عوام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قوم بھی ہیں۔ مگر بیوبر نے ایک ایسے فلسطین کی حمایت کی جو یہودیوں کی طرح عربوں کے لیے بھی کھلا ہو اور 1921ء کی صیہونی کانگریس کے موقع پر اس نے بہت کوشش کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا۔ اس موقع کے بعد بیوبر یہودیوں کے ایک بہت بڑے حصے میں غیر مقبول ہو گیا۔ 1965ء میں اپنی موت کے وقت تک وہ بدستور غیر مقبول رہا۔ وہ 1938ء میں یروشلم آیا، کیونکہ جرمنی میں رہ کر نازیوں کی مخالفت جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ بالخصوص بین الاقوامی سطح پر اس کا مقام مخالفین کے لیے زیادہ باعث تکلیف تھا۔

بیوبر نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کر کے بھی خود کو اپنے دوست فرانز روزنویگ سے ممتاز کیا۔ اس ترجمے اور اس کی تفسیروں نے بھی دینیات پر گہرا اثر ڈالا حالانکہ بیوبر اتنا ہی ماہر دینیات تھا جتنا کہ فلسفی یا سوشلسٹ تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک باطنی تھا' لیکن شاید ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے زندگی کے بارے میں اپنے تقریباً ناقابل بیان تصور کو عملی صورت میں بیان کرنے کی کوشش کی۔

بائبل کے ترجمہ میں مشہور اور اہم ترین چیز خروج 14:3 کے بارے میں بیوبر۔ روزنویگ کی تفسیر تھی (جہاں خدا موسیٰ سے ہم کلام ہے)۔ عموماً اس کا ترجمہ "میں جو ہوں سو میں ہوں" کیا جاتا ہے لیکن بیوبر۔ روزنویگ نے اس کا ترجمہ "میں جو ہوں سو ہی رہوں گا" کیا' جس کا مطلب ہے کہ نجات ہرگز ناگزیر نہیں بلکہ اس کے لیے انسانوں میں ایک قسم کی روحانی قابلیت ہونا ضروری ہے۔

’’میں اور تم‘‘ 1923ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں بیوبر نے ’’ہر چیز کے لیے نیا جواب‘‘ پیش کیا تھا اور زندگی کو بنیادی طور پر ایک ڈائیلاگ کی صورت میں دیکھا۔ کتاب میں ہاسیدیت کے بانی بعل شیم توو کی تعلیمات کی وضاحت کی گئی جو اٹھارہویں صدی کے ابتدائی ساٹھ برس کے دوران گزرا تھا۔ بعل شیم نے کچھ بھی نہ لکھا تھا لیکن وہ یہودی تصوف کو عوام تک لایا۔

’’میں اور تم‘‘ میں دو قسم کے ڈائیلاگ زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ ایک عام ڈائیلاگ ’’میں۔ یہ‘‘ (I- It) ہے جو ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں اور دوسرا ڈائیلاگ ’’میں۔ تم‘‘ مذہبی نوعیت کا ہے (I-Thou)۔ موخر الذکر کو مارٹن بیوبر نے tikkun کے حصول کے ذریعے یا حصول میں معاون ذریعے کے طور پر پیش کیا۔ ’’میں اور تم‘‘ نے اکثر ایک قسم کی وجودیت کی صورت اختیار کر لی جو بذاتِ خود خناسطیت کا ایک جدید اور عموماً سیکولر اظہار ہے۔

بیوبر کو اپنے خیالات کے لیے ایک ابتدائی حمایت کانٹ کے فلسفہ کے ایک اہم پہلو میں ملی جس نے اصرار کیا تھا کہ مکمل معروضیت ناممکن ہے کیونکہ ہم دنیا کو محض کیٹیگریز، مثلاً زمان و مکاں کے توسط سے ہی جان سکتے ہیں۔ کانٹ نے باطنیت یا تصوف کو غیر ضروری قرار دے کر مسترد کیا مگر بیوبر نے دوسری سمت اختیار کی۔ وہ سپنوزا کی طرح ایک Pantheist (ہمہ اوست کا قائل) بھی تھا۔ اس نے خدا کو ایک خدا اور خصوصی ہستی کے طور پر دیکھا مگر جو ہر چیز میں سرایت پذیر ہے۔ چنانچہ سب کچھ خدا میں ہی موجود تھا۔

بیوبر نے ڈائیلاگ اور نتیجتاً گہری رواداری کے جذبے کو یہودیت اور عیسائیت کے درمیان حائل خلیج پر لاگو کیا۔ یہودی ’’جانتا‘‘ ہے کہ ابھی تک مسیحا نہیں آیا۔ عیسائی بھی ’’جانتا ہے‘‘ کہ یسوع مسیح ایک مسیحا تھا۔ یہ دونوں معلومات مکمل طور پر ناقابلِ مصالحت لگتی ہیں۔ ملحدانہ نکتۂ نظر ان دونوں نظریات کو ’’سائنس سے لاعلمی‘‘ کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ لیکن سائنس تخلیق کی حقیقت بیان کرنے میں ناکام ہونے کے علاوہ باطنی داخلی زندگی کے وجود کو بھی نظر انداز کر جاتی ہے جو ہر کسی کے لیے روزمرہ زندگی کا پس منظر تشکیل دیتی ہے۔

بیوبر نے زور دیا کہ اس داخلی زندگی کی نوعیت بنیادی طور پر مذہبی ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے اس کی پیش کردہ نفسیاتی تفصیلات قائل کر لینے والی اور عمیق ہیں۔ ان مصالحانہ

بنیادوں پر اس نے کہا کہ یہودی اور عیسائی (اور یقیناً ہندو، صوفی، بودھی) کے ’’داخلی ایقان‘‘ بذاتِ خود اسرار تھے۔

کانٹ پسند بیوبر کے مطابق ہم خدا کو ایک معروضی ہستی کے طور پر ’’نہیں جان سکتے۔‘‘ لیکن ہم کسی دوسرے کے ساتھ اپنے تعلقات کو ’’جان سکتے ہیں۔‘‘ (اس کا اپنا ’’دوسرا‘‘ اس کی بیوی تھی) چنانچہ اس نے لکھا: ’’مذہب کا مذہبی جوہر اس یقین میں ملتا ہے کہ ہستی کا مفہوم اصل زندگی میں ہی قابلِ رسائی ہے۔ انسان ایک کتے یا چراگاہ کے ساتھ بھی I-Thou قسم کا تعلق بنا سکتا ہے۔‘‘

بیوبر کے خیال میں I-It تعلق لازمی (بنیادی) ہے اور لوگ اسی کے ذریعہ جیتے ہیں۔ کاروباری یا تجارتی تعلقات میں ’’جزوی‘‘ (Partial) کے علاوہ کچھ اور ہونا ممکن نہیں۔ لیکن اس قسم کے تعلقات میں ہم خود کو حقیقی اور کامل طور پر نہیں لگا سکتے اور درست طریقے سے سننے یا وصول کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ ’’سننا‘‘ اور ’’وصول کرنا‘‘ I-Thou تعلق کا لازمی جز ہیں۔ درحقیقت ہر ایک I-Thou تعلق انجام کار I-It تعلق میں تبدیل ہو جاتا ہے‘ لیکن I-Thou کی تجدید ہو سکتی ہے۔

نکتہ یہ ہے کہ I-It تعلق میں زندگی گزارنے والے لوگ ’’مکمل طور پر انسان‘‘ نہیں۔ یہاں مارکس کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس نے معاشی زندگی میں ملوث غیر انسانی بنائے جانے کے عمل کی وضاحت کی۔ لیکن بیوبر ہر قسم کی تھیوری کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں ہم ایک I-Thou تعلق میں ’’بلائے جانے‘‘ کے ذریعہ انسان بننا سیکھتے ہیں۔ ایک ایسا تعلق جس میں آپ دوسرے کے ساتھ ’’مکمل کھلے پن‘‘ سے بات کرتے ہیں۔ (اس میں جنسی قربت کے کردار کو نظر انداز کرنا مشکل ہے)۔

بیوبر نے 80 سے زائد کتب لکھیں، ایڈٹ کیں یا ترجمہ کیں، بشمول ایک ناول کے۔ ان میں سے زیادہ تر کتب ہاسیدیت کے موضوع پر تھیں۔ اس نے I-Thou انداز فکر کو تعلیم کے ساتھ ساتھ یہودی عرب مفاہمت جیسے معاملات پر بھی موثر طریقے سے لاگو کیا۔ "I and Thou" کا انگریزی میں ترجمہ 1937ء میں ہوا۔ اگرچہ سیاستدان اور تاجر (I-It کے ماہر) اسے ہرگز نہیں پڑھتے اور نہ ہی اس کے بارے میں جانتے ہیں مگر یہ نہایت متاثر کن ثابت ہوئی۔

86

دی ٹرائل

"The Trial"

فرانز کافکا

1925ء

''لیکن میں بے قصور ہوں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ کوئی شخص قصوروار ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ یقیناً یہاں ہم سب انسان ہیں، ایک جیسے انسان۔''

''یہ بجا ہے، لیکن قصوروار اکثر اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔''

فرانز کافکا کا ناول دی ٹرائل (Der Prozess تصنیف 5-1914ء) تپ دق کے باعث

اس کی موت کے فوراً بعد شائع ہوا حالانکہ اس نے ہدایت کی تھی کہ اس کی تمام تحریروں کو ''بغیر پڑھے جلا دیا جائے۔'' لیکن اس کے ناول نگار دوست میکس براڈ نے درست فیصلہ کیا کہ ان زبردست تحریروں کو کسی بھی صورت میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

آنے والی نسل نے میکس براڈ کو الزام نہیں دیا، جو بہرصورت اچھی طرح جانتا تھا کہ کافکا موضوع پر دل گرفتگی کا حامل تھا۔ شاید اس نے مایوس کن طور پر محسوس کیا ہو کہ اس کا ''پیغام'' بہت زیادہ وحشی تھا۔ 1930ء میں جب سکاٹش شاعر ایڈون میور اور اس کی ناول نگار بیوی ولا نے ''دی ٹرائل'' کا پہلی مرتبہ ترجمہ کیا تو اس کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی۔ آج تقریباً 75 سال بعد کے ناظرین بے شمار فلموں، ریڈیو پروگراموں اور ٹیلی ویژن ڈراموں کے ذریعے اس سے واقف ہیں۔

اگرچہ ''دی ٹرائل'' کی مجموعی فروخت "Gone With the Wind" کے برابر نہیں لیکن اس کے اثرات اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پائیدار اور گہرے ہیں۔ ''گون ود دی ونڈ'' نے لاکھوں لوگوں کو تفریح مہیا کی اور اسے محض ''پڑھا'' جاتا ہے لیکن یاد نہیں رکھا جاتا۔ دوسری طرف ''دی ٹرائل'' نے بہت سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلا۔ شروع میں ''دانشوروں'' نے ہی کافکا کو زیادہ سراہا لیکن آہستہ آہستہ یہ واضح ہوتا گیا کہ کافکا نے خود بھی ایک دانشور ہونے کے باوجود تمام لوگوں کے احساسات کے بارے میں بھی لکھا۔ ''دی ٹرائل'' دیگر چیزوں کے علاوہ کسی بھی نئی نسل کے ارکان کے لیے ایک بنیادی خاکہ ہو سکتا تھا لیکن صرف یہی لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

محقق اور نقاد جے پی سٹرن نے 1977ء میں ''دی ٹرائل'' کے ایک نئے ترجمہ کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا تھا:

> انگریزی میں عام استعمال ہونے والا واحد لفظ "Kafkaesque" (کافکائی) ہی ہے جو جرمن ادب سے اخذ کیا گیا۔ اس کے مختلف مطلب ہیں...... پراسرار، جادوئی، مافوق الفطرت، خوفناک حد تک بیوروکریٹک سے لے کر بیہت ناک اور ڈراؤنے تک۔ البتہ ہم اسے سائنس فکشن کی خوفناک مشینوں یا ایڈگر ایلن پو کے ساتھ منسوب نہیں کرتے۔ ''کافکائی'' تاثر میں روزمرہ کی خصوصیت موجود ہے۔ اس سے غیر ارضی یا مریخ سے آئی ہوئی مخلوق مراد نہیں، بلکہ ایک ایسا عمل مراد ہے جس میں ہم اپنے آپ سے ہی

اجنبی اور بیگانے ہو جاتے ہیں۔

فرانز کافکا پراگ (چیکوسلواکیہ) کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا (1883ء)۔ اس کا باپ ایک خوش حال تاجر تھا۔ وہ سینہ زوری کرنے والا، درشت، تندرست، بیہودہ اور تند مزاج بھی تھا۔ فرانز کی تینوں بہنیں ہٹلر کے کیمپوں میں ماری گئی تھیں۔ وہ اپنے باپ سے خوف کھاتا تھا، لیکن اس میں باپ کے خلاف جذبات ظاہر کرنے کی ہمت نہ تھی۔ فرانز کافکا نے نہایت منظم انداز میں سکول کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد قانون کا مطالعہ کیا اور ڈگری حاصل کی۔ پھر پراگ کی جرمن یونیورسٹی میں ادب پڑھا (1901ء تا 1906ء)۔ اس نے 1904ء میں لکھنا شروع کیا اور تقریباً اسی دور میں مہلک بیماری کا شکار ہوا۔

1908ء میں کافکا نے ''ورکرز ایکسیڈنٹ انشورنس انسٹیٹیوٹ'' نامی سرکاری تنظیم میں ملازمت اختیار کی۔ اس نے وہاں 14 سال تک ایمانداری سے کام کیا، حتیٰ کہ موت نے اسے ریٹائر کر دیا۔ وہ جون 1924ء میں ویانا کے نزدیک ایک سینے ٹوریم میں فوت ہوا۔ زندگی کے دوران اس کی متعدد محبوبائیں اور متعدد افیئرز تھے۔

کافکا نے اپنی مختصر زندگی کے دوران کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے کئی مجموعے شائع کیے جو بہت سراہے گئے مگر شہرت نہ دلا سکے۔ البتہ اسے ''بجلی جھونکنے والا'' پر 1915ء میں فونٹین پرائز ملا۔ بعد میں یہی کہانی ''امیریکا'' کا پہلا باب بنی۔ اس کا سب سے قابل قدر ناول Das Schloss (دی کاسل: لیکن Schloss کا مطلب تالا بھی ہے) تھا مگر اس میں کوئی اختتام نہیں۔ ''دی ٹرائل'' زیادہ متاثر کن ثابت ہوا۔ کافکا کے خطوط اور ڈائریوں کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی تقریباً 50 سوانحات لکھی جا چکی ہیں جن میں سے میکس براڈ والی سوانح اب بھی کئی لحاظ سے لاثانی ہے۔

کافکا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان تحریروں میں اس کے کام کی نہایت مختلف تعبیریں کی گئیں۔ اسے بیورو کریسی کے خلاف طنز نگار، ایک پیغمبر اور علامتی مصنف قرار دیا گیا۔ اس میں یہ بھی کچھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ مضحک موضوعات پر کامیڈی کے انداز میں لکھنے کا اہل بھی ہے۔ روسیوں نے دوستوئیفسکی میں یہ خوبی دیکھی تھی۔ لیکن کافکا کی کامیڈی میں غیر سنجیدگی نہیں۔

کافکا کے مزاحیہ (Comic) پہلو پر ایک نظر ڈال لینا بہتر رہے گا۔ مثلاً ایک ناتواں آدمی ایک

کیڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے (''کایا کلپ'')۔ ''دی ٹرائل'' پڑھتے ہوئے ہم میں سے کوئی بھی یہ تصور نہیں کرتا کہ ''ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ واقعہ پیش آ سکتا ہے۔'' حالانکہ ناول کا موضوع ہی ہمارے ساتھ اس وقت پیش آ رہے حالات ہیں۔ کیا ہم ایسے بے نام آقاؤں کے غلام نہیں جن کا اپنا بھی کوئی مقصد نہیں؟

کافکا کے عظیم ترین شاہکار ''دی کاسل'' (قلعہ) کے طرفدار اسے ایک لینڈ سروییز کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن وہ تقاضوں پر پورا اترنے کے باوجود ایک بااعتماد آدمی ہے۔ نیز کتاب میں کوئی قلعہ بھی موجود نہیں، مگر پھر بھی قلعہ اس کا بنیادی موضوع ہے۔ چنانچہ کافکا کے ہاں مزاحیہ عنصر پر غور کرنا نہایت اہم ہے۔

اگرچہ کافکا ''جدیدیت پسند'' (modernist) تھا لیکن اس کا ماضی سے بھی اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ حال یا مستقبل سے۔ اس نے روزمرہ استعمال کی سلیس زبان لکھی جو نہایت خوبصورت بھی ہے۔ حتیٰ کہ ملازمت کے دوران اس کے لکھے ہوئے لیٹرز بھی یہ ادبی خصوصیت رکھتے ہیں۔ ادبی نقادوں نے اسے ایک ''اذیت یافتہ آرٹسٹ'' کہا۔ جی ہاں وہ ایک اذیت یافتہ آرٹسٹ تھا' لیکن وہ ایک بہت عام آدمی بھی تھا۔

ہمارے عہد کے ساتھ کافکا کا تعلق اس کی ڈائری کے ایک اقتباس (1918ء) سے واضح ہوتا ہے: ''میں ایک دور کے منفی پہلو کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا ہوں۔'' اس نے مزید کہا کہ وہ خود کو اپنے عہد کا ''نمائندہ'' سمجھتا ہے۔ کافکا جس ''منفیت'' کے بارے میں سوچ رہا تھا اسے انسانوں کی ایک دوسرے کی بہبود سے بڑھتی ہوئی لاتعلقی اور لاپروائی کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

کافکا ان خوفناک امور کو نہایت طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ یاد رہے کہ یہ ''منفی پہلو'' چمکدار میزوں کے گرد بیٹھ کر مشروب پیتے ہوئے لاکھوں لوگوں کو قتل کرنے پر بات چیت کرنے کی قابلیت بیوروکریٹک رنگ رکھتی ہے۔ ہر چیز (چاہے وہ کتنی ہی ہیبت ناک ہو) شائستہ کلرک انجام دیتے ہیں جو انفرادی حیثیت میں خود بھی اپنے نشانہ بننے والے لوگوں جتنی ہی مایوس کن زندگی بسر کرتے ہیں۔ کافکا نے اس صورت حال کو نہایت مؤثر اور انسانیت پسندانہ انداز میں پیش کیا۔

''دی ٹرائل'' کا مرکزی کردار جوزف K ہے۔ یہ جوزف K کون ہے؟ وہ محض ایک فرد، ایک بینک کلرک ہے۔ لہٰذا جدید دنیا میں اس کی کیا وقعت ہے؟ اس قسم کے کچھ سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> کوئی جوزف K کے متعلق ضرور جھوٹ بول رہا ہوگا جسے ایک خوشگوار صبح کو بے خطا گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی مالکہ کی باورچن، جو ہمیشہ اس کے لیے کھانا لایا کرتی تھی، اس موقع پر نہ پہنچ سکی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے تکیے کی اوٹ سے کچھ دیر تک اپنی مالکہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جو اس کی جانب نہایت اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر اسے بیک وقت اکتاہٹ اور بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور ایک آدمی اندر داخل ہوا جسے اس گھر میں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سڈول اور گٹھیلے جسم کا مالک تھا، ہر قسم کی جیبوں، بکلوں، پلیٹوں اور بٹنوں سے مزین، ایک سیاح جیسے حلیے میں۔ ایک بیلٹ بھی تھی جو کسی خاص مقصد کے لیے لگی تھی لیکن کوئی اس کا اصل مصرف نہیں بتا سکتا تھا۔

یہاں صاف الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بینک اہلکار جوزف K نے کوئی خطا نہیں کی۔ لیکن کیا وہ واقعی بے خطا ہے؟ یہ ریاست کے خلاف ایک طنز ہے۔ K کو عدالت میں حاضر ہونے پر کبھی بھی مجبور نہیں کیا جاتا اور وہ اپنے خلاف لگائے گئے الزامات سے بھی آگاہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسے، نازیوں کا شکار ہونے والے کسی یہودی یا ہم جنس پرست یا خانہ بدوش کی طرح، ویرانے میں لے جا کر مار دیا جاتا ہے۔

جے پی سٹرن کے خیال میں ''دی ٹرائل'' کی ایک مذہبی تفسیر ناقابل گریز ہے۔ کافکا نے نطشے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ مذہب کے معاملے میں نطشے سے آگے نکل گیا، لیکن وہ بھی ثقافتی لحاظ سے ''خدا کی موت'' کے بارے میں جانتا تھا۔ اس دنیا کے بارے میں کافکا کی فکرمندی ''قلعہ'' ناول میں زیادہ واضح ہے۔ ایرک ہیلر کے بقول ''قلعہ غناسطی عفریتوں کے ایک گروہ کا فصیل بند مسکن ہے۔'' دی ٹرائل میں یہ عفریتیں جوزف K کو پیش آنے والی مشکلات اور رکاوٹیں ہیں۔ قانونی عمل کے پیچیدہ تانے بانے کو سمجھنے کیلیے اس کی خواہش قنوطیت پسندوں کی جستجوئے خدا جیسی ہے۔

87

سائنسی دریافت کی منطق

"The Logic of Scientific Discovery"

کارل پوپر

1934ء

آسٹریائی فلسفی کارل پوپر ہمیشہ سے ہی ایک مقبول شخصیت نہیں..... اگرچہ اس کے سارے فلسفے کی بنیاد سائنسی نظریات کی ''درستگی'' پر مستقلاً شک کرتے رہنے کی قطعی ضرورت پر تھی، لیکن اس نے خود پر ہونے والی کسی بھی تنقید کا جواب بہت ناخوشی اور حتیٰ کہ درشتی سے بھی دیا۔ البتہ اس نے اپنے جارحانہ پن کے ذریعہ ایک بات کا یقین دلایا: کہ وہ ایک مفکر ہے جس کے ساتھ

کوئی بھی ذمہ دار شخص معاملات طے کر سکتا ہے۔ اس کا اثر صرف سائنس اور سائنس کی تاریخ سے پرے تک ہے: وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ زیر بحث لائے جانے والے انسانوں میں سے تھا اور اب بھی ہے۔ کچھ لوگ شاید کہیں گے کہ اس کی بااثر ترین کتابیں ''کھلا معاشرہ اور اس کے دشمن'' (1945ء) اور ''تاریخیت کا افلاس'' (1957ء) تھیں۔ لیکن یہ کتب وسیع پیمانے پر متاثر کن ہونے کے باوجود ان کے دلائل مستحکم نہ رہ سکے۔ جبکہ اس کی پہلی کتاب "The Logic Scientific Discovery" کو عموماً ایک شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی قاری اس کتاب کو ناپسند تو کر سکتا ہے لیکن اسے اپنی ناپسندیدگی کی وجہ کی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ یہ بذات خود ایک زبردست کامیابی ہے۔

کارل پوپر ویانا میں پیدا ہوا (1902ء)۔ اس کے یہودی والدین نے لوتھری عقیدہ قبول کر لیا تھا۔ پوپر ابتداء سے ہی فلسفہ، سائنس اور نفسیات کے علاوہ موسیقی میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسے موسیقی کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ اس کے برعکس شاعری اور ادب میں اسے بہت کم دلچسپی تھی اور وہ انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ نوجوانی کے دور میں وہ ایک پرجوش مارکسسٹ رہا مگر جلد ہی اس دور سے نکلا اور پھر کارل مارکس پر بیسویں صدی کے موثر ترین اور شدید ترین نقادوں میں سے ایک بن گیا۔

پوپر منطقی ثبوتیت پسندوں کے ویانا مکتبہ سے کافی قریب تو تھا مگر اس میں شامل نہیں تھا: البتہ اس نے اپنی پہلی کتاب میں ان پر شدید تنقید کی۔ کافی بعد میں، دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ وٹگنسٹین سے ملا جو منطقی ثبوتیت پسندوں سے کافی قریب تھا۔

آسٹریا پر ہٹلر کی چڑھائی سے پہلے ہی پوپر اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ نیوزی لینڈ میں ملازمت کرنے چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ''کھلا معاشرہ اور اس کے دشمن'' پر کام کیا۔ اسی کتاب نے اسے پہلی بار شہرت دلائی۔

یہ دائیں اور بائیں بازو کی مطلق العنانیت پر ایک بھرپور اور وسیع حملہ تھا۔ پوپر کا کھلا معاشرہ وہ ہے جس میں خیالات آزادانہ لیکن ذمہ دارانہ طور پر بنتے ہیں۔ اس قسم کے معاشرے کی شان وشوکت کے بارے میں پوپر حد سے زیادہ رجائیت پسند رہا ہوگا۔ اکثر قائل کر لینے والے انداز

میں کہا گیا ہے کہ یہ ہرگز اتنا آزاد...... یا ذمہ دار...... نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس بند معاشرہ افراد سے مل کر نہیں بنتا: یہ ''نامیاتی انداز میں'' ایک ہی طاقت ور قبیلے، قدیم لوگوں کے گروہ کے طور پر عمل کرتا ہے۔ جو اجتماعیت کے ساتھ مخلص ہونے کے ناتے نئی اور ترقی پسندانہ سوچ کا سامنا یا اسے قبول کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ایک کھلے معاشرے میں بہترین بات کیا ہے: پوپر کے خیال میں یہ چیز "Piecemeal Social Engineering" ہے...... یعنی ترقی عملی خطوط پر ہونی چاہیے نہ کہ تھیوریٹیکل خطوط پر۔

تاہم، معاشرے کی ان دو مبینہ اقسام کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل ہے، اور پوپر نے اپنی تفصیلات پیش کرنے میں بہت سی لطافتوں اور امتیازات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اس غیر مشکوک/ قطعی امر کے ساتھ نمٹنے کی کوشش نہیں کرتا کہ ایک اوپن یا کھلے معاشرے میں بھی اجتماعی پہلو موجود ہوتا ہے...... مثلاً لگتا ہے کہ اس نے فرانسیسی سوشیالوجسٹ ایمائل درخائم کے خیالات کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا جس نے اجتماعیت کے متعلق کافی بہتر تجزیات پیش کیے تھے۔ درحقیقت پوپر اپنے سارے کیریئر کے دوران اور بالخصوص اس کے آخری حصے میں غیر نکتہ سنج رہا۔

پوپر نے اجتماعی قسم کے معاشرے کے مرکزی حامیوں، افلاطون، ہیگل اور مارکس کے خلاف حملہ کیا۔ افلاطون کے بارے میں اس کی تفسیر متنازعہ تھی۔ اگرچہ ''ری پبلک'' میں اس کا نظریہ انصاف یقیناً اجتماعیت پسندانہ ہے، لیکن وہ اور بھی بہت کچھ کہتا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ پوپر ان باتوں کی قدر افزائی نہ کر سکا۔ اس نے بحیثیت مفکر کارل مارکس کی اہمیت گھٹا کر بیان کی۔ پوپر پر یہ بھی تنقید کی گئی کہ اس نے تاریخیت کا ایک ایسا نظریہ ایجاد کیا جو وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔

کارل مارکس کے لیے پوپر کی نفرت کے ساتھ یہ نظریہ بھی منسلک تھا کہ تاریخ کے کوئی اساسی قوانین موجود نہیں۔ آج عمومی طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ اپنے اینٹی ہیروز (جن میں فرائیڈ بھی شامل تھا) کی سوچ کا تجزیہ کرتے وقت وہ ان سے انصاف نہ کر سکا۔ انجام کار اس نے ایک نہایت غیر موثر فلسفہ پیش کیا (''آبجیکٹو نالج'' 1972ء)۔ اس نے (اپنے خیال میں) سائنسی عمل کا موازنہ قدرتی انتخاب کے ذریعہ ارتقاء کے ساتھ کرنے سے ابتداء کی۔ اور حتیٰ کہ ایک

''حقیقی'' کیٹیگری بھی ایجاد کرلی جسے وہ ''ورلڈ 3'' کہتا ہے۔ لیکن وہ کبھی بھی اسے ایک مربوط فلسفے کی صورت نہ دے سکا، اور اس کی باطنی ورلڈ 3 کسی بھی چیز کی مفید انداز میں وضاحت نہیں کرتی۔ ہم اس کے متعلق شاذ و نادر ہی سنتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ ایک سچ ہے کہ قارئین نے ان کتب سے کافی تحریک پائی۔

''سائنسی دریافت کی منطق'' اساسی لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں پوپر نے استنباطی (Inductive) طریقۂ کار استعمال کرتے ہوئے سائنسی ترقی کے نظریہ پر حملہ کیا۔ اس میں کوئی منطق نہیں تھی۔ ہر صبح سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھنے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ سورج کا طلوع ہونا ایک قانون ہے۔ قطعی نظر آنے والے کچھ چیزیں ہرگز قطعی نہیں ہوتیں۔ پوپر نے دلیل دی کہ استنباطی طریقۂ کار سائنس کے ساتھ مربوط نہیں۔

چنانچہ پوپر نے نہایت بے باکی کے ساتھ سارے عمل کو سر کے بل کر دیا۔ ان ذرائع سے آگے بڑھنا اہم تھا جن کو منطقی طور پر ثابت کیا جا سکے۔ پوپری طریقۂ کار مفروضاتی استنباطی (Hypothetical Inductive) طریقۂ کار کہلاتا ہے۔

یہ تسلیم کرنا اہمیت کا حامل ہے کہ پوپر نے درحقیقت کبھی اس بات سے انکار نہیں کیا تھا کہ غیر سائنسی سرگرمیاں مفید ہو سکتی ہیں۔ اس کی نظر میں اصل دشمن جعلی یا نام نہاد سائنس تھی۔ البتہ پوپر کے نقادوں نے جس چیز کی نشان دہی کی وہ اس کا تحلیلی نفسیات جیسی سرگرمیوں کو خارج کرنے میں حد سے زیادہ قطعی رویہ ہے۔

88

روزگار، سود اور دولت کی جنرل تھیوری

"The General Theory of Employment, Interest and Money"

جان مینارڈ کینز

1936ء

انگریز معیشت دان اور ریاضی دان جان مینارڈ کینز (1883ء تا 1946ء) اپنے ایک قریبی ہم عصر البرٹ آئن سٹائن کے ساتھ بہت کچھ مشترک رکھتا ہے: عام عوام میں ...... حتیٰ کہ تعلیم یافتہ عوام میں سے بھی ...... محدودے چند لوگ ہی اس کی تحریروں کو سمجھ پاتے ہیں: دونوں نے بہت گہرا اثر ڈالا جس کا اندازہ اب بھی پوری طرح نہیں کیا جا سکا۔

تاہم، (کینز کے معاملے میں) خود کو حکمرانی کے لیے موزوں ترین خیال کرنے والے ممالک کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ عوام اس قدر لاعلم ہیں؛ چنانچہ حکومتیں عوام کا پیسہ چرا کر بڑی آسانی سے اسے ضائع کر دیتی ہیں۔ یہ خود ہی تعینات ہونے والے لوگ درحقیقت عوامی فنانس کی دیکھ بھال اس سے بہتر انداز میں نہیں کرتے جیسے میں اور آپ اپنے نجی فنانس کی کرتے ہیں۔

کیمبرج میں کینز کے ایک استاد نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ "وہ کسی شبہ یا جھجک سے ماورا اپنے دور کا دلچسپ ترین، بااثر ترین اور اہم ترین ماہر معیشت تھا۔" چند ایک لوگ ہی اس بات سے اختلاف کریں گے، کیونکہ 1970ء کی دہائی کے وسط میں کینز کے خلاف بغاوت بھی اسی کی اصطلاحات میں ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اقتصادی توسیع کے دور کو بجا طور پر "کینز کا عہد" کہا جاتا ہے۔

جان مینارڈ کینز کیمبرج کے ایک منطق پسند اور ماہر معیشت جان نیوائل کینز کا بیٹا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک مشہور بیلے ڈانسر لیڈیا لوپوکووا سے 1925ء میں شادی کی اور اس کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزاری، لیکن ساری زندگی ہم جنس پرست ہی رہا۔ اسے سکاٹش مصور ڈنکن گرانٹ کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔ کینز، گرانٹ، ناول نگار ای ایم فارسٹر، ورجینیا وولف اور ادب اور آرٹ سے منسلک کئی دیگر افراد نے مل کر "Bloomsbury Group" تشکیل دیا تھا۔ ان لوگوں میں کچھ خوبیاں مشترک تھیں...... لبرل، انسانیت پسند، شائستہ، روپے پیسے کی فکر سے آزاد اور نہایت ذہین۔ یہ بھی تو نہیں مگر ان میں سے زیادہ تر ہم جنس پرست تھے۔ ناراض شاعر اور ناول نگار ڈی ایچ لارنس نے 1915ء میں کیمبرج میں کینز کو پاجامہ پہن کر ایک صبح برٹرینڈ رسل کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو بڑی خفگی کے ساتھ ایک دوست کو لکھا:

> تمہارا یہ کہنا حماقت ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... مردوں کی مردوں سے محبت...... یہ انحطاط اور پستی ہے۔ ہم دوپہر کے وقت (کینز کے) کمرے میں گئے...... اسے وہاں کھڑے دیکھ کر مجھے آہستہ آہستہ اندازہ ہوا، اور تب سے ہی میں کچھ دیوانہ ہو رہا ہوں......

اب بالعموم یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ خود لارنس بھی ہم جنس پرستی کی جانب مائل تھا؛ لیکن

کینز کا لارنس جیسوں کے لیے قابل نفرت ہونا دلچسپ امر ہے۔

ابتداء میں کینز ایک سول سرونٹ تھا، لیکن 1908ء میں کیمبرج میں معاشیات کا پروفیسر بن گیا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے اس کا مقالہ مسترد کر دیا گیا، لیکن اس نے 1921ء میں اسے بنا سنوار کر "A Treatise on Probability" کے طور پر شائع کیا۔ آج اسے اس موضوع پر ایک اہم تحریر سمجھا جاتا ہے...... بلاشبہ اس کے کلاسیکی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آج بھی ہم میں سے بہت کم لوگ ہی Probability کی موزوں تفہیم رکھتے ہیں۔ بعد کی زندگی میں کینز نے آرٹس کی سرپرستی بھی کی اور "برٹش آرٹس کونسل" کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا۔

سرمایہ داری نظام کے کئی پہلوؤں سے نفرت کرنے کے باوجود کینز نے محسوس کیا کہ یہ بے پناہ توسیعی قوتیں رکھتا تھا۔ اگر وہ اس قسم کی توسیع پسندی میں مضمر برائیوں کی نشان دہی کر دیتا تو اسے ایک انارکسٹ یا مرکز گریز قرار دیا جاتا، اور حکومتی پالیسی پر اس کا کوئی اثر بھی نہ پڑ سکتا۔

تاہم، وہ کچھ شکوک وشبہات کا شکار تھا۔ بہرحال سرمایہ داری کو خدا کا ودیعت کردہ اور فطری نظام قرار دینے والوں نے اسے اس کا محافظ اور نجات کار بھی کہا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ اگر "طبقاتی جنگ" چھڑی تو وہ ایک "غیر اخلاقیاتی" ہونے کے ناتے بورژوا کا ہی ساتھ دے گا۔ لیکن اس نے مارکس کو کبھی سنجیدگی سے نہ لیا، اور نہ ہی اس کی تحریروں کے بارے میں کسی گہری تفہیم کا مظاہرہ کیا۔ کینز ایک لبرل تھا جو تشدد اور غربت دونوں سے نفرت کرتا تھا، پھر بھی (ممتاز معیشت دان جوآن رابنسن کے بقول) اس نے دیکھا کہ "سرمایہ داروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے کی تکلیف بالکل ہی استحصال نہ ہونے کی تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" اس چیز نے سرمایہ دار کو یہ خوشگوار احساس دیا کہ وہ دوسروں کا نجات دہندہ ہے۔

مارکس نے کہا تھا کہ خوش حالی اور سرگرمی کے طویل دور ہی انجام کار سرمایہ داری کو تباہی سے دوچار کر دیں گے۔ اس کی "کلاسیکی معیشت" ژاں باپتسٹ Say کے قانون کے گرد گھومتی تھی۔ ژاں باپتسٹ (1767ء تا 1832ء) ایک فرانسیسی تھا جس کا بزنس کیریئر ایڈم سمتھ کو پڑھنے کے بعد معطل ہو گیا؛ وہ ایک معیشت دان بنا۔ اس کا نام نہاد "اصول" کہتا ہے کہ رسد اپنے مساوی طلب پیدا کرتی ہے۔ مالتھس کی طرح کینز نے بھی اس پر شدید تنقید کرتے ہوئے اسے بالکل

الٹا دیا...... اس نے زور دیا کہ: طلب اپنی رسد پیدا کرتی ہے۔

اسی نکتۂ نظر کے نتیجے میں ''ڈیمانڈ مینجمنٹ'' کا تصور پیدا ہوا جس میں بہت زیادہ حکومتی مداخلت درکار تھی۔ لیکن 1940ء اور تقریباً 1975ء کے درمیانی برسوں میں یہی اصول حکمران رہا۔ کینز نے ''جنرل تھیوری'' لکھنے کے دوران جارج برنارڈ شا سے کہا تھا کہ ''یہ آئندہ دس برس میں معاشی مسائل کے متعلق دنیا کے انداز فکر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دے گی۔'' اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

اس انقلابی تبدیلی میں کینز کا کتنا ہاتھ ہے، اور کس حد تک وہ محض اس کا پیش بین تھا؟...... یہ ہنوز متنازعہ معاملہ ہے۔ بلاشبہ فرینکلن روز ویلٹ نے محسوس کر لیا تھا کہ ریاست کو خود سرمایہ کاری کرنی چاہیے؛ کینز نے ایسا کرنے کے لیے منطق پیش کی۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اسے غلط قرار دیا۔ ''جنرل تھیوری'' کا حقیقی اطلاق یہ ہے کہ مکمل روزگار دینا ریاست کا فرض ہے۔ کینز کے مخالفین کا خیال تھا کہ اس طرح افراط زر میں ناقابل قبول حد تک اضافہ ہو جائے گا۔

کینز نے وسیع پیمانے پر توجہ اس وقت حاصل کی جب اس نے 1919ء میں ورسیلز کی امن کانفرنس میں برٹش ٹریژری کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرنے کے بعد ''امن کے معاشی نتائج'' شائع کی۔ اس نے اس تصنیف میں جرمنوں کے لیے مطالبہ کردہ بھاری تلافیوں کے خطرات کی نشان دہی کی۔ اگرچہ حالات نے جلد ہی اس کی رائے کی درستگی کو واضح کر دیا، مگر وہ تقریباً بیس برس تک سرکاری حلقوں میں لعنت ملامت کا نشانہ ہی بنا رہا۔ اس لحاظ سے اس کا کیریئر بھی ونسٹن چرچل کے کیریئر سے زیادہ مختلف نہ تھا۔

کینز کا تھیسس بیان کرنے کا ایک اور آسان طریقہ یہ ہے کہ: اس نے پرچار کیا تھا کہ خوشحالی کے ادوار میں حکومتوں کو ٹیکسز بڑھا دینے اور اخراجات کم کر دینے چاہئیں؛ البتہ سیاسی بحران کے دور میں اس کے برعکس کرنا چاہیے۔ وہ سرمایہ داری کی ''توسیعی قوتوں'' پر یقین کے باعث ہی اس کے ساتھ چمٹا رہا۔

ذاتی حیثیت میں کینز ''ہمیشہ راستی پر تھا۔'' وہ کبھی کبھی مضحکہ خیز بھی نظر آتا ہے، مثلاً اس نے کہا تھا کہ زلزلے مفید ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے تعمیرات کے شعبے میں تیزی آتی ہے، یا یہ کہ

شیکسپیئر کا جینئس صرف افراط زر کے دور میں ہی پھل پھول سکتا تھا (کیسی احمقانہ بات ہے!)۔ اکثر وہ سوچ سے عاری نظر آتا ہے، اور اسے دیا گیا خطاب ''بلڈوزر'' منصفانہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہ بہت سوں کی نظر میں بیسویں صدی کے انسانیت پسند ماہرین معیشت کا باپ تھا۔

تمام سنجیدہ معیشت دان مکمل روزگار اور کم سے کم افراط زر کی بات کرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ اصل بحث اس بات پر ہے کہ یہ مقصد کیسے حاصل کیا جائے۔ کینز نے دلیل دی کہ حکومت کو پبلک ورکس اور بہبود پر رقم خرچ کرنے کے ذریعہ طلب کو بڑھانا اور سود کی شرحوں کو کم کرنا چاہیے...... کچھ نے اسے ''سوشلزم'' خیال کیا۔

عالمی جنگ کے بعد سریع الرفتار توسیع کے ایک دور کے بعد معیشتیں مشکلات میں پڑنے لگیں، اور سب سے بڑا مسئلہ بلند شرح افراط زر کا تھا۔ تب ماہرین معیشت کا ''شکاگو مکتبہ'' سامنے آیا جس میں سب سے زیادہ با اثر شخص بلاشبہ ملٹن فرائیڈ مین (پیدائش 1912ء) تھا۔ عمومی سیاسی نظریات کے حوالے سے دائیں بازو کے ان ماہرین معیشت نے مداخلت پسندی کی مخالفت کی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ افراط زر صرف دولت کی سپلائی پر سخت کنٹرول کے ذریعہ ہی قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ یوں امریکہ، برطانیہ اور دیگر جگہوں پر "monetarism" نے ایک خالصتاً آزاد تجارت کی صورت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ خود فرائیڈ مین نے بھی اس پر تنقید کی۔

چند ایک ماہرین معیشت نے 1981ء کے برطانوی بجٹ کی حمایت کی جس نے 1920ء کی دہائی کے بعد سے جاری بدترین معاشی مندے سے نمٹنے کی کوشش میں ٹیکس بڑھا دیے تھے۔ تب تک امریکہ اور برطانیہ میں حکومتیں مداخلت کرنے کو زیادہ تیار تھیں، جبکہ افراط زر پر کنٹرول بنیادی ہدف تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ چیزیں دوبارہ کینز کی حمایت میں جا رہی تھیں۔

89

وجود اور لا وجود

"Being and Nothingness"

ژاں پال سارتر

1943ء

اہم قرار دیے جانے والے تمام فلسفیوں میں سے ایک سارتر ہی ایسا تھا جو اپنے دور میں ڈرامہ نویس، ناول نگار، سیاسی کارکن اور ادبی نقاد کے طور پر بھی نمایاں حیثیت کا حامل رہا۔
کیا آنے والی نسلیں اسے تاریخی اہمیت ہی دیں گی؟ کیا اسے ایک عظیم ناول نگار مگر کمتر فلسفی سمجھا جائے گا؟ یا پھر عظیم فلسفی مگر کمتر ناول نگار؟ کیا اپنے ملک پر اس کے مرتب کردہ اثرات اسی

طرح انمٹ ہیں جیسے کہ والٹیئر یا دیدرو یا حتیٰ کہ برگساں کے ہیں؟

وہ عالمی جنگ کے فوراً بعد اٹھنے والی وجودیت پسندی کی لہر کا قائد تھا جس کی جگہ ساختیات، غیر ساختیات اور اب پس جدیدیت نے لے لی ہے۔ اگلے مرحلے کو کیا نام دیا جائے گا؟ مابعد پس جدیدیت؟

سارتر کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں بلاشبہ اس کے ناول ہیں: شاندار فلسفیانہ ناول "La Nausee" (متلی) اور چار جلدوں پر محیط "Les Chimins de Liberte" (آزادی کی راہیں)۔ لیکن ان دونوں ناولوں میں اس کی مشہور ترین کتاب کی پیش بینی ملتی ہے: "L'Etre et le N'eant" (وجود اور لا وجود)۔

وجودیت سوچ کے متعدد دھاروں کا ملغوبہ تھی۔ یہ ایک رجحان یا جھکاؤ ہے...... فلسفہ نہیں۔ خود سارتر نے بھی اسے "انسانیت پسندی" کہا۔ اس کے اندر دینیات کے عناصر بھی موجود تھے، لیکن شدید ملحد سارتر نے انہیں سیکولر رنگ دے دیا۔

"مسیحی وجودیت پسند" بھی موجود تھے، جن میں سب سے مشہور غالباً گابریئل مارسیل تھا۔ وجودیت عالمی سطح پر مقبول ہونے سے پہلے بھی ہسپانوی مصنف حوزے اورٹیگا دی گاسیٹ کے شاندار فلسفہ میں موجود تھی۔ اورٹیگا نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی۔ نفسیاتی معالج کارل جیسپرز کے فلسفہ میں بھی وجودیت کا رنگ ملتا ہے۔

وجودیت پسندی کے بنیادی ماخذ ہیں: کیرکیگارڈ، نطشے، ہسرل اور ہائیڈیگر۔ اس سے پہلے کے ماخذ بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں: مثلاً ہیراکلیتس، آگسٹائن، آکوینس، نظر انداز کردہ میکس شیلر (جس سے ہائیڈیگر نے کافی کچھ چرایا تھا) اور کانٹ، دوستوئیفسکی، پاسکل، ٹالسٹائی وغیرہ کے کچھ پہلو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک ملحدانہ تحریک، وجودیت پسندی کی جڑیں سیکولر کی بجائے دینیاتی فکر میں تھیں۔ لیکن اسے اپنا جوش و جذبہ دینیات سے مستعار لینے کی ضرورت تھی۔ وجودیت پسندی میں عام رجحان "تجرید کی مخالفت" تھا۔ چنانچہ سارتر نے "وجود اور لا وجود" کا آغاز ہیگل پر تنقید سے کیا۔ اس سے وجودیت پسندی کے دائرے میں شامل کسی شخص کو تو پریشانی نہیں ہوتی، لیکن باہر والے بہت سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

لہٰذا یہاں ہم وجودیت کو ایک فلسفہ کی بجائے ایک طرزِ فکر کے طور پر بیان کریں گے جس کی نمائندگی سارتر بہت مناسب انداز میں کرتا ہے۔ وجودیت میں کیر کیگارڈ اور نطشے کی حصہ داری زیادہ تر جذباتی نوعیت کی تھی۔ دانشورانہ عنصر آسٹریائی فلسفی اور ریاضی دان ایڈمنڈ ہسرل (1859ء تا 1938ء) نے ہی پیدا کیا جو بحیثیت مفکر سارتر کی نسبت کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کتاب میں ہسرل کی تصنیف "Ideas: General Introduction to Pure Phenomenology" (1913ء) کو شامل نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا اثر بالواسطہ ہی پڑا تھا؛ یہ صرف تربیت یافتہ فلسفیوں کے لیے قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہسرل کے ریفرنس کے بغیر وجودیت کی تفہیم ممکن نہیں۔

ہسرل باقی سب باتوں سے پہلے ایک ریاضی دان تھا۔ وہ فرانز برینٹانو (1838ء تا 1916ء) کے پاس پڑھنے گیا۔ نہایت کٹر برینٹانو کا کہنا تھا کہ دنیا دو قسم کی چیزوں سے مل کر بنی ہے: طبعی اور نفسیاتی، مثلاً میز کرسیاں اور امید۔ اس نے رومانوی تحریصات کے سامنے جھکنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی نفسیاتی چیزوں (OBjects) کا تعین کرنے کے لیے کہا کہ وہ سب ''ارادیت'' یعنی "Intentionality" کی معروضات ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''کسی جاری چیز کے بغیر سماعت نہیں اور امید کردہ چیز کے بغیر امید کا وجود نہیں۔'' ایک بصیرت ہمیں بتاتی ہے کہ اس قسم کی ذہنی سرگرمی میں ہم ایک ''داخلی ادراک'' رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے فلسفہ میں یہ بصیرت نہایت اہم تھی، اور ہسرل نے اسے ''مظہریت'' کی صورت میں واضح کیا۔

کوئی شخص غیر منصفانہ اور بے جا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ ہسرل نے شعور کا فلسفہ تراشا لیکن وہ سب کچھ چھوڑ دیا جو عام مرد یا عورت کے لیے باعثِ دلچسپی تھا۔ اس نے برینٹانو کے مفہوم میں معروضات کے حامل ذہنی افعال کا مطالعہ کیا اور ''موڈز'' (moods) وغیرہ جیسی حالتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن نوجوان سارتر کو ہسرل کے ساتھ پرجوش انداز میں وابستہ کرنے والی بات اس کا حتمی کلیہ تھا: واپس چیزوں کے اصل کی طرف جاؤ۔ ہسرل کا حقیقی فرانسیسی وارث بننا سارتر کے فلسفی دوست موراِس مرلو پونٹی کی قسمت میں لکھا تھا۔

ہسرل کے فلسفہ میں وجودی (ہماری روز مرہ زندگی سے وابستہ) اور نفسیاتی ممکنات بے

شمار ہیں۔ جیسا کہ ریمنڈ آرون نے ایک نائٹ کلب میں کاک ٹیل ہاتھ میں لیے ہوئے سارتر سے کہا تھا: ''دیکھو میرے ننھے کامریڈ، اگر تم ایک مظہریت پسند ہو تو اس کاک ٹیل کے بارے میں بھی بات کر سکتے ہو اور یہ گفتگو فلسفہ ہوگی۔'' تخلیقی امنگ رکھنے والے سارتر کو یہ بات پسند آئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے خود سے کہا: ''فلسفے کو گھسیٹ کر اس میں کیوں نہ لے آیا جائے؟ میں ایک فرانسیسی ہوں۔''

سارتر ایک مصنف کی حیثیت میں کیر کیگارڈ جیسا ہے، لیکن وہ ہماری زندگیوں کو بامعنی انداز میں بیان کرنے کی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ اس میں ایک پورا نظام پیش کرنے کی اہلیت تھی۔

''وجود اور لاوجود'' فلسفیانہ اعتبار سے زیادہ بلند پایہ نہیں لیکن یہ ہمارے سامنے ایک پورا نیا نظام پیش کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کبھی کسی تربیت یافتہ فلسفی نے اسے بہت زیادہ سنجیدگی سے لیا ہو، لیکن یہ سارتر کی بہترین تصانیف میں پیش کردہ خیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔

''وجود اور لاوجود'' کا اصل زور غناسطی ''نظریہ لاشیئت'' ہے۔ سارتر غناسطیت سے بالکل بے خبر تھا، وہ اس کے بارے میں جانتا ہی نہ تھا، لیکن اس نے نادانستہ طور پر اسے اپنے عہد کے ساتھ مربوط کیا۔ سارتر خود کو بے دیوتا نظر آنے والی دنیا میں فرد کی زندگی کو بامعنی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے بیشتر افراد کی مشینی اور پرجلال زندگی کو ''غیر معتبر'' خیال کیا۔ اور اس غیر معتبریت کو معتبریت میں تبدیل کرنے کے لیے یہ شناخت شامل تھی کہ ''کسی ہستی کو ہمیشہ لاشئے (یا لاوجود) کے طور پر ہی آشکار کیا جا سکتا ہے۔''

90

غلامی کی شاہراہ پر

"The Road to Serfdom"

فریڈرک واں ہائیک

1944ء

آسٹریائی معیشت دان، فلسفی اور ماہر نفسیات فریڈرک آگسٹ واں ہائیک نے دانشوروں کے گھرانے میں جنم لیا (1899ء میں ویانا کے مقام پر)۔ اس کا باپ ایک طبیب اور ماہر نباتات تھا۔ آسٹریائی حکومت میں ایک معیشت دان کے طور پر شہرت پانے کے بعد اس نے 1930ء کی دہائی کے اوائل میں ''لندن سکول آف اکنامکس'' میں ملازمت اختیار کی، اس کے

بعد ''یونیورسٹی آف لندن'' اور پھر ''یونیورسٹی آف شکاگو'' میں (جہاں ملٹن فرائیڈ مین بھی اس کا شاگرد تھا)۔ اگرچہ لندن سکول آف اکنامکس کا ماحول کینز کے سخت خلاف تھا...... ہائیک ہمیشہ سے کینز کا مخالف تھا......لیکن انجام کار کینز کے خیالات کو بالادستی حاصل ہوئی اور ہائیک کا نام کئی سال تک گمشدہ رہا۔

ہائیک نے 1938ء میں برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی اور ''سوشلسٹ'' نازیوں سے نفرت کرتا تھا لیکن اس وقت کے لحاظ سے اس کے انوکھے خیالات کا پااثر ہونا خلاف قیاس تھا۔ صرف آسٹریاؤں اور کچھ جرمنوں کے لیے اس کے خیالات عجیب نہیں تھے، اور اس وقت یہ دونوں ملک برطانیہ اور امریکہ کے دشمن تھے۔

1974ء میں ہائیک کو دوبارہ شہرت ملنا شروع ہوئی جب اسے نوبل انعام برائے معاشیات دیا گیا۔ یہ انعام معاشیات میں اتار چڑھاؤ کے حوالے سے اس کے عہد ساز کام کی بنیاد پر تھا۔ اس وقت برطانیہ اور بالخصوص امریکہ میں دائیں بازو کی انارکسٹ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بوڑھا ہائیک وزیراعظم تھیچر اور صدر ریگن دونوں کی نظر میں گرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن یہ اس کی کتاب ''غلامی کی شاہراہ پر'' ہی تھی جس نے زیادہ زوردار اثر مرتب کیا۔ اس کی نئی شہرت نے اس تصنیف کو دوبارہ اہمیت دلائی۔

''آزادی کی شاہراہ'' پر فاشزم اور کمیونزم کے ساتھ ساتھ جمہوری سوشلزم پر بھی ایک تنقید تھی۔ اس اور بعد کی تصنیفات میں ہائیک سوشلزم کو ہر قسم کی استبدادیت پر منتج ہوتا دیکھتا ہے۔ اس نے آسٹریا سے ''لندن ٹائمز'' کو خطوط لکھ کر تھیچر کو مبارک باد دی اور اس کی پالیسیوں میں بھی استبدادیت کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ وہ آگاہ تھا کہ تھیچر اور اس کی حکومتوں نے ٹیکس کا بوجھ بڑھا دیا ہے' البتہ اس نے کوئی رائے نہ دی۔

''غلامی کی شاہراہ پر'' فاشسٹ اور کمیونسٹ یعنی مطلق العنان معیشتوں کے خلاف ایک حملہ ہے جس کی بنیاد اس دلیل کو بنایا گیا کہ کوئی فرد واحد یا منصوبہ سازوں کا ایک گروپ بھی معیشت کی سمت بندی کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ہائیک خود صرف تھیوری کی حد تک جمہوریت کے

سا مخلص تھا۔ ''غلامی کی شاہراہ پر'' کے مطابق عالمی جنگ کے بعد سوشلسٹ ویلفیئر سٹیٹ کے لیے منصوبہ بندی کرنے والا کوئی بھی ملک استبدادیت کی راہ پر چل پڑے گا۔

جوانی میں فوجی ملازمت سے واپسی کے بعد ایک دو سال تک ہائیک ''سوشل ڈیموکریٹ'' رہا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ چلی۔ اور ممکن ہے کہ اپنی جوانی کے دوران آسٹریائی سوشل ڈیموکریٹس کے لیے اس کے دل میں پیدا ہونے والی نفرت ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہو۔

بالاصل ہائیک کی تربیت ایک وکیل اور پھر ایک ماہر معیشت کے طور پر ہوئی تھی۔ فلسفہ اور نفسیات میں اس کی کاوشوں کا مقصد آزاد منڈی کے تقدس کے متعلق اپنے نظریات کی توجیہہ پیش کرنا تھا۔ ہائیک کی ہر تحریر کا بنیادی تھیسس یہ تھا کہ ریاست ایک ''لازمی برائی'' نہیں ہے۔ ہائیک اور آسٹریائی مکتب کے دیگر افراد کی نظر میں ''معروضیت'' ممکن نہیں، چنانچہ صرف موضوعی پر ہی توجہ دی گئی۔ برطانوی فلسفی انتھونی کوئنٹن نے ہائیک کی ''آزادی کا آئین'' (1961ء) کو ایک ''پرجلال ڈائنوسار'' قرار دیا۔ لوگ اب بھی اسے خریدتے اور بغیر پڑھے اٹھائے پھرتے ہیں۔

ہائیک نے جو کچھ کہا وہ اتفاقاً قابل دلچسپی تھا، حالانکہ وہ سب کچھ پہلے بھی کہا جا چکا تھا۔ بالکل پوپر کی طرح اس نے بھی ترقی کو ایک ''جزوی'' معاملہ جانا۔ اس کے لیے معاشیات ویسی ہی تھی جیسی پوپر کے لیے سائنس تھی: دریافت کا ایک عمل جس میں آزمائش اور خطا کے ذریعے ہی ترقی ہوتی تھی۔

نیز سوشلزم کے رنگ میں رنگی ہوئی ریاست اس قسم کی ترقی کی دشمن ہے۔ لیکن وہ خود کو بھی انارکزم کے متعلق اپنا نظریہ اپنانے کی ہمت نہ دلا سکا، یہ کام اس کے امریکی شاگردوں نے کیا۔ فرض کیا جاتا ہے کہ ایک بائیں اور ایک دائیں بازو کا انارکزم موجود ہے۔ گوڈون والا بائیں بازو کا انارکزم ٹامس پین کے اس نکتۂ نظر کو ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے کہ ریاست ایک ''لازمی برائی'' ہے: وہ اس سے کلی طور پر نجات پانا چاہتا ہے۔ دائیں بازو کا انارکزم حقیقت میں انارکزم ہی نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ صرف ایک حقیقی سیاسی شے موجود ہے: فرد۔ نجی جائیداد اور نجی

افواج کے حقوق کو مسترد نہیں کرنا چاہیے۔

اس قسم کے تمام دلائل دائیں بازو کا فلسفہ اور کانٹ کے نظریات کی مدد سے ایک خوفناک قسم کی بدنظمی کا دفاع کرتے ہیں جن میں نیک ارادہ اور بھائی چارے کا احساس مکمل طور پر غیر حاضر ہیں۔ یہ ایک ایسی انارکی کے حق میں ہیں جو جنگی سورماؤں کو لڑ کر فیصلہ کرنے کی اجازت دیتی ہے جبکہ اصل نقصان عام آدمی ہی اٹھاتا ہے۔ وہ ہیوم اور ایڈم سمتھ کی بیان کردہ انسانی خوبی ''ہمدردی'' کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ''ہمدردی'' کبھی کسی فلسفیانہ مفہوم میں واضح نہیں کی گئی مگر مراد یہی تھی۔ اگر ہمیں ''دائیں بازو کا یہ انارکی پسند'' قسم کا فلسفہ ہی اپنانا پڑے (اور ہائیک اسی طبقے کا تھا) تو پھر بہتر ہے کہ ہمارا کوئی فلسفہ ہی نہ ہو۔

91

دوجی جنس

"The Second Sex"

سیمون دی بووا

1948ء

عورت کی آزادی کے حوالے سے سیمون دی بووا کی ضخیم تصنیف پیرس سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ 1953ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ایک ہی جلد میں شائع کیا گیا۔ یہ کتاب اس دور تک لکھی جانے والی کتابوں میں بے مثال اور فلسفیانہ لحاظ سے متوازن تھی۔ اس سے قبل جان سٹوارٹ مل کی "The Subjection of Women" 1869ء میں شائع ہوئی تھی۔

سیمون دی بووا بھی اس کی معترف تھی۔

''دی سیکنڈ سیکس'' آزادیٔ نسواں پر بیسویں صدی میں لکھی جانے والی نہایت مدلل کتاب ہے۔ اگرچہ اس کتاب نے اپنے ملک میں بھی فوری اور واضح اثر مرتب نہ کیا، پھر بھی یہ اپنی دانشورانہ وسعت اور گہرائی میں کافی ایڈوانس ہے۔ دی بووا کی ایک سوانح نگار نے اسے ''ہم سب کی ماں'' کہا۔

وہ پیرس کے ایک کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئی (1908ء)۔ اس کی پرورش کیتھولک ماحول میں ہی ہوئی۔ ژاں پال سارتر کے ساتھ اس کی تاحیات رفاقت کا آغاز عہدِ طالب علمی میں ہی ہو گیا (1929ء) دی بووا نے کچھ عرصہ سکول میں پڑھایا۔ وہ 1945ء کے بعد کثیر الاشاعت میگزین Le Temps Modernes میں سارتر کی شریک ایڈیٹر رہی۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ سارتر کا فلسفۂ وجودیت دی بووا کے ہاں زیادہ پرزور اور پائیدار نظر آتا ہے۔ لیکن دی بووا کا مقصد صرف اس احساس کا ابلاغ کرنا تھا کہ اس دور میں ایک پرفکر اور غور و خوض کرنے والی عورت کے طور پر زندگی کیسے گزاری جائے۔

کچھ عرصہ قبل حقوقِ نسواں کے نام نہاد علمبرداروں نے دی بووا کو اس بات پر بہت برا بھلا کہا کہ وہ سارتر کے سامنے بالکل جھک گئی تھی، لیکن یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے، اور دی سیکنڈ سیکس کے دلائل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے اپنے ناول The Mandarins (1954ء) میں امریکی ناول نگار نیلسن الگرین کے ساتھ اپنے طویل افیئر کو پوری تفصیل سے (مگر فکشن کے انداز میں) پیش کیا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ سیمون انگریز ناول نگار جارج ایلیٹ کی طرح یہ نہیں جانتی تھی کہ ''ایک عورت کا رویہ کیسے اپناتا ہے''...... یعنی بالکل کوئی افیئر نہ چلانا یا پھر حیاتیاتی رجحانات کے باوجود جراَت مندانہ ہم جنس پرستی کی راہ اختیار کرنا۔ تاہم، وہ اپنی نکتہ چینوں کے برعکس حقیقت میں دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ متعدد پرفکر ناول اور ڈرامے، چار کتابوں پر مشتمل یادداشتیں، جدید دنیا میں پرانے دور کا پراثر مشاہدہ La Vieillesse (1970ء) لکھنے کے بعد 1986ء میں فوت ہوگئی۔ وہ سارتر کی وفات کے چھ سال بعد تک زندہ رہی اور اپنی لے پالک بیٹی کے ساتھ کافی تنازعات کا شکار رہی۔

تاہم، دی سیکنڈ سیکس سیمون دی بووا کا موثر ترین کام ہے جس میں اس کے ملک کی حقوق نسواں کی تحریک مکمل انداز میں نظر آتی ہے۔ جتنا اس کتاب نے فرانس کو متاثر کیا وہ امریکہ پر فرائیڈان کی کتاب کے اثر کی نسبت کہیں کم براہِ راست تھا، لیکن ''دی سیکنڈ سیکس'' زیادہ پرفکر، عمیق النظر اور تحقیقی ہے۔ فرائیڈ کی ''مرکزیتِ لنگ'' (Phallocentricity) پر بھی اتنی اچھی دلچسپ باعمدہ بحث نہیں کی گئی۔

بلاشبہ دی بووا کا نکتۂ نظر ''وجودی'' تھا: یعنی اس کے خیال میں ایک ہر لحظہ بدلتی ہوئی کائنات میں انسان ہی انتخاب کرتا ہے کہ اسے کیا بننا ہے۔ وہ سارتر کی الحاد پرستی اور بورژوا کی گرافک کیٹیگرائزیشن سے پوری طرح متفق ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ کم پرجوش رہی۔ دی بووا نے عورتوں پر الزام عائد کیا کہ وہ مردوں جتنی ہی ''غیر معتبر'' ہیں کیونکہ وہ مردانہ کھیل کھیلتی ہیں:

> سچی بات تو یہ کہ عورتوں نے مردانہ اقدار کے مقابلہ میں کبھی بھی زنانہ اقدار قائم نہیں کیں: مردانہ استحقاق کے خواہش مند مردوں نے ہی یہ گریز ایجاد کیا۔ مردوں نے ایک زنانہ اقلیم...... زندگی کی، مجہولیت کی سلطنت...... تخلیق کرنے کا مفروضہ قائم کیا تا کہ عورتوں کو اس کے اندر قید کرسکیں۔

اس کے بعد سیمون دی بووا عورتوں کو بطور ''دوجا'' (the Other) بیان کرتی ہے۔ اس کے مطابق مرد عورت سے فرار نہیں حاصل کرسکتے تھے: چنانچہ انہوں نے اسے ''ایجاد'' کرلیا۔ اس نے کہا کہ ہم جنس پرست مرد بھی عورتوں سے چھٹکارا نہیں پاسکے، اور انہوں نے اپنی ہی جنس میں مسرت کے معروض میں فرجی سحر (Vaginal magic) داخل کردیا۔ (اس نے یہ بھی رائے دی کہ مرد جذباتی طور پر اپنے تخیل کی ''نرم و ملائم'' زنانہ دنیا کی جانب بڑھتا ہے جبکہ عورت ''سخت'' مردانہ دنیا میں رہنے پر مائل ہے۔) سیمون نے کہا کہ عورت اپنی بہترین حالت میں مردوں کے مصنوعی تصوف (باطنیت) اور بدترین صورت میں سادیت (Sadism) کی شکار ہے۔ اس نے عورتوں کی ہم جنس پرستی کے بارے میں بھی کافی وضاحت سے لکھا۔ ہم

> ....کا تعین ہرگز کسی ''جسمانی'' مقدر سے نہیں ہوتا............ سچ تو یہ ہے کہ ہم جنس پرستی جان بوجھ کر اپنائی ہوئی کجروی سے زیادہ ایک بدنصیبی ہے۔ یہ ایک مخصوص صورتحال میں منتخب کردہ رویہ ہے............ یعنی بیک وقت تحریک یافتہ اور آزادانہ اپنایا ہوا بھی۔ اس انتخاب کے حوالے سے موضوع کے نمایاں عناصر میں سے کوئی بھی...... جسمانی حالت، نفسیاتی پس منظر، سماجی صورت حال...... عنصر غیر فیصلہ کن نہیں، تاہم، یہ سب اس کی وضاحت میں شریک ہیں۔ دیگر راہوں کی طرح یہ بھی ایک راہ ہے جس کے ذریعہ عورت بحیثیت مجموعی اپنی حالت، بالخصوص اپنی شہوانی حیثیت کی جانب سے پیش کردہ مسائل کو حل کرتی ہے۔ سارے انسانی رویے کی طرح ہم جنس پرستی بھی مکروفریب، عدم مساوات، مایوسی و محرومی، کذب و ریا تک لیجاتی، یا پھر اس کے برعکس یہ حقیقی زندگی میں اپنے انداز اظہار کی مطابقت میں مکافاتی تجربات کا سرچشمہ بن جاتی ہے...... چاہے یہ تجربات بداعتقادی، کاہلی اور تصنع میں ہوں، یا تابندگی، فیاضی اور آزادی میں۔

قاری وجودی الحاد پرستی کے بارے میں چاہے کچھ بھی رائے رکھتا ہو، لیکن یہ ایک سادہ اور معتدل سمجھداری ہے، اور اس میں ہم جنس پرستی کی تعریف ایک اچھی چیز کے طور پر نہیں کی گئی۔

اسی سمجھداری میں سیمون دی بووا شاندار عمیق نظری کے ساتھ ''عورت کی مظلومیت'' کا تجزیہ کرتی ہے۔ ممتاز فرانسیسی مورخ اور مفکر Jules Michelet نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ

> عورت ایک اندرونی زخم کے باعث مسلسل تکلیف زدہ ہے۔ 28 میں سے پندرہ یا تیس برس کے لیے عورت کو نہ صرف معذور بلکہ مجروح بنا کر رکھا جاتا ہے۔ وہ محبت کے ازلی زخم کی تکلیف متواتر جھیلتی ہے۔

دی بووا کی رائے میں یہ چیز عورت کو انسان بننے میں مدد نہیں دیتی۔ وہ اس بنیاد پر ''زنانہ تصوف یا باطنیت'' سے نفرت کرتی تھی کہ ''عارفہ ایک غیر حقیقت کے ساتھ تعلق جوڑ لیتی ہے۔'' وہ مارکس کے براہِ راست اثر میں کہتی ہے کہ عورت کے پاس معتبر بننے کی صرف ایک راہ ہے کہ

وہ ''اپنی محنت کو معتبریت کے ساتھ استعمال کرے،'' یعنی اسے انسانی معاشرے میں مثبت عمل کے ذریعے سامنے لائے۔ ''دی سیکنڈ سیکس'' کا واحد ناقص پہلو یہ ہے کہ اس میں مذہبی جذبات کی وضاحت نہیں کی گئی۔ لہٰذا: ''سیاسی عقیدہ رکھنے'' اور ''یونینوں میں عسکری اقدام کرنے والی عورتیں ہی ...... روز مرہ کی بلا شکریہ محنت کو اخلاقی مفہوم دے سکتی ہیں۔''

''دی سیکنڈ سیکس'' کی اشاعت کے بعد ہونے والے واقعات (چیکوسلواکیہ پر کمیونسٹ قبضہ، 1956ء میں ہنگری پر روس کا حملہ) نے سارتر اور دیگر مارکسی وجودیوں کو ایک قسم کی دربدری سے دوچار کر دیا: وہ دیکھ سکتے تھے کہ سوویت روس بہت کم حوالوں سے حقیقی مارکسی ریاست ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ ان مفکرین کی یہ گوشہ گیری سیمون کی کتاب کی کمزوریوں میں منعکس ہوتی ہے۔

لیکن سیمون کو ایک کمزوری کا مورد الزام تو بالکل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ کمزوری اس بات سے انکار کرنا تھا کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی حقیقی فیصلہ کن فرق۔ حتیٰ کہ جسمانی بھی نہیں ...... موجود نہیں۔ لیکن خود کو آزاد کر لینے والی نادر عورت کے بارے میں بھی سیمون لکھتی ہے کہ یہ عورت

> ایک اخلاقی، سماجی اور جسمانی صورتحال میں بھی مرد جیسی ...... کیونکہ اپنی بالغ زندگی کا آغاز کرنے پر اس کے پیچھے لڑکوں جیسا ماضی موجود نہیں ہوتا ...... کائنات اسے ایک مختلف تناظر میں دکھائی دیتی ہے ...... وہ خود کو مونث کی حیثیت میں محدود رکھنے سے انکار کر دیتی ہے، کیونکہ ایسا کرنے میں اس کی قطع برید ہو جائے گی؛ لیکن اس کی جنس کو نامنظور کرنا بھی تو ایک قسم کی قطع و برید ہی ہوگا۔

یہ رائے اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ سیمون دی بووا نے کبھی بھی سنجیدگی سے عورت کے ''مرد بن جانے'' کے بارے میں نہیں سوچا، اور نہ ہی اس بارے میں شبہ کیا کہ دونوں جنسوں کے مابین ایک ناگزیر فرق موجود تھا۔ کتاب کی ایک خامی اس کا حد سے زیادہ سیاسی ہونا بھی ہے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ مرد اور عورتیں صرف ''اپنے فطری امتیازات کے ذریعہ'' ہی ''بھائی چارے'' کو یقینی بنا سکتے ہیں:

''عورت گمشدہ ہے۔ عورتیں کہاں ہیں؟ آج کی عورتیں ہرگز عورتیں نہیں!'' ہم نے غور کیا ہے کہ ان پراسرار نعروں کا کیا مطلب ہے۔ مردوں کی نظر میں ...... اور مردوں کی نظر سے دیکھنے والی عورتوں کے جم غفیر کے لیے ...... صرف نسوانی جسم کا مالک ہونا یا محبوبہ یا ماں کا نسوانی وظیفہ اختیار کر لینا ہی ''حقیقی عورت بننے کے لیے کافی نہیں۔ کوئی عورت جنسیت اور مادرانہ پن میں خود مختاری کا دعویٰ کر سکتی ہے، لیکن ''حقیقی عورت بننے کی خاطر اسے خود کو بطور ''دوجا'' قبول کرنا ہوگا۔

کیا یہ پراسرار نعرے اب بھی نہیں لگائے جا رہے؟

92

سائبرنیٹکس

"Cybernetics"

نوربرٹ وِینر

1948ء (نظر ثانی 1961ء)

ریاضی دان نوربرٹ وینر (Norbert Wiener) کا نام شاید ہی آپ میں سے کسی نے سن رکھا ہو، البتہ سپیشلسٹ حضرات کے لیے وہ ہرگز انجان نہیں۔ لفظ "سائبرنیٹکس" اسی نے وضع کیا جو یونانی لفظ "Kybernetes" (گورنر) سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ لفظ اپنے موجد ریاضی دان

کی نسبت کہیں زیادہ مشہور ہے۔ معتبر اور معروف لغات اور انسائکلو پیڈیاز میں بھی اس لفظ کے حوالے سے وینر کا نام شاذ و نادر ہی لکھا ہے۔ بہرحال وینر چاہتا تھا کہ اسے انسانیت پسندی کے حوالے سے زیادہ یاد رکھا جائے۔

وینر سے لاپروائی بدقسمتی تو ہے مگر ہرگز حیرت انگیز نہیں۔ اس کے کارناموں کو بیان کرنا کسی بھی طرح آسان نہیں ہے۔ صرف سپیشلسٹ ہی یہ کام بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہے:

> کسی الیکٹریکل انجینئر کی نظر میں وہ مواصلات اور کنٹرول کی جدید (شماریاتی) تھیوری کا بانی ہے: نظری طبعیات دان کے لیے وہ فنکشنل انٹیجرل اور پاتھس متعارف کروانے کی وجہ سے اہم ہے: اور ماہر حیاتیات کے خیال میں وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے منفی اور مثبت فیڈ بیک، سائبرنیٹک سسٹم، میسج اور noise کے تصورات کو حیاتیات میں متعارف کروایا۔ حد سے زیادہ عسکریت اپنانے کے مخالفین کے لیے وہ ایک مثالی شخص ہے جس نے ہتھیاروں کے میدان میں سرگرمی کے ساتھ کام کرنے کے بعد انہیں مسترد کیا......

نوربرٹ وینر 20ویں صدی کی نہایت قابل ذکر شخصیات میں سے ایک تھا، اور بلاشبہ اس نے اپنے یکتا پن کی نفسیاتی لحاظ سے قیمت ادا کی ...... جیسے اس سے قبل موزارٹ اور مینڈل سوہن نے کی تھی۔ اس نے اپنی دو خود نوشتہ سوانحات (1953ء اور 1956ء) میں اس متعلق بتایا۔ یہ اچھے انداز میں لکھی ہوئی کتب سائنسی قسم کے غیر متنازعہ جینئس کی تفہیم عطا کرتی ہے، لیکن انہیں زیادہ پڑھا نہیں گیا۔

وینر کا روسی باپ لیو وینر ہارورڈ یونیورسٹی میں سلاوونک زبانوں اور ادب کا پروفیسر تھا اور نوربرٹ کی پیدائش کولمبیا، میسوری میں ہوئی۔ باپ نے اس کی بہت زیادہ مدد اور رہنمائی کی۔ اس نے 1909ء میں Tufts یونیورسٹی سے 14 برس کی عمر میں گریجوایشن کر لی۔ بعد میں وہ حیاتیات کی بجائے فلسفے میں دلچسپی لینے لگا، اور آخر کار ریاضی دان بن گیا۔ اس کے لیے کوئی بھی سائنسی بات کبھی مشکل کا باعث نہ بنی۔ 19 برس کی عمر میں وہ "ہارورڈ ٹریولنگ فیلو" تھا اور

بیس برس کی عمر میں کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ میں برٹرینڈ رسل کے پاس زیر تعلیم تھا۔ تب وہ رسل اور وائٹ ہیڈ کی تصنیف "Principia Mathematica" (1910ء تا 1913ء) کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ رسل نے اس سے متاثر ہو کر اسے ریاضی کے شعبے سے ہی منسلک رہنے کی نصیحت کی۔ اس کے بعد وہ گوٹنجن (جرمنی) گیا اور وہاں کچھ دیر تک ایک اور عظیم ترین ریاضی دان ڈیوڈ ہلبرٹ کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ وہ 1919ء سے لے کر 1984ء میں اپنی وفات تک میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پروفیسری کرتا رہا (وہ صرف 25 برس کی عمر میں اسسٹنٹ پروفیسر بن گیا تھا)۔

وینر کی مختلف بصیرتوں کے حوالے سے ایک اہم اقتباس اس کی سوانح عمری کی دوسری جلد میں ملتا ہے، اور یہ اسے سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ سائنس اور منطق کے میدانوں میں کام کرنے والا اس جیسا شخص خود کو بڑی خوشی کے ساتھ برٹرینڈ رسل کے تجزیاتی فلسفیانہ پن سے منسلک کر سکتا تھا۔ مگر وینر کو کیر کیگارڈ میں زیادہ دلچسپی تھی، جس نے فلسفۂ وجودیت کو قائم کرنے میں کسی بھی اور فلسفی کی نسبت زیادہ کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ سائنس کے مذہبی پہلوؤں کی جانب بھی متوجہ ہوا۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے الفریڈ وائٹ ہیڈ کی اختیار کردہ مذہبی سمت میں مزید آگے قدم بڑھایا۔ چیک امریکی کرٹ گوڈیل نے اپنے عہد ساز تھیورم (1931ء) میں یہ ثابت کیا کہ ریاضی ''کامل'' نہیں تو وہ دیگر ریاضی دانوں جتنا ناخوش نہیں ہوا تھا۔ وینر نے ''میں ریاضی دان ہوں'' میں لکھا:

> میرے لیے، منطق اور علم اور ذہنی سرگرمی کی دیگر تمام صورتیں ہمیشہ ایک مکمل اور اختتام یافتہ تصویر جیسی ناقابل تفہیم رہی ہیں، اور میں نے ہمیشہ انہیں ایک ایسے عمل کے طور پر سمجھا ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرتا ہے...... ہم بدنظمی کے عظیم دھارے کی مخالف سمت میں تیر رہے ہیں...... تیرنے کا عمل جاری رکھنا ہی عظیم ترین ممکنہ فتح ہوگی...... کوئی بھی شکست ہمیں اس کائنات میں (جو ہم سے لاپروا لگتی ہے) کچھ دیر کے لیے ہست رہنے کی کامیابی سے محروم نہیں کر سکتی۔

وینر کے کام کو بحیثیت مجموعی بے ترتیبی کو شکست دینے یا اس کے اثرات کو محدود کرنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے اپنے فلسفہ کو کافی نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ خود فلسفی نہیں تھا مگر اس کا کام متواتر ''فلسفہ کیا ہونا چاہیے'' کے حوالے سے آراء کو متاثر کرتا رہا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران وینر نے دیگر چیزوں کے علاوہ اینٹی ایئر کرافٹ فائر کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے حوالے سے بھی کام کیا۔ اس نے دلیل دی کہ اگر بالکل درست فائر کیا جا سکے تو پائلٹ کسی منصوبے کے بغیر حملے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اندازہ لگانے کی اسی قابلیت نے اسے سائبر نیٹکس کی سائنس تخلیق کرنے پر مائل کیا۔ اس کے مطابق سائبر نیٹکس ''جانور اور مشین میں کنٹرول اور کمیونیکیشن کی سائنس ہے۔'' وہ انسانوں کی جگہ پر مشینیں استعمال کرنے کی وکالت نہیں کرتا، اور نہ ہی اس نے یہ کہا کہ (جیسا کہ بی ایف سکنر نے کہا تھا) انسانوں کو واحد آقا کے زیر اختیار مشینوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ درحقیقت انسان مشینیں نہ بننے کی اہلیت رکھتے تھے، لیکن کافی حد تک مشینوں کی طرح ہی عمل کرتے تھے۔ وینر کو اسی امر میں دلچسپی تھی۔ ایک موقع پر تو اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ سائبر نیٹکس کی مدد سے دماغی مریضوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔

ابتداء میں امریکی پبلشرز ایک ایسی کتاب میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے جس میں بتایا گیا تھا کہ انسانوں کے بارے میں ہماری تفہیم کو بڑھانے کے لیے ریاضیاتی اصول کس طرح استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ''سائبر نیٹکس'' نے اس کی توجہ حاصل کر لی اور ایک وقت تو ایسا بھی تھا جب اس کا اطلاق ہر قابل تصور موضوع پر کیا گیا (بشمول نفسیات، حیاتیات اور سوشیالوجی)۔ فیڈ بیک، منفی فیڈ بیک، مثبت فیڈ بیک، ان پٹ، انفارمیشن کنٹرول، آؤٹ پٹ اور فلٹرنگ جیسی اصطلاحات کا استعمال بلا تخصیص ہونے لگا۔ آج کل کی مشینوں کی بہتر کارکردگی میں وینر کا بڑا ہاتھ ہے۔ شاید اس کے اور بھی زیادہ جاندار خیالات (مثلاً نیک ارادے اور انصاف پر یقین) ابھی تک موزوں حد تک اثر انداز نہیں ہوئے۔ کم از کم اس کی سوانحات کو تو ضرور پڑھا جانا چاہیے۔

93

انیس سو چوراسی

"Nineteen Eighty-Four"

جارج آرویل

1949ء

جارج آرویل کی ضد یوٹوپیا، (جہاں ہر چیز خوفناک ہے) ''انیس سو چوراسی'' کی منصوبہ بندی 1943ء میں ''یورپ کا آخری آدمی'' کے زیر عنوان ہوئی۔ چنانچہ یہ اس کی موت کا باعث بننے والی تپ دق کی بیماری کا ترش ردعمل نہیں تھی۔ آرویل 1950ء میں 50 برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کی تصنیف ذاتی مایوسی سے بالکل پاک ہے۔ یہ ایک تصوراتی ریاست

کے ماتحت انفرادی زندگی کی ناگفتہ بہ حالت کی تصویر کشی کرتی ہے۔ مستقبل کی یہ ریاست سوویت یونین کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جذبات سے عاری سوشلزم کے تحت انفرادیت نہ صرف کم بلکہ تباہ ہو جاتی ہے۔

آرویل نے اپنی فیاضی اور انکساری کو برقرار رکھا۔ تاہم، اس نے شدید مایوس کن بیماری کی حالت میں ناول مکمل کیا۔ لیکن یہ ایک موت زدہ آدمی کی جانب سے ایک انتقامی پیشگوئی نہیں تھی۔ اس کی بجائے یہ طنز بھر پر امید، ممکنہ صورتحالات کی یاد دہانی تھا۔

''انیس سو چوراسی'' بہت اثر انگیز ثابت ہوا: کچھ لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ اس نے اپنی پیش بینیوں کو حقیقت کا روپ دھارنے سے روکا۔ اس میں شامل ''بگ برادر'' اور دیگر اصطلاحات زبان کا حصہ بن گئیں۔ یہ سٹالنسٹ ''پاکیزگی'' اور فریب پر طنز کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے دور کی استبدادی ''سیاسی درنگی'' کی پیش بینی بھی کرتا ہے۔ ابتداء میں ''انیس سو چوراسی'' کی مخالفت تو ہوئی ہی تھی۔ قابل سکاٹش نقاد ڈیوڈ ڈیچز نے اسے ''شاندار انداز میں بے کارا'' قرار دیا۔

آرویل 1903ء میں بنگال میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ انڈین گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ پیدائش کے بعد اس کا نام ایرک آرتھر بلیئر رکھا گیا۔ اس نے ایٹن کے خصوصی پبلک سکول میں داخلہ لیا، مگر یونیورسٹی میں جانے کے لیے سکالرشپ حاصل نہ کر پایا اور برما میں ''امپیریل انڈین پولیس'' میں بھرتی ہوا، اور پھر سکول ماسٹر اور صحافی کے طور پر زندگی گزاری۔ ابتدائی زمانے میں اس نے خود کو ''انارکسٹ'' بیان کیا مگر 1930ء کی دہائی کے دوران سوشلزم کا زبردست حامی بن گیا۔ آرویل پر بائیں اور دائیں بازو (سوویت روس کے خلاف طنزیہ ناول "Animal Farm" کی وجہ سے) دونوں نے حق جتایا۔ مگر اس کا عمومی رویہ بائیں بازو کی جانب رجحان ظاہر کرتا ہے...... امن پسند، سرمایہ داری کا مخالف، زیریں- متوسط- اور بالائی طبقات کی تقسیم پر شرمسار، اور مزدوروں کی سادہ اقدار میں شراکت کا تمنائی۔

سب چیزوں سے بڑھ کر وہ ایک قلم کار تھا، اور اپنا زیادہ تر وقت یہ منصوبہ بندی کرنے کی کوشش میں صرف کیا کہ بحیثیت مصنف اپنی آزادی کو قربان کیے بغیر انسانیت پسندانہ اور

اصلاحی سیاسی خیالات کو کس طرح عملی جامہ پہنائے۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی...... لیکن اگر اس نے اس قسم کے ٹکراؤ کی ضرورت محسوس نہ کی ہوتی تو یقیناً وہ ویسا مصنف نہ بن پاتا جیسا کہ بنا۔ اپنے دور کے بہت سے انگریزوں کی طرح اس کے طرز عمل میں تبدیلی 1947ء کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتی ہے:

''اگر آپ کو روس اور امریکہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو آپ کسے منتخب کریں گے؟''...... ہم اب اتنے طاقتور نہیں رہے کہ الگ تھلگ رہ سکیں، اور اگر ہم ایک مغربی اتحاد (یونین) کو وجود میں نہ لا سکے تو طویل المدت میں ہم ایک یا پھر دوسری عظیم طاقت کی پالیسی کے تحت چلنے پر مجبور ہوں گے...... اور ہر کوئی اپنے دل سے جانتا ہے کہ ہمیں امریکہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔

کچھ اینٹی کمیونسٹ امریکیوں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ آرویل امریکہ کا معترف تھا، مگر حقیقت ایسی نہیں۔ مثلاً وہ زندگی بھر ایٹم بم کی شدید مخالفت کرتا رہا: ''اگر ہم نے اسے مسترد نہ کیا تو یہ ہمیں تباہ کر دے گا۔''

آرویل ہسپانوی سول جنگ میں فرانکوں کے خلاف لڑنے کے لیے سب کچھ چھوڑ کر سپین چلا گیا۔ اس لڑائی کے دوران (جب وہ زخمی بھی ہوا) اسے پہلی مرتبہ ان سٹالنی طریقوں کا علم ہوا جن پر اس نے ''اینیمل فارم'' میں طنز کی۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس نے ''لیبر'' کو ووٹ دیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مزدور طبقہ ''لیبر'' کو ووٹ دے گا۔

''اینیمل فارم'' نے اسے کچھ شہرت دلائی مگر ''انیس سو چوراسی'' نے تو عالمی سطح پر مشہور کر دیا۔ خود آرویل نے تسلیم کیا تھا کہ یہ ایک اور (مغرب میں بہت کم مشہور) ضد یوٹوپیا "We" کی بنیاد پر تھا (جو Zamyatin نے لکھی تھی)۔ تاہم، ''انیس سو چوراسی'' کے حوالے سے "We" کا نہیں بلکہ برطانوی ناول نگار آلڈس ہکسلے کی "Brave New World" (1933ء) کا خیال آتا ہے۔

ہکسلے کی کتاب کا مقصد پیش گوئیاں کرنا تھا۔ اور اس نے ایک تخیلاتی کام کی بجائے ایک پیش گوئی کے طور پر ہی کامیابی حاصل کی۔ اس کے ذریعہ ہکسلے اپنے دور کے ذہنی خالی پن اور

شہوت پرستی کے رجحانات سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے بھی ایوگینی زمیاتن (1884ء تا 1937ء) کی تصنیف "We" سے کافی کچھ لیا تھا۔ لیکن ہکسلے نے نہ معلوم وجوہ کی بنا پر زمیاتن کا حوالہ تک نہ دیا اور کہا کہ اس نے "We" نہیں پڑھا۔ تاہم، یہ امر یقینی ہے کہ اس نے واقعی زمیاتن کی تحریر پڑھ رکھی تھی اور کسی بھی نقاد کو اس حوالے سے کوئی شک نہیں۔

آرویل کے ''انیس سو چوراسی'' کی بنیادوں میں زمیاتن کا "We" موجود ہے۔ لیکن اس سے انیس سو چوراسی کی قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شیکسپیئر کے کئی ڈراموں کے پلاٹ بھی تو کچھ دیگر تصنیفات سے مستعار لیے ہوئے ہیں۔ لیکن آرویل کے ناول کا حوالہ ادبی سے زیادہ سیاسی بنتا ہے۔ "We" کا شمار 100 عظیم ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ''انیس سو چوراسی'' انگلینڈ کی ایک اسطورہ اور اس امر کی ایک خوبصورت شرح بھی ہے کہ "Etonianism" (جس سے آرویل بخوبی آگاہ تھا) کا ویز چھلکا ٹوٹنے والا تھا۔ اس دور میں ایٹن کی حکومت کا انحصار رسوماتی دہشت (Ritual terror) پر تھا...... فرد کے مفادات میں ملفوف دہشت۔ آرویل نے اس کا اثر بھی لیا اور اس سے نفرت بھی کی۔ آرویل کا کردار او برائن اپنے ''عام ہیرو'' ونسٹن سمتھ سے کہتا ہے:

پارٹی صرف اپنی خاطر اقتدار کی متمنی ہے۔ ہم دوسروں کی بہتری میں دلچسپی نہیں رکھتے؛ ہمیں صرف اور صرف اقتدار میں دلچسپی ہے۔ اب آپ سمجھ جائیں گے کہ خالص اقتدار یا طاقت کیا ہے...... جرمن نازی اور روسی کمیونسٹ اپنے طریقہ ہائے کار میں ہمارے بہت قریب آ گئے ہیں، لیکن ان میں اپنے ارادوں کو تسلیم کرنے کی ہمت کبھی نہیں تھی...... اقتدار ایک ذریعہ نہیں بلکہ مقصد ہے...... ایذا دہی اور تادیب کا مقصد صرف ایذا دہی اور تادیب (Perseustion) ہی ہوتا ہے......

اگر دنیا، یا دنیا کا ایک حصہ اس قسم کی باتوں سے کم خوف کھاتا ہے تو اس کی وجہ کافی حد تک آرویل ہی ہے۔

94

بیلزیبب کے قصے، اپنے پوتے کیلیے

"Beelzebub`s Tales to His Grandson"

جارج ایوانووچ گُردجیف

1950ء

تمیں سال قبل ہم بیس افراد نے وسطی ایشیا میں کئی برس گزارے، اور ہم نے زبانی روایات، قدیم ملبوسات کے مطالعے، لوک گیتوں اور مخصوص کتب کی مدد سے عقیدے کی عمارت دوبارہ تعمیر کی۔ عقیدہ ہمیشہ سے موجود تھا، لیکن روایت معطل ہو گئی تھی۔ قدیم دور میں کچھ گروہ اور ذاتیں اس کے بارے میں جانتی تو تھیں مگر

پوری طرح نہیں۔ قدیم لوگوں نے مابعد الطبیعیات پر بہت زیادہ زور دیا، ان کا عقیدہ بہت مجرد تھا۔

گُردجیف نے یہ بیان 1923ء میں اپنے عقیدے کے ماخذ کے حوالے سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے دیا تھا۔ تب گُردجیف کو اس عقیدے کا پرچار کرتے ہوئے تقریباً ایک عشرہ ہو چکا تھا۔ عقیدے کا اصل جوہر ''بیلزیبب کے قصے، اپنے پوتے کے لیے'' میں ہے۔ اس کتاب کا اثر بہت عمیق ہے، لیکن غیر محسوس انداز میں۔ اگرچہ اس میں، کہیں کہیں مبہم صورت میں، اس مخصوص تعلیم کی جھلک ملتی ہے جو پی ڈی اوسپنسکی نے اپنی کتاب ''معجزے کی جستجو: ایک نامعلوم تعلیم کے شذرے'' میں پیش کی تھی۔ آخری عمر میں گُردجیف نے اوسپنسکی کی کتاب کی اہمیت کو تسلیم بھی کیا تھا۔

تو پھر اوسپنسکی کی ''معجزے کی جستجو'' کی بجائے ''بیلزیبب کے قصے'' کیوں منتخب کی گئی؟ وجہ سیدھی سادی ہے: گُردجیف کے پرچار کردہ ''نظام'' یا عقیدے کے بغیر ''معجزے کی جستجو'' بھی نہ ہوتی۔ اور ''بیلزیبب کے قصے'' گُردجیف کی سائنس، فکشن انداز میں اپنی تعلیمات کی تفسیر ہے۔ چنانچہ اس نے ایک تحریک شروع کی جس نے لاکھوں لوگوں کو عوامی اور نجی لحاظ سے متاثر کیا۔ کپلنگ' جے بی پریسٹلے اور آلڈس ہکسلے اس کے عقیدے کا اثر قبول کرنے والے مشہور قلم کاروں میں شامل ہیں۔ لیکن بہت سے امریکی ہپیز، برطانوی اراکین پارلیمنٹ، بزنس مین، بینک کار اور دیگر بھی گُردجیف یا پھر اوسپنسکی کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ گُردجیف کا ''عقیدہ'' آج تک مشرقی اور مغربی سوچ کا سب سے زیادہ قائل کر لینے والا ادغام ہے۔ یہ Blavatskyism یا ''ماورائی مجاہدے'' کو بہت سادہ بناتا ہے۔

زرتشت مت، بدھ مت، عیسائیت (بالخصوص مشرقی آرتھوڈوکس)، قبالہ، صوفی ازم، فیثاغورثیت اور دیگر مذاہب ونظاموں کے عناصر ''عقیدے'' میں موجود ہیں۔ گُردجیف کو یقین تھا کہ اس کے تیار کردہ مسلک میں انسانی ہستی کے متعلق بہت سی سچائی شامل تھی: اس نے سچائی کو مشکل خیال کیا: لہٰذا اس نے ہر ایسے شخص کے لیے زبردست مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کردیں جو اس کے بارے میں جاننے کا خواہشمند ہوتا۔

جارج ایوانووچ گرجیف یونانی باپ اور آرمینیائی ماں کے ہاں 1866ء میں روسی آرمینیا میں Kars کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا باپ آیوناس جارجیادیس چرواہا تو تھا مگر ایک لوک شاعر بھی تھا۔ 1873ء میں جب طاعون کی وبا نے اس کے مویشیوں کا صفایا کر دیا تو وہ لکڑی کا کاروبار کرنے لگا۔ گرجیف بچپن سے ہی اپنے باپ کو لوک اور اساطیری نظمیں گنگناتے ہوئے سنتا آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مشہور ترکی کردار ملا نصر الدین کی کہانیاں بھی سنی تھیں جو گرجیف کے ایک مزاحیہ کردار کے لیے رول ماڈل بن گیا۔ اس کی پرورش چھ بہن بھائیوں کے ہمراہ ہوئی۔ والدین اسے پادری بنانا چاہتے تھے۔

گرجیف لوگوں کو اچانک دھچکا (Shock) پہنچانے کا شوقین تھا۔ اس کے خیال میں دھچکے اگرچہ عارضی ہوتے ہیں مگر لوگوں کو ان کے حقیقی روپ میں لے آتے ہیں۔ وہ بڑے جوش سے کہتا ہے کہ مخلوقات سورج کی سطح پر آباد ہیں..... جو برفانی حد تک ٹھنڈا ہے۔ بوزنے انسان کی اولاد ہیں۔

اس کا انداز دانستہ شفاف، فصیح، ظریفانہ اور ہلکا پھلکا تھا۔ زیر بحث کتاب کا مسودہ گرجیف نے پنسل سے اپنی مقامی آرمینیائی زبان میں لکھا تھا۔ روسی شاگردوں نے اسے روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ انگریزی کے مترجم اور ایڈیٹر الفرڈ اوریج نے گرجیف سے صلاح مشورہ کر کے کتاب کو انگریزی جامہ پہنایا۔ اوریج نے 1920ء کی دہائی کے اوائل میں گرجیف کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنے کی خاطر ''نیو ایج'' کی ایڈیٹری چھوڑ دی تھی۔

بیسویں صدی کے تمام روحانی گروؤں میں سے گرجیف اس اعتبار سے یکتا تھا کہ اس نے اپنے معتقدوں کی اپنے لیے عقیدت کی حوصلہ شکنی کی۔ وہ چاہتا تھا کہ شاگرد خود سوچیں اور عمل کریں۔

بیس یا تیس برس تک گرجیف نے ایسے مردوں اور عورتوں کی صحبت میں رہ کر علم و دانش کی جستجو کی جو بنیادی سوالات کے جواب چاہتے تھے..... مثلاً میں کیوں موجود ہوں؟ ہم کیوں موجود ہیں؟ کیا زندگی کا کوئی مقصد ہے؟ اگر انسان کسی طرح لافانیت پا سکتے ہیں تو کیسے؟ فطرت کے قوانین کیا ہیں اور ہم انہیں کس حد تک جان سکتے ہیں؟ اس نے ان تمام برسوں کا

افسانوی بیان اپنی سادہ ترین کتاب "Meetings with Remarkable Men" میں پیش کیا۔ پیٹر بروک نے 1979ء اسی نام سے اس پر ایک فلم بنائی۔ اس کا سکرین پلے بروک نے خود لکھا اور گرجیف کے اپنے متعین کردہ جانشین جین ڈی سالزمان سے رہنمائی لی (سالزمان نے 101 برس کی عمر میں 1990ء میں وفات پائی۔)

گرجیف کی زندگی کا بہترین دور 1920ء کی دہائی کے اوائل میں آیا۔ مختلف شہروں میں اپنا مکتبہ کھولنے کے بعد وہ فونٹین بلیو میں Prieure کے مقام پر سکونت پذیر ہو گیا۔ یہاں اسے اخبارات میں کچھ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر وہ درست قسم کے شاگردوں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا، اور اسے روپے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے امیر امریکیوں اور دیگر کو شاگرد بنانے سے نفرت نہیں تھی۔

1922ء کے اواخر میں نیوزی لینڈ کی افسانہ نگار کیتھرین مینز فیلڈ اس سے ملنے Prieure آئی۔ وہ اپنی شہرت کے عہد عروج میں تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو چکی تھی۔ طبی علاج نے اس کی حالت اور بھی بگاڑ دی تھی۔ گرجیف نے اس کا خیال رکھا اور اسے روحانی سکون دیا جو کہیں اور نہیں مل پایا تھا۔ جنوری 1923ء میں اپنی اچانک مگر ناگزیر موت کے وقت اس نے گرجیف اور اس کے عقیدے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر بھی گرجیف کو ''کیتھرین کو ہلاک کرنے والا نیم حکیم'' کہا گیا۔

1924ء میں گرجیف ایک کار ایکسیڈنٹ میں مرتے مرتے بچا۔ لگتا ہے کہ اس نے حادثے کی پیش بینی کر لی تھی، حتیٰ کہ اپنے ساتھ (اس قسم کے مواقع پر) باقاعدگی سے سفر کرنے والی خاتون کو بھی اس بار ساتھ نہ لیا۔ معجزاتی طور پر وہ صحت یاب ہو گیا، لیکن اسے فونٹین بلیو میں پرانے طریقے سے زندگی جاری رکھنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس نے عقیدے کے بارے میں ریکارڈز مرتب کرنے کا فیصلہ۔ 1930ء کی دہائی کے اواخر میں اس نے یہ کام مکمل کر لیا۔ تاہم، "All and Everything" نامی مجموعے کی آخری جلد (Lifels Real Only Then, Whon "I Am") کبھی مکمل نہ ہو سکی۔ گرجیف کی بقیہ زندگی کے دوران مختلف شاگردان کتب کو پڑھتے رہے۔ آخر کار وہ 1949ء کے اواخر میں مر گیا۔ ''بیلز بب'' 1950ء

میں شائع ہوئی، اور دیگر دو کتب اس کے بعد۔

گُرجیف کے مسلک کے حوالے سے پہلی اہم چیز یہ ہے کہ اس میں کسی بھی ایسے شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں جو حقیقی تنقیدی اور تشکیکی جذبے کے ساتھ غور و فکر کے بعد اس کی جانب نہ آیا ہو۔ اس میں ایک تکوینیات (Cosmology) اور نفسیاتی نظام موجود ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کو آگہی حاصل کرنے میں مدد دینے کا ایک طریقہ کار بھی ہے۔ لیکن اس کے لیے کامل خلوص درکار ہے...... ایسا خلوص جو عام جھکتی یا اعتقاد سے بالاتر ہو۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مرد اور عورتیں عام انداز حیات میں زیادہ تر وقت ''نیند میں'' گزارتے ہیں۔ جیسا کہ گرجیف کے پیشرو فارسی شاعر رومی نے کہا تھا:

> اس دنیا میں تمہاری زندگی ایک سوئے ہوئے شخص جیسی ہے جو خواب میں خود کو سوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، ''اب میں سو رہا ہوں'' اور یہ نہیں جانتا کہ وہ تو پہلے سے ہی دوسری نیند میں ہے۔
>
> (بقول غالب: ''ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں''۔ مترجم)

ہم اپنی معمول کی زندگی میں مشینیں ہیں جن کی کارکردگی کا انحصار خالصتاً خارجی مہمیز پر ہے۔ فطری نیند سے بیدار ہونے پر ہم دراصل مکمل بیدار نہیں ہوتے، مگر خود کو بیدار ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ شاگردوں کو متواتر ''خود کو یاد رکھنے'' کی مشق کروائی جاتی ہے: اپنے اردگرد سے آگاہ رہنے کی کوشش کرنا، اپنے اندرونی مشینی نفس کو درست کرنا، اپنی اہم خطاؤں کا پتہ لگانے کی کوشش کرنا۔ کسی شخص کی شخصیت کو اس کے جوہر سے ممیز کیا جاتا ہے۔ اپنے جوہر سے آگاہ ہونے کے لیے شخصیت کو مطیع بنانا آنا چاہیے۔ اس تقلیبی عمل کو صرف معجزہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

1923ء میں گرجیف نے پروفیسر ڈینس سورات کو اپنے یورپ آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ

> میں مشرق کی باطنی روح کو مغرب کی سائنسی روح کے ساتھ ملانا چاہتا ہوں۔ مشرقی روح راہِ راست پر ہے، لیکن صرف اپنے رجحانات اور عمومی تصورات میں۔ مغربی روح اپنے طریق ہائے کار اور تکنیکوں میں ٹھیک ہے۔ تاریخ میں صرف مغربی طریقے ہی موثر رہے ہیں۔ میں ایک ایسی قسم کا ولی تخلیق کرنا چاہتا ہوں جو مشرقی روح کو مغربی تکنیکوں کے ساتھ ملا کر دے گا۔

واٹسن، سکنر اور اس قبیل کے دیگر کرداریت پسند (behavioristic) ماہرین نفسیات کی پیش کردہ ''انسانی مشین'' اور گرجیف کے نظریے میں کافی کچھ مشترک پایا جاتا ہے۔ لیکن گرجیف کی نفسیات اصل میں قطعی مختلف ہے۔ عام انسان واقعی ایک مشین ہے۔ لیکن وہ اپنی ''عام'' حالت میں بھی اچانک جھٹکوں کے باعث بیدار ہوتا ہے۔ وہ مشین جیسا ردعمل دیتا لیکن اپنے اندر ایسا نہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ ''بیلزیب کے قصے'' موجودہ حالات کو بہتر بنانے کے بارے میں بتاتے ہیں۔

rekhta

95

فلسفیانہ تحقیقات

"Philosophical Investigations"

لُڈوگ وِٹگنسٹین

1953ء

آسٹریائی فلسفی اور ریاضی دان لڈوگ وٹگنسٹین (1889ء تا 1951ء) نے 20 ویں صدی کے فلسفہ میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ فلسفہ کے میدان میں اس کی شخصیت جرمن گوئٹے یا آئرش ڈبلیو بی Yeats سے ملتی ہے۔ تاہم، آج بھی کچھ برطانوی یا امریکی فلسفی اس کے نظریۂ فلسفہ کے ساتھ متفق ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ الجھن ختم کرنے کا اقاعدہ ہے...... ورنہ کچھ بھی نہیں۔ بہ الفاظ

دیگر فلسفہ برائے فلسفہ بے کار ہے۔

وٹگنسٹین کی زندگی میں اس کی صرف ایک کتاب "Tractatus" (1921ء) ہی شائع ہوئی تھی دوسری اہم کتاب ''فلسفیانہ تحقیقات'' مرنے کے بعد ہی شائع ہوئی۔ عظیم تسلیم کیے جانے والے تمام فلسفیوں میں سے صرف ایک وٹگنسٹین ہی ایسا تھا جس نے بہت کم فلسفہ پڑھا تھا۔ یہ اس کے لیے زیادہ کارآمد نہیں تھا۔ برطانوی ماہر کرداریت (Behaviorist) فلسفی گلبرٹ رائکل اس کے تصوف سے نالاں تھا مگر اس کے علم کو تسلیم کرتا تھا۔ تاہم، وٹگنسٹین نے جتنا بھی فلسفہ پڑھا اسے اچھی طرح سمجھ بھی لیا۔ شوپنہاور کی تحریروں نے اس پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اس کے علاوہ عظیم آسٹریائی طنز نگار، شاعر اور ایڈیٹر کارل کراز، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، برٹرینڈ رسل، جی ای مور اور فرائیڈ نے بھی متاثر کیا۔ وہ شاعری اور عیسائی روایت کو بہت پسند کرتا تھا۔

ان میں سے سب سے زیادہ اثر غالباً ٹالسٹائی کا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اس کی "Gospels" پڑھتے ہوئے وٹگنسٹین صوفی بن گیا۔

یہ معاملہ متنازعہ ہے کہ وٹگنسٹین کی ہم جنس پرستی کا اس کے فلسفیانہ رویوں اور خودکشی کے دوروں کے ساتھ کیا تعلق تھا: اس میں ذہنی سرگرمی کے ہمراہ ایک بلند شہوانیت کی حالت بھی ملتی ہے؛ لیکن وہ اس یقین کا حامل بھی نظر آتا ہے کہ شہوانیت پر عمل درآمد...... مثلاً مشت زنی، یا عورتوں/مردوں کے ساتھ صحبت...... محبت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ یہ چیز اکثر فلسفیوں کی بجائے شاعر محسوس کرتے ہیں (اخلاقیات کے مردِ مبلغ اکثر دوسرے مردوں کی بیویوں کو لے کر بھاگ گئے)۔ وٹگنسٹین نے ایک ہی عورت کے ساتھ جنسی تعلق استوار کیا (لیکن وہ غالباً ویانا کی ایک فاحشہ تھی)۔

تاہم، اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ وہ ہم جنس پرستی کو مرد و عورت کے جنسی تعلق کے مقابلہ میں ''کمتر'' (یا ''برتر'') سمجھتا تھا، نہ ہی وہ خود کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے ملامت کرتا تھا۔ دوسری طرف اس کی پرورش ایک ایسی روایت کے زیرِ سایہ ہوئی تھی جس میں ہم جنس پرستی ممنوع تھی، اور یقیناً اس رجحان نے اس کی مسرتوں پر منفی اثر ڈالا ہوگا۔

اس کا پیانو نواز بھائی پال پہلی عالمی جنگ میں اپنا دایاں بازو کھو بیٹھا، لہٰذا اس نے

بائیں ہاتھ سے پیانو بجانے کی حیرت انگیز تاریخ رقم کی۔ وہ بھی وٹگنسٹین جتنا ہی تیوراتی اور مشکل شخص تھا۔

وٹگنسٹین نے آسٹریائی فوج میں شجاعت کے جوہر دکھانے کے دوران "Tractatus" مکمل کی اور پھر فلسفہ سے تعلق توڑ کر آسٹریائی ایلیمنٹری سکولوں میں پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے فلسفہ سے متعلقہ تمام بڑے مسائل حل کر لیے تھے۔ بحیثیت استاد وہ کامیاب نہ رہا۔ جنگ کے بعد ویانا میں ایک قابل تعریف لبرل روایت میں تربیت پانے کے باوجود اس کے دو طریقے بہت بھونڈے تھے...... وہ اپنے شاگردوں (لڑکوں یا لڑکیوں) کے بال کتروا دیتا اور ان کے کانوں پر گھونسے مارا کرتا تھا۔ کافی عرصہ بعد (جب شاگرد بالغ ہو چکے تھے) وہ ان میں سے کچھ کے پاس معافی مانگنے گیا۔ لیکن کچھ لڑکوں کی نظر میں وہ چوہدری شبیہہ بن گیا تھا۔

1926ء میں اس نے فیصلہ کیا کہ بہرحال ابھی فلسفے کے تمام مسائل حل نہیں ہوئے تھے، چنانچہ وہ اپنی بہن کے لیے ایک گھر تعمیر کرنے کے بعد واپس کیمبرج چلا گیا اور 1939ء میں وہاں مور کی جگہ پر پروفیسر تعینات ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اس نے لندن ہسپتال میں بطور رپورٹر اور نیو کاسل میں بطور لیبارٹری اسسٹنٹ بھی کام کیا۔ 1945ء کے بعد ایک دو برس کے لیے کیمبرج واپس آنے پر بیسویں صدی کے عظیم ترین فلسفیانہ ذہن نے اسے زبردست احترام دیا۔ مگر یہ چیز اس کے لیے باعث تسکین نہ ہو سکی۔ یہ اس کا اصل استاد برٹرینڈ رسل تھا جس نے "Tractatus" کی اشاعت اپنی نگرانی میں کروائی تھی (آسٹریا، جرمنی اور برطانیہ کا کوئی بھی پبلشر اسے چھاپنے پر رضامند نہ ہوا تھا)۔ 1913ء میں ہی رسل کو یقین ہو گیا تھا وٹگنسٹین مستقبل کا آدمی تھا۔ رسل اور وائٹ ہیڈ کے خیال میں وٹگنسٹین کا ذہن ان کے اپنے ذہنوں سے کمتر نہ تھا۔ رسل ایک پرزور ملحد اور وٹگنسٹین تمام فلسفیوں میں سب سے زیادہ مذہبی تھا۔ اگرچہ وہ کبھی کسی کلیسیا کا رکن نہیں رہا اور نہ ہی ٹالسٹائی کی طرح تاریخی اور افسانوی یسوع مسیح کے مسائل میں اسے کوئی دلچسپی تھی۔

وٹگنسٹین کا کام مہیب اور کافی متنازعہ تکنیکی مشکلات پیش کرتا ہے جن پر یہاں بات کرنا ممکن

نہیں۔ چنانچہ ہم صرف اس کے پہلے اور دوسرے شاہکار (جو مکمل نہیں) کے درمیانی عرصہ کے دوران اس کے ذہن و دل میں ہونے والی تبدیلی یا ترقی پر ہی بات کریں گے۔ دونوں ہی کتابوں کے اثرات ایک جیسے تھے، لیکن ''فلسفیانہ تحقیقات'' نے زیادہ عمیق اثر ڈالا اور یہی اس کے خیالات کی زیادہ بہتر انداز میں نمائندگی کرتی ہے۔

"Tractatus" میں زبان کو حقیقت کی ''تصویر'' پیش کرنے والی تصور کیا گیا ہے۔ یہاں تصویر سے مراد نمونہ (ماڈل) ہے، مثلاً کسی روڈ ایکسیڈنٹ کا ماڈل۔ اس تھیوری کے مطابق کسی جملے کا تعلق اپنے اندر بیان کردہ بات سے اسی نوعیت کا ہے جو کسی نقشے کا اپنے ذریعہ دکھائے گئے لینڈ سکیپ سے۔ "Tractatus" دکھانے (ثابت کرنے) اور فضول گفتگو کے درمیان فرق پر بھی زور دیتی ہے۔

وٹگنسٹین کی تحریروں کے دوسرے مجموعے ''فلسفیانہ تحقیقات'' میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب زبان میں موجود ''مطلب'' کو محض ایک سیاق و سباق کا معاملہ قرار دیا گیا؛ یہ کسی بھی مخصوص تقریر میں محض ایک فنکشن تھا، لہٰذا اس کا تعین سماجی حوالے سے ہوتا تھا۔ وٹگنسٹین نے سوچا کہ زبان کو استعمال کرنے کے بے شمار ''کھیل'' موجود تھے۔ مثلاً انجینئرنگ، عبادت، عورتوں یا مردوں کے ساتھ مجامعت کرنے، پوچھنے، امید کرنے، حکم دینے، درخواست کرنے، خواہش کرنے، شاعری لکھنے کے حوالے سے زبان کی کھیلیں۔ ہم ان میں سے کچھ کھیلیں بہت خوب انداز میں کھیلتے ہیں، لیکن عموماً مخصوص کھیلوں سے بہت زیادہ متاثر ہو جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ تاہم، اس عمل میں الجھن یا پیچیدگی کا شکار ہوتے ہیں، مگر سوچے سمجھے بغیر بولتے وقت کوئی الجھن موجود نہیں ہوتی۔ سب باتوں سے بڑھ کر وٹگنسٹین ایک ذہین مبلغ گو بھی تھا، غالباً عظیم ترین مبلغ گو۔ اس کی عظمت اس امر کی پیداوار ہے کہ ہم میں سے بیشتر کی طرح وہ بھی شاعرانہ زبان بنانے کی صلاحیت سے محروم تھا، چنانچہ اس نے یہ امر تسلیم کرتے ہوئے اپنی طرف سے مقدور بھر کوشش کی۔

96

نحوی اجزاء

"Syntactic Structures"

ناؤم چومسکی

1957ء

امریکہ میں ناؤم چومسکی کی شہرت تین وجہ سے ہے، اور چونکہ اس نے اپنی فکر کے ان تین نمایاں پہلوؤں کے درمیان کوئی روابط بنانے کی کوشش نہیں کی، اس لیے ایسا کرنے کی تحریص ناقابل مدافعت ہے۔

اکیڈمک حلقوں سے باہر چومسکی ''ایک قسم کا سوشلسٹ انارکسٹ'' مشہور ہے (اس نے خود

ہی ایک اصطلاح "anarchosyndicalist" وضع کی جس کا مطلب ہے: کسی کارپوریشن میں کام کرنے والے مزدور کو بھی اس کی پالیسیاں بنانے میں شریک ہونا چاہیے۔) چومسکی کو جنرل موٹرز اور تمام دیگر کارپوریشنوں، میڈیا میں دخل دینے والوں، سیاست دانوں اور بحیثیت مجموعی اسٹیبلشمنٹ سے نفرت ہے۔ یہ امر واضح نہیں کہ آیا وہ "anarchosyndicalism" کے کبھی معرض وجود میں آنے پر یقین رکھتا ہے یا نہیں؛ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موجودہ نظام پر تنقید کرنے کے ذریعے سے اسے فروغ دینے پر وقت صرف کرتا ہے۔

اس نے غیر تسلی بخش انداز میں یہ نظام قائم ہونے کے طریقے کے متعلق کہا: ''تھوڑی بہت تنظیم سازی کے بغیر لوگ حقیقی دنیا کو متاثر کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یاسیت مندانہ انداز میں سہی، مگر وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک دانشور کی حیثیت میں اسے اپنا انسانی اور انسانیت پسندانہ فرض ادا کرنا چاہیے: ایک روز ایسا ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ قبل وہ ای میل کے ذریعہ موصول ہونے والے خطوط کا جواب دینے کے لیے 20 گھنٹے فی ہفتہ خرچ کرتا تھا۔ بڑے پبلشرز نے اس کی سیاسی تحریروں کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن وہ صرف چھوٹے پبلشرز میں ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ غالباً وہ بھرپور داخلی زندگی پر بھی یقین رکھتا ہے...... لیکن اس بارے میں بات نہیں کرتا۔ بائیں بازو کے بہت سے مفکر اس بات پر غضب ناک ہوئے کہ اس کے پاس ''کوئی تھیوری نہیں ہے جو بحث کو آگے بڑھا سکے۔'' تاہم ممکن ہے کہ وہ بحث سے زیادہ براہ راست عمل کو ترجیح دیتا ہو۔

چومسکی اپنے انٹرویوز میں ایسے بیانات دیتا ہے جو عدم اطمینان اور غصہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا جواب دینا اتنا آسان نہیں۔ مثلاً اس نے کہا کہ اگر نیورمبرگ قوانین (جن کے تحت نازی جنگی مجرموں پر مقدمات چلائے گئے) اب بھی نافذ العمل ہوں تو دوسری عالمی جنگ کے بعد سے امریکہ کا ہر صدر پھانسی کا مستحق قرار پائے۔ ٹھوس منطقی بنیادوں پر واقعی ایسا ہو سکتا ہے...... لیکن اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ امریکہ کے حیات صدور کو پھانسی دے دینی چاہیے، کیونکہ وہ تشدد پر یقین نہیں رکھتا۔

رابرٹ فوریسن نامی فرانسیسی نے ایک کتاب لکھی جس میں کہا کہ ''عالمگیر تباہی'' (ہالوکاسٹ) ایک یہودی تصور ہے۔ چومسکی (جو بہت سے دیگر اسرائیلیوں کی طرح ایک زبردست تنقید

کرنے والا یہودی ہے) نے کتاب پڑھنے کی زحمت کیے بغیر دیباچہ لکھا جس میں یہ نہ کہا کہ کوئی ہالوکاسٹ نہیں ہوا تھا۔ لیکن فوریسن کو اپنی رائے کے اظہار کا حق تھا۔ نہ ہی اس نے یہ کہا کہ فوریسن کو مارنا پیٹنا اور حتیٰ کہ قید کر دینا چاہیے۔ یہ باتیں اس کی نظر میں غیر اہم ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا متمنی ہے جس میں ہر کوئی اپنی مرضی کی بات کہہ سکے۔ ایسے معاشرے میں فوریسن کے خیالات خود ہی مسترد ہو جائیں گے۔

اگرچہ چومسکی کے پیش کردہ خیالات مارکس، انارکسٹ باکونن اور روسو کی تحریروں پر مبنی لگتے ہیں لیکن وہ ایک مارکسسٹ نہیں، اور اس نے دیگر حکومتوں کی ہی طرح مارکسسٹ حکومتوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

اب ہم اس کی دوسری مگر کم مقبول وجۂ شہرت پر بات کریں گے۔ (تیسری وجہ اسی کی ایک شاخ ہے۔) ''نحوی اجزا'' میں چومسکی کا مکمل نظریہ لسانیات شامل نہیں، لیکن یہاں اسے شامل کرنے کی وجہ اس کا لسانیات کے میدان میں ایک بہت اہم موڑ ہونا ہے۔ اس کتاب کے بعد سے اس کی لسانی تھیوری ہی زبان کی نوعیت اور ''ذہن'' و دماغ کے باہمی روابط کے بارے میں تمام تحقیق کی بنیاد بنی ہوئی ہے۔ تاہم، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس تحقیق نے چومسکی کی تھیوری کے ''خلاف'' کچھ بھی نہیں کیا۔ لیکن اس اہمیت کی حقیقت بدستور موجود ہے۔ فی الحال تھیوری کی تصدیق یا تردید کی کوئی راہ موجود نہیں۔ چومسکی بدستور چھایا ہوا ہے۔

لسانیات زبان کی عمومی نوعیت کے مطالعہ کو کہتے ہیں۔ زبان ہی انسان کو دیگر تمام انواع حیات سے ممیز کرتی ہے، لہٰذا یہ ہمارے ادراک اور شعور کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ہم زبان کے توسط سے ہی آپس میں رابطہ کرتے ہیں، اور ایسا کرتے رہیں گے۔ اس حوالے سے یہ سوال بہت اہم ہے: ہم زبان کیسے سیکھتے ہیں؟

اس دور کے دیگر تمام افراد کی طرح چومسکی نے بھی لسانیات میں تحقیق کا آغاز لیونارڈ بلوم فیلڈ (1887ء تا 1949ء) کے زیر اثر کیا۔ بلوم فیلڈ نے امریکہ میں لسانیات کو ایک جداگانہ ضابطۂ علم منوایا اور پھر لسانی کرداریت (linguistic behaviorism) کی جانب متوجہ ہوا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ بلوم فیلڈ لسانی کرداریت پسند بن گیا تو اس سے ہماری مراد ہوتی ہے کہ اس

نے نفسیات میں ''پیش رفت'' کی روشنی میں زبان کو سمجھنے کے ایک نئے طریقہ کار کی حمایت کی۔

بلوم فیلڈ ایک قابل آدمی تھا مگر حد سے زیادہ پرجوش۔ اس دلیل میں اسے کوئی مغالطہ نظر آیا: اس نے کہا کہ لسانی forms کے مطالب کو صرف اور صرف اس مہیج کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے ان کی ادائیگی ہوئی ہو۔ اس دلیل نے زبان کو دیکھنے کا ایک نکتۂ نظر فراہم کر دیا۔

پنسلوانیا یونیورسٹی...... جہاں چومسکی 16 سال کی عمر میں داخل ہوا...... میں چومسکی کا استاد زیلنگ ہیرس بلوم فیلڈین تھا، اور چومسکی کا تمام تر ابتدائی کام بلوم فیلڈین ترکیبی مفروضات کے زیر اثر ہی ہوا۔ ''نحوی اجزا'' کے ذریعہ جب چومسکی اس مکتبہ فکر سے جدا ہونے لگا تو وہ بدستور قائل تھا کہ کسی زبان کا مطالعہ مفہوم کے حوالوں کے بغیر ہی کیا جا سکتا ہے۔ چومسکی زبان کو ایک حیرت انگیز اور معجزاتی شے سمجھتا تھا۔ البتہ حیرت اور معجزہ سائنس کی اقلیم سے باہر ہیں......اور سائنسدان چومسکی کو بہت کچھ واضح کرنا پڑا۔

مختصر بات کی جائے تو چومسکی نے لسانیات کے میدان میں ایک ایسے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جو برٹرینڈ رسل پہلے ہی پیش کر چکا تھا: ''دنیا کے ساتھ مختصر، شخصی اور محدود روابط رکھنے والے بنی نوع انسان وہ کچھ جاننے کے قابل کیسے ہوئے جتنا کہ وہ جانتے ہیں؟''

چومسکی نے اس سوال کو یہ صورت دی: ''پانچ یا چھ سال کے بچے ایسے بے شمار الفاظ بولنے اور سمجھنے کے قابل کیسے ہو جاتے ہیں جن سے قبل ازیں ان کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا ہوتا؟'' اس کا جواب یہ تھا کہ بنی نوع انسان زبان کے لیے ایک خلقی استعداد، ایک خلقی تخلیقیت رکھتے ہیں۔

ایف بی سکنر کی "Verbal Beharior" اور چومسکی کی "Syntactic Structures" ایک ہی برس شائع ہوئیں۔ سکنر نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسانوں کی لسانی استعداد کی بنیاد صرف تجربے پر ہوتی ہے۔ چومسکی نے سکنر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اس یقین کو واضح کیا کہ بنی نوع انسان پیدائش کے وقت خصوصی استعدادوں کے حامل ہوتے ہیں جو انہیں آزادانہ طور پر عمل کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ بے شک ماحول انہیں متاثر کرتا ہے مگر وہ ایک خلقی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ مفروضہ کرداریت پسندی کی نسبت زیادہ ''امید افزا'' ہے۔

لیکن امید بھی سائنسی دائرہ کار میں نہیں آتی۔

اب ہم چومسکی کی سوچ کے تیسرے اہم پہلو کی جانب آتے ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ لسانی استعداد کی بنیاد تجربہ نہیں ہو سکتا تو اس نے ایک اور دھاوا بولا ...... یہ دھاوا فلسفیانہ تجربیت پسندی کے خلاف تھا؛ یہ افلاطون، ڈیکارٹ، لیبنز، سپینوزا اور ان جیسے دیگر تمام افراد کے خلاف تھا جو سب کے سب دعویٰ کرتے تھے کہ پیدائش کے وقت ہمارے اندر پہلے سے ہی کچھ موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے موزوں فلسفیانہ دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر بچوں کی لسانی استعداد کی وجہ صرف سیکھنے کی صلاحیت ہی ہوتی ہے تو بچے گرامر کے پیچیدہ اصول کیسے سیکھ لیتے ہیں؟ وہ وافر مثالیں پیش کرتا ہے۔

چومسکی کی سیاسی اور لسانی سرگرمیوں کے درمیان تعلق کی موجودگی کافی حد تک واضح ہے۔

97

سائنسی اِنقلابات کی تشکیل

" The Structure of Scientific Revolutions "

ٹی ایس کُہن

1962ء (نظرثانی 1970ء)

تامس سیموئیل کُہن (Thomas Samuel kuhn) کی ''سائنسی انقلابات کی تشکیل'' بیسویں صدی کی موثر ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اپنے حریف نقاد کارل پوپر کی طرح کُہن خود بھی ایک پرانی طرز کا سائنسی مورخ تھا جو دل کی گہرائیوں سے ''سائنسی ترقی'' پر یقین رکھتا تھا: یعنی اسے یقین تھا کہ سائنس کی ''ترقیاں'' بحیثیت مجموعی نوع انسانی کے لیے نہایت مفید

ہیں۔ سائنسی ترقی کاملیت کی جانب گامزن ہے، جیسا کہ دو عالمی جنگوں کے دوران ہتھیار سازی کے حوالے سے ثابت ہوتا ہے۔

البتہ کُہن نے الزام لگایا کہ سائنس ہمیشہ منطقی انداز میں نہیں بلکہ بڑی بڑی چھلانگوں کی صورت میں آگے بڑھتی ہے اور یوں یہ منطق واستدلال پر اپنے ہی یقین کی نفی کر دیتی ہے۔ سائنس کے ''آگے بڑھنے'' کے نظریہ کو کئی ایک بنیادوں پر چیلنج کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک بہت ابتدائی قسم کی دلیل دی جاتی ہے کہ اگر انسان نیوکلیئر فزکس کے نقصان دہ نتائج کو کنٹرول نہیں کر سکتا تو اس میدان میں دریافتوں کا کیا فائدہ؟ معاملہ صرف ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کا ہی نہیں بلکہ نیوکلیئر پاور سٹیشنوں کو مکمل طور پر کنٹرول کرنے میں سائنس دانوں کی عدم قابلیت کا بھی ہے...... یہ سٹیشن 100 فیصد محفوظ نہیں ہیں۔ البتہ نیوکلیئر بیوروکریٹس (جو خود نیوکلیئر سائنسدان نہیں) ان کے محفوظ ہونے کے حوالے سے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ یہ بھی عیاں ہوتا جا رہا ہے کہ نیوکلیئر صنعت اپنے فاضل مواد کو محفوظ طور پر ضائع کرنے کے قابل نہیں۔
کیا ہم کوئی نیا سائنسی نظریۂ دنیا اپناتے وقت پرانے سائنسی نظریۂ دنیا کی کچھ دانش کھو نہیں دیتے؟ عام آدمی کے لیے کُہن کے پیغام کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے: سائنسدانوں کی بہت بڑی اکثریت اپنے تجربات سچے جذبے اور اکثر ذہین انداز میں کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنی توقعات اور دعووں کے برعکس اپنے نظریات کی وجوہ کے بارے میں سائنسی انداز کے حامل نہیں رہتے۔ وہ بھی باقی کی انسانیت جیسے ہیں!

تھامس کُہن 1922ء میں Cincinnati، اوہیو کے ایک صنعت کار کے گھر پیدا ہوا۔ ہارورڈ میں اس نے بطور ماہر طبیعیات تربیت حاصل کی، لیکن ریڈیو لیبارٹری میں کچھ دیر گزارنے کے بعد سائنس کے مورخ اور فلسفی کی راہ اپنائی۔ وہ 1951ء سے 1961ء تک ہارورڈ میں تاریخ سائنس کی فیکلٹی کا رکن رہا۔ اس کے بعد برکلے اور پھر پرنسٹن گیا۔ آخر کار 1979ء میں وہ MIT چلا گیا۔ اس نے 73 برس کی عمر میں وفات پائی (1996ء)۔ کُہن کا انداز تحریر نفیس نہ تھا (اس کے عنوانات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے مطالب کا زیادہ خیال نہیں رکھتا تھا)۔ اور شاعری میں اس کی دلچسپی بھی کارل پوپر سے زیادہ نہ تھی۔

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ کُہن طبعاً کوئی انقلابی یا ملحد نہیں بلکہ ایک ایماندار آدمی تھا جس نے کوئی سچائی معلوم ہونے پر اسے صاف صاف بیان کر دیا۔ اس نے اپنے خلاف اٹھائے گئے نہایت بھونڈے اعتراضات کا جواب بھی دھیمے انداز میں دیا۔

کُہن کی نظر میں Paradigm کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ Paradigm سے اس کی مراد تھی: ''مابعد سائنسی سرگرمی کے لیے ایک ماڈل۔'' نیوٹن کی "Principia" اور ڈارون کی ''انواع کا ماخذ'' Paradigms کی مثالیں ہیں۔ ماڈل تصورات اور طریقہ ہائے عمل کے ایک سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے جو سائنسدانوں کے لیے راہ عمل کو مرتب کرتے ہیں۔

یقیناً اس نکتۂ نظر کو کسی بھی سرگرمی پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ادبی برادری میں ایک Paradigm ہے کہ ڈبلیو ایچ Auden ایک عظیم جدید شاعر ہے، یا ''موسیقار برادری'' میں لارڈ اینڈریو لائیڈ ویبر ایک عظیم موسیقار ہے۔ لیکن عوامی پریس کے Paradigms فہم کی بجائے نافہمی کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

کُہن کے بقول ''نارمل سائنس'' درست مان لیے گئے اعتقادات اور قوانین کے ایک مجموعے پر مشتمل تھی...... ان پر کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ تاہم، انجام کار anomalies یا بے قاعدگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً مشاہدات کیے جاتے ہیں جنہیں پرانے Paradigm کے حوالوں سے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر انہیں زبردستی کھینچ تان کر فٹ کرنے کی نہایت غیر منطقی کوششیں کی جاتی ہیں۔ لوتھر یا ماٹمنی جیسے ذہین افراد نے سورج کی مرکزیت کے مفروضے کو مسترد کیا۔

جب حقائق پرانے ماڈل پر پورے نہ اتر سکیں تو ہم ایک ''ماڈل سے گریز کے رجحان'' "Paradigm Shift" کا تجربہ کرتے ہیں (جیسا کہ ہم نے انجام کار کوپرنیکس کی تھیوری کو قبول کرنے میں کیا) جس دور میں یہ عمل واقع ہو رہا ہو تو بحران پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک سائنسی انقلاب بپا ہوتا ہے۔ تب سائنسی طرز فکر پر پرانے ماڈل کا غلبہ ختم ہونے لگتا ہے، لیکن جلد ہی نیا ماڈل غلبہ پا لیتا ہے۔ مختلف ماڈلوں کے درمیان فرق، اور بالخصوص پرانے اور اس کے جانشین ماڈل کے درمیان فرق کو کُہن نے Incommensurability کا نام دیا۔ (اردو میں ہم

اس کا ترجمہ جاین، فقدان مخرج مشترک اور جس کا کوئی مشترکہ پیمانہ یا معیار قابل نہ ہو، کر سکتے ہیں)۔ ایک ماڈل سے دوسرے تک عبور کے عمل کو بیان کرنے کے لیے بطخ، خرگوش کی تصویر استعمال کی: آپ اس میں خرگوش یا بطخ دیکھ سکتے ہیں، لیکن دونوں نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس دانوں کو پہلی مرتبہ اپنے ہی موضوع کے بے وقت فلسفیوں کے طور پر دیکھا گیا۔ خرگوش۔ بطخ کی تصویر دیکھنے پر آپ کسی منطقی بنیاد پر اسے خرگوش یا بطخ کی صورت میں نہیں دیکھتے۔ آپ تو بس اسے دیکھتے ہیں، اور اپنی مرضی کے مطابق ہی خرگوش سے بطخ یا بطخ سے خرگوش کی جانب جاتے ہیں۔ اس طرح خود کو "درست" سمجھنے والا شخص بطلان کا شکار ہو جاتا ہے۔ کونسی صورت درست ہے؟ اور بلاشبہ ایک معقول مفہوم میں ہر چیز کی نوعیت "بطخ۔ خرگوش" والی ہے۔

لوگ دینیات یا ادب میں ذوق کی اس قسم کی تبدیلیوں کو زیادہ آسانی سے تسلیم کر سکتے ہیں کیونکہ ایک عقیدے یا قلم کار کی "قدر پیمائی" کا کوئی قطعی سائنسی طریقہ موجود نہیں۔ ادب کو سائنس کی صورت میں محدود کرنے کی کوششیں ہمیشہ ناکام ہوئی ہیں: ادبی تصنیفات کا انحصار جذبے پر ہوتا ہے جو موزوں سائنسی تجربیت میں ہرگز موجود نہیں ہوتا۔ (تاہم، لگتا ہے کہ شماریات کے بدنام زمانہ شعبے میں تجربات کرنے والوں کو "من چاہے" نتائج حاصل ہو گئے: تقریباً 25 برس قبل متعصب ماہرین نفسیات ہانس Eysenck اور Jensen نے "ثابت کیا" کہ کالے لوگ "دیگر نسلوں" کے مقابلہ میں "کم ذہین" تھے، لیکن دیگر نے قطعی مختلف نتائج حاصل کیے۔ کیا تحقیقات زیادہ جاندار ہوتے جانے پر سائنس زیادہ غیر یقینی، اور کم "سائنسی" ہوتی جاتی ہے؟)

البتہ سائنس دان اس اطلاع پر غصے میں آ جاتے ہیں کہ ان کا ضابطۂ علم بھی کسی دوسرے ضابطۂ علم جتنا ہی متلون ہے۔ کُہن کا کہنا ہے کہ نارمل سائنس میں غالب ماڈل (paradigm) کو پرکھنے کی بجائے محض "استعمال" کیا جاتا ہے۔ پھر عموماً کوئی نوجوان اور روایتی لحاظ سے کوالیفائی نہ کرنے والا شخص (مثلاً آئن سٹائن) آتا اور مروج ماڈل کو چیلنج کرتا ہے۔ کُہن ماڈلز کی تبدیلی کی کوئی "منطقی" وجہ نہ جان سکا، اور بالعموم اس نظریے کو اب تذبذب کے ساتھ قبول کر

لیا گیا ہے۔

کُہن کے برعکس پوپر نے سائنس کو ایک نہایت منطقی انداز میں آگے بڑھتے ہوئے تصور کیا۔ البتہ بحیثیت مجموعی (کچھ مستثنیات کے ساتھ) سائنسی پیش رفت کی تاریخ کے بارے میں کُہن کا نظریہ غالب آ گیا ہے۔ اس نے کم از کم یہ تو دکھا دیا کہ کس طرح سائنس دان اکثر ایسے خیالات کے حامل ہوتے ہیں جن کا وہ سائنسی انداز میں دفاع نہیں کر سکتے۔ اس کی کتب خشک انداز میں لکھی ہوئی ہیں، مگر انہوں نے بہت گہرا اثر ڈالا کیونکہ ان کے مواد نے سائنسی تساہل کا خول توڑ ڈالا۔ یقیناً یہ سائنس کی بھلائی تھی۔

rekhta

98

عارفہ

"The Feminine Mystique"

بیٹی فرائیدان

1963ء

بیٹی فرائیدان (Betty Friedan) 1921ء میں وسطی امریکہ کے ایک رجعت پسند علاقے پیوریا (الینائس) میں پیدا ہوئی۔ یہ جگہ ایک ایسی عورت کے لیے نہایت موزوں تھی جس نے امریکہ میں انقلابِ نسواں کی چنگاری بھڑکانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ حالات کی زمین بالکل تیار تھی، لیکن بیج اسی نے بوئے۔

فرائیدان نے بحیثیت عورت خود کو اس قدر برے حالات میں پایا کہ بغاوت کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے تصفیئر کے ایک پروڈیوسر سے شادی کی، تین بچوں کی ماں بنی، ڈاکٹر Spock کو پڑھا، صحافت کی...... لیکن پھر وہ ایک ''بے نام مسئلہ'' محسوس کرنے لگی۔

''عارفہ'' (The Fenimine Mystique) کے بعد حقوقِ نسواں پر لکھی گئی کتب میں اس کا اثر موجود ہے۔ اور انقلاب محض اپنی ہی ایک نقالی کی صورت میں انحطاط پذیر ہو گیا تھا جس میں عورتوں نے یہ مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو ممتاز کیا کہ وہ بھی مردوں جتنی ہی احمق ہو سکتی ہیں۔ لیکن مرد طویل عرصے سے غالب کردار کے حامل تھے؛ حقوقِ نسواں کی پُر زور حمایت نے واضح کر دیا ہے کہ عورتیں بھی مردوں جتنی ہی انسانی اور ناقص العقل ہو سکتی ہیں۔ حقوقِ نسواں کے علمبردار بننے کی کوشش کرنے والے بیشتر روشن خیال مرد غالباً گروچیف سے اتفاق کریں گے، جس نے کہا تھا کہ ''عورت سب کچھ جانتی ہے مگر بھلا چکی ہے۔''

حقوقِ نسواں کی جدید تاریخ میں ''عارفہ'' کا اثر بھی میری وولسٹون کرافٹ اور سیمون دی بووا جیسا ہی زوردار تھا۔ لیکن ایک تحریر کے اعتبار سے اس کا موازنہ ''حقوقِ نسواں کی حمایت'' سے نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ ''دوجی جنس'' جیسی اعلیٰ فکری سطح رکھتی ہے۔ تاہم، یہ فلسفیانہ سے زیادہ مناظرانہ ہے۔ مستقبل میں اسے اس کی بصیرتوں کی وجہ سے زیادہ پڑھا نہیں جائے گا۔ مردانہ پن پر اس کی تنقید معقول ہے، لیکن کچھ دیگر جگہوں پر اسے زیادہ بہتر انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ مردانہ پن فرائیڈین نفسیات میں خلقی ہے۔

لیکن اس نے اپنا کام کر دکھایا۔ فرائیدان نے اپنی کتاب کے ذریعہ ایک تحریک پیدا کی جو امریکہ میں 50 برس سے محوِ خواب تھی۔ یہ بنیادی طور پر ایک منطقی احتجاج تھا۔ امریکی عورتوں کو فرائیدان کی درست فہم اور قابلیت کا معترف ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی ''عارفہ'' کیا تھی؟

یہ عورت کے بارے میں طویل عرصے سے چلی آ رہی امریکی اسطورہ (myth) تھی۔ دیگر ممالک میں بھی اسی نوعیت کی اسطورہ موجود تھی، مگر مختلف صورتوں میں۔ سیمون دی بووا کی تصنیفات اور دیگر ممالک میں لکھی گئی اسی قسم کی کتابیں اس کا خاطر خواہ مظاہرہ کرتی ہیں۔ اسطورہ کی امریکی صورت بالخصوص جاندار اور زبردست تھی۔ فرائیدان نے نہ صرف اپنی زندگی کی الجھنیں اور مایوسیاں دیکھی تھیں بلکہ اس سے پہلے اپنے ماں کی مایوسیاں بھی دیکھ چکی تھی۔ یہ

مایوسیاں اسے اپنی انسانی ضروریات کی تکمیل کی کوشش کرنے کے دوران ہوئیں۔ وہ یہودی بھی تھی اور عورت بھی، لہٰذا ان کی شدت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

امریکہ میں بطور عورت شمار ہونے کے لیے آپ کو مثالی ''گھریلو بیوی۔ ماں'' بننا پڑتا تھا۔ اس اسطورہ میں مختلف قسم کی اطاعتیں شامل تھیں...... جنسی، گھریلو، سیاسی۔ مرد عورتوں سے جس قسم کی اطاعت کا تقاضا کرتے تھے وہ (اس دور میں) اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھی جتنا کہ فرائیڈان دکھانے کے قابل ہو سکی۔ لیکن اس کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اسے معاملات حد سے زیادہ سادہ انداز میں پیش کرنا پڑے۔ بصورت دیگر کوئی بھی اس پر توجہ نہ دیتا۔ اسے دوسری عورتوں کے ذہن میں ایک تار چھیڑنا تھا...... اور اس نے یہ کام کر دکھایا۔ اس حوالے سے اس کا ابتدائی اندازہ بے خطا تھا، کیونکہ کتاب کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں اور اس نے رویوں میں ایک تبدیلی پیدا کی۔ بعد میں اسے انا پرستی اور خودسری کا الزام دیا گیا مگر لوگوں میں اس نوعیت کی تبدیلیاں لانے کے لیے خودسر، طاقتور اور ناقابل تسخیر ہونا یا نظر آنا ضروری تھا۔

کتاب میں 1950ء کی دہائی کے دوران اس اسطورہ کی مختلف صورتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے: فرائیڈان نے مقبول عام ادب، تعلیمی تھیوری، اکیڈمک سائیکالوجی، سوشل سائنس اور اپنے تجربے کو بھی بنیاد بنایا۔ اس نے اوسط درمیانے طبقے کی امریکی عورت کی تصویر کشی کی (وہ کالی یا مزدور عورت کو تقریباً نظر انداز کر گئی) جو اپنی زندگی میں ایک جھوٹے عکس یا شبیہ کے ساتھ مطابقت اختیار کرنے کی کوشش میں ناخوشی کا شکار تھی: ''یہ شبیہ بے ضرر نہیں۔ اس کے پیدا کردہ نقصان کو بیان کرنے کے لیے نفسیات میں کوئی اصطلاح موجود نہیں۔ لیکن اس وقت کیا واقع ہوتا ہے جب عورتیں ایک ایسے امیج کی مطابقت میں زندگی گزارنے کی کوشش کرتی ہیں جو ان کے ذہنوں کو مسترد کرتا ہو؟ اس صورت میں کیا واقع ہوتا ہے جب عورتیں ایک ایسا امیج اختیار کر لیتی ہیں جو بدلتی ہوئی دنیا کی حقیقت کو مسترد کرتا ہو؟''

اگر یہ کتاب عمیق النظر، تفصیلی یا پیچیدہ تجزیات پر مبنی ہوتی تو زیادہ مفید یا کارآمد نہ ثابت ہوتی۔ لیکن اس نے درست راہ اپنائی...... اور بعد میں دیگر عورتوں کو بھی کم مقبول تجزیات پیش کرنے میں مدد دی۔ ''عارفہ'' میں کیس کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، ایسا کرنا ضروری تھا۔ مثلاً

عورتوں کے رسائل کے مرد ایڈیٹروں پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ عورتوں کو گھریلو پن تک ہی محدود رکھنے کی سازش کے تحت ایسی کہانیاں شائع کرتے ہیں جن میں ماں اور بیوی کے کرداروں کو رفعت دی جاتی ہے نہ کہ عورت کی آزادی کو۔ یہ بات کافی حد تک درست تھی، اور اسے ایسے ہی خام انداز میں بیان کرنا ضروری تھا۔ فرائیڈان ممکنہ طور پر یہ پیش بینی کرنے کے قابل نہیں تھی کہ 25 برس بعد مردوں کے زیر اختیار جرائد ''آزادی یافتہ'' عورتوں کی نفسیاتی اعتبار سے غیر معتبر اور محض فیشن ایبل کہانیاں شائع کر رہے ہوں گے۔ یہ تصور اس کے لیے سوہان روح ہوتا کہ حمایت نسواں جلد ہی ''نام نہاد حمایت نسواں'' کی صورت اختیار کر لے گی۔ اگر وہ ذرا کم خام انداز اپناتی تو شاید اپنے ہی قارئین کو دشمن بنا لیتی۔

فرائیڈان نے ایک متبادل، ''عورتوں کے لیے زندگی کا ایک نیا منصوبہ'' پیش کیا: ''کون اس محبت کی ممکنات کا تصور کر سکتا ہے جب مرد اور عورتیں نہ صرف بچے، گھر اور باغ میں ہی شراکت کریں، اور نہ صرف اپنے حیاتیاتی کرداروں کی ہی تسکین کریں، بلکہ کام کی ذمہ داریوں اور شوق میں بھی شریک ہوں جو مستقبل کی تعمیر کرتا ہے اور انہیں اپنے متعلق بھرپور انسانی علم دیتا ہے؟''

آگے چل کر فرائیڈان NOW (نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن) کی صدر بنی، اور بلاشبہ اسے ''ناامید حد تک بورژوا'' ہونے کا الزام دیا گیا۔ اسے ان لوگوں کے درمیان سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا جن کے بل بوتے پر اس نے اعلان کیا تھا کہ ''مرد دشمن نہیں'' اور ''نسوانی شاونزم نہایت خطرناک اور تفریحی کھیل ہے۔'' یوں کہہ لیں کہ اس نے اپنے ''امیج کو نرم بنایا۔'' ایک مناظرے کی حیثیت میں ''عارفہ'' کا درجہ کافی بلند ہے۔ اس پر عموماً متوسط طبقے کے لیے مخصوص ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ اس قسم کا انقلاب متوسط طبقے کی سطح پر بپا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر وہ انقلاب بپا ہی نہیں ہو گا۔ فرائیڈان نے متوسط طبقے کی امریکی عورت کو دکھایا کہ اس میں کیا کمی تھی۔ بے شک کتاب میں ہمیں جنسوں کے کردار کے حوالے سے معاشرتی تجزیہ نہیں ملتا، لیکن 1963ء میں ایک مناظراتی کتاب میں ایسا کرنا ناممکن تھا۔

99

چیئرمین ماؤزے تنگ کے اقوال

"Quotations From Chairman Mao Tse-tung"

ماؤزے تنگ

1966ء

اپنی شہرت کے دنوں میں ''چھوٹی سرخ کتاب'' کہلانے والی کتاب کو 1966ء میں چین کے جاہ کن ''عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب'' کے وقت لاکھوں لوگ سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ آج اس پر شاذ ہی بحث ہوتی ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت 1960ء کی دہائی کے آخر میں

صرف چین تک ہی محدود نہیں رہی تھی؛ اس کی وجہ سے لندن کی ڈاک لینڈ میں لڑائیاں ہوئیں، اور دنیا بھر میں یونیورسٹی طلبا نے بغاوت کی۔ اس کے اثرات سے کوئی انکار نہیں، بالخصوص 1968ء میں فرانس کے واقعات کے حوالے سے اس کا اثر واضح ہے۔

چین بھر میں ماؤ کے بٹن بیجز کے ساتھ تقسیم کی گئی یہ کتاب کچھ برس میں وہی حیثیت اختیار کر گئی جو کسی بنیاد پرست کے لیے بائبل کی ہے۔ لیکن یہ نئی اور سیکولر تھی، لہٰذا اس کا اثر بائبل سے بھی زیادہ ہوا۔ ظلم اور جنونیت کے ان چار یا پانچ برس کے دوران چین میں سب سے زیادہ پوچھے جانے والے سوال یہ دو تھے: ''کیا آپ کے پاس چھوٹی سرخ کتاب ہے؟'' اور ''کیا آپ اسے پڑھ کر سنا سکتے ہیں؟''

بحیثیت مصنف ماؤ نے مارکسسٹ لیننسٹ نظریے کی بجائے کلاسیکی چینی توضیحات کو ترجیح دی۔ بحیثیت شاعر وہ باصلاحیت اور کامیاب تھا: اس نے اپنے دور کے گھٹیا چینی کمیونسٹ ''شاعروں'' کی طرح نظموں کی بنیاد ''ٹریکٹرز'' کو نہ بنایا۔

چین میں ایک روایت ہے کہ پڑھے لکھے لوگ صرف ایک ہنر اور سلیقے کے طور پر شاعری کرتے ہیں۔ ماؤ کی ''شاعری'' اس روایت کی بہترین مثال پیش کرتی ہے، اور یہ اس کے ظالمانہ اقدامات کے برعکس حقیقی رحمدلانہ جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

ماؤ کی ''چھوٹی سرخ کتاب'' سچائی تھی۔ لوگ اس کی خاطر جی اور مر سکتے تھے۔ طلباء اور ''سرخ گارڈز'' میں کام کرنے والے لوگ زندہ رہے۔

یہ کتاب ماؤ کی تمام ماقبل تحریروں میں سے لیے گئے منتخب اقوال پر مشتمل ہے۔ اسے اس دور میں ماؤ کے وزیر دفاع لن پیاؤ نے ایڈٹ کیا۔ لیکن کوئی جنگ جیتنے کے خواہش مند افراد کے لیے یہ اب بھی نہایت مفید ہے۔ لن پیاؤ نے ایسا ہی ایک اور مجموعہ اقوال ''ماؤزے تنگ کی فکر زندہ باد'' کے نام سے بھی ایڈٹ کیا (بعد میں وہ ماؤ کے خلاف ہو گیا تھا)۔

ماؤ ازم میں فہم عامہ کافی زیادہ ہے، لیکن یہ بآسانی عامیانہ پن کی جانب بھی مائل ہو جاتی ہے: یاد سیلہ بنو، مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرو، خیالات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھو، اور مشترکہ فلاح و بہبود کے لیے سخت محنت کرو۔'' ماؤ ازم میں کنفیوشس کی تصنیفات کے اثرات بھی موجود

ہیں، بالخصوص نظریہ بھوت؛ چنانچہ ماؤ نے مختلف مواقع پر چیانگ کائی شیک کے ساتھ مل کر بھی کام کیا۔ اس نے مارکس سے ہیگلی جدلیات کی ایک سادہ صورت بھی سیکھی۔ بلاشبہ چینی فکر میں اس کا مترادف موجود ہے۔

لیکن ماؤ ازم نے متعدد نہایت اہم حوالوں سے ''مارکسٹ۔لیننسٹ'' لائن سے انحراف کیا جس پر چین 1949ء کے بعد سے عمل کر رہا تھا۔ ''اقوال'' میں شامل کردہ اقوال اس امر کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں۔ یہ مارکسزم کی سب سے زیادہ عوامی صورت ہے، اور لینن یا سٹالن کی بجائے ٹراٹسکی اور روزا لکسمبرگ کی سوچ کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ اور یہ حقیقی مقبولیت کے ذریعہ ملک پر کنٹرول حاصل کرنے کا غالباً واحد کیس بھی ہے۔ ماؤ نے اپنی جدوجہد کے برسوں کے دوران دیہی آبادی کے لیے دوستانہ اور مددگار رویہ اختیار کر کے طاقت حاصل کی۔ کچھ کے خیال میں ماؤ نے سرکاری مارکسزم میں محض ''چینی جاگیرداری کی روایت کے خلاف لڑنے کے لیے'' ایک ہتھیار ہی دیکھا۔

ماؤ نے دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر تقریباً 25 برس تک حکومت کی۔ وہ اپنی خوفناک غلطیوں کے باوجود عہد ساز شخصیت تھا۔ وہ بجا طور پر تاریخ عالم میں سکندر اعظم سے زیادہ اہم شخصیت بنتا ہے۔ یقیناً اس کی پالیسیاں زیادہ لوگوں کی موت کا باعث بنیں۔ ماؤ کے جانشینوں نے کبھی بھی اس کی پالیسیوں کو کلیتاً مسترد نہیں کیا: وہ سمجھتے ہیں کہ ماؤ کی زیادہ تر پالیسیاں نقصان دہ ثابت ہوئیں، لیکن ملک پر مکمل قبضہ پانے کے لیے وہ ضروری تھیں۔ لیکن شاید ماؤ ایک مارکسسٹ سے زیادہ ایک انارکسٹ تھا۔

ماؤ 1893ء میں صوبہ ہونان میں ایک کاشتکار کے گھر پیدا ہوا۔ اس نے طاقتور چینی روایت کے برعکس بچپن میں ہی ''فرزندانہ سعادت'' سے انحراف کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کی ماں نیتاً نرم خو اور راسخ بدھسٹ تھی۔ ماؤ نے بیجنگ یونیورسٹی کی لائبریری میں بطور اسسٹنٹ کام کیا اور پھر Changsa میں پرائمری سکول ٹیچر کی تربیت پائی۔ اس نے 18 برس کی عمر میں گریجوایشن کر لی۔ وہ ''فرسٹ کانگریس اور چائنیز کمیونسٹ پارٹی'' (1921ء) کے 12 مندوبین میں سے ایک تھا، لہٰذا اس کے بانی ارکان میں بھی شمار ہوتا ہے۔ تاہم، اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ ہمیشہ

اس پارٹی پر زبردست تنقید کرتا رہا۔ وہ کبھی بھی اپنی کابینہ کو مکمل طور پر اختیار میں نہ لا سکا۔

ماؤ پہلا ایسا سرکردہ چینی کمیونسٹ تھا جس نے کاشتکاروں کی انقلابی صلاحیتوں کو شناخت کیا۔ مارکس نے تھیوری اور لینن نے عمل میں کمیونزم کو ایک شہری نظریے کی حیثیت میں دیکھا تھا۔ 1920ء کی دہائی کے اواخر میں ماؤ نے ہونان کے لوگوں کو منظم کیا......سب سے پہلے اپنے گاؤں والوں کو......اور ایک طاقتور فورس بنائی۔ یہ نہایت عملی طریقہ کار فیدل کاسترو کے زیر اثر تھا جس نے 1959ء میں کیوبا کا قبضہ سنبھالا۔ اس نے ویتنام، لاؤس اور کمبوڈیا کے کمیونسٹوں کو بھی اپنے اپنے ملکوں کا اقتدار حاصل کرنے پر مائل کیا۔ چینی کمیونسٹ محض صنعتی شہری علاقوں میں مارکسسٹ لیننسٹ خطوط پر کام کر کے چیانگ کائی شیک سے حکومت نہیں چھین سکتے تھے۔

چین پر ماؤ کی اصل حکومت 1949ء میں شروع ہوئی جب چیانگ کائی شیک کو پسپا ہو کر تائیوان جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس فتح سے پہلے کے برسوں میں ہی اس نے بہترین کام سرانجام دیا۔ اس کی داخلی پالیسیاں کامیاب نہیں تھیں، اگرچہ وہ ہمیشہ عام کسان کی خواہشات اور امنگوں سے منسلک رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ اس نے "Hundred Flower" تحریک شروع کی: اس نے شہریوں کو پارٹی پر تنقید کرنے کی مکمل آزادی دی۔ اس حوالے سے اس کا دفاع کیا جا سکتا ہے: اپنے ہی ساتھیوں نے اسے یہ داخلی پالیسی منسوخ کرنے پر مجبور کیا۔

ماؤ کا اگلا اقدام زیادہ قابل دفاع نہیں اور ساتھیوں کے پاس اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی زیادہ ٹھوس بنیادیں تھیں: یہ اقدام ''آگے کی جانب بڑا قدم'' (1958ء) تھا جس کا مقصد چینی لوہے کی پیداوار کو 30 ملین ٹن سالانہ تک لیجانا تھا۔ جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ تاہم، اس پروگرام کے تحت لاکھوں چھوٹی لوکل فرنس ملیں بنانا بہرحال قابل ستائش تھا۔ کیا کوئی شخص گاندھی کو یہ الزام دے سکتا ہے کہ اس نے مقامی طور پر سوت کاتنے پر زور دیا تھا؟

1965ء میں ماؤ کو کنٹرول اپنے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے کہا کہ ''عوام کو لاعلم رکھنا ظالم آمروں کے فائدے میں ہوتا ہے، انہیں ذہین اور باخبر بنانا ہمارے مفاد میں ہے۔'' لیکن اس کے سبھی ساتھی متفق نہ تھے، اور وہ خود کسان طبقے کے تقاضوں سے آگے کچھ بھی

نہیں سوچ سکتا تھا۔ ماؤ کو اپنے ساتھیوں پر اعتبار نہیں تھا، اور پالیسیوں کو نافذ کرنے کے عمل میں اس نے اچھے حلیف نہ منتخب کیے۔ اس نے کبھی بھی صنعت کو سمجھا اور نہ ہی اس سے ہمدردی رکھی۔ بہرحال چین کا دارومدار صنعت پر ہی تھا۔

1966ء میں انقلابی "سرخ گارڈز" کی تشکیل اور انہیں دیہی علاقوں میں بھیجا جانا (تاکہ وہ بیوروکریٹس، پروفیسرز، ٹیکنیشنز اور غیر کسانوں کو دیہی کام کرنے پر مجبور کریں) ایک طرح سے اپنی ہی کابینہ کے خلاف اعلان جنگ کروانے کے مترادف تھا۔ اسے کمیونسٹ ریاست کے خلاف عوامی انقلاب کہا گیا۔ سرخ گارڈز کی زبردستیوں کا الٹ نتیجہ برآمد ہوا۔ لاکھوں افراد کو قتل یا مستعفی ہونے اور توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ حکومت کے خلاف غیض وغضب اور نفرت کی ایک لہر اٹھی، بیوروکریٹس کے لیے نفرت نے انتقامی صورت اختیار کر لی۔ چین کی معیشت متاثر ہوئی اور سارے ٹیکنیشن مارے گئے۔ یہ امر واضح نہیں کہ ان دست درازیوں میں ماؤ کی چوتھی بیوی کا کس حد تک عمل دخل تھا، لیکن ماؤ کی وفات کے بعد اسے اور دیگر ("چار کا ٹولہ") کو پکڑ کر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنائی گئی۔

لہٰذا "چھوٹی سرخ کتاب" میں نظر آنے والا ماؤازم ایک قطعی غیر فکری مظہر ہے۔ سوویت روس میں پارٹی حکام تنقید سے مبرا تھے۔ ماؤازم میں پارٹی حکام کو ترجیح دینے کی بجائے "عوام کی سننے" کی براہ راست پالیسی اختیار کی گئی۔ ماؤازم سوویت مارکسزم کی نسبت کہیں زیادہ انارکسٹ ہے، مگر زیادہ پرکشش بھی۔ لیکن 1966ء سے شروع ہونے والے واقعات ان لوگوں کے لیے ایک واضح وارننگ تھے جو اس کے یوٹوپیائی آئیڈیلز کی جانب متوجہ ہوئے۔ 1966ء میں چین ایک ایسا ملک نہیں تھا کہ جس میں انارکزم کا اچانک تجربہ کیا جاتا۔ نتیجتاً ہر طرف افراتفری اور بے ترتیبی پھیل گئی۔

rekhta

100

آزادی اور وقار سے ماورا

"Beyond Freedom and Dignity"

بی ایف سکنر

1971ء

1926ء کے موسم سرما میں محترم شاعر رابرٹ فراسٹ نے مشی گن یونیورسٹی میں تخلیقی تحریر کا ایک کورس کروایا۔ اس کے شاگردوں میں ایک 22 سالہ مسٹر سکنر بھی شامل تھا جس کے بارے میں اس نے ایک خط میں لکھا: "مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم میں آرٹ کی حس موجود ہے۔ تمہاری کہانیوں کا مجموعہ عمدہ ہے۔ اس برس جن لوگوں کی نثر میری نظر سے گزری ہے تم ان سے دو گنے

قابلِ قدر ہو"۔ مسٹر سکنر نے نہایت لطیف اور عمدہ مشاہدات پیش کیے۔ فراسٹ نے اسے بتایا: ''تمہیں زندگی پر میرے یقین کو بڑھانا یا پھر اسے منسوخ (کراس) کرنا ہوگا۔''

Burrhus Frederic Skinner 1904ء میں بمقام پنسلوانیا پیدا ہوا۔ اسے افسردہ فراسٹ کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں کا ''زندگی پر یقین'' پار کرنا تھا۔ اس نے اپنے سادہ لوح ناول "Walden Two" میں لکھا: ''جب طرزِ عمل کی ایک سائنس حاصل ہو جائے تو ایک منصوبہ بند (یا منظم) معاشرے کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔'' سکنر کے یہ الفاظ بہت سے لوگوں کو چبھے۔ البتہ بہت سی سرکاری ''منصوبہ بندی'' سکنری سائنس کے زیرِ اثر نظر آتی ہے۔ سکنر کو ایک انسانیت پسندی کے مخالف کے طور پر دیکھا گیا۔ اس نے ''منصوبہ سازوں''، ''منیجروں'' اور ان جیسوں کو بھی متاثر کیا۔

چنانچہ سکنر کی جانب سے یاسیت پسند شاعر فراسٹ کے ''زندگی میں یقین'' پر اصرار کی ''تنسیخ'' ایک افسانہ یا نثر نگار، کسی تخلیقی قلم کار نے نہیں بلکہ ایک ماہرِ نفسیات نے کی۔ سکنر اپنے عہد کا اولین کرداری ماہرِ نفسیات تھا۔ اس نے واٹسن کی کرداریت پسندی کو بھی احترام دلایا۔ سکنر کی شہرت یا بدنامی کی وجہ اس کی تخیلاتی تحریریں نہیں بلکہ پابند قواعد چوہے اور کبوتر، اس کے ''مشینی انداز میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے'' اور اس کا ''سکنر باکس'' تھا۔ یہ چیزیں اس کے غیر دلچسپ اور بے وقوفانہ ناول "Walden Two" (1948ء) اور ''آزادی اور وقار سے ماوراء'' میں ملتی ہیں۔

ایک تخلیقی مصنف اور ادبی نقاد کے طور پر اس کی ابتدائی کوششوں کا تذکرہ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ''مکمل متحد'' معاشرہ بنانے کے لیے اس کا منصوبہ...... جس میں ہر کوئی اس کے ''مثبت اطلاق قوانین'' کے تحت پابند تھا...... تخلیقی میدان میں اس کی ناکامی کا ہی نتیجہ تھا۔ وہ ایک شاعر نہ بن سکنے پر غضب کا شکار تھا۔ بڑھاپے میں اس نے اپنی جوانی کی ایک تحریر سے اقتباس کا حوالہ دیا اور پچھتانے کے انداز میں کہا کہ اس کے خیال میں یہ ''خراب نہیں۔'' لیکن ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

آج کل باقی سب کو پابند کرنے کے خواہشمند اور متکبر چند لوگوں کو چھوڑ کر، وہ ابہام کی دھند

میں غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ اسی کا حق دار ہے۔ لیکن کیا اس نے ایک مہلک نشان چھوڑا...... وہ نشان جس کی نشاندہی بیسویں صدی کے آغاز میں کافکا نے خوفناک حد تک پرسکون انداز میں کی تھی؟ جے بی واٹسن کی قائم کردہ امریکی کرداریت پسند روایت کے تحت کیا ہوا اس کا نفسیاتی کام زوردار اور ممتاز تھا۔ وہ کبھی بھی ایک جعلی سائنس دان نہیں رہا تھا، اور جانوروں میں کرداری ترمیم کے حوالے سے دلچسپ اور باریک بین تجربات کرنا بھی جانتا تھا۔ تاہم، اس کے اخذ کردہ نتائج بعید از قیاس ہونے کے ساتھ ساتھ احمقانہ بھی تھے۔

> ہم نے اس اونچائی کا مشاہدہ کیا جس پر کبوتر کا سر نارمل حالات میں اوپر اٹھتا ہے، اور پھر اونچائی کے پیمانے پر ایک لائن منتخب کی جہاں تک اس کا سر شاذ و نادر ہی پہنچتا ہے۔ پیمانے پر بدستور نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس وقت فوراً فوڈر کھولنا شروع کی جب بھی کبوتر کا سر اس لائن سے اوپر جاتا۔ نتیجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

بلاشبہ یہ مفید ہے، اور اس انداز کی ایک اچھی مثال بھی جس کے تحت کبوتر سکنر جیسے انسانوں کو اپنے لیے خوراک فراہم کرنے کی تربیت دے سکتے ہیں۔

سکنر کا پیدا کردہ اثر بحیثیت مجموعی اس کی حمایت کردہ معاشرتی سمت کے برعکس رہا ہے: پابند، باتمیز اور اکتائے ہوئے افراد پر مشتمل معاشرہ۔ چونکہ سکنر میں کسی بھی قسم کے تخیل کا فقدان تھا، لہٰذا وہ جلد ہی اس میں ناکام ہو گیا اور اس نے دنیا کو اس کی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، اس کا سنگین ترین گناہ ظلم پسندی یا طاقت کی خواہش کی بجائے یہ خیال نہ رکھنا تھا کہ اس کے نظریات کس طرف لے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک اچھا تجربیت پسند سائنس دان تھا، لیکن انسانی اعتبار سے نہایت خطرناک اور اپنے اندر سے رحم خوئی کا شائبہ تک مٹا دینے کو بے قرار۔

ولیم جیمز جیسے ماہرین نفسیات پر عیاں تھا کہ نفسیات کی ایک کارآمد شاخ موجود ہے جو سائنسی انداز میں خالصتاً خارجی طرزِ عمل کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ لیکن روسی سائنس دان آئیوان پاولوف (1849ء تا 1936ء) نے ہی نفسیات کی کرداریت پسندانہ شاخ میں حقیقی جان پیدا کی۔ کتوں پر اس کے مشہور تجربات نے ثابت کیا کہ انہیں پابند کیا جا سکتا تھا۔ ایک بھوکے کتے کو کھانا دیتے وقت گھنٹی بجائی جاتی، اس طرح گھنٹی کا پابند کر لیے جانے پر کھانا دیے بغیر گھنٹی

بجانے پر بھی اس کے منہ سے رالیں بہنے لگتیں۔

نتیجتاً واٹسن نے کہا،

''مجھے درجن بھر صحت مند شیر خوار بچے دو، اور میری مخصوص دنیا میں ان کی پرورش کرنے کی اجازت دو۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ انہیں جس قسم کا سپیشلسٹ چاہوں گا بنا دوں گا...... ڈاکٹر، آرٹسٹ، تاجر اور حتیٰ کہ بھکاری اور چور؛ چاہے ان کے رجحانات، قابلیتیں، دلچسپیاں اور صلاحیتیں کچھ بھی ہوں۔

یہ نکتۂ نظر سکنر کے پروگرام کی بنیاد تھا، لیکن اس کی پرانی ادبی امنگیں بھی قائم رہیں: وہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔

"Walden Two" میں ایک کردار پروفیسر Burris کو ایک مستعد اور خود انحصار آبادی سے متعارف کروایا جاتا ہے جس کے افراد بے جوش، بور، بور کرنے والے اور خود پسند تھے۔ یہ برادری "reinforcement" کے ذریعے ''کام کرتی'' تھی۔ اس طرح ہم ''سکنر باکس'' تک پہنچتے ہیں۔ اس میں چوہا (جو سکنر کے لیے انسان کے مساوی ہے) پہلے ادھر ادھر گھومتا ہے۔ لیکن انجام کار لامحالہ طور پر ایک لیور دبا دیتا ہے۔ ایسا ہونے پر اسے روٹی کا ٹکڑا ملتا ہے۔ یہ ''مثبت reinforcement'' ہے۔ چنانچہ سکنر کی واہیات زبان میں چوہا "Operant" بن جاتا ہے۔ "Walden Two" کے ''لوگ'' اسی قسم کے ہیں۔ لیکن بلاشبہ وہ مکمل لوگ نہیں...... حتیٰ کہ وہ لوگ بھی نہیں بلکہ صرف صفر ہیں۔

''آزادی سے ماورا'' میں سکنر نے اس سب کی بنیاد پر اپنی آزاد مرضی کے تحت عمل کرنے والی انسانیت کے ''رومانوی'' نظریہ سے نفرت کا اظہار کیا۔ اس نے زور دیا کہ ماحول کے جبر سے آزادی ممکن نہیں تھی، لہٰذا پابند یا مشروط انسانیت واحد امید تھی۔ آزادی کسی ''اقتداری'' کی اطاعت میں ہی برقرار رہتی اور استعمال ہوتی ہے۔''

محض اتفاقاً اس میں ایک سچائی پائی جاتی ہے جسے ہم میں سے زیادہ تر لوگ تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ انسانی رویے کی ''مشینی'' نوعیت کا برسوں پہلے ''بیلزےبب کے قصے'' (1950ء) میں ''تجزیہ'' کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مصنف گُرجیف کی تعلیمات کو پی اوسپنسکی نے اپنی

تصنیف "In Search of the Miraculous" میں واضح کیا۔ جے بی واٹسن کبھی بھی گُرجیف سے نہیں ملا تھا۔ وہ گُرجیف کی کہی ہوئی باتوں کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

لیکن واٹسن کا شاگرد سکنر بھی گُرجیف کا مطمحِ نظر نہ سمجھ سکا: کہ انسانیت کا ایک پہلو قطعی غیر مشینی تھا۔ یہ پہلو مذہبی تھا اور سچائی کا متلاشی تھا۔ سکنر نے بھی حیرت انگیز طور پر انسانی رویے پر مذہبی عقیدے کے لاریب اثرات کو نظر انداز کر دیا۔ یہ معتبر انداز میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ماورائی مراقبے پر عمل کرنے کے ذریعے مخصوص آبادیوں / برادریوں میں شرح جرم میں خاطر خواہ بہتری پیدا ہوگی۔ لیکن اس قسم کے مذہبی عقیدے کا نظریہ سکنر کی فہم سے بالاتر تھا۔ ذہن کے بارے میں اس کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا: ''یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ فضول ہے!''

آخر میں سکنر ایک طرح کی حسرت ناک شخصیت بن گیا۔ کبھی کبھی وہ خود کو بالکل غلط تسلیم کر لیتا۔ تاہم، انسانوں کو سزا دینے اور پابند کرنے کے حوالے سے اس کے خیالات دنیا بھر میں استعمال کیے گئے اور اب بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ طریقہ ہائے کار کچھ لوگوں کے رویے میں ''عارضی طور پر'' ترمیم کر دیتے ہیں، لیکن زیادہ تر پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بحیثیت مجموعی یہ طریقہ ہائے کار بھی دیگر طریقوں جتنے ہی کامیاب اور ناکام رہے۔ سکنر کا کیریئر اس امر کا غماز ہے کہ مسائل کے جزوی حل پیش کرنا کوئی بھی حل پیش نہ کرنے کی نسبت زیادہ بری چیز ہیں۔